مردوم

خدا بخش لائبریری

جرنل

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 20088

۱۷ ۱۸

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن ۳۳۴۴/۷۷۷

مجلس ادارت

- قاضی عبدالودود (چیرمین)
- سید حسن عسکری
- افسر الدولہ فیاض الدین حیدر
- عابد رضا بیدار (سکریٹری)

سترھواں اٹھارھواں شمارہ: ۱۹۸۱ء

اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے، جو خدا بخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری کے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت : تیس رُپے

سالانہ زرِ خریداری —
- اندرون ملک : ۶۰ رُپے
- پاکستان : ۱۲ ڈالر
- یورپ : ۸ پونڈ
- امریکہ اور دیگر ممالک : ۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

قاضی عبدالودود

کا

ماہنامہ معیار پٹنہ

مکمل فائل کی عکسی شاعت

ایک تجزیاتی اشاریہ کے ساتھ

خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۱۹۸۱ء

خدا بخش لائبریری کی طرف سے شائع کردہ **ادیب** (الٰہ آباد) **صبحِ اُمید** (لکھنؤ) کے انتخابات کی پیشکش کی مانند **معیار** کے مکمل فائل کی یہ عکسی اشاعت بھی اپنے اصل سائز ۲۰ × ۳۰ کے بجائے کمتر سائز ۱۸ × ۲۲ میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس فرق کے ساتھ، بقیہ تمام و کمال مواد من و عن شائع ہو رہا ہے۔

پیشگفتار

یہ ماہنامہ 'معیار' (پٹنہ) کے مکمل فائل کی عکسی نقل پیش خدمت ہے جو قاضی عبدالودود صاحب نے ۱۹۳۶ء میں ۴۲ سال کی عمر میں نکالا اور جو مارچ سے جولائی، اگست تک چھ ماہ میں ۶/۵ پرچے نکل کے اسی سال بند ہو گیا۔ اس کے بند ہونے میں خریداروں کی کمی کو اتنا دخل نہ رہا ہوگا، جتنا قاضی صاحب کی اُس مسلسل علالت کو جس کا سلسلہ ۱۹۲۴ء قیام یورپ، سے شروع ہو گیا تھا جب ڈاکٹروں نے ان کے پھیپھڑے میں خرابی تشخیص کی تھی جب سب انہیں چھ مہینے موسز ریلینڈ میں مونتانا کے سینی ٹوریم میں علاج کے لیے قیام پذیر ہونا پڑا اور ہندوستان واپسی پر بھی ڈاکٹر انہیں یہی بتاتے رہے جس کے سبب وہ ۱۹۳۷ء تک دلچسپی سے کوئی مہم نہ کر سکے اور جو ہوائی (نینی تال) اٹکی اور پونا کے سینی ٹوریم میں صحت کی جستجو کرتے رہے۔ تاآنکہ ایک ماہر ڈاکٹر نے ۱۹۳۷ء میں پورے جسم کو چیک اپ کرنے کے بعد وثوق سے بتایا کہ یا تو پھیپھڑے میں خرابی تھی ہی نہیں اور تشخیص غلط ہوتی رہی یا بالآخر کم از کم اس وقت تک وہ مرض قطعی طور سے ختم ہو چکا تھا۔

'معیار' نے اپنے لیے جو حدود متعین کیے تھے ان میں سے ۱۹۳۶ء میں اس نے ایک ادبی اور تحقیقی جریدے کا وہ معیار پیش کیا جو یورپ کے اعلیٰ ادبی مجلات کے پیش نظر رہتا تھا۔ اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کے لیے بیشتر یہ ہوا کہ ایڈیٹر کو خود بہت لکھنا پڑتا تھا جس کے لیے تنوع کی خاطر مختلف قلمی نام بھی اختیار کرنے پڑتے تھے۔

اس وقت قاضی صاحب کی دلچسپیاں صرف تحقیق تک محدود نہ تھیں اگرچہ خصوصی مرکز اس وقت بھی تحقیق ہی تھا۔ **غالب اور آوارہ گرد اشعار** کی بات 'معیار' میں بار بار اور متعدد عنوانوں سے

۱۔ "مرزا غالب کے متفق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں" ۱۶

۲۔ "دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچین نگاہ تو ز داماں گلہ دارد
در بزم وصال تو چو شبنم نگہ ما — نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے ہیں ... فارسی اشعار کا ایک مجموعہ میں یہ اشعار 'عشرتی' کے نام سے نقل کیے" الخ۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ برسوں بعد معاصر نئی ۱۹۵۱ء میں اس کی جستجو کو انجام تک پہنچا کر لکھا کہ یہ غزل نصرت نصرتی کی ہے۔

چھڑتی رہی۔ مخطوطات کے مطالعے سے حاصل شدہ نوادر سامنے لائے جاتے رہے۔ قدیم شعرا کے سوانح کے سلسلے میں یا تاریخ پیدائش و وفات کے بارے میں، یا تاریخ تصنیف کے تعین کے مسئلے پر تحقیق و جستجو ہوتی رہی۔ ترتیب متن اور صحت متن کی بات بھی بار بار آتی رہی۔ کتابوں پر تفصیلی تنقید کے مواقع پیدا ہوتے رہے، خالص ادبی و شعری تنقید کے گوشے نکلتے رہے ——— لیکن تنقید میں طنز کے ساتھ توازن برقرار رکھا جاتا رہا۔ اگرچہ اپنی بات اور اپنے نظریات پوری شدت کے ساتھ سامنے لائے جاتے رہے

'معیار' کے بعد جب نانصلی صاحب دوبارہ جم کے ادب کے میدان میں آئے، تو صرف تحقیق کے ہو رہے۔ معیار کے دور میں ایسا نہ تھا۔ ڈراما اور افسانوی ادب سے ان کی دلچسپی کے ثبوت میں معیار میں چھپنے والے دوسروں کے ہی نہیں ان کے اپنے ترجمہ اور طبع زاد دونوں قسم کے افسانے پیش کیے جا سکتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ہی ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے کیا جب ان کا پہلا افسانہ 'آگرہ اخبار' میں شائع ہوا 'معیار' میں ان کا طبع زاد افسانہ 'ہونہار نوجوان' اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس کا ماڈل کیمرج کے ایک پنجابی ساتھی طالب علم (خورشید احمد) ہیں ——— افسانہ کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ 'ترقی' کرتے ہیں جو دوسروں کو استعمال اور استحصال کا گر جانتے ہیں۔

جاسوسی ادب (جس سے ان کی دلچسپی آج بھی جاری ہے۔ گرچہ یہ تعجب خیز امر ہے کہ وہ 'مجموم' کو جاسوسی دنیا پر ترجیح دیتے ہیں) کے سلسلے میں 'معیار' میں ایک بار لکھا تھا: "سر کونن ڈائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مترجمین کو اب فریمین کی طرف متوجہ ہونا چاہیے" (ص ۲۶۳)۔ غزل، اس کی ہیئت اس کے مشتملات، اس کی زبان اور طرز ادا اس میں گہری دلچسپی تھی جو 'معیار' کے صفحات میں بھی چھلکی پڑتی تھی، اس کے باوصف کہ انہوں نے پابندی لگا دی تھی کہ شعرائے حال کی غزلیں قطعاً شائع نہ ہوں گی۔ غزل کی زبان میں ہندیت مرنج ہے یا فارسیت، اس بارے میں لکھتے ہیں ——— "آجکل کے اکثر مشہور غزلگو فارسیت کو ہندیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب و مومن کے بعد داغ نے دہلی میں اور شاگردان آتش و ناسخ نے لکھنؤ میں فارسیت کے سیلاب کو

۱۔ یہ علم (یعنی باب) کے شعری حصے پر تنقید کا انداز وہ ہے جو بعد میں عندلیب شادانی اور 'فاران' کے مرتبہ القادری نے اپنایا۔

روکنا چاہا تھا۔ عزد جدید میں حالی بھی ان لوگوں کے ہمخیال تھے لیکن بیسویں صدی میں کلام غالب کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ فارسیت کا بول بالا رہا اور اس کے آگے "ہندیت" کا چراغ نہ جل سکا۔"

غزل کے الفاظ کیسے ہوں اس کے بارے میں قاضی صاحب کی رائے یہ تھی کہ :

"غزل میں ایسے الفاظ کا استعمال جو اخبار نویس بے تامل استعمال کر سکتے ہیں، غزل کی نزاکت انکی متحمل نہیں ہو سکتی ..... ہزاروں الفاظ جو بجائے خود صحیح ہیں اور نثر تو نثر قصیدہ و مثنوی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں، غزل میں نہیں کھپ سکتے" اور ہماری رائے میں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم غزل کو اسکی خصوصیت سے عروم کر دیں۔" (اتنا لکھ کر مثالیں دی ہیں کہ حقیقۃً، نسبتہً، خلقۃً، رسماً وغیرہ ہماری رائے میں غزل میں ان سے احتراز لازم ہے۔ مزید الفاظ کی جو مثالیں دی ہیں وہ یہ ہیں : تکمّانِ، جمودِ دل، تنقید، تبلیغ، مادیت، تنظیم، مطمح، لغت، تاریخ)۔

اور غزل کے مشتملات کے بارے میں ایک غزل گو کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ :

——— "(یہ) غزلیں رکیک اور مبتذل مضامین سے یکقلم پاک ہیں۔ ان کے اشعار میں چند ہی ایسے ہیں جو ایک حیادار نوجوان اپنے والدین کے سامنے نہ پڑھ سکتا ہو، یا تیرھویں صدی (کذا) کا باپ اپنی دوشیزہ لڑکی کے سامنے نہ سنا سکتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اشعار کا یہ معیار کہاں تک صحیح ہے؟"

——— "مادیت کو غزل سے بالکل خارج نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کہتا ہے : "لطافت بے کثافت الخ" کیمرج کے تعلیم یافتہ "معیار" کے ایڈیٹر کے قلم سے غزل کے بارے میں مندرجہ بالا "ہدایات" اور "معیار" کی پالیسی کے طور سے یہ اعلان کہ "شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری ریشن کیخلاف ہے" اگلی دہائی میں کیمرج ہی سے لکھنے والے اردو غزل کے مشہور ناقد کے لیے انسپریشن کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ۱۹۴۰ء میں قاضی صاحب سے پہلی ملاقات کے ذکر میں کلیم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ : ——— "یوں تو میں ان کے نام سے واقف تھا، 'معیار' جو وہ نکالا کرتے ہیں اس کے دو شمارے میں نے دیکھے تھے، ان کی قابلیت کی شہرت تھی لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔" (معاصر، دو دو نمبر)

طنز، جو قاضی صاحب کی تحریر میں اب بھی چپکے سے در آتا ہے (اگرچہ وقت اور جگہ بچانے کے لیے اب وہ اس کے استعمال میں اسراف نہیں کرتے) ملکیوں کہا جائے کہ جب ناگہ یہ ہو اب اسی وقت

اس سے کام لیتے ہیں) 'معیار' میں جا بجا مناسب و برمحل مواقع میں اس کا استعمال ملتا ہے، اور یہ بڑا لطیف طنز ہوتا ہے۔

ایک قدیم دیوان کے ایڈیشن کی ترتیب و اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دکن کی اکثر مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی حسنِ ظاہر سے بہرہ وافر رکھتی ہے... دیباچہ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ متن کی درستی کس اصول کی بنا پر کی گئی ہے... یہ نسخہ جتنا چاہیے اتنا صحیح نہیں لیکن دوسرے اداروں سے جو کتابیں نکلتی رہتی ہیں ان کے مقابلہ میں زیادہ غلط بھی نہیں... الحاقی کلام کم داخل ہے۔"

ایک نئے رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(اس) کے 'مقاصد' مسلمانوں میں اصلاحیں لانا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزلوں کی اشاعت کس طرح مسلمانوں کی اصلاح میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔"

ایک مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں:

"(مضمون نگار کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے مخاطب اس مضمون سے برا نہ مان جائیں۔ برخلاف اس کے ہماری رائے ہے کہ سید صاحب کی ہر دلعزیزی میں اس مضمون کی اشاعت سے معتد بہ اضافہ ہو جانے کی توقع ہے۔"

ایک رسالہ کے افسانہ نمبر میں شامل ایک افسانہ کے بارے میں جو طبع زاد کے طور پر پیش کیا گیا، جبکہ واقعتہً وہ ایک انگریزی افسانہ سے ماخوذ تھا جو چند سطریں لکھی ہیں ان میں تو طنز لطافت کی اس سطح پر پہنچ گیا ہے کہ مجھے اس امر کی توثیق کرانی پڑی کہ واقعتہً یہ طنز یہ عبارت ہے لکھتے ہیں:

"نو افسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں۔ ان میں کم سے کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے۔ اسلم صاحب نے تمہید اپنی طرف سے بڑھا دی ہے، کئی نام بدل دیے ہیں اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حذف کر دی ہیں۔ لوگ اسے سرقہ کہیں گے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی کو اسلم صاحب پر اعتراض کا حق نہیں! کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں؟ کیا سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ دیکھتے میں فارسی کے مضامین باندھو؟ اور کیا ہمارے شعرا کا اب تک اس ہدایت پر عمل نہیں ہے؟ افسانہ نگاروں کے لئے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے؟"

ایک رسالے پر، جس میں اغلاط بکثرت تھے، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر اوسط فی صفحہ دو بھی رکھا جائے تو اغلاط کی تعداد ۳۲۴ ہوتی ہے۔ رسالے کا صحیح چھپوانا اگر ممکن نہیں تو غلط نامہ ہی شامل کر دیا ہوتا، پڑھنے میں اتنی اُلجھن تو نہ ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غلطنامے کی صورت دیکھتے ہی بدظن ہو کر اُٹھتے ہیں لیکن سُننے میں آیا ہے کہ اب اس کا علاج بآسانی ہو جاتا ہے۔" (ص ۲۶۲)

——— ایک شاعر پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اشعار کا جو 'پوسٹ مارٹم' کیا ہے، اس میں جا بجا یہ نمکنے گا، جس کا نمونہ مندرجہ ذیل شذرہ تبصرے میں موجود ہے:

"ایک ہی سانحے نظامِ عشق کا ماضی و حال ؛ میری تجویز و فا ناکام تھی، ناکام ہے"

"یہ عشق کا ذکر ہے یا کسی انجمن میں کسی تحریک کے نامنظور ہونے کا؟"

جس محنت سے یہ ماہنامہ مرتب ہوتا تھا، جب تک اس کے مشتملات، خصوصاً مستقل عنوانات تفصیلاً نہ پڑھا جائے، اس کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ مقالات، نظموں، افسانوں، تمثیلوں (ڈراموں)، مراسلات اور استفسارات کے علاوہ جن میں دوسرے بھی حصہ بٹاتے تھے، معروضات، تعارف، تصحیح اغلاط، آثار (= نوادر)، غالب (= غالبیات)، مطبوعات جدید (= تبصرے)، اقتباسات (اہم مضامین، خطبات وغیرہ کے)، محکمہ (= اسٹینڈرڈ)، اوراق پارینہ (= نوادر)، یادرفتگاں (= تعزیتی نوٹ)، صوبہ بہار (یا بہار و بنگال) ۱۹۳۷ء کے ادبی مضامین ——— اور عالم ادب اس رسالے کے وہ مستقل عنوانات تھے، جن کے لیے ایڈیٹر کو اچھی خاصی محنت کرنی پڑتی تھی۔ مخطوطات، تازہ مطبوعات اور رسائل کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے ان کے ضروری نوٹ بنانے ہوتے تھے۔ اکثر ان پر رائے بھی دینی ہوتی تھی! اور یہ سب، کچھ سلیقہ اور توازن کے ساتھ ہوتا تھا۔ معارفین پر جائز تنقید بھی ہوتی تھی۔ ان کے کام، محنت، صلاحیت اور اہلیت کا جس قدر مستحق ہوتا اعتراف بھی کیا جاتا۔ ایسے معارفین جن کی تحریروں کا 'معیار' میں بطور خاص نوٹس لیا گیا، ان کی تعداد خاصی ہے۔ ایسے تمام نام اشاریہ میں اشخاص کے عنوان سے جمع کر دیے گئے ہیں۔

معاصروں کا کھُل کے اعتراف ان کی تعریف، توصیف (مراجعے کام کی تحسین اور

اعتراف قاضی صاحب بھی کرتے ہیں مگر لکھت میں ایسی چیزیں کم لاتے ہیں۔ لفظ 'نظر' یہ ہے کہ یہ پہلو سب کے سامنے ہے ہی، وہ پہلو جو عام طور سے نظر نہیں آسکتا اس پر روشنی ڈالنا زیادہ ضروری ہے) و 'زبان' و بیان میں لسبتہ زیادہ شگفتگی، نسبتہً کم جزرسی، جابجا لطیف طنز کا استعمال؛ تحقیق کے ساتھ ساتھ ادب کی دوسری اصناف سے بھرپور دلچسپی؛ ان کا مطالعہ اور ان پر رائے زنی: تازہ کتابوں پر جن میں ہر صنف شامل تھی تفصیلی، تحلیلی تبصرے؛ اُردو کے تقریباً تمام اہم رسائل کے ممتاز مشمولات کا طلاعہ اور جہاں ضروری ہو، تنقید یا تحسین؛ ——— اور سب سے بڑھ کر اُردو میں تحقیق کا ایک نیا معیار سامنے لانا، ان سب امور نے 'معیار' کو (اپنے قائم کردہ حدود کے اندر) اُردو کا ایک بھرپور پرچہ بنا دیا تھا، جس کے صرف چھ پرچے شائع ہوئے لیکن اس کے باوجود وہ ایک ایسا معیار قائم کر گیا جسے ۱۹۳۶ء کے ۴۴ سال گزرنے کے بعد بھی نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔

یہ 'معیار' کی سرسری سرگزشت ہوئی۔ اس سے آگے کی تفصیلی بات **اشاریہ** میں ملے گی جہاں سب سے پہلے تو 'معیار' میں شامل قاضی صاحب کی تحریروں کا تجزیاتی انڈکس بنانے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ وہ بھی ہمہ جہتی اور ہر پہلو پر حاوی نہیں کہی جاسکتی ——— کہ اس کے لئے مزید مطالعہ کے واسطے خود 'معیار' کے مکمل فائل کا عکس ہی آپ کی خدمت میں پیش ہے)۔ اس کے بعد بقیہ مضمون نگاروں کے ناموں کے ساتھ ان کی تحریروں کا انڈکس ہے۔ امید ہے اس اشاریہ سے اس پیشکش کے استعمال میں سہولت ہوگی اور ایک نظر میں 'معیار' کے متعدد پہلو سامنے آجائیں گے۔

اشاریہ کے بعد، معیار کے لکھنے والوں کا دو ایک سطری مختصر تعارف بھی دیا جارہا ہے۔

عابد رضا بیدار

●●

انجمن ترقی اردو (شاخ پٹنہ) کا رسالہ

معیار

مرتبہ

قاضی عبدالودود

بانکی پور

مارچ ۱۹۳۶ء

انجمن ترقی اُردو، شاخ پٹنہ کا اَدبی رسالہ

معیار

مرتب :- قاضی عبدالودود معاون :- محمد شرف عالم آرزو جلیلی

ضروری گزارش

کسی رسالے کی کامیابی کے لیے چار عناصر کا اشتراک عمل اور دوام میں بعض خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ اول نکالنے والے یعنی وہ لوگ جن سے رسالے کے انتظامی معاملات اور مالیات کا تعلق ہے، ان میں شوق فضول و جرأت رندانہ کے ساتھ ساتھ یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ رسالے کے لیے کافی سرمایہ جمع کر سکیں، ورنہ اس کی بنیاد متزلزل رہے گی۔ دوسرے مرتبین رسالہ ان میں علم کے ساتھ صحیح قوت نقد بھی ضروری ہے، ورنہ ان کی حیثیت محض ڈاک کے کارکنوں کی ہوگی جو بلا تمیز رطب و یابس جو کچھ ان کے پاس آئے گا وہ دوسروں تک پہنچا دیں گے۔ اس میں زبان کا خون ہو جائے تو ہو، نہیں بحث نہیں۔ اور غلط معلومات کی اشاعت ہو تو ہو، نہیں پروا۔ ایسی لاہور کے ایک رسالے نے بھی چند سال ہوئے روہانیہ کی آبادی، اگر دو تہائی تھی، یہ شان مستشیات میں نہیں، بلکہ کثیر الوقوع ہے۔ تیسرا عنصر رسالے کے علمی معاونین میں کوئی رسالہ محض مرتب کے زور قلم سے نہیں چل سکتا۔ اگر مرتب کو اتنا وقت بھی مل سکے کہ ماہوار رسالے کو اپنے مضامین سے بھر تا رہے، جب بھی ایک قلم وہ تنوع نہیں پیدا کر سکتا جس کے لوگ رسائل کے مضامین میں خواہش مند ہیں۔ چوتھا عنصر جو اہمیت میں کسی سے کم نہیں خریدار ہیں، ہر رسالہ آرزومند ہے کہ خریدار تعداد میں زیادہ اور خوش معاملہ ہوں۔ معیار اپنے خریداروں میں ایک اور صفت کا طالب ہے اور صحت ذوق ہے۔ کسی رسالے کو معیار بلند رکھنا یا اسے پستی پر کھینچ لانا خریداروں کا کام ہے۔

خریداروں سے (۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کامل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں سہ دست صرف چھ پرچے نکلا کریں گے، یہ پرچے جنوری، مارچ، مے، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۲۸ صفحوں پر شائع ہوا کریں گے، بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہوں گے، ۴۰ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، دسمبر میں شائع ہوا کریں گے۔ سال بھر میں معیار تصاویر و سرورق کے علاوہ کم از کم ۸۱۶ صفحات پیش کیا کریگا۔

(۲) سالانہ قیمت بلیغ فی پرچہ ۱۲ر۔ نمونے کا پرچہ ۱۳ کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔ کچھ پرچے معمولی کاغذ پر نوٹ بھیجنے کے لیے چھپائے گئے ہیں، قیمت فی پرچہ ۸ر۔ اگر دفتر سے منگانا ہو تو ۹ر کے ٹکٹ بھیجیے۔ جواب طلبا مور کے لیے ٹکٹ بھیجنے چاہئیں۔

مضمون نگاروں سے (۱) معیار خاص ادبی رسالہ ہے، جو اصحاب اس کی علمی اعانت کا ارادہ رکھتے

سالانہ چندہ
للعمر

معیار

بانکی پور

فی پرچہ ۱۲؍
انگریزی ایڈیشن (معمولی کاغذ) فی پرچہ ۸؍

جلد ۱ | مندرجات بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

نمبر شمار	تفصیل مندرجات	صفحہ
۱	معروضات از قاضی عبدالودود	۳
۲	تعارف از قاضی عبدالودود	۴
	آثار ادبیۃ :-	
۳	مخمس مصحفی	۹
۴	غزل آصف الدولہ جواب شمس النسا بیگم	۱۱
۵	مثنوی میر حسن غیر مطبوعہ	۱۲
۶	غالب :- میرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط	۱۵
	افسانے :-	
۷	گوتی - از بونین (مترجمہ منصور احمد صاحب)	۱۶
۸	سانپ - از میرو ژیرس (مترجمہ تمنائی)	۱۹
۹	عکدہ - از منفلوطی (مترجمہ عروج قادری)	۲۵
۱۰	تیشہ - سکون آزمیتر لنک (مترجمہ آزد جمیلی)	۳۰
۱۱	نظم - شکست پندار از پریم پجاری	۴۲
	مقالات :-	
۱۲	سن وفات آبرو از قاضی عبدالودود	۴۴
۱۳	دیوان جوشش از قاضی عبدالودود	۴۷
۱۴	دریائے لطافت از قاضی عبدالودود	۵۳
۱۵	میتر لنک کے خاموش ڈرامے - از آزد جمیلی	۵۹
۱۶	صوبہ بہار - گیارہویں صدی کی اردو - از ق - ع - و	۶۳
	مطبوعات جدیدہ :-	
۱۷	دیوان معروف از قاضی عبدالودود	۷۰
۱۸	دریائے لطافت از ق - ع - و	۷۹
۱۹	سرنگاں از ؟	۸۳
۲۰	ندیم بہار نمبر از ؟	۸۶
۲۱	مثنوی مادر ہند از آزد جمیلی	۸۸
۲۲	افکار عصریہ از متعلم	۹۰
۲۳	حبش اور اہل یہ از ؟	۹۱
۲۴	نکات الشعرا از ق - ع - و	۹۲
	اقتباسات :-	
۲۵	غزل میرزا غالب ماخوذ از دیوان معروف	۹۵
۲۶	میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس	۹۵
۲۷	۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین :- از ادارہ	۹۷
۲۸	محکمہ :- از ق - ع - و	۱۰۴
۲۹	عالم ادب :- از ادارہ	۱۰۵

غلطنامہ :-

ناظرین سے گزارش ہے کہ پہلے غلط نامے کے مطابق رسالے کی تصحیح کر لیں اس کے بعد اسے ملاحظہ فرمائیں۔ کاتبے جہاں ہوئے ہوئی کیجیے چاہیے لیے اور اسی قبیل کے الفاظ جزمے کے ساتھ لکھے ہوں انہیں بغیر جزمے کے سمجھا جائے۔ رائے میں بھی جزمہ ہیں اور ہیچاہیں واو غلط ہے۔ کوئی ہندی یا انگریزی لفظ جائے تحقیق زیر تحریر نہیں ہوتا اس کے خلاف اگر ہو تو غلط ہے۔ لفظ اغلاط کہیں نہ کہیں نوٹس ہو گیا ہے۔ یہ ہر جگہ نہ کر ہونا چاہیے۔ سطر ۲۵ سطروں کا ہے سطروں کا شمار سطر کے حساب سے ہے۔ "اہل صفوالف گزارش سطر ۱۰۔" "اور صحت ذوق" "اور وہ صحت ذوق"

ص ۹ س ۱۲ = ۲۵ تیر ۲۵ ہیر، ۲۵ انشا ۲۵ ابھی، انشا ۲۵ ۵ ۲۵ ۱۲ کا لمرد ۲۵ ص ۱۵ (اغلاس نقل کے مطابق ہے جو رام پور سے آئی ہے) ۲۵ دوش خانہ، دوش خانے، ۲۵ کیسے، کیا کر ۲۵ ہوتا رہتا تھا، ہوا کرتا تھا ۲۵ شیشہ، شیشے ۲۵ جان میں جان کر ۲۵ کیسے، کیونکر ۲۵ کی سی، کی ۲۵ بہترین، نفیس ۲۵ منزل، قیام گاہ ۲۵ راستہ، راستے ۲۵ گھنٹے کے بعد، گھنٹہ بعد ۲۵ گذارتا ہے، بھیر تا ہے ۲۵ کرے، کرے ۲۵ پرشکالی، پرشکالی ۲۵ خزانا، خزانہ ۲۵ ہیں، ہے ۲۵ آئے، جائے، ۲۵ آئے، گئے، ۲۵ ہاتھ، ہاتھ ۲۵ آئے، گئے، ۲۵ ۱۲۳۰ = ۱۲۳۰ ف، ۲۵ ص = ۵۰۹۵، ۲۵ کمنی، کمی ۲۵ یہاں، وہاں ۲۵ خط، خط ۲۵ مدت، مدت ۲۵ پر بھی، اس پر بھی، ۲۵ مقامات پر، مقامات سے ۲۵ ان، اس، ۲۵ تمثالیں، تمثیل، ۲۵ چھوٹے، چھوٹے، ۲۵ حباب، حباب، ۲۵ رہے، رہے، ۲۵ پڑھتا کوئی، پڑھنا کوئی، ۲۵ دوادی، دوادی ۲۵ گھنٹے، گھنٹے دوادی، ۲۵ پڑھتے رہے، پڑھتے رہے، کبھی کسی عورت سے پڑھوایا، ۲۵ طمانیت، طمانیت، ۲۵ ۱۵ تمام، ۵ پنجے تمام، ۲۵ مصنف، کسی عورت، ۲۵ چاہے، چاہتے، ۲۵ کہو، جو کہو، ۲۵ روپیہ، روپے، ۲۵ شش، شش، ۲۵ کے، کو، ۲۵ تنقیدی، تقلیدی، ۲۵ شاعری اور، شاعری، ۲۵ صانع، صانع، ۲۵ جھوٹی، جھوٹی، ۲۵ اسباب، ان اسباب، ۲۵ ایجاد، ایجاد، ناسخ و آتش کی شاعری، ۲۵ ناسخ و آتش کی شاعری ہے، ہے، ۲۵ پنجتورا، چھورا، ۲۵ رسما، رسماً، ۲۵ سوار، سوار، ۲۵ ہیں، ہوں، ۲۵ سلطان، سلیمان، ۲۵ خدمت، جدت، ۲۵ حمیدیہ، حمیدیہ، ۲۵ اور بعض، ناسخ اور بعض، ۲۵ القابہ، بالقابہ، ۲۵ شمس، شمس، ۲۵ خاتم، خاتم، ۲۵ کرتا، کرتا، ۲۵ استعمال، اشتعال، ۲۵ جب ..... جب ہم، ۲۵ اس، ۲۵ کے، کی، ۲۵ کی، کے، ۲۵ نہ رہا، نہ تھا، ۲۵ سے رونے، رونے، ۲۵ لطیفۂ فنون، فنون لطیفہ، ۲۵ انسان، انسان، ۲۵ پوربی، پوربی، ۲۵ وقت، وقت تک، ۲۵ دی جائے، دیا جائے۔ ناظر میں سے آخری سطر [illegible] اعجاز حسن خاں۔ اور ریاض حسن ..... سے ہی گئی۔

معروضات

از قاضی عبدالودود

ادب قومی خصوصیات کا آئینہ دار ہے ایک نسل سے دوسری نسل میں انہیں منتقل کرتا ہے اور قوم میں اتحاد خیال پیدا کرتا ہے قومی سیرت پر ادب کا جو گہرا اثر پڑتا ہے اس کا اعتراف وہ معاشرت بھی کرتی ہے جو ادب کو فن تعمیر سے مشابہ سمجھتی ہے اور وہ جماعت بھی جو دوسرے فنون کی طرح ادب کو نشائے کمال سے قرار دیتی ہے کہ یہ سوسیٹی میں ضم ہو جائے۔ قومی زندگی میں ادب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اقتضا تھا کہ ہندوستانی زبان میں بکثرت رسالے ادب کو اپنا موضوع خاص بنا لیتے لیکن باوجود اس کے کہ جہاں تک رسائل کی تعداد کا تعلق ہے ہندوستانی مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں سے بہت پیچھے نہیں ہے اس زبان میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے سوا بھی رسالے اردو کے علاوہ کوئی قابل ذکر رسالہ ایسا نہیں جو ادب کے سوا کسی اور موضوع سے سروکار نہ رکھتا ہو۔ اردو نے ہندوستانی زبان اور ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کر کے خود اپنے فقدان بصیرت کا اعلان کرنا ہے۔ اس کے تحقیقاتی مضامین اور عالمانہ تبصرے ہماری زبان میں آپ اپنی نظیر ہیں لیکن نظم کے سوا تخلیقی ادب کے اور اصناف کے نمونے اگر اس نے پیش کیے ہیں تو وہ انگار کالعدوم کا حکم رکھتے ہیں اس لیے انجمن ترقی اردو (اشاعت پبلشنگ) کو ایک ایسا رسالہ نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو صرف ادبیات زبان سے متعلق تحقیقی مضامین اور مطبوعات جدیدہ کے تبصرے شائع کرنے پر قناعت نہ کرے بلکہ تخلیقی ادب کے نمونے بھی بالالتزام پیش کرتا رہے۔ معیار اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ معیار نے بظاہر اپنا دائرہ عمل بہت تنگ کر لیا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ادب بھی اتنا وسیع ہے جس قدر انسانی زندگی ہے اور رومی شاعر کے الفاظ میں ادب کی طرف سے یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ میں انسان ہوں اور کسی شے سے جس کا تعلق انسانوں سے ہے بے تعلق نہیں ہو سکتا ہمارا خیال ہے کہ خالص ادبی رسالے میں بھی تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس خاص موضوع پر اگر دس رسالے بھی یہ یک وقت نکلیں تو ہر رسالہ اپنی انفرادی شان قائم رکھ سکتا ہے۔ معیار کے اشتہاری مضمون میں یہ عرض کرنے میں تامل نہ ہوا کہ ہم کس قسم کے ادب کی ترویج کے خواہاں ہیں لیکن افسوس ہے کہ دوسرے مضامین نے اتنی جگہ لے لی کہ اب تفصیل اغراض کی بالکل گنجائش نہیں اور ہم مجبوراً اسے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ معیار اجتماعی تقلید کی ترویج دیتا ہے تو انفرادی فن کو منزل من السماء نہیں سمجھتا اور ان میں بدیہی تغیرات کا حامی ہے۔ طلبہ یا فتہ جماعتوں کا ادب کو اپنی اغراض کا تابع بنانے کی کوشش کو پسند کرتا اور صنعت کاروں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی کا طلبگار ہے۔ ادب میں یہ کسی طرز کا پابند نہیں بلکہ اس کی اصل پرکھ ہے کہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے۔ ذوقیات و معنویات میں فوائد کش و برتر کا اعلان معیار کے نزدیک بھی اسی قدر مضحکہ جتنا کہ ماہر سل پروست کی رائے میں تھامسن سے بڑھ کر صنعت کار کے لیے تخلیق حسن تبلیغ مقاصد سے زیادہ مقدم ہے اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو خیالات کتنے اعلیٰ کیوں نہ ہوں صنعت کاروں میں شمار نہیں ہو سکتا۔

تعارف

از قاضی عبدالودود

اس عنوان کی اصلی غرض مندرجات معیار کے متعلق ضروری معلومات کی فراہمی اور لکھنے والوں کے نقطۂ نظر کی توضیح ہے اس مرتبہ عنوانات رسالہ کی تشریح بھی اسی عنوان کے تحت کر دی گئی ہے۔

‡ معروضات ‡ اقتباسات ‡ استفسارات: یہ عنوانات تشریح کے محتاج نہیں استفسارات کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اگر جواب وصول ہوئے تو وہ بھی شائع کر دئے جائیں گے اور ایسے سوالات جن کے جواب تھوڑی سی محنت سے متداول کتابوں میں مل سکتے ہیں درج نہ ہوں گے۔ مرزا غالب کی غزل دیوان معروف میں اس وجہ سے نہ تھی کہ معروف نے اس کو مخمس کیا ہے۔ یہ غزل اشعار کے ایک قدیم مجموعے "چمن بے نظیر" میں بھی پائی جاتی ہے۔

†† آثار ادبیہ: یہ عنوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ قدیم نظم و نثر کا وہ حصہ جو ادبی تاریخی یا لسانی نقطۂ نظر سے قابل قدر اور عام ناظرین کی رسائی سے باہر ہے منظر عام پر لایا جا سکے۔

مخمس مصحفی کی شان نزول یہ ہے کہ مصحفی اور انشا میں جب بگاڑ ہوا اور طرفین سے ہجو بازی کی نوبت آئی تو سلیمان شکوہ نے انشا کا ساتھ دیا یہ یا مجبوت کسی نے شہزادے کے کان میں پھونک دیا کہ مصحفی نے آپ کی ہجو کہی ہے اسی الزام سے اپنی بریت میں مصحفی نے اپنا مشہور قصیدہ رائیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

مزاج شاہ ہو یوں منحرف تو مجھ کو بھی یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیش وزیر

آصف الدولہ سے استغاثہ کرنے کا ارادہ قوت سے فعل میں آیا اور مصحفی نے مخمس اور اس کے ساتھ ایک قصیدہ آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا مخمس کا ایک مصرعہ مشکوک رہ گیا ہے دیوان چہارم کے کسی صحیح نسخے تک کسی صاحب کی رسائی ہو تو وہ توجہ فرمائیں۔

آصف الدولہ کی غزل اور اس کا جواب دونوں دیوان جہاں منفذ یعنی زائن النسا تلی عجائب خانہ برطانی لندن اسے ماخوذ ہیں شمس النسا بیگم دلمن بیگم کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے باپ انتظام الدولہ داداقرالدین خاں اور نانا (غالباً) صمصام الدولہ خان دوراں تھے آصف الدولہ کے ساتھ ان کی شادی فیض آباد میں بڑی دھوم

دھام کے ساتھ ۱۸۳۳ء میں ہوئی۔ شجاع الدولہ کی زندگی میں چونکہ آصف الدولہ کی کسی اور شادی کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا، قیاس ہے کہ میر حسن نے اپنی مثنوی میں جو معیار میں شائع ہو رہی ہے اسی شادی کی کیفیت بیان کی ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو مثنوی کا سال تصنیف بھی ۱۸۳۳ء ہوگا اور اس حساب سے یہ مثنوی سحر البیان اور گلزار ارام سے پرانی ہے۔ کلیات میں کے جس نسخے سے یہ ماخوذ ہے وہ انجمن ترقی اردو کے لیے ابھی حال میں نقل ہوا ہے اور غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ قیاسی تصحیح کے متعلق ہم ان اصحاب سے اظہار رائے کی درخواست کرتے ہیں جن کی نظر سے کلیات کے دوسرے نسخے گزر چکے ہیں۔

+ غالب: یہ عنوان مرزا غالب کے لیے مخصوص ہے، یا تو ان کی غیر مطبوعہ نظم و نثر اس کے تحت شائع ہوگی یا ان کی زندگی اور شاعری کے کسی نہ کسی پہلو سے بحث کی جائے گی۔ تین خطوط جو اس بار ہم شائع کر رہے ہیں، جناب عرشی ناظم کتب خانۂ رامپور سے ملے ہیں اور ہم اس عنایت کے لیے ان کے نہایت ممنون ہیں۔

+ افسانے: افسانوں کے لیے قطع زاد یا ترجمے کی قید نہیں لیکن ترجمے کسی مسلم الثبوت مصنف کا افسانہ منتخب کرنا چاہیے۔ واقعات میں من مانی ترمیم سے بچنا چاہیے اور مقامات و اشخاص افسانہ کے نام وہی رہنے دینے چاہییں جو اصل میں ہیں۔ مترجم کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ افسانے کا اصل عنوان کیا ہے، جس سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور مصنف کا کیا نام ہے۔ مختصر کہانیوں کے علاوہ طویل افسانوں کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ گوتی 'سانپ' اور غم کدہ علی الترتیب گوتی 'دی مین اینڈ دی اسنیک' اور غرفتہ الاحزان کے تراجم ہیں

± تمثیل: بہ شرح صدر' سکون' لاں تیریر" کا ترجمہ ہے۔

± نظم: شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں بھی جدت تخیل لازمی ہے۔ ان قیود کی وجہ سے بخوبی ممکن ہے کہ ہم کبھی کبھی نظمیں بالکل نہ شائع کر سکیں۔ اگر کوئی پرچہ نظم سے خالی رہا تو ہم اس کی جگہ کسی دوسرے عنوان کے تحت غیر زبان کے مستند شعرا کے کلام کا ترجمہ شائع کیا کریں گے۔ شکست پندار کے مصنف پریم پجاری صاحب شاعری پیشہ نہیں لیکن عروض و قافیہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نظم میں بعض قوافی ان اصحاب کو کھٹکیں گے جو اب تک قدیم قواعد کی خود بھی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کرانا چاہتے ہیں۔ پریم پجاری کا مسلک ان اصحاب سے جدا گانہ ہے اور وہ قدیم قواعد میں ترمیم کے حق میں ہیں۔ ان کا ایک خط ہمارے پاس موجود ہے جس میں بعض مشکوک قوافی کے جواز کی دلیل پیش کی ہے اور اپنے مسلک کی توضیح کی ہے اگر ضرورت ہوئی تو ہم اسے شائع کر دیں گے۔

± مقالات: ادب کے مالہ و ماعلیہ سے بحث کی جائے تو نفسیات کی حدود میں قدم رکھنا ناگزیر ہے۔ عمل تخلیق، یا ادب کی اثر اندازی کا ذکر آئے تو نفسیات سے دوچار ہونا لازمی ہے، اور اگر یہ بیان آجائے کہ کن حالات

میں کسی خاص زبان کے ادب نے نشو و نما پائی یا کون سے اسباب اس کی ترقی یا زوال کا باعث ہوئے، تو تاریخ سے واسطہ پڑنا یقینی ہے۔ معیار خالص ادبی رسالہ ہے لیکن ادب علم بالا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اگر وقتاً فوقتاً ہم ان کی حدود میں قدم رکھیں تو ہمیں مداخلت بیجا کا الزام نہ دیا جائے۔ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ گو معیار کا موضوع خاص اردو ہے لیکن دوسری زبانوں کے ادب سے متعلق مضامین بھی اس میں شائع ہوا کریں گے، ہم ان ذوقی و معنوی تحریکات سے جو ہندوستان اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کو متاثر کر رہی ہیں یا آئندہ متاثر کریں گی اپنے ناظرین کو باخبر رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مضامین اردو کے حالات با لالتزام معیار میں درج ہوا کریں گے۔ اور ممالک غیر کے مستند مصنفین کا دنیائے اردو سے تعارف کرانا بھی ہم اپنے فرائض میں داخل سمجھتے ہیں۔

وفات آرزو: نکات الشعرا کے جس نسخے کا حوالہ دیا گیا ہے وہ طبع اول ہے طبع ثانی نہیں۔ تذکرہ بیجگر کا ذکر فہرست میں بہ ۳۴ کے تحت ص ۳۴ پر ہے۔

دیوان بوعشق کا قلمی نسخہ عبدالرشید صاحب خلف شوق مرحوم نے ہمیں چھپوانے کے لیے مستعار دیا ہے، اس عنایت کے لیے ہم ان کے نہایت ممنون ہیں۔

دریائے لطافت کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ پہلی کتاب ہے جو تواعد اردو میں کسی ہندوستانی نے لکھی ہے لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ صفیر مرحوم سے آزاد کے دعوے کی تردید ہو سکے گی ہم اس پرانے جھگڑے کو زندہ نہ کرتے لیکن ابھی حال میں لکھنؤ کے ایک رسالے میں نورالحسن صاحب مولف نورالغات کا ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے بھی اغلباً بتقلید صفیر یہ دعویٰ کیا ہے کہ دریائے لطافت انشائے اصلاح ناسخ سے مستفید ہو کر لکھی ہے۔ ان بسر و چشم قبول ہے بصحفی کی اس سے کیا مراد ہے، ہم نے اس کا مفصل ذکر اس مقالے میں کیا تھا جو چند سال قبل ہم نے ادبی کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ ہم اس مقالے کا وہ حصہ جو ناسخ اور مصحفی کے تعلقات سے متعلق ہے اسی سال شائع کریں گے

++ بہار: یہ بہار سے متعلق ادبی تاریخی اثری مضامین اس عنوان کے تحت درج ہوا کریں گے۔

یہ عبارت سنہ کاتب کو لکھنے کے لیے دیا گیا تھا کہ مصنف کے سال ولادت کا علم ہوا (صفحۂ اول کا تب سے دوبارہ لکھوایا گیا ہے) کتاب کا سال تصنیف ۱۰۸۱ھ بتایا گیا ہے، اگر مصنف کا سال ولادت ۱۰۵۰ھ ہے جیسا کہ مصنف تذکرۃ الصالحین نے لکھا ہے تو ۱۰۸۱ھ میں مصنف کی عمر ۳۱ سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی، اور یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ گیارہویں صدی میں اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لیے اردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی اور صرف نثر ہی نہیں بلکہ نظم بھی اس زبان میں لکھتا۔ کتاب کے خاتمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کتاب کی زندگی اعتماد کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ حالانکہ مصنف کے حالات جو تذکرۃ الصالحین میں درج ہیں ان سے یہ ترجیح ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ ۱۰۸۰ھ کے بہت بعد ہوگا۔ ہم نے جناب متا کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا ہے لیکن ابھی

تک ان کا جواب وصول نہیں ہوا ہے۔ اس رسالے کے متعلق تنقیح طلب سوالات حسب ذیل ہیں (۱) مصنف کی ولادت کب ہوئی؟ (۲) یہ رسالہ کب لکھا گیا؟ (۳) کیا یہ واقعی انہیں بزرگ کی تصنیف ہے جن کی طرف منسوب کیا گیا ہے؟ (۴) اگر نہیں تو اصلی مصنف کون ہے؟ اور غلط انتساب کی کیا وجہ ہے؟ رسالے کی مذہبی حیثیت سے اہمیت ہو یا نہ ہو ادبی حیثیت سے اس بات کا فیصلہ ہو جانا ضروری کہ یہ کب لکھا گیا ہے۔ اگر یہ واقعی گیارہویں صدی کا لکھا ہوا تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صوبے میں نثر و نظم اردو کا اس سے قدیم تر نمونہ اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا ہم چاہتے ہیں کہ وہ اصحاب جو متاخرین صوفیہ کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں علی الخصوص متوسلین خانقاہ محمدیہ و خانقاہ جمیلیہ اس رسالے کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔

+ اوراق پارینہ: یہ عنوان اشاعت زیر نظر میں نہیں ملے گا' اس لیے کہ جو مضامین اس عنوان کے تحت شائع ہو سکتے تھے وہ مقالات کے اندر آ گئے' اس عنوان کی غرض کیا ہے مطبوعات و مخطوطات کا تفصیلی بیان ہے۔ آئندہ سے اس قسم کے مضامین کے لیے ایک خاص باب ہوا کرے گا۔

+ ہماری زبان: اس عنوان کے لیے اشاعت زیر نظر میں جگہ نہ نکل سکی' ماہ مئی سے اس کا آغاز ہو گا۔ اس عنوان کے تحت زبان اردو کے متعلق ہر قسم کے تحقیقی مضامین شائع ہوا کریں گے۔ اردو میں بہ کثرت الفاظ ایسے ہیں جن کا املا مختلف فیہ ہے۔ یا ان کا املا بالعموم غلط لکھا جاتا ہے' سیکڑوں محاورات اور الفاظ ہیں جن کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا ہے' ہر روز یا فصیح صرف و نحو کے بہت سے قواعد بھی ابھی تک طے نہیں ہوئے' غرض یہ کہ بہ کثرت مسائل ایسے ہیں جو بحث طلب ہیں' اور یہ باب قائم کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ بالالتزام ان باتوں کے متعلق بحث ہوتی رہے'

++ مطبوعات جدیدہ: کتابوں کے تبصروں میں ہم یا ہمارے معاون حتی الوسع انصاف اور دیانت سے کام لیتے ہیں' لیکن نہ تو ہمارے معیار منزہ عن الخطا ہیں اور نہ معیار کے معاونین' اس لیے بخوبی ممکن ہے کہ بغیر اس کے کہ ہمارے ارادے کو اس میں دخل ہو' انصاف کے خلاف کچھ باتیں قلم سے نکل جائیں' واقعات کی غلطیاں ہو جائیں یا یہ کہ مصنف کے نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے سے ہم قاصر رہیں' اس لیے ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بہ خوشی مصنفین یا دوسرے ذمہ دار اصحاب کو اس کا موقع دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے تبصروں سے اختلاف ظاہر کریں۔

اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی اہم مطبوعات پر اس عنوان کے تحت نظر ڈالی جائے گی' لیکن ابھی ہمارے انتظامات مکمل نہیں ہوئے ہیں۔

دیوان معروف کی صحیح زیادہ تر قیاس پر مبنی ہے' اس میں جو دو یہی جناب ریاض حسن خاں صاحب خیال سے ملی ہے' اس کا ہم شکر گزاری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔ اس دیوان میں ابھی اور غلطیاں رہ گئی ہیں' ان کی طرف آئندہ توجہ کی جائیگی۔

† محکمہ: ادارہ معیار یا معاونین معیار کو نہ یہ دعوے ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور نہ یہ وہم ہے کہ ان سے غلطی نہیں سرزد ہو سکتی۔ یہ عنوان صرف اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ دوسروں کو یا خود نگارندوں کو اس کا موقع دیا جائے کہ مندرجات معیار پر اضافہ کریں یا ان کی غلطیوں کی اصلاح کر سکیں۔ محکمہ فورم کا ترجمہ ہے۔ شعرا نے یہ لفظ اس عموم میں بہ کثرت استعمال کیا ہے۔

†† ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین، مختلف رسائل میں ادب اردو کے متعلق جو مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ان کا علم صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو کل رسائل کا بالالتزام مطالعہ کرتا رہے اور چونکہ ہر شخص کو اس کا موقع نہیں ملتا بہ کثرت ایسے مضامین لکھے رہتے ہیں جن سے عام طور پر لوگ بے خبر رہتے ہیں، ہم نے یہ باب اس خیال سے قائم کیا ہے کہ صرف اس کے مطالعے سے ہمارے ناظرین کو دوسرے رسائل کے تحقیقی مضامین کی واقفیت ہوتی رہے اور وہ بہ شرط ضرورت ان کی طرف رجوع کریں۔ بعض صورتوں میں مضامین کے عنوانات مضمون نگاروں کے نام اور ان مضامین کے متعلق مختصر اظہار رائے پر قناعت کی جائے گی لیکن بعض مضامین کے ہم خلاصے بھی پیش کریں گے۔ رائے کی غلطی یا صحت سے ہمیں بحث نہیں لیکن واقعات کی کوئی غلطی اگر نظر آئی تو اس کی طرف ہم اپنے ناظرین کی توجہ ضعف کرنا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی غرض دوسرے رسائل کی تحقیر نہیں بلکہ محض تحقیق حق ہے طوالت کے ڈر سے ہم نے صرف خلاف ظاہر کرنے پر قناعت کی ہے۔ یہ شرط ضرورت ہم وجوہ اختلاف پیش کرنے اور ایسے دعووں کا ثبوت دینے کے لیے بھی آمادہ ہیں۔

†† عالم ادب: کتابوں اور مصنفوں کے متعلق ہر قسم کی اطلاعات اس عنوان کے تحت موضح ہوا کریں گی۔ اس باب کی کامیابی مصنفین اور ناشرین کے اشتراک عمل کے بغیر ناممکن ہے اور ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی سرگرمیوں سے ہمیں باخبر رکھا کریں۔

‡ تصویر: عبدالحق صاحب کی تصویر دوسرے رسائل میں پہلے بھی شائع ہو چکی ہے لیکن یہ تصویر بھی حال میں لی گئی ہے اور غالباً کسی دوسرے رسالے میں نہیں نکلی۔ موصوف کی تصویر ہندوستانی اکاڈمی کی کانفرنس (منعقدہ بمبئی) کے شعبۂ اردو کے صدر ناظم انجمن ترقی اردو اور مسلم الثبوت انشاپرداز کی حیثیت سے شائع کی جا رہی ہے۔ ان کے مختصر حالات زندگی اگر گنجایش نکل سکی تو اسی پرچے میں ورنہ آئندہ شائع ہوں گے

---

†† اس سے مراد ہے کہ یہ ابواب بلا استثنا کل پرچوں میں ہوں گے † اس سے مراد ہے کہ ضمیموں کے علاوہ یہ ابواب کل پرچوں میں ہوں گے۔ ‡ اس سے مراد ہے کہ ہر پرچے میں ان ابواب کا پایا جانا لازمی نہیں گو یہ کوشش کی جائے گی کہ کوئی پرچہ (بعض صورتوں میں بشمول ضمیمہ اور بعض میں بہ استثنائے ضمیمہ) اس سے خالی نہ رہے۔

آثارِ ادبیہ:-

(۱) خمسہ مصحفی۔ (۲) غزل آصف الدولہ و جواب شمس النسا بیگم۔ (۳) مثنوی میر حسن۔ +

خمسۂ مصحفی در استغاثہ بجناب آصف الدولہ

۱ اول توجو گوئے پیمبر ہے مصحفی ۲ پھر نغمہ سنج مدحت حیدر ہے مصحفی
۳ مسکیں فقیر ہے تو نگر ہے مصحفی ۴ ملک سخن کا صاحب افسر ہے مصحفی
۵ سب جانتے ہیں اس کو کہ بے شر ہے مصحفی
۶ اس کا دہن ہے یہ کہ کرے شاہ کی ہجا ۷ ہے سب یہ اس غریب پر انشا کا افترا
۸ بغض اپنا وہ نکالے ہے لے شہ کا ارتلا ۹ کس واسطے کہ اس کا سخن اس پہ ہے رسا
۱۰ فکر غزل میں لاکھوں سے بہتر ہے مصحفی
۱۱ واقف ہیں میر سوز بھی خوب اس کے حال سے ۱۲ کچھ مطلع میں میر بھی اس کے کمال سے
۱۳ نفرت ہے اس کو ایسے تو قال و مقال سے ۱۴ لیکن عجب نہیں یہ زمانے کی چال سے
۱۵ گر سب کہیں کہ تیغ کے در خور ہے مصحفی
۱۶ ہے جائے عدل آصف دوراں تری جناب ۱۷ رکھتا ہے عرض تجھ سے یہ مداح بوتراب
۱۸ سمجھے یہ اپنی داد کو اور ہوئے کامیاب ۱۹ تا سب کہیں کہ نرمی ہے یہ بات بے حساب
۲۰ ہاجی نہیں کسی کا شناگر ہے مصحفی
۲۱ آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جائے امن ۲۲ گوشے میں پا شکستہ پڑا تھا برائے امن
۲۳ اخبار میں لکھا ہی کیا ماجرائے امن ۲۴ بگڑی نظر پڑے ہے اب اس کو ہوائے امن
۲۵ جو حکم ہو سو کہیے کہ مضطر ہے مصحفی
۲۶ اس کا نہ کوئی یار و دیار ہے اس جگہ ۲۷ نہ خویش و اقربا نہ برادر ہے اس جگہ
۲۸ پر کیا کہے جو حادثہ اس پر ہے اس جگہ ۲۹ ہر سو اسی کی بجو کا دفتر ہے اس جگہ
۳۰ ناحق مغلظات کا معدر ہے مصحفی
۳۱ ایسی ہی بدتیں ہوئیں گر شہر میں عیاں ۳۲ اہل کمال کا ہے کو کوئی رہے گا یاں
۳۳ کیا دار ے گا شعر و سخن میں کوئی زباں ۳۴ ہوئیں گی شاعروں کی یہ سوا یاں جہاں

۳۵ اس طبرے سے سخت مکدر ہے مصحفی

۳۶ شاعر جو آپ اس سے کرے ابتدائے ہجو ۳۷ کھو اکے کھیجے شعر و غزل از برائے ہجو

۳۸ کیا مدح یہ جواب میں لکھے بجائے ہجو ۳۹ اس کی سُنے نہ اپنی پھر اس کو سُنائے ہجو

۴۰ کیا شاعری میں اتنا محقر ہے مصحفی

۴۱ پوچھو تو یاں جواب ہے ہر اک سوال کا ۴۲ پر تب جو محکمہ ہو کہیں قیل و قال کا

۴۳ جب حرف درمیان میں آیا قتال کا ۴۴ پھر کیا کمال نظم خطیر و کمال کا

۴۵ حاصل کہ ہم فنوں میں سدا در رہے مصحفی

۱؎ مخمس کا متن دو نسخوں کی مدد سے درست کیا گیا ہے۔ نسخہ کتبخانہ مشرقیہ، خ اور نسخہ مملوکہ فضل علی خاں صاحب، ف، ج میں عنوان اس طرح ہے "مخمس در خطاب نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم بہ امام ہجو و مہاجا از انشا در حالت قلق گفتہ شد در بیان ستم شدن ہجو گفتن شاہزادہ عالمیان مرزا سلیمان شکوہ بہادر و انکار آں و استغاثہ نمودن بجناب نواب آصف الدولہ بہادر مغفور" ۲؎ شہ یا شاہ سے مراد سلیمان شکوہ ہیں، حالانکہ شاہ عالم زندہ تھے اور سلیمان ولی عہد بھی نہ تھے۔ ۳؎ میر سوز آصف الدولہ کے اُستاد مشہور ہیں، مصحفی کے حسن کلام کے معترف تھے۔ تذکرہ ہندی ص ۱۱۱۔ ۴؎ میر آصف کے درباری شاعروں میں تھے "بر فقیر بسیار مہربانی می فرمایہ" تذکرہ ہندی ترجمہ میر حسن ۲۴۲ مصحفی خود بھی میر کے مداح تھے، لیکن کبھی کبھی چوٹ بھی کر جاتے تھے، ایک قصیدے کا شعر ہے ؎ آئیں نہ کریں مجھ سے فن شعر میں پنجہ ؎ سودا نہیں بیٹھے ہیں سودا کی جگہ میر، ؎ کلیات سودا، نولکشوری ص ۱۱۔ ۵؎ ف بے حساب کی جگہ انتخاب، دونوں صورتوں میں مصرع غلط معلوم ہوتا ہے۔ ۶؎ خ مجھے اب بجائے اب اس کو ۷؎ تذکرۂ خانۂ الشعرا (مصنفہ محمد میران جان محمدی الہ آبادی، سیدا جلی تخلص) میں اس کی تاریخ اختتام ۱۲۰۰ھ ہے سید انشا کا جو ترجمہ درج ہے وہ رسالہ دودے مصلی علی گڑھ بابت ۱۹۳۵ء میں نقل کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نے انشا کو لکھنؤ سے نکال دیا تھا، لیکن پھر واپس بلا لیا، کسی دوسرے تذکرے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ۸؎ انشا سے جھگڑ کر مصحفی کی واقعی بڑی رسوائی ہوئی تھی، ایک معاصر تذکرہ نگار، صاحب مخزن الغرائب (جلد اول قلمی ترجمہ انشا) کا قول ہے کہ صرف گدھے پر چڑھا کر تشہیر کرانا باقی رہ گیا تھا۔ ۹؎ ف اہل کمال کا ہے کو رہتے لکھا جاں، ۱۰؎ مصحفی کہتے ہیں کہ انشا نے ابتدا کی، لیکن انشا بھی یہی کہتے ہیں "قسم می خورم اکنوں کہ مرا ہیچ نوسرکار نبودہ و نیست۔ ولے از طرف گفت شروع این ہمہ اقوال مزخرف" آب حیات طبع نہم ص ۳۱۹ +

غزل آصف الدّولہ

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں
وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

شتابی سے آ ذرہ نہ پیچھے سیحا
کوئی دن کو راہ عدم دیکھتے ہیں

ملے تم ہو میرے رقیبوں سے جاکر
ہمیں ہیں کہ سو سو ستم دیکھتے ہیں

بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہمسے
بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں

تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

جواب شمس النسا بیگم

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں
نہ آنکھوں سے ہم اپنی نم دیکھتے ہیں

تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

نگاہ کرم جس جگہ پر کرے تو
ہم اشجار باغ ارم دیکھتے ہیں

کرم سے تیرے شاد و خرم ہیں یہ سب
مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں

زیادہ ہو یعقوبؑ سے غم ہمارا
جو ہم تجھ کو یوسفؑ سے کم دیکھتے ہیں

تبسم بلب ہیں تماشا یہ مردم
ہم اپنی ہی آنکھوں میں نم دیکھتے ہیں

تمھیں کیا غرض ہے جو آؤ یہاں تک
ہمیں آن کر اب قدم دیکھتے ہیں

کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی
اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں

کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ
نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

مثنوی میر حسن (غیر مطبوعہ)

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل
یعنی تھی میرے تئیں فکر غزل
یک بیک ہاتف[۱] نے دی آواز یوں
آج کے دن فکر میں بیٹھا ہو کیوں
گھر سے باہر تک[۲] نکل اے بے خبر
چل ذرا قدرت خدا کی سیر کر
فکر و غم ہے آج تو سب سے بعید
شام میں ظاہر یہاں صبح امید
سن کے یہ مژدہ اٹھا میں یک بیک
سیر کرتا جوں گیا بازار تک
دیکھا رستوں میں اکا دہو ہجوم
تب کہا میں نے کہ کیسی ہے دھوم
اک لگا کہنے چلا چل بے خبر
چل ہمارے ساتھ تو بھی سیر کر
ساتھ ساتھ اس کے گیا میں بھی وہاں
جس جگہ تھا عیش و عشرت کا مکاں
دیکھتا کیا ہوں کہ بے حد و قیاس
روشنی کا ٹھاٹھ ہے دریا کے پاس
لے زمیں سے آسماں تک ہے بلند
ہے سے روشن ہو چراغ اس کا دو چند
اس[۳] طرح روشن تھا واں ہر اک چراغ
عرش پر جیسے کہ لٹکتا تھا دماغ
تھا شعاع روشنی کا بس وفور
شام سے لے صبح تک تھا وقت نور
نیچے اوپر جلتے تھے جوں جوں چراغ
تھا عدد کو داغ بر بالائے داغ
وہ اس کا ہوتا تھا جوں جوں بلند
آتش حسرت پہ تھا دشمن سپند
کیا بیاں اس کا کروں میں سر بسر
طولی تقریر کے جلتے ہیں پر
روشنی اس طرح کی ہوتی ہے کہ
اک سرا جس کا ازل اور اک ابد
روشنی کچھ اک نہ تھی اس جا عیاں
اس میں آتشبازی کا بھی تھا سماں
اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور
موج زن، ریتی میں تھا دریائے نور
کاسہ مہتاب تھا اس کا حباب
نور سے لبریز مثل آفتاب
حلقۂ دود چراغاں تھا بھنور
لہر گوٹے[۴] کی سی اس میں سر بسر
پلٹنیں دونوں طرف مثل کنار
زیب بخش موج دریا وار پار
روشنی کے جھاڑ چوبیں اس میں یوں
نخل مرجاں لٹکے ہے دریا سے جوں
دیکھ روشن اس میں کاغذ کے کنول
جل گئے یکبارگی سے پانی میں کنول
بنبش ہر شعلۂ شمع و چراغ
موج دریا کے تئیں کرتی ہے داغ
بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار
نور کی سی لہر تھی فوارہ وار
ہاتھی آتشبازیوں کے چھٹتے جب
نور کوہ طور تھا نظروں میں تب
نور اس کے اس میں چھوٹے اس قدر
چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس کو گن[۵] پھر کہے ہیں دو دو تھا
وجد میں آتش کا دل تھا برملا
بس کہ چھٹتے تھے ستارے بے شمار
آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، تتیھول، گلریز و انار
کرتے جاتے تھے طبق گل کے نثار
یہ بھی گل اس واسطے ہو کا رہا تھے
اس میں بھی دو شو ہوا پر بار ہا تھے
قیس نہ روشن مورتوں کی ٹٹیاں
مردم ناری تھے یہ جلوہ کناں
متصل چھٹتی تھی ازبس پھلجھڑی
نور کی بارش کی گویا تھی جھڑی

۱؎ قلمی نسخے ق میں نہ نہیں ہے ۲؎ ق میں تک نہ ہے ۳؎ ق اس، روشن تھا واں ہر اک چراغ ۴؎ ق لہر گوٹی کی سی اور

نے زمیں تھی اور نہ تھا وہ آسماں
اور ہی روشن ہوا تھا اک جہاں
ایسی آتشبازی پھبتی ہے کہیں
آسماں ہو جس کے آگے گل زمیں
آتشیں گل دیکھ یہ اور یہ چراغ
آسماں کا دل ہوا تھا باغ باغ
جس طرف جاتی تھی واں مژہ نگاہ
جوش گلبازی سے پاتی تھی نباہ
دیکھ کر اس وقت یہ سوجھی دلیل
ایسی ہی ہوئے گی گلزار خلیل
سیکڑوں لاکھوں تماشائی ہزار
روشنی کے گرد تھے پروانہ وار
بس کہ تھی سیر ہوائی کی ہوا
شوق میں دیدہ ہوائی سب کا تھا
نور کے دریا کو یوں ثابت کیا
اور سن لے اس کا مجھ سے ماجرا
تھے شناور اس کے تو اس میں عیاں
بحر سے تھے پنڈول و بیڑے رواں
مور پنکھی پالکی اور اسپ تاز
فیل زریں پوش کا تھا یوں بناؤ
تو کہے دریا میں تھا کوہ طلا
یا کہ بادل تھا سنہری شام کا
فیلوں پر زریں نہ تھیں عماریاں
ابر میں تھے نور کے تھے عیاں

یا مگر اس روشنی ہی کے سبب
سیر کو آئے تھے مل کر روز و شب
برق کے مانند سب زریں لباس
ہنستے پھرتے تھے خوشی سے آس پاس
پھرتے تھے سب بادلا اور پہنے تاش
کیا سپاہی کیا غنی کیا خواجہ تاش
بادلے میں غرق سب اسباب تھا
پانی اس دریا کا جوں سیماب تھا
کھا پچیاں ساچق کی جب آئیں نظر
یوں ہی ٹھہری دل پر اپنے سر بسر
نور کے دریا سے بھر بھر کر گھڑے
سر اُپر لے فرشتے ہیں کھڑے
دیکھنا ان مشکیوں کی آب و تاب
کوہ میں دریا ہوا تھا آپ آپ
کشتیاں یوں تھیں جواہر کی رواں
جس طرح دریا میں تیریں کشتیاں
سبز فانوسوں کی اس میں جھلک
جس طرح پانی پہ سبزے کی لہک
رنگ کے شیشے نہ تھے اس میں دھرے
دل بھوں کے تھے وہ عشرت سے بھرے
دیکھ آرایش کے تختے مرد ماں
کہتے تھے یہ دیکھ لو باغ رواں
باغ اس خوبی کو پہنچے ہے کہیں
یہ تماشا ہونے دیکھا بس یہیں

کیتکی جوہی چنبیلی موگرا
سیوتی شبو گلاب اور موتیا
جعفری صد برگ عباسی بنام
اشرفی گل لالہ نرگس ہوں تمام
چشم گیتی نے نہ دیکھا زینہار
موسم ہر گل کی ہوئے اک بہار
گرچہ تھے وہ دیدہ میں کاغذ کے گل
پر مفصل مجھ سے سن اس جز کا کل
رنگ کو کب گل کے ہوئے ہے قرار
یہ وہ گل ہیں جن کی دایم ہو بہار
تھے رواں تختوں پہ ارباب نشاط
عیش کی ہر طرف بچھتی تھی بساط
دیکھ کر وہ ناچ ان کا راگ رنگ
مشتری تھی دیدہ اور زہرہ دنگ
ثبت نقارخانہ کی صدا
چھا گئی تھی ارض سے لے تا سما
جتنے تھے نفیر اُستاد تھے
سب ہنر لوک نہاں پر یاد تھے
اس قدر شہنائی والے خوش نوا
بس کو کہیے لحن داؤدی ادا
مشعلوں کے ہر طرف روشن تھے بھاؤ
تو کہے وہ تھے تجلی کے پہاڑ
اس میں نوشہ کا کروں میں کیا بیاں
نور حق تھا اس تجلی میں عیاں

---

۵۴ ق بر، اسی جز سے ۵۵ ق تک گلن پکڑ کی جگہ سرد گلینج ہے۔ بنا بر خیال کی، رائے ہے کہ گلن پکڑ ہونا چاہیے، بر بھی ص منفی ہے

دیکھ کر یہ دھوم اور یہ عزو شاں
میں نے پوچھا ایک سے کیا ہے یہاں
کس کی یہ شادی ہے اور کس کی یہ فوج
جوش ملے کس پہ دیا کی ہے موج
تب کہا اک شخص نے تو اس قدر
حال سے ہے کیا جہاں کے بے خبر
ہو وہ خواب اک شجاع الدولہ نام
دھاک سے لرزے ہے جس کی روم شام
قدرت قوت میں لاثانی ہے وہ
عدل اور انصاف کا بانی ہے وہ
صاحب شمشیر[۱] اور باب کرم
ہے خزف سے جس کے لعل لعل کم
مغز فطرت اور دماغ عقل ہوش
چشم ہمت اور چراغ ہوش گوش
مہر گستر عدل افزا ظلم کاہ
بندگان عالی و نوازالہ
نکتہ سنج و نکتہ پرور نکتہ داں
ماہ خوبی، رونق افزائے جہاں

تیغ میدان شجاعت روز رزم
اہ خشان وجاہت روز بزم
دشمنوں کے واسطے برق غضب
دوستوں کو مایۂ عیش و طرب
عادل ایسا عہد میں جس کے سدا
شمع سے بچکر چلے بادِ صبا
دست و بازو میں یہ قوت ہو اگر
تیغ مارے کوہ پر وہ کھنچ کر
دو کرے اس کوہ کو یوں اس کی دھار
تیر جائے جس طرح صابن میں تار
اور سخاوت میں تو ہو وہ یکہ تاز
جس کو چاہے دم میں کر دے بے نیاز
کیا کروں میں اس کا وصف بار پا
بند ہوتی کب قلم سے ہے ہوا
ہو سلیماں جاہ اور دارا حشم
جس کا ہے افلاک اک ادنیٰ خدم[۲]
شان و شوکت کا کروں میں کیا بیاں
قیصر خاقاں سے ہوں خادم جہاں

قائم اس کا حق رکھے جاہ و جلال
اس کے دشمن کو رکھے نت پائمال
اس کے ہے فرزند اک عالی جناب
آصف الدولہ بہادر ہے خطاب
نیک طینت اور پاکیزہ صفات
اس کی شادی ہے یہ اور اس کی برات
عیش و عشرت کا ہر اک جا ذکر ہے
آج فکر و غم کو اپنی فکر ہے
سن کے بولا یوں دعائیہ حسن
نت رہے، روشن وہ شمع انجمن
حق رکھے روشن چراغ اس کا سدا
جس نے اک عالم کو روشن کر دیا
شعر کا بھی غرض طرفہ ہے یہ فن[۳]
تا ابد جس کا ہے، روشن یہ سخن[۴]
زر کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طلب
گر قبول افتد زہے عزو شرف

---

[۱] یہ مصرع اسی طرح ہے ق میں ' کلیا بی سے ' کی جگہ گلنا ہی سے ' ہے ق میں اسی طرح ہے [۲] ق میں لفظ کا چھوٹا ہوا ہے [۳] ق میں ' کوہ نہ میں ' دریا ہوا تھا آپ آب ' جناب خیال کی ' رائے میں کوہ نہ زمیں ' کی جگہ ' کوہ بن ' ہونا چاہیے۔ ق میں ' وہ ' چھوٹ گیا ہے [۴] ق ' جوں ہی جنبیلی سونگرا ' جناب خیال کی رائے ہے کہ لفظ کینکی ابتدا میں بڑھانا چاہیئے۔ متن میں اسی طرح درج ہے، لیکن جاہی جوہی اور چنبیلی موتیا، بھی ہو سکتے ہیں [۵] ق جعفر صد عیاسی تمام۔ دونوں مصرعوں میں تمام ہے جو صریحاً غلط ہے، ایک میں تعجب نہیں کہ بنام ہو [۶] ق ' موسم ہر گل کی ہو اک بہار، ناموزوں [۷] ق تیغ کی غرض سے لے تا سماں، صریحاً غلط ہے [۸] ق صاحب شمشیر اور ارباب کرم، صریحاً غلط ہے [۹] ق ' جس کا ہے افلاک ایک ادنیٰ خم '، متن جناب خیال کی رائے کے مطابق ہے [۱۰] ق ' تا ابد جس کا رہے، روشن یہ فن۔ دونوں مصرعوں میں فن قافیہ نہیں ہو سکتا۔ متن قیاسی تصحیح ہے

غالب

میرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط

(۱)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان عزیز از جان منشی سیل چند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ کیوں صاحب ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں اور تمہارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے۔ خط لکھنا تم نے یک قلم موقوف کر دیا اور بھائی بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے: طاقت باقی ہے نہ حواس درست ہیں۔ آج کے نواب صاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہوئیں مجھ سے لکھا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بھیا اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا۔ کل بچا پرسوں مرا۔

اس خط کا جواب مجھکو جلد لکھو اور اس میں یہ لکھو کہ احسان حسین خاں اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ سے آئے ہیں نواب صاحب کی سرکار سے ان کا کیا دماہ مقرر ہوا ہے اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے۔ دربار میں جو آئے ہیں تو بیٹھتے کہاں ہیں۔ اس خط کے جواب کا طالب غالب

۱۱ر جون

۲

برخوردار نورچشم منشی سیل چند میر منشی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اگلے مہینے میں اگست ۱۸۶۸ء کی تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی اس کا روپیہ ابتک نہیں پٹا۔ میں تو جس دن ہنڈوی آتی ہے اسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہات کہ وہ بھی مہاجن ہے بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اس مختار کار کو جس کے ہاں ہنڈوی آتی ہے اس نے روپیہ اب تک نہیں دیا۔ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچ کر روپیہ میں نے لیا تھا اور آج اٹھارہ ہے۔ مختار کار کو روپیہ اس نے اب تک نہیں دیا۔ جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے اس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے تاکہ مختار کار کا روپیہ پٹ جاوے۔ غالب

۳

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیل چند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعائے دوام حیات و ترقی درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روئے خط حضور صحت و عافیت حضور معلوم ہوئی ہے لیکن یہ کیس سے نہیں سنا کہ غسل صحت کیا یا کب کریں گے۔ آپ سے فقیر کا سوال ہے کہ مجھکو لکھیے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے شاچکیں ہوں تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔ خیر و عافیت کا طالب غالب۔

۲۵ر دسمبر ۱۸۶۳ء

افسانے

(۱) گوتمی مصنفہ ایون بونین (مترجمہ منصور احمد صاحب مدیر ادبی دنیا)
(۲) سانپ مصنفہ ایمروز بیرس (مترجمہ "ممتاز")
(۳) غمکدہ مصنفہ مصطفیٰ لطفی منفلوطی (مترجمہ سید احمد صاحب عروج قادری)

گوتمی

مصنفہ **ایون بونین** (مترجمہ منصور احمد صاحب)

ہمالیہ کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب خطے کے درمیان ایک آباد گاؤں تھا جس کے ایک غریب لیکن شریف خاندان میں گوتمی پیدا ہوئی۔

اس کا قد سرو کی طرح بلند تھا اور پہلی نظر میں وہ کسی قدر دبلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سانولے اور ہنس مکھ چہرے اور اس کی سادہ اور علیم طبیعت نے اس کے ہمسایوں کو بیباک بنا دیا تھا، اور انھوں نے اس کے نام کے ساتھ ایک اور بھدا سا لقب کا اضافہ کر دیا تھا وہ اسے "گوتمی دبلی" کہا کرتے تھے۔ لیکن گوتمی اس سے ناراض نہ ہوتی تھی۔ ہر حکم و خندہ پیشانی سے بجا لاتی تھی اور ہر حکم کو وہ ایسے الفاظ کے ساتھ قبول کرتی تھی۔ جیسے:۔

"بہت اچھا میرے آقا، میں ابھی یہ کام کرتی ہوں!"
"بہت اچھا بیگم صاحبہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔"

گوتمی بہت دانشمند لوگوں میں سے نہ تھی۔ لیکن اس نے کبھی کوئی بے وقوفی کی بات بھی نہ کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت باتیں نہ کرتی تھی اور صبح سے شام تک اپنے کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس کا لباس غریبانہ ہوتا تھا، اور ہمیشہ ایک ہی قسم کا، لیکن ہمیشہ صاف ستھرا۔

ایک دن ایک نوجوان نے جو خوبصورت اور امیر تھا، اور اس علاقے کے بادشاہ کا بیٹا تھا اسے ایک دریا کے کنارے پر دیکھا وہ اس وقت اپنی بہنوں اور بھائیوں کے کپڑے دھو رہی تھی۔ شاہزادے کے دل میں خیال آیا کہ یہ لڑکی بڑی عاقل اور فرمانبردار ہے، لیکن کوئی اس کا ہاتھ بٹانے والا نہیں۔ ماں باپ بھی نہیں۔

اس نے خیال کیا۔

اس کے ماں باپ کہتے ہوں گے "اس کا کیا علاج۔ گوتمی نہ ہمارے بچوں میں سب سے زیادہ ہوشمند ہے۔ نہ حسین ہے۔ وہ ہماری لڑکی معلوم ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک دائی۔ اس سے کون شادی کرے گا؟ جلد یا بدیر جو شخص بھی اس سے شادی کرنا چاہے گا یہ اُسے قول دے بیٹھے گی۔ کیونکہ وہ انکار کرنا نہیں جانتی۔ کاش یہ آدمی بے رحم نہ ہو اور اُس بچے کو جو اس لڑکی سے پیدا ہو بہترین تربیت دلائے۔"

بادشاہ کا بیٹا یہ باتیں سوچ رہا تھا اور گوتمی کپڑے دھو کر سورج کی کرنوں سے چمکتے ہوئے پانی میں بیٹھی نہا رہی تھی۔

اپنے تمام کپڑے اُتار کر اس نے چھاتی سے گھٹنوں تک ایک چادر لپیٹ رکھی تھی اپنے سیاہ بال پھیلائے وہ دونوں سے اپنے دانت صاف کر رہی تھی اور اپنے سانولے پنڈے پر پانی ڈال رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ شاہزادہ درختوں کی جھلملیوں میں سے اُسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اُس نے گوتمی کو آواز دی، اور اس کے پاس جا کر مسکراتے ہوئے نہایت لطف آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"تم کتنی دل آویز ہو گوتمی، اور دُبلی بالکل نہیں جیسا کہ لوگ تمہیں کہتے ہیں، سیدھا سادھا لباس پہننے والی بلند قامت لڑکیوں کو لوگ ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ گوتمی میں نے سُنا ہے تم بہت فرمانبردار ہو۔ آؤ چپ چاپ میری آغوش میں آجاؤ۔ اس وقت دریا کی تنہائی میں ہماری ہم آغوشی کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔"

گوتمی شاہزادے کے اظہارِ آرزو پر شرما گئی اور آہستہ آواز میں کہنے لگی:

ہاں میرے پیارے آقا، میرا سر تسلیم آپ کی مرضی کے آگے خم ہے!

شاہزادہ۔ جب گوتمی کے حسن سے محظوظ ہو چکا تو اس نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی ہے! اور اس کی آنکھیں، اگرچہ اُن میں فکر و خیال کی کوئی نئی جھلک پیدا نہیں ہوئی پھر بھی پہلے سے زیادہ بھرپور آنکھیں نظر آرہی ہیں۔ اس کے بعد وہ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں اکثر ملا کرتے، اور جب کبھی شاہزادہ حکم دیتا گوتمی وہاں موجود ہوتی۔ اس نے کبھی سرتابی نہیں کی۔ اور نہ بہت زیادہ ملنے جلنے سے اس کی فروتنی اور لرپائی میں فرق آیا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ گوتمی کو اپنا جسم ایک بچے کے وجود سے بوجھل معلوم ہونے لگا۔

اس وقت شاہزادے نے اسے اپنی کنیزوں میں داخل کر لیا۔ گوتمی اپنے غریبانہ ساز و سامان سمیت محل میں داخل ہو گئی، اور زمانہ گزرتا گیا، یہاں تک کہ ولادت کا دن آپہنچا۔ اُس دن محل میں مہتمم نے اسے کہا۔

گوتمی دستور کے مطابق جب کسی بیگم کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو وہ اپنے باپ کے گھر چلی جاتی ہے لیکن تم بیگم نہیں ہو بلکہ کنیز ہو۔ اس لیے اپنے ماں باپ کے گھر نہ جاؤ اور اُس حد سے تجاوز نہ کرو جو موزوں اور مناسب ہے۔

گوتمی نے اسے سلام کیا، اُٹھی اور محل کے بڑے دروازے سے باہر نکل گئی۔

پاس ہی ایک نہر بہتی تھی۔ اس کے چوبی پل پر سے گزر کر اس نے دیکھا کہ ایک بڈھا ہاتھ میں کچکول لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ یہ ایک اندھا فقیر تھا جس نے ایک میلے سے چیتھڑے سے اپنا ستر چھپا رکھا تھا، اور جس کے بازو، ٹانگیں، سینہ اور چمکتی ہوئی پیٹھ چیچک ہوئی دھوپ اور بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

فقیر نے اسے ٹھہرایا اور تجربہ کار بڈھوں کی طرح اپنی بے نور آنکھیں اوپر اٹھا کر اس طرح مسکرایا کہ اس کی مسکراہٹ میں رمز و التفات دونوں موجود تھیں۔ اس نے کہا،

گوتمی میں تجھے دیکھ نہیں سکتا، مگر میں تیرے آنے کو محسوس کر رہا ہوں۔ گوتمی، جس راہ پر تو جا رہی ہے

خدا اُسے تیرے لیے مبارک کرے۔"

گوتمی نے جھک کر فقیر کے قدموں کو چوما اور اپنے راستے پر آگے بڑھ گئی، اسی راستے میں دھوپ سے تپتے ہوئے جنگل میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا جس کا غیر مقدم اس نے خوشی کے آنسوؤں سے کیا۔ بچے کو آغوش میں لئے وہ شاہزادے کے محل میں واپس آگئی وہ اس ننھی سی جان کو جو روز بروز نشو و نما حاصل کر رہی تھی اور ہوش و شعور میں ترقی کر رہی تھی دیکھتی، چومتی، مس کرتی، سینے سے لگاتی اور وفورِ مسرت میں آپے سے باہر ہو ہو جاتی۔ +

اگرچہ گوتمی شاہزادے کو بہت عزیز تھی، اور اگرچہ آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر غازہ مل کر اس کے بالوں کو سونے کے تاروں میں گوندھ کر، دہنوں کا ساز، زرق برق لباس پہنا کر، پھولوں کی بارش میں باجے گاجے کے ساتھ اسے شاہی محل میں لے جایا گیا اور وہ شاہزادے سے وابستہ ہو گئی۔ لیکن یہ الفاظ اس سے کسی نے نہ کہے: "گوتمی! میرا جذبِ دل تجھے پھر کھینچ لایا ہے!"

بچے کی پیدائش کے بعد گوتمی نے نہایت صبر کے ساتھ نوجوان شہزادے کی سرد مہری کو برداشت کیا۔ وہ ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرنے لگی، تاکہ اتفاقی ملاقات بھی شاہزادے کو تکلیف یا جرم کا احساس نہ ہو۔ +

وہ محل کے احاطے کے اندر حوض کے کنارے ایک کٹیا میں رہا کرتی۔ اور اُن ہنسوں کی پرورش اس نے اپنے ذمہ لے لی جو حوض میں کنول کے پھولوں اور اُبلی سبزے کے درمیان تیرتے رہتے تھے۔

اسی طرح وہ کچھ مدت تک نہایت خوش رہی، اور خوشی کے معین لمحات کے بعد غم کی مشکل گھڑیاں گزارنے کے لیے، اور گیروے کپڑے پہننے والوں میں شامل ہو کر اُس تنہا پیچے راستے پر چلنے کے لیے نامعلوم طور پر تیار ہوتی رہی جو قسمت کے پردے کے پیچھے اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ +

مبارک ہیں وہ جن کے دلوں میں عجز و انکسار ہے اور جو دنیاوی بندشوں کو توڑ چکے ہیں

جنھیں کائنات کی کسی چیز سے الفت نہیں ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں بے پایاں مسرت کا راج ہے اور وہ ایک پرندے کی طرح ہیں جس کے کندھوں پر اپنے پروں کے سوا اور کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ +

سانپ

مصنف ایمبروز بیرس
مترجمہ منشائی

"یہ تحقیق شدہ امر ہے، ایک ایسی حقیقت جس سے کوئی صاحب عقل اب انکار نہیں کرتا کہ سانپ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے، اتنی زبردست کہ باوجود اپنی خواہش کے، وہ کسی انسان اس کے زیر اثر آ جاتا ہے اور اس کی جانب کھچ کر اس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

ہارکر برٹن ڈریسنگ گاؤن اور زیر پائجامے آرام دہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ موریسٹر کی کتاب "سائنس کے عجائبات" میں سے مندرجہ بالا سطور پڑھ کر وہ مسکرایا۔ "اس میں عجیب بات صرف یہی ہے" اُس نے اپنے دل میں کہا "کہ موریسٹر کے زمانے کے صاحب عقل ایسی واہیات باتوں پر یقین رکھتے تھے جنہیں آج کل کے جہلا بھی مہمل سمجھتے ہیں۔"

خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ برٹن غور و خوض کرنے کا عادی تھا۔ اور بغیر اپنی آنکھوں کا رُخ بدلے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر کتاب نیچے کر دی۔ جیسے ہی کہ کتاب اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی کمرے کے ایک تاریک گوشے میں کسی چیز نے اس کی توجہ ماحول کی طرف منعطف کر دی۔ اُس کی سہری کے نیچے اندھیرے میں روشنی کے دو نقطے تھے، ایک دوسرے سے تقریباً ایک انچ علیحدہ۔

ممکن ہے کہ یہ نقطے آتش گیس کے لیمپ کے عکس ہوں جو اس کے اوپر لوہے کی کانٹی سے آویزاں تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کسی چیز نے۔ کسی احساس نے، جس کا تجزیہ کرنے کا خیال اسے نہیں ہوا۔ اس کو مجبور کیا کہ کتاب نیچی کر کے اس چیز کو دیکھے جسے اُس نے پہلے دیکھا تھا۔ روشنی کے نقطے اب بھی وہیں تھے۔ ان کی روشنی پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ ان میں ایک ہلکی سبزی مائل چمک تھی جسے وہ پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ان نقطوں نے حرکت کی تھی۔ اس سے قریب تر ہو گئے تھے۔ وہ اب بھی اتنے اندھیرے میں تھے کہ معمولی توجہ سے ان کی حقیقت نہیں ظاہر ہو سکتی تھی۔ وہ پھر مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ یکایک کتاب کی ایک عبارت نے کسی خاص خیال کو اُبھارا جس سے وہ چونکا اور تیسری مرتبہ اس نے کتاب اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹائی۔ اور اس کا ہاتھ صوفے کے کنارے رُک گیا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُلٹتی ہوئی زمین پر اس طرح گری کہ اس کی پشت اوپر تھی۔

برٹن بیٹھا غور سے سہری کے نیچے تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ جہاں نقطے تیز روشنی سے چمک رہے تھے۔ وہ متوحش ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اب تجسس تھیں۔ اسے سہری کے

نیچے ایک بڑا سا سانپ نظر آیا۔ روشنی کے نقطے اُس کی آنکھیں تھیں! اس کا مکروہ سر کنڈلی کے اندر والے حلقے سے نکل کر باہر والے حلقے پر رکھا ہوا۔ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چوڑے خوفناک جبڑے اور اس کی پیشانی اس کی نظروں کے مرکزِ توجہ کو ظاہر کر رہی تھیں۔ آنکھیں اب صرف روشن نقطے نہ تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں ایسے معنی خیز انداز سے دیکھ رہی تھیں جس سے کچھ کا اخذ ہوتا تھا۔

۲

کسی جدید شہر کی خواب گاہ میں سانپ کی موجودگی کوئی عام واقعہ نہیں کہ اس کی توجیہ بیکار ہو۔ بارکر برٹن جو ۳۵ سال کا کنوارا، کاہل، ہر دلعزیز، دولتمند، تندرست، اور علم کا لدادہ تھا دور دراز کے غیر مانوس ملکوں کے سفر سے حال ہی میں سان فرانسسکو واپس آیا تھا۔ ہوٹلوں میں ٹھہرنے سے اسے فطری نفرت تھی اور اس لیے اس نے اپنے دوست اور سائنس کے ممتاز ماہر ڈاکٹر ڈورنگ کی دعوت بخوشی قبول کر لی۔ ڈاکٹر ڈورنگ کا پرانا قدیم وضع کا مکان شہر کے غیر معروف حصے میں تھا۔ اس کی ساخت سے سنوارنہ سنجیدگی ہویدا تھی۔ یہ اپنے[1] بدلے ہوئے ماحول سے التفات کرنے پر آمادہ نہ تھا اور اس بیگانگی کی وجہ سے جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی اس میں موجود تھی بعض ایک بازو جو خیالی طور پر بے جوڑ اور مقصد کے لحاظ سے بھی ویسا ہی باغی تھا۔ کیونکہ یہ ڈاکٹر ڈورنگ کے عجائب خانے معمل اور دوشنی خانے کا مجموعہ تھا۔ یہیں وہ اپنی فطرت کی علمی افتاد کو ان مخلوقات کے مطالعہ حیات سے آسودہ کرتا جن سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اور اس کی یہ دلچسپی

"نچلے طبقے" تک محدود تھی کیونکہ "اونچے طبقے" والوں کو اس کے وحوش خانہ میں پہنچنے کے لیے اپنے کو "بینڈک اور سانپ" کی خاصیت سے موصوف کرنا پڑتا۔ اس کے علمی مشاہدے کا میدان کیڑے مکوڑے اور رینگنے والے جانوروں کی طرف تھا۔ اسے فطرت کے "گنواروں" سے الفت تھی اور وہ اپنے آپ کو علم حیوانات کا زولا[1] سمجھتا تھا۔ اس کی بی بی اور بیٹیاں چونکہ اس کے اس "اعلیٰ ذوق" میں شریک نہ تھیں اس لئے وہ "سانپ گھر" کی دلچسپیوں سے بالکل محروم تھیں۔ اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر نے انھیں اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کی دولت کے ذریعے اپنے ماحول کی عظمت و شوکت اور اپنی آرائش و زیبائش میں سانپوں سے بڑھ جائیں۔

آرائش کے لحاظ سے "سانپ گھر" میں ایسی سخت سادگی تھی جو اس کے رہنے والوں کے خیال کے موافق تھی، ان میں سے بہتوں کے لیے وہ آزادی موذوں نہیں ہوتی جو زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں یہ تکلیف دہ خصوصیت تھی کہ وہ زندہ تھے۔ لیکن اپنے کمروں میں انھیں صرف اس قدر ذاتی آزادی حاصل تھی کہ وہ ایک دوسرے کو کھا نہ جا سکیں۔ اور برٹن ہشیار کر دیا گیا تھا کہ

[1] زولا۔ فرانسیسی۔ ادیب۔ اُس کے ناول زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے متعلق ہوتے تھے۔ (مترجم)

یہ حقیقت، روایت کی حد سے بڑھ چکی تھی کہ ان میں سے بعض بسا اوقات مکان کے ایسے حصے میں پائے گئے تھے۔ جہاں ان کے لیے اپنی موجودگی کی وجہ بتانی مشکل ہو جاتی۔

"سانپ گھر" کی کراہیت انگیز موجودگی کے باوجود بھی — اور سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ ہی روز بعد اسے بالکل ہی بھول چکا تھا — "ڈر در رنگ ولا" کی سکونت اس کی طبیعت کے موافق تھی۔

۳

تعجب اور حقارت کے سوا مسٹر برٹین نے اور کچھ محسوس نہ کیا۔ اس کا پہلا خیال گھنٹی بجا کر نوکر بلانے کا ہوا۔ لیکن باوجود اس کے کہ گھنٹی کا فیتا بالکل نزدیک ہی لٹک رہا تھا اس نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، اسے یہ شک ہوا کہ اس کی اس حرکت سے ڈر جانے کا شبہ ہو سکتا تھا حالانکہ وہ مطلقاً خوف زدہ نہ تھا۔ پست فطرت کے اُس اِس موقع کے بھونڈے پن کا زیادہ احساس تھا۔ جو قابل نفرت مگر مہمل تھا۔

یہ سانپ اس جنس سے تھا جس سے برٹین ناآشنا تھا۔ اس کے طول کا وہ صرف قیاس ہی کر سکتا تھا۔ اس کا سب سے نمایاں حصۂ جسم اس کے بازو جتنا موٹا تھا۔ اگر یہ خطرناک تھا تو کیونکر؟ کیا زہریلا تھا؟ یا نگلا گھونٹنے والا؟ خطرات فطرت سے ہشیار کرنے والی علامتوں کا علم بھی اِس وقت اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اُس نے کبھی ایسا معمہ حل نہیں کیا تھا۔

اگر خطرناک نہیں تو کم از کم اس کی موجودگی ناگوار خاطر ضرور تھی۔ وہاں اس کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بے تمیزی تھی، نگینہ انگوٹھی کے لایق نہ تھا! ہمارے زمانے اور ہمارے ملک کے وحشیانہ ذوق نے بھی اس جگہ کو، جنگل کی اس وحشی بستی کے لئے موزوں نہ بنایا تھا۔ اگر چہ اس ذوق نے کمرے کی دیواروں کو تصویروں سے اور کمرے کے فرش کو فرنیچر سے اور فرنیچر کو آرائش کے سامانوں سے بھر دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیسا روح فرسا خیال تھا۔ اُسی ہوا میں سانس لینا جس میں ایک سانپ سانس لے رہا ہو!

انھیں خیالات نے اسے کچھ کرنے پر آمادہ کیا۔ یہی وہ عمل ہے جسے ہم "فکر و فیصلہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم دانا یا نادان ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح خزاں کی پتیاں زمین یا جھیل کی سطح پر گر کر اپنی ہم جنسوں سے زیادہ یا کم ذہانت کا ثبوت دیتی ہیں انسانی افعال کا راز بالکل کھلا ہوا ہے۔ کوئی چیز ہمارے اعصاب میں تشنج پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی مضائقہ ہے اگر اسی اعصابی تغیر کا نام "قوت ارادی" رکھ دیں۔؟

برٹین کھڑا ہو گیا۔ اور بغیر سانپ کو بھڑکانے کے پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے سے باہر نکل جانے کے لیے تیار ہوا لوگ اسی طرح بڑوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ بڑائی "طاقت" ہے اور طاقت "خطرہ" ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بغیر کسی رکاوٹ کے الٹے پاؤں چلکر وہ آسانی سے دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر موذی اس کا تعاقب کرے تو اسی ذوق نے جس نے دیواروں کو نقش و نگار سے بھر دیا تھا۔ خونخوار شرقی ہتھیاروں کو بھی دیوار سے آویزاں کر دیا تھا اور وہ انھیں میں سے ایک ہتھیار کو

موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اُٹھا سکتا تھا۔ . . . .
اس عرصے میں سانپ کی آنکھیں اور بھی زیادہ بے رحمانہ حقارت سے چمکنے لگیں۔ !

برٹین نے پیچھے ہٹنے کے لئے دہنا پاؤں زمین پر سے اُٹھالیا۔ اس وقت اُسے اس فعل سے سخت نفرت ہوئی "میں بہادر کہلاتا ہوں !" اُس نے آپ ہی آپ کہا۔ "تو کیا بہادری غرور اور شیخی کے سوا اور کچھ نہیں؟ چونکہ کوئی میری بزدلی کا شاہد نہیں، اس لئے میں پیچھے ہٹ جاؤں؟"

(۴)

دہنا ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھے اور پاؤں اُٹھائے وہ اپنا توازن قائم کر رہا تھا "مہبل" اس نے بلند آواز سے کہا میں اتنا بڑا بزدل نہیں کہ خود اپنے نزدیک خوف زدہ معلوم ہونے لگوں" پھر تی سے گھٹنے کو موڑ کر اُس نے اپنا پاؤں نیچے اور اوپر اُٹھایا اور اس کو زمین پر رکھ دیا۔ دوسرے پاؤں سے ایک انچ آگے وہ سمجھ نہ سکا کہ ایسا کیوں کر ہوا۔ بائیں پاؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ پھر دہنے پاؤں کے آگے تھا۔ کرسی کی پشت پر جو ہاتھ تھا وہ کرسی کو پکڑے ہوئے تھا۔ بازو سیدھا تھا کچھ پیچھے کی طرف . . . . . .

. . . . . معلوم ہوتا تھا کہ وہ کرسی کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ سانپ ابھی تک پہلے کی طرح کنڈلی کے اندر والے حلقے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ سانپ نے حرکت نہ کی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بجلی کے شعلے تھیں جن سے بے شمار شعاعیں نکل رہی تھیں۔

برٹین کا چہرہ زرد ہو گیا۔ پھر اُس نے ایک پاؤں آگے بڑھایا پھر دوسرا۔ کرسی کو گھسیٹتے ہوئے۔ جو آخر کار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر زور سے گری۔ وہ کراہا۔ سانپ نے نہ تو حرکت کی نہ اُس کی آواز ہی سُنائی دی۔ لیکن اُس کی آنکھیں وغیرہ کون سورج تھیں جنھوں نے خود اُس کو چھپالیا تھا۔ ان آنکھوں سے تیز اور شوخ رنگوں کے دائرے نکل رہے تھے جو پھیل پھیل کر صابن کے بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے تھے۔ وہ برٹین کے چہرے تک پہنچے معلوم ہوتے اور معاً انتہائی دوری پر پہنچ جاتے۔ وہ کہیں ڈھول کی مسلسل ڈھب ڈھب سُن رہا تھا جس کے ساتھ دور سے موسیقی کا ایک جھونکا بھی آجاتا۔ پہلے کے نغمے کی طرح حیرت انگیز شیرینی لئے ہوئے۔ اُس نے سمجھا کہ یہ "یمین کے مجمعے کا" نغمہ سماعی" ہے اور سوچا کہ وہ نیل کے ساحل پر کھڑا برسوں اشتیاق سے صدیوں کی خاموشی میں سے غیر فانی نغمہ سُن رہا ہے۔ موسیقی بند ہو گئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ کم ہو ہو کر گھٹتے ہوئے طوفان کے کوکوں کی گڑگڑاہٹ ہو کر رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک منظر تھا۔ بارش اور آفتاب سے چمکتا ہوا اس پر قوس قزح کی محراب تھی۔ جس کے عظیم الشان خم میں سیکڑوں شہر معلوم ہو رہے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا سانپ تاج پہنے اپنا سر اُٹھائے ہوئے تھا اور اپنی مُردہ ماں کی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ یکایک یہ پُراسرار۔ دلکش منظر تیزی اور آہستگی سے اوپر اُٹھتا معلوم ہوا۔ تھیٹر کے پردے کی طرح۔ اور خلا میں غائب ہو گیا۔ کوئی چیز بڑے زور سے اُس کے چہرے اور سینے پر لگی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ناک اور خراش

پائے ہوئے ہونٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے سکتہ سا ہو گیا اور آنکھیں بند کیے چہرہ زمین پر رکھے دو پڑا رہا۔ چند لمحات میں اُسے ہوش آ گیا اور اس وقت اس نے محسوس کیا کہ گرنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں دوسری طرف ہو گئی تھیں اور اس طرح وہ طلسم ٹوٹ گیا تھا جو اُسے مسحور کیے ہوئے تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنی نگاہیں دوسری طرف کیے ہوئے وہ یقیناً پیچھے ہٹ سکے گا۔ لیکن یہ خیال نہایت ہیبت ناک تھا۔ سانپ اس کے سر سے صرف چند فیٹ کے فاصلے پر ہے۔ شاید اچھل کر اُس کی گردن میں اپنی کنڈلی پیسٹ دینے کی تیاری میں ہے۔ اور وہ سانپ کو دیکھ نہیں رہا ہے۔ اس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اُن مقناطیسی آنکھوں کو دیکھا اور پھر اُن کی گرفت میں آ گیا۔ سانپ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ احساس پر اب سانپ کا اثر کچھ کم ہو گیا تھا چند لمحے قبل کے عالیشان خیالی مناظر اب پیش نظر نہیں تھے اس کی چپٹی بھوؤں کے نیچے اس کی سیاہ گولیوں کی سی آنکھیں اُسی طرح چمک رہی تھیں جیسے پہلے۔ انتہائی متانت کے ساتھ اظہار کے ساتھ گویا کہ اس جانور نے اپنی کامیابی کا یقین کرتے ہوئے مسحور کرنے والی ترکیبوں کا استعمال ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب ایک خوفناک منظر شروع ہوا۔ بیرٹن نے جو اپنے دشمن سے ایک گز دور زمین پر پڑا ہوا تھا۔ کہنیوں کے بل جسم کے اوپر کا حصہ اُٹھایا۔ اُس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور اس کے پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ جس پر خون کے دھبے تھے۔ بالکل سفید تھا۔ آنکھیں انتہائی حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر کف تھا۔ اور آہستہ آہستہ زمین پر گر رہا تھا۔ اس کے جسم میں زور زور سے لرزش ہوتی تھی۔ اُسی طرح جیسے سانپ پیچ و خم کھاتا ہے۔ وہ کمر کے بل جھک گیا اور اپنے پاؤں کو ادھر ادھر ہٹانے لگا۔ ہر حرکت پر وہ سانپ کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے کہ اپنے کو پیچھے کی طرف ڈھکیلے لیکن کہنیوں کے بل لگے ہی بڑھتا گیا۔

۵

ڈاکٹر ڈورنگ اور اُس کی بی بی دارالمطالعہ میں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کی طبیعت اس وقت بے حد موزوں تھی۔ "میں نے ابھی ایک شخص سے" "اوفیو فاگس" کا نمونہ حاصل کیا ہے"۔ "اور یہ ہے کیا!" اس کی بی بی نے بے پروائی سے پوچھا؟

"کیوں خدا کی پناہ! کیسی جہالت! میری پیاری جس آدمی کو شادی کے بعد اس کا یقین ہو جائے کہ اُس کی بی بی یونانی زبان نہیں جانتی اُسے طلاق دے دینے کا حق حاصل ہے۔ اوفیو فاگس ایک سانپ ہے جو دوسرے سانپوں کو کھا جاتا ہے"۔

"میں امید کرتی ہوں کہ یہ تمہارے سب سانپوں کو کھا جائیگا" وہ لیپ کو ہٹاتے ہوئے بے پروائی کے لہجے میں بولی "لیکن یہ دوسرے سانپوں کو پکڑتا کس طرح ہے۔ غالباً ان کو مرعوب کر کے؟"

"یہ بالکل تمہاری جیسی بات ہے پیاری" ڈاکٹر نے کہا تم جانتی ہو کہ سانپ کی مقناطیسیت کی طرف

اشارہ کرنا بھی میرے نزدیک کتنا احمقانہ خیال ہے!"

گفتگو ایک زبردست چیخ سے منقطع ہو گئی جو خاموش مکان میں اس طرح گونجی جیسے شیطان قبر میں سے گرج رہا ہو۔ پھر ایک ہیبت ناک صفائی سے آواز آئی۔ وہ اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر گھبرایا ہوا۔ اس کی بی بی زرد اور خوف زدہ۔ تبل اس کے کہ آخری چیخ کی گونج ختم ہوئی ہو۔ ڈاکٹر کمرے کے باہر تھا۔ وہ دو سیڑھیوں کو تڑپتا ہوا وہ دہلیز میں آیا۔ بریسٹن کے کمرے کے سامنے اُسے چند نوکر ملے جو اوپر کی منزل سے آئے تھے۔ سب مل کر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر گھس گئے۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ بریسٹن پیٹ کے بل زمین پر مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر اور بازو دن کا کچھ حصہ مسہری کی پٹی کے نیچے چھپا تھا۔ اُنھوں نے جسم کو باہر کھینچا اور چت کر دیا۔ چہرہ خون آلودہ تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں گھور رہی تھیں۔ "غشی کی حالت میں مر گیا۔" خوف ناک نظارہ تھا۔ ڈاکٹر نے جھک کر اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جھکنے پر اس کی نگاہ مسہری کے نیچے گئی۔ "اوخدا!" اس نے کہا۔ "یہ یہاں کیسے آگیا؟" اُس نے مسہری کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور سانپ کو کھینچ کر باہر پھینک دیا۔ اس کی کنڈلی ابھی تک بندھی ہوئی تھی۔ یہ زمین پر گر کر خت کھنکتی آواز کے ساتھ پھیلتا ہوا دیوار سے جا کر لگا۔ اور بے حس و حرکت ہو کر پڑا رہا۔ یہ ایک مصنوعی سانپ تھا جو بھورا بھر کر بنایا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جوتے کے دو بٹن سے بنی تھیں۔ +

۵۱" یہ پلے ہوئے ماحول سے ..... " یہ ترجمہ بالکل لفظی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اردگرد کے مکانات میں نئی وضع کے مطابق تغیر ہو گیا تھا لیکن یہ مکان اپنی پرانی وضع پر قائم تھا، اور اپنی قدامت پسندی پر نازاں تھا۔ ۵۲" یہ حقیقت روایت کی حد سے بڑھ چکی تھی"۔۔۔ جنی محض سنی سنائی بات نہ تھی بلکہ مشاہدے سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی۔ ۵۳" اور اپنی مردہ ماں کی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا" یہ لفظی ترجمہ ہے ــــ اور مفہوم صاف نہیں ہے۔ ۵۴" کہ وہ پیچھے ہٹ سکے گا" اُردو میں غالباً وہ کی جگہ میں اور سکے گا کی جگہ سکوں گا ہونا چاہیے۔ لیکن انڈایرکٹ نیریشن بھی اُردو میں رواج پا رہا ہے۔ ۵۵" یہ بالکل تمہاری جیسی بات ہے" یہ بھی لفظی ترجمہ ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ ایسی بات ہے جس کی توقع تمہیں سے کی جا سکتی ہے۔

مترجم

غمکدہ

مصنفہ مصطفےٰ لطفی منفلوطی

مترجمہ سید احمد صاحب عروج قادری

جمیل۔ میرا دوست تھا، میں اس سے محبت کرتا تھا، میں اُس پر فریفتہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ بڑا حسین یا پیر ہیز گار تھا بلکہ اس کے اتفاقاً ہمسال و کلش سے کہیں زیادہ اس کے غلغلہ انداز ادبی کمال نے مجھے اس کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس کی موجودگی میرے لئے باعث تسکین بن گئی تھی۔ میں ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا اور اس کی سحر بیانی سے محظوظ ہوتا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو میں گھبرا اُٹھتا تھا۔ ایک عرصے تک میں اس کے ساتھ رہا۔ وہ مجھ سے خوش تھا اور میں اس سے! اچانک میں ایک شدید ضرورت کی وجہ سے قاہرہ سے باہر چلا گیا، ہم دونوں میں برابر مراسلات جاری رہے، کچھ دنوں بعد اس نے خط لکھنا چھوڑ دیا، میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا۔ پھر تو طرح طرح کے خطروں نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ ناچار میں اسی حیرت و پریشانی میں قاہرہ لوٹ آنے پر مجبور ہو گیا، لیکن افسوس کہ میرا دوست مجھے نہ ملا۔ میں نے قاہرہ کی اُن تمام گلیوں کی خاک چھانی۔ جہاں اُس کے دیدار کی امید تھی، لیکن محض بیکار، اُس کے محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ عرصے سے مفقود الخبر ہے۔ میں نے اُس کی تلاش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا لیکن افسوس کہ بے سود! جب میں ناامید ہو گیا کہ وہ اب نہیں ملے گا۔ تو میری آنکھیں نمناک ہو گئیں، اور میں رنج و غم، اور حزن و الم کی سراپا تصویر بن کر رہ گیا۔ میرے اور اُن افسوس کی وہی شخص قدر کر سکتا ہے جس کا کوئی دوست بچھڑ گیا ہو اور جس کا دل آتش فراق سے جل چکا ہو۔ +

مہینے کی آخری تاریخ تھی، لیل شب کی تاریک و طویل رُلفیں ہر طرف بکھر گئی تھیں۔ قاہرہ کے کتب خانے میں واپس جا رہا تھا کہ راستہ بھول گیا، بھٹکتا ہوا میں ایسی جگہ پہونچا جو اسکندریہ وغیرہ مرصوف اور خوفناک تھی کہ گویا میں حبشہ کی بستی میں آگیا تھا تاریکی اتنی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک ایسے سیاہ دریا میں غوطے لگا رہا ہوں جو دو پہاڑوں کے درمیان موجیں مار رہا ہو تاریکی کی خطرناک موجوں نے مجھے گھیر رکھا تھا، میں کھڑا ہوا اپنی رہائی کی تدبیریں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک دھیمی سی آواز فضا میں پھیل گئی، یہ کسی کی صدائے خیف میرے کانوں سے ٹکرانے لگی۔ اس خوفناک اور ویران گلی میں کسی کی موجودگی تعجب سے خالی نہ تھی مگر میں نے یہ عہد کیا تھا کہ حتی الوسع ہر مصیبت زدہ کی مدد کروں گا۔ اس لئے میں اس آواز کی طرف لپکا اور اس دروازے پر پہنچ گیا جہاں سے آواز آرہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کنڈی ہلائی لیکن صدائے برخواست۔ ناچار پوری شدت سے کنڈی ہلانی پڑی۔ اب دروازہ کھلا۔ ایک دس برس کی لڑکی ہاتھ میں ٹمٹماتی ہوئی شمع لئے میری طرف

تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جس طرح چاند ابر کے منتشر ٹکڑوں میں نظر آتا ہے۔ "کیا یہاں کوئی مریض ہے"؟ میں نے پوچھا۔ اس لڑکی نے زور سے ایک ٹھنڈی سانس لی، قریب تھا کہ دل کی رگیں پھٹ جائیں۔ پھر اُس نے کہا "مہربان من آئیے اور میرے قریب مرگ باپ کی مدد کیجیے"۔ شمع لیے ہوئے وہ آگے بڑھی، اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چلا، تھوڑی دیر میں وہ ایک بالاخانہ پر پہنچی اس میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہستی سے نیستی، اور زندگی سے موت کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ بالاخانہ "مزار" اور پلنگ پر لیٹا ہوا مریض "مردہ" معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے جس میں سانس کی اس طرح آمد و رفت ہے جس طرح لکڑی کے بنائے ہوئے مجسمے میں ہوا آتی جاتی ہے۔ میں مریض سے قریب ہو گیا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پست آواز سے کہا۔ "الحمد للہ کہ میں نے اپنے دوست کو پالیا"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی، معلوم ہوتا تھا کہ میرا کلیجا سینے سے باہر نکل آئے گا اور میرا دل شدت الم سے پھٹ جائے گا۔ میرا دوست مل گیا تھا مگر افسوس کہ وہ دو گھڑی کا مہمان تھا۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ قبرستان کا سا سکوت مطلق۔ ہم سب خاموش تھے، بالکل خاموش جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے کہا۔ جمیل! جمیل! تمہاری یہ حالت! آہ زمانہ کی بوقلمونیوں نے تمہارے ساتھ ایسا ستمگار و دلآزار برتاؤ کیا! بتاؤ تم اتنے دنوں کہاں رہے، اور ایسی حالت کیوں ہے؟" وہ اُٹھنے لگا لیکن اُٹھ نہ سکا۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے اس کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔

جمیل نے ٹھنڈی سانس لی اور کہنا شروع کیا "دس سال کی طویل مدت گذری کہ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے مکان کے پہلو میں ایک اور مکان تھا جس میں ایک مختصر گروہ تعلقہ کنبا بسا ہوا تھا۔ ہر کھارت کی ایک بہار، آخریں شام تھی، میں اپنے بالاخانے پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے والے مکان کے در پیچے پر پڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک "پیکر جمال" مجسمۂ حسن و شیزہ عالم محویت میں شام کا لطف اُٹھا رہی ہے۔ میرے دوست یقین کرو کہ وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے آسمان سے کوئی حور اُتر آئی ہو یا سنگ مرمر کے خوبصورت مجسمے میں خون دوڑا دیا گیا ہو۔ جب وہ چلی گئی، تو میرے منہ سے ایک آہ آتشیں نکلی گئی جس نے میرے دل و جگر کو جلا ڈالا۔ میں اُس کا گرفتار محبت ہو گیا۔ اور بے قرار رہنے لگا۔ میں نے اُس کو شیشہ میں اُتارنے کی ان تھک کوششیں کیں۔ لیکن ہمیشہ وہ مجھ سے بچتی رہی۔ میرے ترکش کے تمام تیر ختم ہو چکے تھے۔ صرف ایک باقی رہ گیا تھا۔ (آہ یہ وہی تیر تھا جس نے میری اور اُس کی زندگی کو برباد کر دیا) میں نے اُس سے کہا کہ گھبراؤ نہیں میں تم سے نکاح کر لوں گا۔ آہ میرا یہی آخری حربہ تھا جس نے اس معصومہ کو گھائل اور اس کی عفت کو برباد کر دیا۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں اُس کا گرفتار تھا اور وہ میری پرستار، غرض تھوڑے ہی دنوں میں میری ہو سنا کیوں نے اس کی نسوانیت کے وہ تمام مخفی خزانے لوٹ لے جن پر ایک عورت کو ناز ہو سکتا ہے اور وہ صحیح معنی میں دولت مند کہی جا سکتی ہے۔ ابھی

ایک ہی ماہ گزرا تھا کہ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے۔ جان میرے نفس اور ضمیر میں جنگ چھڑ گئی کہ وہ نکاح پورا کرنا چاہیے یا نہیں۔ میرے ضمیر کی شرافت یہ کہہ رہی تھی کہ زبان ہار جانے کے بعد غداری بدترین لعنت ہے۔ اور میرے نفس کی خباثت اس پر تلی ہوئی تھی کہ اس کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جانا چاہیے، آخر کار میرا بد نفس دل کی آواز پر غالب آ گیا۔ اور میں اُس کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا۔ جہاں تم مجھ سے ملا کرتے تھے۔ ایک طویل مدت تک مجھے اس دوشیزہ کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکیا مجھے یہ خط دے گیا۔ جمیل نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک زرد رنگ کا سیلا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

خط

..... "اگر میں اس خیال سے تم کو خط لکھنا چاہتی کہ ٹوٹے ہوئے عہد اور گزری ہوئی محبت کی تجدید کروں تو ہرگز ایک سطر ایک لفظ ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ اس لئے کہ میں تمہارے جیسے پیمان شکن اور وفا ناشناس انسان کے عہد و پیمان، اور تم جیسے ہوالہوس اور بندۂ نفس کی جھوٹی محبت کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ اس کا تذکرہ کیا جائے پھر یہ کہ جب اس کی تجدید و توثیق کی خواہش، یا اس پر حسرت و افسوس کا اظہار ہو ——— تم جانتے ہو کہ جس وقت مجھے چھوڑ کر تم چلتے ہوئے میرے پہلو میں ایک آگ تھی جو سُلگ رہی تھی، اور ایک بچہ تھا جو تڑپ رہا تھا۔ لیکن تم نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور سُنہ چھپا کر بھاگ گئے۔ آہ تمہارے دل نے اتنی ہمت بھی گوارا نہ کی۔ کہ میری بدبختی پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے حالانکہ اس بدبختی کا باعث تمہیں تھے۔ اور تمہارے ہاتھوں نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ سکیں حالانکہ اس اشک مسلسل کا دریا تمہارے ہی ہاتھوں رواں ہوا تھا پھر میں کیسے سمجھوں کہ تم شریف آدمی ہو۔ بلکہ میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو رہی ہوں کہ تم انسان نما حیوان ہو جس میں دنیا بھر کی خباثت، درندگی۔ اور بہیمیت کا اجتماع ہے۔ اور تم جیسا انسیت مطلق کے متظاہر تم ہو ——— تم اپنے دعوی محبت میں جھوٹے تھے، تیری سادگی سے تم نے ناجائز فوائد اٹھایا۔ تم صرف اپنے خبیث نفس کے پجاری تھے، اور صرف ہوس رانی کے لئے تم نے ایک معصوم، پاک باز اور کردہ بستی کو لوٹا۔ بگاڑا اور تباہ کیا تمہاری مثال اس رہزن کی ہے جو رہبر بن کر لوٹتا ہے اور اس لیڈر کی سی ہے جو بھولی بھالی قوم کو بہکا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتا ہے۔ اگر تم بندۂ ہوس نہ ہوتے تو کبھی میرا چہرہ بھی نہ دیکھتے ——— تم نے خیانت کی اور نکاح کا سبز باغ دکھا کر دھوکا دیا۔ شاید تمہارے نفس نے مجھ جیسی مجرمہ عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کیا۔ لیکن سوچو کہ میں مجرمہ کس کی وجہ سے بنی۔ کیا یہ تم نہ تھا؟ دانستہ اگر تم نہ ہوتے تو میں کبھی مجرمہ نہ بنتی۔ میں نے اپنے بچانے کی ساری کوششیں صرف کر دی تھیں لیکن میں کب تک کوشش کرتی۔ عورت تھی، کمزور تھی۔ اور ناچار، کار، آخر بے قابو ہو گئی۔ جس طرح چھوٹا سا بچہ جابر و ظالم بڑا کو دں کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے، آہ تم نے میری عصمت و عفت برباد کر دی۔ میں ذلیل ہو گئی۔ میرا دل طرح طرح کی معصیتوں میں گھر گیا۔ میری عاصیانہ زندگی کا ایک ایک دن پہاڑ ہو گیا۔ اور موت کو سوں دور نظر آنے لگی۔ اس عورت کی بدقسمتی میں کیا شبہ

ہو سکتا ہے جو نہ کسی کی بی بی بن سکتی ہو، نہ ماں، آہ میں کسی کے سامنے سر اُٹھانے کے قابل بھی نہ رہی، ہر وقت میری گردن جھکی رہتی ہے، دل جلتا، جگر گھلتا ہے اور سینے میں آگ لگی رہتی ہے۔ لوگوں کے خوف اور اپنی رسوائی کے ڈر سے بستر پر تنہا بالکل تنہا سسکتی، ہتی ہوں ذرا تنہائی میں سوچنا تو سہی، یہ مصیبتیں کس کی لائی ہوئی ہیں؟ تم نے میری راحت چھین لی، کیونکہ اس حادثے کے بعد میں روپوش ہونے پر مجبور ہو گئی۔ مجھے اپنے بہترین محل، دولت مند اور ناز بردار والدین راحت و آسایش کے تمام ساماؤں کو یا دل ناخواستہ الوداع کہنی پڑی۔ اپنی زندگی کے بقیہ دن کاٹنے کے لیے ایک ایسی گلی میں چلی آئی جس کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ تنگ و تاریک کوٹھری میں نت نئی مصیبتوں کے ساتھ بقیہ ایام حیات گزار رہی ہوں۔ آہ مجھے یہ بھی خبر مل گئی کہ میرے مہربان والدین کو میرے غم فراق نے ہلاک کر دیا۔ خزاں دل پر ہاتھ تو رکھ کہ اس قتل کا ذمہ دار کون ہے؟ ۔ تم نے مجھے بھی مار ڈالا، اس لیے کہ شراب زندگی کے یہ سخ گھونٹ جو تم نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پلائے ہیں۔ اور عرصہ حیات کے یہ طویل آلام جو تم نے دعوت دے کر مجھ پر مسلط کرائے ہیں۔ وہ اپنی آخری حد تک پہونچ چکے ہیں۔ میں بستر مرگ پر دراز ہوں، اور میری مثال اس مٹے ہوئے فتیلے کی ہے جو چند منٹ میں خاکستر ہو جائیگا۔ اللہ نے میری دعا قبول کر لی ہے۔ چند ساعتوں کی مہمان ہوں اور تھوڑی دیر میں اپنی تمام خون شدہ آرزوؤں کے ساتھ ختم ہو جاؤں گی۔ ـــــ میرے قاتل جمیل میں نے تم کو یہ خط اس لیے نہیں لکھا ہے کہ تجھ سے محبت کروں۔ یا اپنے حال پر متوجہ کروں، ارے اب میرا کیا؟ چراغ سحری ہوں تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لیے گل ہو جاؤں گی۔

میں نے یہ خط اس لیے لکھا ہے کہ اپنی امانت لے جاؤ، تمہاری بیٹی دس سال کی ہو چکی ہے۔ زندگی بھر میں اس کی ناز برداری کرتی رہی۔ اب اس کی بدنصیب ماں مر رہی ہے۔ دنیا میں تمہارے سوا اس کا کوئی پرساں نہیں، اگر میری محبت تمہارے دل میں نہ رہی تو کوئی شکایت نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کم از کم تمہارا دل شفقت پدری سے خالی نہ ہوگا۔ آؤ اور اپنی لخت جگر کو لے جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی اپنی ماں کی طرح بدبختی کا شکار ہو جائے۔ اچھا رخصت!

میں نے خط تمام بھی نہ کیا تھا کہ جمیل کو دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے۔ خط پڑھ چکنے کے بعد میں نے پوچھا میرے دوست پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ جمیل نے کہا، کہ خط پڑھتے پڑھتے میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی اور غم و اندوہ سے سر لٹکا بیٹھنے لگا۔ میں دوڑا ہوا اس بدنصیب عورت کی منزل پر پہونچا اور یہ وہی مکان ہے جس میں اس وقت مجھے دیکھ رہے ہو) دیکھا کہ اسی پلنگ پر وہ پڑی ہے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ یہ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی ہے اور سخ ترین رو نا رو رہی ہے۔ یہ منظر دیکھکر میں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ غشی کی حالت میں مجھے نظر آیا کہ میرے جرائم سینما کی تصویروں کی طرح خوفناک شکلوں میں مبدل ہو کر میرے سامنے کھڑے ہیں۔ بہت سے ہیبت ناک شیر ہیں جن میں سے کوئی تو مجھ پر دانت تیز کر رہا ہے اور کوئی پنجے تان رہا ہے۔ ہوش آنے کے بعد

میں نے قسم کھائی کہ اب ہمیشہ اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں رہوں گا۔ اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر میں بھی اُسی طرح مروں گا۔ جس طرح وہ بدنصیب عورت مری تھی۔ میرے دوست! اب میری سمجھ میں آیا کہ خدا کی اس ضعیف لیکن نازک مخلوق، عورت کو ستانا کسقدر ہولناک نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ یہ کہتے کہتے جمیل کی زبان بند ہوگئی اس کا چہرہ زرد پڑگیا۔ اور اپنے بستر پر گر پڑا آہ اس کی روح نکل چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے بھی ہوش نہ رہا۔ پھر میں نے اس کے دوستوں اور ملنے والوں کو بلا بھیجا اور سب لوگوں نے مل کر جمیل کو سپرد خاک کردیا۔ اس دن سے زیادہ نہ تو میں کبھی رویا اور نہ وہ لڑکی۔ +

خدا جانتا ہے کہ میں یہ داستان غم لکھ رہا ہوں اور رو رہا ہوں۔ میں عمر بھر جمیل کا وہ جملہ کبھی نہ بھولوں گا۔ جو مرنے کے وقت اس کی زبان سے نکلا تھا (انبتی یا صدیقی) "میری بچی، لے میرے دوست"

تمثیل :-

سکون

مصنفہ مورس میٹرلنک

مترجمہ آرزو جلیلی

افراد تمثیل

باغ میں
بوڑھا آدمی
اجنبی
مارتھا } بوڑھے کی پوتیاں
میری }
ایک کسان
لوگوں کا مجمع

مکان میں
باپ
ماں
دو لڑکیاں } خاموش ہستیاں
بچہ

ایک پرانا باغ جس میں شاہ بلوط کے درخت نصب ہیں۔ اس کے پیچھے ایک مکان جس کی منزل کے تین دریچے دو طن ہیں۔ ان دریچوں سے ایک خانہ ان کے افراد صاف نظر آ رہے ہیں۔ جو لیمپ کے گرد بیٹھے ہیں باپ آتش دان کے قریب بیٹھا ہے۔ ماں بازو کو میز پر ٹیکے ہوئی، فضا پر اپنی نظریں جمائے ہے۔ دو کم سن لڑکیاں سفید لباس پہنے، بنی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی ہیں، کمرے کی پرسکوں فضا میں وہ محو خیال ہیں اور مسکرا رہی ہیں۔ ایک بچہ اس طرح سویا ہوا ہے کہ اس کا سر ماں کے بائیں بازو پر ہے۔ جب ان میں سے کوئی اٹھتا، چلتا، یا اشارہ کرتا ہے۔ تو یہ حرکت بنجیدہ اور سست معلوم ہوتی ہے۔ گویا فانوس یا دریچے کے شفاف شیشوں کی وجہ سے اس حرکت میں روحانیت پیدا ہو گئی ہو۔

(بوڑھا آدمی اور اجنبی باغ میں ہوشیاری سے داخل ہوتے ہیں)

بوڑھا آدمی۔ ہم لوگ باغ کے اس حصے میں ہیں جو مکان کے پیچھے ہے۔ وہ کبھی یہاں نہیں آتے ہیں دروازے دوسری طرف ہیں۔ جو بند ہیں اور دریچے بھی بند ہیں۔ اگر مکان کے اس طرف دریچے نہیں ہیں اور میں نے روشنی دیکھی ..... ہاں وہ اب تک لیمپ کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہ اچھا ہے۔

کہ انھوں نے ہماری آواز نہیں سُنی۔ ماں یا لڑکیاں اگر باہر آ گئی ہوتیں۔ تو ہم کیا کرتے۔؟

اجنبی۔ اب ہم کیا کریں گے۔؟

بوڑھا آدمی۔ پہلے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ سب مکان کے اندر ہیں یا نہیں۔ ہاں میں باپ کو آتش دان کے قریب بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں وہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اس کے گھٹنے پر پڑے ہوئے ہیں۔ ماں اپنے بازو میز پر ٹیکے ہوئے ہے۔

اجنبی۔ وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔

بوڑھا آدمی۔ نہیں وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی ہے اس کی آنکھیں جامد ہیں۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتی۔ ہم بڑے بڑے درختوں کے سائے میں ہیں۔ لیکن قریب جاؤ اور پھر مرزہ (لڑکی) کی دو بہنیں بھی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ کشیدہ کاڑھ رہی ہیں۔ اور ننھا بچہ سو گیا ہے۔ گوشے میں جو گھڑی ہے اس میں نو بج گئے ہیں..... انھیں اس کا وہم بھی نہیں کہ بُری خبر آنے والی ہے اور وہ بالکل خاموش ہیں۔

اجنبی۔ اگر ہم باپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں۔ اور اس کو اشارہ کریں؟ اس نے اپنا سر اس طرف پھیرا ہے۔ میں کسی دریچے پر دستک دوں؟ ان میں سے کسی ایک کو اوروں کے پہلے باخبر سننی ہی پڑے گی۔

بوڑھا آدمی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کسے انتخاب کروں ہمیں بہت ہوشیار، بننا چاہیے۔ باپ بوڑھا اور مریض ہے۔ ماں بھی۔ اور بہنیں بہت کم سن ہیں اور سب اس سے ایسی محبت کرتے تھے جیسی محبت وہ پھر کبھی نہیں کر سکیں گے.....

میں نے اس سے زیادہ خوش و خرم گھرانا نہیں دیکھا۔... نہیں نہیں دریچے کے قریب نہ جاؤ۔ اس سے زیادہ بُرا کام ہم نہیں کر سکتے۔ بہتر ہے کہ ان کو ہم یہ خبر بہت سنجیدگی سے سُنائیں۔ اس طرح کہ گویا یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ اور ہمیں بہت غمگیں نہیں نظر آنا چاہیے۔ ورنہ انھیں احساس ہوگا۔ کہ ان کے غم کو ہمارے غم سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ نہیں سمجھ سکیں گے کہ وہ کیا کریں..... چلو ہم باغ کی دوسری طرف چلیں۔ ہم دروازے پر دستک دیں گے۔ اور اطمینان سے چلے جائیں گے کہ گویا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ پہلے میں اندر جاؤں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر متعجب نہیں ہوں گے۔ میں اکثر شام کو ان کو دیکھنے جایا کرتا ہوں۔ کبھی پھول اور پھل لیکر اور کبھی ایک دو گھنٹا اُن کے ساتھ گزارنے کے لیے۔

اجنبی تم مجھے کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تنہا جاؤ۔ میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب تم مجھے پکارو۔ انھوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا ہے میں تو محض ایک راہی۔ ایک اجنبی ہوں۔

بوڑھا آدمی۔ بہتر ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ایسی بدقسمتی جس کا اعلان ایک ہی آواز کرتی ہے۔ بہت زیادہ

نمایاں اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے راستے میں یہ سوچا تھا کہ اگر میں اکیلے اندر جاؤں تو مجھے تھوڑا ہی بولنا پڑے گا۔ وہ سب کچھ چند الفاظ میں سمجھ جائیں گے۔ پھر میرے کہنے کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہے گی۔ اور میں اس خاموشی سے گھبراتا ہوں جو اُن آخری الفاظ کے بعد طاری ہوتی ہے، جو کسی مصیبت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس وقت کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ اگر ہم دونوں ساتھ جائیں تو میں سنجیدہ طریقے سے کام شروع کروں گا۔ مثلاً میں اُن سے کہوں گا۔" لوگوں نے اُسے ایسے پایا، ویسے پایا، وہ چشمے کے دھارے پر بہہ رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ یوں پھیلے ہوئے تھے۔"

اجنبی۔ اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے نہیں تھے۔ اُس کے بازو اُس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔

بوڑھا آدمی۔ دیکھو! باوجود کوشش کے ہم گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ اور اصل مصیبت کی طرف سے دھیان ہٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر میں تنہا اندر جاؤں تو میں اُن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی الفاظ کا بڑا خوفناک اثر ہوگا۔ اور پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔ لیکن اگر ہم باری باری اُن سے بولیں تو وہ ہماری باتیں نہیں سنیں گے۔ اور خبر سے مقابل ہونا بھول جائیں گے۔ یہ نہ بھول جاؤ کہ وہاں پر ماں بھی ہوگی۔ اور یہ کہ اُس کی زندگی محض ایک دھاگے سے لٹک رہی ہے۔ بہتر ہے کہ غم کی پہلی موج اپنی طاقت غیر ضروری الفاظ پر صرف کرے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کے گرد لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق جمع ہونے دیا جائے۔ بہت سے غیر متعلق لوگ بھی غم کے کچھ حصے کو بغیر محسوس کیے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ بغیر کوشش، بغیر شور و خوف کے، خوشی یا ہوا کی طرح غم رفع ہو جاتا ہے۔

اجنبی۔ تمہارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور پتھر پر اُن میں سے پانی ٹپک رہا ہے۔

بوڑھا آدمی۔ صرف میرے لبادے کا دامن پانی سے بھیگ گیا تھا۔ تمہیں سردی محسوس ہو رہی ہوگی۔ تمہارا کوٹ کیچڑ سے لت پت ہے۔ اس قدر اندھیرا تھا کہ میں راستہ میں ٹھہر نہیں کر سکا تھا۔

اجنبی۔ میں اپنی کمر تک پانی میں گیا تھا۔

بوڑھا آدمی۔ میرے آنے کے بہت پہلے ہی تم اُس کو نکال چکے تھے؟

اجنبی۔ میں نے اُس کو تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے نکالا تھا۔ میں واپس کی طرف جا رہا تھا۔ اپنی نظریں دریا پر جمائے چلا جا رہا تھا جو سڑک کے مقابلے میں زیادہ روشن تھا۔ اتنے میں میں نے کسی عجیب چیز کو آبی پودوں کے قریب دیکھا.....

میں اُس کے نزدیک گیا اور میں نے اُس کے بال دیکھے جو پانی پر بہہ رہے تھے۔ اُس کے سر کے گرد گول حلقہ بنائے ہوئے تھے اور پانی کی روانی کے ساتھ ادھر ادھر رُخ بدلتے رہتے تھے۔

(کمرے کے اندر دونوں لڑکیاں اپنے منہ

(دریچے کی طرف پھیرتی ہیں)

بوڑھا آدمی۔ تم نے "اُس" کی دونوں بہنوں کے بال کو اُن کے شانوں پر لہراتے دیکھا؟

اجنبی۔ اُنھوں نے اپنے سر اِدھر پھیرے تھے۔ اُنھوں نے اس طرف صرف اپنے سر پھیرے تھے۔ شاید میں بہت بلند آواز سے بول رہا تھا۔

(دونوں لڑکیاں پھر اُسی طرح بیٹھ جاتی ہیں جیسے وہ پہلے بیٹھی تھیں۔)

وہ پھر اُس طرف پھر گئی۔ ہیں۔ میں کمر بھر پانی میں گیا اور جب میں نے کسی طرح اُس کا ہاتھ پکڑا اور آسانی سے اُس کو کنارے کھینچ لایا، وہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی اُس کی بہنیں۔

بوڑھا آدمی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُن سے زیادہ خوبصورت تھی ——— میں نہیں جانتا کہ میں نے کیوں ہمت ہار دی ———

اجنبی۔ "ہمت" سے تمہارا کیا مطلب؟ ہم نے سب کچھ کیا۔ جو انسان کر سکتا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کے پہلے ہی مر چکی تھی ———

بوڑھا آدمی۔ آج صبح وہ زندہ تھی۔ میں نے گرجا سے باہر آتے وقت اُس سے ملاقات کی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں جا رہی ہوں۔ اپنی دادی اماں کو دیکھنے دریا کے اُس پار جا رہی ہیں۔ جس دریا کے کنارے تم نے اُسے پایا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اُسے پھر کب دیکھ سکوں گا ——— وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور یکایک وہ مجھ سے جُدا ہو گئی۔ مگر اب میں غور کرتا ہوں اور میں نے اُس وقت نہیں غور کیا تھا کہ وہ اس طرح مُسکرائی تھی جس طرح وہ لوگ مُسکراتے ہیں جو خاموش رہنا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو ڈرتے ہیں کہ کوئی ان کی بات نہیں سمجھے گا ——— امید بھی اُسے تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پوشیدہ تھیں۔ وہ شاذ و نادر ہی میری طرف دیکھتی تھی۔

اجنبی۔ بعض گسانوں نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے اُسے سہ پہر کے وقت دریا کے کنارے سرگرداں دیکھا تھا۔ اُنھوں نے سمجھا کہ وہ پھولوں کی تلاش میں تھی ——— ممکن ہے کہ اس کی موت ———

بوڑھا آدمی۔ کوئی کہہ نہیں سکتا ——— کوئی جان ہی کیا سکتا ہے؟

وہ غالباً اُن لوگوں میں سے تھی۔ جو گفتگو کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہر شخص کے سینے میں اپنے زندہ رہنے کی ایک سے زیادہ دلیلیں پوشیدہ رہتی ہیں ——— تم روح کی گہرائیوں کو اُس طرح نہیں دیکھ سکتے جس طرح تم اس کمرے کے اندر کی چیزوں کو دیکھ سکتے ہو۔ وہ سب یکساں ہیں۔ وہ صرف معمولی باتیں کرتے ہیں۔ اور کوئی خواب بھی نہیں دیکھتا کہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہو۔ جب تم مہینوں تک ایسے شخص کے ساتھ رہتے ہو جسے اب دنیا سے تعلق نہیں باقی رہا۔ اور جس کی روح اس طرف مائل نہیں ہو سکتی۔ تم اُس کو بغیر سوچے ہوئے۔ جواب دیتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کیا ہوتا ہے۔

وہ بے جان ڈھانچوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں اور ان کی روحوں میں بہت سے خیالات گردش کرتے ہیں۔ وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں؟ وہ اُسی طرح رہ سکتی تھی۔ جس طرح دوسرے رہتے ہیں وہ اپنے موت کے دن کہہ سکتی تھی "آج صبح پانی برسے گا" یا ہم کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ تیرہ پر تیرہ آدمی ہوں گے" یا "ابھی پھل نہیں پکا ہے" وہ مسکرا کر ان پھولوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جو مرجھا چکے ہیں۔ اور اندھیرے میں روتے ہیں۔ آسمانی فرشتہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ جو دیکھا جا سکتا تھا۔ اور انسان کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ جب تک معاملہ ہی ملوث ہو جائے ..... کل شام کے وقت وہ روشنی میں اپنی بہنوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اور تم ان سبھوں کو اس طرح نہ دیکھ سکتے اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا.....

میں تو گویا اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں ..... قبل اس کے ہم اس کو سمجھ سکیں ہماری معمولی زندگی میں کوئی نیا واقعہ ہونا چاہیے۔ وہ دن رات تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور تم انھیں حقیقت میں اُس وقت تک نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ وہ اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے الوداع نہ کہہ دیں۔ پھر بھی اُس کی کیسی ننھی اور عجیب و غریب روح ہو گی۔ کیسی ننھی، بے لوث اور گہری روح جو کچھ کہہ سکتی ہو گی۔ جو اُس نے کہا ہو گا اور جو کچھ کر سکی ہو گی۔ جو اُس نے کیا ہو گا۔

اجنبی - دیکھو وہ کمرے کی خاموشی میں مسکرا رہے ہیں.....

بوڑھا آدمی۔ وہ مطلقاً پریشان نہیں ہیں۔ وہ آج اُس کی واپسی کے منتظر نہیں ہیں .....

اجنبی - وہ بے حس و حرکت بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ مگر دیکھو باپ اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتا ہے ....

بوڑھا آدمی۔ وہ اُس بچے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو اپنی ماں کے سینے پر سویا ہوا ہے۔

بوڑھا آدمی۔ وہ اب کپڑے نہیں سی رہی ہیں۔ گہری خاموشی ہے .....

اجنبی - اُنھوں نے سفید ریشم کے رومال کو گرا دیا ہے۔

بوڑھا آدمی۔ وہ بچے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اجنبی۔ وہ نہیں جانتے کہ دوسرے اُنھیں دیکھ رہے ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ ہم پر بھی اُن کی نگاہ ہے۔

اجنبی - اُنھوں نے اپنی نظروں کا رخ اوپر کی طرف کیا ہے۔

بوڑھا آدمی۔ پھر بھی وہ نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اجنبی۔ وہ بظاہر خوش نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی کوئی بات ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا۔

بوڑھا آدمی۔ وہ اپنے کو خطرے کی زد سے باہر سمجھتے انھوں نے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور جھگلوں میں لوہے کی چھڑیں ہیں۔ انھوں نے پرانے مکان کی دیواروں کی مرمت کرا لی ہے۔ اور شاید بلوط کے تینوں دروازوں میں کنڈیاں لگوا دی ہیں انھوں نے ہر اُس ہونے والی بات کو محسوس کر لیا ہے۔

جو محسوس کی جا سکتی ہے۔

اجنبی۔ ابھی یا تھوڑی دیر کے بعد ہم اُن سے ضرور کہہ دیں گے۔ شاید کوئی آجائے اور یکایک کہہ دے۔ جس وقت ہم اُس مردہ لڑکی کے پاس سے چلے تھے تو وہاں پر کسانوں کا مجمع تھا۔ اگر اُن میں سے کوئی آئے اور دروازے پر دستک دے.....

بوڑھا آدمی۔ مارتھا۔ اور میری لاش کی حفاظت کر رہی ہیں۔ کسان درختوں کی شاخوں سے ایک پلنگ تیار کر رہے تھے۔ اور میں نے اپنی بڑی پوتی سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ واپس ہوں تو وہ جلدی سے آکر مجھے خبر کر دے۔ اُس کے آنے تک انتظار کرو۔ وہ میرے ساتھ جائے گی! کاش ہم ان لوگوں کو اس طریقہ سے نہ دیکھ سکے ہوتے! میں نے سمجھا تھا کہ دروازے پر دستک دینے۔ سادگی سے مکان کے اندر داخل ہو جانے اور چند فقروں میں انھیں کہہ دینے کے سوا اور بات ہی کیا ہے؟.....

مگر میں بہت دیر سے انھیں دیکھ رہا ہوں۔ لیمپ کی روشنی میں وہ.....

(میری داخل ہوتی ہے)

میری۔ وہ آرہے ہیں۔ دادا جان۔

بوڑھا آدمی۔ تم ہو! وہ کہاں ہیں؟

میری۔ وہ آخری سڑک کے کنارے ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ وہ چپ چاپ آرہے ہیں۔

میری۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ وہ دھیمی آواز میں کلمات دعا پڑھیں۔ مارتھا اُن لوگوں کے ساتھ ہے۔

بوڑھا آدمی۔ بہت لوگ ہیں، کیا؟

میری۔ ساری بستی کے لوگ جنازے کے پاس ہیں۔ وہ شعلیں لے کر آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ شعلیں گل کر دیں۔

بوڑھا آدمی۔ وہ کس راستے سے آرہے ہیں؟

میری۔ وہ چھوٹے راستوں سے آرہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ اب وقت ہو گیا کہ....

میری۔ آپ نے اُن سے کہہ دیا، دادا جان؟

بوڑھا آدمی۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے اُن سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ وہ ابھی تک لیمپ کی روشنی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھو میری بچی دیکھو! تم دیکھو گی کہ زندگی کیا چیز ہے۔

میری۔ آہ! وہ کس قدر مطمئن نظر آتے ہیں! مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں انھیں خواب میں دیکھ رہی ہوں۔

اجنبی۔ دیکھو! میں نے دونوں بہنوں کو چونکتے ہوئے دیکھا۔

بوڑھا آدمی۔ وہ اُٹھ رہی ہیں.....

اجنبی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دریچوں کے قریب آرہی ہیں۔

(اس وقت ایک بہن پلنگ دریچے کے پاس اور دوسری بہن تیسرے دریچے کے پاس جاتی ہے۔ اپنے ہاتھوں کو شیشوں پر رکھ کر وہ تاریکی پر نظریں جما دیتی ہیں۔)

بوڑھا آدمی۔ درمیانی دریچے کے قریب کوئی نہیں آتی ہے۔

میری۔ وہ باہر کی طرف دیکھ رہی ہیں، وہ کچھ سن رہی ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ بڑی بہن کچھ نہیں دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

اجنبی۔ دوسری بہن کی آنکھوں سے خوف نمایاں ہے۔

بوڑھا آدمی۔ ہوشیار رہو کون جانتا ہے کہ انسان کے ارد گرد کتنی دُور تک روح حلقہ کئے ہوئے ہے

(طویل خاموشی۔ میری۔ بوڑھے کے سینے سے چمٹ جاتی ہے اور اس کا بوسہ لیتی ہے)

میری۔ داداجان۔

بوڑھا آدمی۔ آنسو نہ بہاؤ، میری بچی۔ ہماری باری بھی آئے گی۔

(وقفہ)

اجنبی۔ وہ نظریں جمائے ہوئے ہیں.....

بوڑھا آدمی۔ غریب ہستیاں! وہ کچھ بھی نہیں دیکھینگی اگر وہ سو ہزار سال تک بھی دیکھتی رہیں۔ رات بہت اندھیری ہے۔ وہ ادھر دیکھ رہی ہیں اور مصیبت اُدھر سے آرہی ہے۔

اجنبی۔ یہ اچھا ہے کہ وہ اس طرف دیکھ رہی ہیں۔ کوئی چیز جسے یہ پہچانتا نہیں۔ میدان کی طرف سے ادھر آرہی ہے۔

میری۔ یہ لوگوں کا مجمع ہے۔ وہ سب بہت دور ہیں۔ اس لئے ہم انھیں صاف نہیں دیکھ سکتے۔

اجنبی۔ وہ راستے کے پیچ وخم پر قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔ چاندنی میں پھر وہ نظر کے سامنے آگئے۔

میری۔ وہ کتنی کثیر تعداد میں نظر آرہے ہیں۔ جب میں آرہی تھی اُسی وقت شہر کے اطراف وجوانب سے لوگ آرہے تھے..... وہ بہت پر پیچ راستے سے آرہے ہیں۔

بوڑھا آدمی۔ پھر بھی آخرکار وہ پہنچ ہی جائیں گے۔۔

میں بھی انھیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ میدان سے گزر رہے ہیں۔ وہ اسقدر چھوٹے نظر آتے ہیں کہ سبزہ زار میں اور اُن میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ تم یہ تصور کرسکتی ہو کہ وہ بچے ہیں جو چاندنی رات میں کھیل رہے ہیں۔ اگر وہ لڑکیاں انھیں دیکھیں تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھیں۔ جہاں تک اُن کا جی چاہے وہ بے خبر رہیں۔ مگر مصیبت قدم بہ قدم قریب آرہی ہے۔ اور گزشتہ دو گھنٹوں میں بڑھتی ہی گئی ہے۔ وہ اسے ٹھہرنے کا حکم نہیں دے سکتیں۔ اور جو اُسے لا رہے ہیں۔ اُس کو روکنے سے قاصر ہیں۔ مصیبت نے اُن پر بھی قابو پالیا ہے۔ اور اب انھیں اُس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ وہ اپنی منزل سے واقف ہے اور اُسی طرف گام زن ہے مصیبت اَن تھک ہے اور اُس کا ایک ہی مقصد ہے انھیں اپنی پوری طاقت سے اُس کی مدد کرنی ہوگی۔ وہ منحوس ہے مگر وہ قریب تر آرہے ہیں۔ ان کے دلوں میں رحم ہے۔ مگر انھیں مجبوراً آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے۔

میری۔ بڑی بہن نے اب مسکرانا ختم کردیا ہے۔ داداجان!

اجنبی۔ وہ دریچے کے پاس سے ہٹ رہی ہے۔

میری۔ وہ اپنی ماں کے بوسے لے رہی ہے۔

اجنبی۔ بڑی بہن بچے کے بالوں پر بغیر اس کو جھکائے

ہاتھ ہمیشہ رہی ہے۔

میری۔ آہ! باپ بھی چاہتا ہے کہ وہ اس کا بوسہ لیں۔

اجنبی۔ اب خاموشی ہے.....

میری۔ وہ اپنی ماں کے پہلو میں واپس آگئی ہیں۔

اجنبی۔ اور باپ اپنی نظریں گھڑی کے رقاص پر جمائے ہوئے ہے۔

میری۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر سمجھے ہوئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ عبادت میں مشغول ہیں۔

اجنبی۔ غالباً وہ اپنی روحوں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

(وقفہ)

میری۔ اِن سے آج رات کو نہ کہیے دادا جان!

بوڑھا آدمی۔ دیکھو اب تم بھی ہمت ہار رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ تمہیں اُن کی طرف نہ دیکھنا چاہیے تھا۔ میرا سن تراسی سال کا ہے۔ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے زندگی کی حقیقت کو سمجھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں مجھے عجیب و غریب کیوں معلوم ہوتا ہے۔ وہ روشنی میں بیٹھے ہوئے کس سادگی سے رات کا انتظار کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم اپنے گھروں کے اندر انتظار کرتے ہیں۔ اور پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اُنھیں دوسری دنیا کی بلندی سے دیکھ رہا ہوں، کیونکہ میں ایک بات جانتا ہوں جو وہ ابتک نہیں جانتے ہیں۔ میرا خیال صحیح ہے میری بچی؟ بتاؤ کہ تم بھی اسقدر زرد کیوں ہو گئیں؟ شائد کوئی بات ایسی ہے جسے ہم الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتے اور جو ہمیں رُلا دیتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ زندگی میں کوئی چیز اس قدر غم انگیز بھی ہوتی ہے۔ یا یہ کہ وہ اُن لوگوں کو خوف زدہ کر سکتی ہے۔ جو اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر کچھ نہ بھی ہوا تھا۔ جب بھی میں انھیں اسقدر سکون کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ کر ڈر جاتا۔ انھیں اس دنیا پر بہت زیادہ بھروسا ہے۔ وہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے اور دشمن کے درمیان صرف شیشے کے پردے حائل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ چونکہ انھوں نے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے روح کے اندر ہوتا ہے۔ اور اُن کے دروازے پر ہی دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہیں اور وہ خواب میں بھی نہیں دیکھتے کہ بہت سے دوسرے لوگ، زندگی سے اُن کی بہ نسبت زیادہ واقف ہیں۔ اور یہ کہ میں غریب بوڑھا آدمی۔ اُن کے دروازے سے دو قدم پر کھڑا اُن کی خوشی کو اپنے ضعیف ہاتھوں کی ہتھیلی میں ایک مجروح چڑیا کی طرح دبائے ہوئے ہوں اور اپنی مٹھیوں کو کھولنے کی ہمت نہیں کر سکتا.....

میری۔ اُن پر رحم کیجیے، دادا جان!

بوڑھا آدمی۔ ہم اُن پر رحم کرتے ہیں۔ میری بچی۔ مگر ہم پر کوئی رحم نہیں کرتا۔

میری۔ اُن سے کل کہیے گا دادا جان! روشنی ہو جانے پر ان سے کہیے گا تو وہ اس قدر مغموم نہ ہوں گے۔

بوڑھا آدمی۔ میری بچی! غالباً تمہارا خیال صحیح ہے۔ رات بھر اس معاملے کو اسی طرح، ہتے دینا بہتر ہوگا۔ دن کی روشنی مصیبت کا تریاق ہے .....

مگر وہ کل ہم سے کیا کہیں گے۔؟ بدقسمتی لوگوں کو حاسد بنا دیتی ہے۔ جن پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ اجنبیوں کی موجودگی میں اس کی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے نامعلوم ہاتھوں میں چھوڑ دینا نہیں چاہتے۔ بظاہر انھیں یہ محسوس ہوگا کہ ہم نے اُن سے کوئی چیز چھین لی ہے۔

اجنبی۔ اس کے علاوہ اب وقت گذر چکا۔ میں عاؤں کی آواز سن رہا ہوں۔

میری۔ وہ آ پہنچے۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے گزر رہے ہیں۔

(مارتھا داخل ہوتی ہے)

مارتھا۔ میں آگئی میں نے یہاں تک اُن کی رہبری کی میں نے اُن سے سڑک پر ٹھہرنے کے لیے کہا۔

(بچوں کا شور و غوغا سنائی دیتا ہے)

آہ بچے اب تک رو رہے ہیں۔ میں نے انھیں منع کر دیا تھا۔ کہ وہ نہ آئیں۔ مگر وہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور اُن کی مائیں میرا حکم نہیں مانتیں۔ میں جاؤنگی اور انھیں کہہ دوں گی۔ نہیں۔ اب اُنھوں نے چیخنا چھوڑ دیا ہے۔ سب کچھ تیار ہے؟۔ میں وہ چھوٹی انگوٹھی لیتی آئی ہوں۔ جو اُس کے پاس تھی۔ بچے کے لیے پھل بھی لائی ہوں۔ میں نے فوراً اُسے آرام کرنے کے لیے تختے پر لٹایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو رہی ہے۔ اُس کے بالوں نے مجھے بہت پریشان کیا۔ میں انھیں سلجھا نہ سکی۔ میں نے اُن سے مارگریت کے پھول جمع کرنے کے لیے کہا۔ افسوس ہے کہ اور قسم کے پھول نہ مل سکے۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ اُس کے پاس کیوں نہیں ہیں؟ (وہ دریچوں کی طرف دیکھتی ہے) وہ وُد نہیں رہے ہیں! اوہ..... آپ نے اُن سے نہیں کہا، !۔

بوڑھا آدمی۔ مارتھا! تمہاری روح زندگی سے معمور ہے تم نہیں سمجھ سکتیں.....

مارتھا۔ میں کیوں نہیں سمجھ سکتی (وقفے کے بعد سنجیدہ شکایت کے لہجے میں) آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ دادا جان۔

بوڑھا آدمی۔ مارتھا تم نہیں جانتیں.....

مارتھا۔ میں جاکر ان سے کہہ دوں گی۔

بوڑھا آدمی۔ تھوڑی دیر کے لیے یہیں پر ٹھہر جاؤ۔ میری بچی۔

مارتھا۔ آہ مجھے اُن پر کس قدر رحم آتا ہے۔ اب انھیں بے خبر نہیں رکھنا چاہیے۔

بوڑھا آدمی۔ کیوں نہیں؟

مارتھا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کیوں نہیں۔ مگر اب یہ ممکن نہیں!

بوڑھا آدمی۔ یہاں آؤ میری بچی .....

مارتھا۔ وہ کس قدر صابر ہیں!

بوڑھا آدمی۔ یہاں آؤ میری بچی

مارتھا۔ (اُس کی طرف مڑکر) آپ کہاں ہیں دادا جان! میں بہت افسردہ ہوں۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکتی ہوں میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

بوڑھا آدمی۔ اُدھر نہ دیکھو جب تک کہ وہ سب کچھ جان جائیں.....

مارتھا۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ ا.....

بوڑھا آدمی۔ نہیں مارتھا۔ یہیں پر ٹھہرو۔ اپنی بہن کے ساتھ پتھر کے اس پُرانے بنچ پر مکان کی دیوار سے ٹیک کر بیٹھو۔ اور اُدھر دیکھو نہیں تم بہت کم سن ہو۔ تم کبھی اس واقعے کو بھول نہ سکو گی۔ تم نہیں جانتیں کہ انسان کا چہرہ کیسا ہوتا ہے۔ جب اُس کی آنکھوں میں موت کا گزر ہوتا ہے۔ شائد وہ بھی رونے لگیں گے..... اُدھر مڑکر نہ دیکھو۔ شائد کوئی آواز ہی نہ ہو۔ اگر کوئی آواز نہ ہو تو اس کا لحاظ رکھو کہ تم اُدھر مڑکر نہ دیکھو۔ کسی کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی کہ غم کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ روح کی گہرائیوں سے چند سسکیاں نکلیں گی۔ اور بس۔ میں خود نہیں جانتا کہ جب میں اُن کی آوازیں سنوں گا تو کیا کروں گا۔ وہ اس دنیا کی ہستیاں نہیں ہیں۔ میری بچی۔ میرے جانے کے قبل میرا بوسہ لے لو۔

(دعا کی آواز بہ تدریج قریب تر آگئی۔ مجمع کا ایک حصہ باغ میں آجاتا ہے۔ کانا پھوسی اور دبے پاؤں چلنے کی آواز آتی ہے۔)

اجنبی۔ (مجمع سے) یہیں ٹھہرو۔ دریچے کے قریب نہ جاؤ۔ وہ کہاں ہیں۔

ایک کسان۔ کون؟

اجنبی۔ اور لوگ۔ جنازہ اُٹھانے والے۔

کسان۔ وہ اس راستے سے آرہے ہیں۔ جو دروازے تک گیا ہے۔

(بوڑھا آدمی چلا جاتا ہے۔ مارتھا اور میری اپنی بیٹھ دریچوں کی طرف کرکے بنچ پر بیٹھ گئی ہیں۔ مجمع میں کانا پھوسی کی دھیمی آواز سُنائی دیتی ہے)

اجنبی۔ ہش۔ بولو نہیں۔

(کمرے کے اندر دونوں بہنوں میں جو زیادہ لمبی ہے وہ دروازے تک جاتی ہے اور کھٹکا لگا دیتی ہے۔)

مارتھا۔ وہ دروازہ کھول رہی ہے۔

اجنبی۔ نہیں بلکہ اسے بند کر رہی ہے،

(وقفہ)

مارتھا۔ دادا جان کمرے کے اندر داخل نہیں ہوئے ہیں۔

اجنبی۔ نہیں پھر وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہے۔ لوگ حرکت نہیں کر رہے ہیں۔ اور بچہ ابھی تک سویا ہوا ہے۔

(وقفہ)

مارتھا۔ میری ننھی بہن۔ ہاتھ میری طرف بڑھاؤ۔

میری۔ مارتھا!

(وہ ایک دوسرے کا پیار کرتی ہیں۔ اور بوسہ لیتی ہیں۔)

اجنبی۔ اُس نے دستک دے دی ہوگی۔ ان بچوں نے اپنے سر بہ یک وقت اُٹھائے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

مارتھا۔ آہ۔ آہ میری ننھی بہن۔ میں بھی مشکل سے گریہ وزاری کو روک سکتی ہوں۔

(وہ اپنی بہن کے شانے پر سر رکھ کر سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہیں۔)

اجنبی۔ اس نے پھر دستک دی ہوگی۔ باپ گھڑی دیکھ رہا ہے۔ وہ اُٹھتا ہے .....

مارتھا۔ بہن بہن۔ مجھے بھی اندر جانا چاہیے۔ اُنھیں اکیلے چھوڑنا نہیں چاہیے۔

میری۔ مارتھا۔ مارتھا۔

(مارتھا کو روک لیتی ہے)

اجنبی۔ باپ دروازے کے قریب ہے۔ وہ کھٹکے کو اُٹھا رہا ہے۔ وہ اُسے ہوشیاری سے کھول رہا ہے۔

مارتھا۔ اوہ۔ تم نہیں دیکھتے .....

اجنبی۔ کیا ؟

مارتھا جنازہ لانے والے .....

اجنبی۔ اُس نے دروازے کا صرف ایک حصہ کھولا ہے۔ سوائے میدان کے ایک ٹکڑے اور چشمے کے یں اور کچھ نہیں دیکھتا ہوں۔ وہ اپنا ہاتھ دروازے پر رکھتا ہے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے۔ وہ غالباً کہہ رہا ہے "آہ یہ تم ہو" وہ اپنے بازو اُٹھاتا ہے۔ وہ پھر ہوشیاری سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔ تمہارا دادا کمرے کے اندر داخل ہو گیا ہے۔

(مجمع در پیچے کے قریب آ گیا ہے)

مارتھا اور میری اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہتی ہیں۔ پھر اُٹھ جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے قریب سٹی ہوئی مجمع کے ساتھ در پیچے کے قریب جاتی ہیں۔ بوڑھا آدمی کمرے کے اندر آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دونوں بہنیں اُٹھتی ہیں۔ ماں بھی اُٹھتی ہے اور بچے کو ہوشیاری سے اُس آرام کرسی پر لٹا دیتی ہے جس پر سے وہ اُٹھتی ہے۔ اس طرح کہ باہر سے بچہ کمرے کے بیچ میں سویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا سر ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ ماں بوڑھے آدمی سے ملنے کے لیے آگے بڑھتی ہے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی ہے مگر قبل اس کے کہ وہ اُس سے ہاتھ ملا سکے، اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتی ہے۔ ایک لڑکی اس کا لبادہ اُتارنا چاہتی ہے۔ اور دوسری اس کو ایک آرام کرسی پیش کرتی ہے۔ مگر بوڑھا آدمی اشارے سے انکار کرتا ہے۔ باپ اظہار تعجب کے ساتھ مسکراتا ہے بوڑھا آدمی در پچوں کی طرف دیکھتا ہے۔)

اجنبی۔ وہ اُن سے کہنے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔

(مجمع میں دبی آوازیں)

اجنبی۔ ہش۔

(بوڑھا آدمی در پچے کے باہر لوگوں کو دیکھ کر جلدی سے اپنا منہ ادھر سے پھیر لیتا ہے۔ چونکہ لڑکی اب تک اس سے آرام کرسی پر بیٹھنے کی کوشش

کر رہی ہے۔ وہ آخر کار بیٹھ جاتا ہے اور دایاں ہاتھ چند دفعہ اپنی پیشانی پر گھماتا ہے)

اجنبی۔ وہ بیٹھ رہا ہے .....

(کمرے کے اندر جو لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عرصے میں باپ بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آخر کار بوڑھا آدمی بولتا ہے اور اس کی آواز ان لوگوں کو متوجہ کر دیتی ہے۔ لیکن باپ اس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے۔ بوڑھا آدمی پھر بولنا شروع کرتا ہے۔ اور بہ تدریج سب لوگ احساس خوف سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ یکایک ماں چونکتی ہے اور کھڑی ہو جاتی ہے)

مارتھا۔ اُف! ماں سمجھنے لگی ہے!

(وہ اس طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔ مجمع میں پھر بھنبھناہٹ شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں۔ بچے روتے ہیں کہ انھیں اوپر اوٹھا لیا جائے تاکہ وہ بھی دیکھ سکیں۔ بہت سی مائیں ایسا ہی کرتی ہیں جیسا کہ بچے چاہتے ہیں۔)

اجنبی۔ ہش! اُس نے اُن سے ابھی نہیں کہا ہے.....

(ماں بوڑھے آدمی سے بہ قراری میں سوالات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ چند الفاظ اور کہتا ہے۔ تب یکایک سب کے سب اُٹھتے ہیں۔ اور اس سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سر کو آہستہ سے ہلا کر اثبات کا اشارا کرتا ہے۔)

اجنبی۔ اُس نے اُن سے کہہ دیا۔ ہمّن نے اُن سے یکایک کہہ دیا مجمع کی آوازیں۔ اُس نے اُن سے کہہ دیا! اُس نے اُن سے کہہ دیا

اجنبی۔ میں کچھ بھی نہیں سُن رہا ہوں۔

(بوڑھا آدمی بھی اُٹھتا ہے اور بغیر اُس طرف دیکھے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو اس کے پیچھے ہے۔ ماں باپ اور دونوں لڑکیاں دروازے کی طرف دوڑتی ہیں۔ دروازہ کھولنے میں باپ کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ بوڑھا آدمی ماں کو باہر جانے سے روکنا چاہتا ہے)

مجمع کی آوازیں۔ وہ باہر نکل رہے ہیں! وہ باہر نکل رہے ہیں!

(باغ میں۔ مجمع کے اندر ہل چل۔ سوائے اجنبی کے، جو دریچوں کے قریب کھڑا رہتا ہے، سب لوگ مکان کی دوسری جانب جاتے ہیں۔ اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ کمرے کے اندر مرنے والا دروازہ آخر کار باہر کھل جاتا ہے۔ سب لوگ ایک ساتھ باہر نکل جاتے ہیں۔ سامنے تاروں بھرا آسمان، میدان اور چشمہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ جو کمرہ کے بیچ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ آرام کرسی پر چین سے سویا رہتا ہے۔ تھوڑا وقفہ)

اجنبی۔ بچہ نہیں جاگا۔!

(وہ بھی چلا جاتا ہے)

نظم

شکست پسند

از پریم پجاری

پھر فصلِ برشگال
مخمور سی مسرت
ذوقِ نظر کو دعوت
ہر گوشۂ چمن ہے
رنگینیاں فضا میں
دل گد گدا رہا ہے
کافور سی گھٹا ہے
پھولوں کی انجمن میں
جھولے میں جلوہ فرما
یہ نازشِ تمنا
یا بُنبشِ حسیں ہیں
فطرت نے جبکہ چاہا
انوارِ صبح لے کر
موسیقی حزیں ہیں
جب یہ تمام اجزا
کس کی مجال دیکھے
سیمائے صاف و روشن
ماتھے پہ سُرخ بندی
ہلتے ہیں جھولنے میں
یہ اُکھڑیاں خدایا
آفاق کی نظر ہیں

شاطرِ جہاں ہے
ہر شے پہ چھا رہی ہے
دیتے ہیں سبزہ و گل
قوسِ قزح کا دامن
تحلیل ہو گئی ہیں
یہ رنگ و بو کا عالم
دن اسقدر سُہانا
اک گُل نیا کھلا ہے
اک حُسن کی جوانی
لیتی ہے جبکہ جھونکا
گہوارہ حُسن کا ہے
اک معجزہ دکھانا
کچھ بجلیاں ملائیں
شامل کیا تبسم
باہم ہوئے مرکب
اس کو نگاہ بھر کے
سجدہ گہہ نظر ہے
گردن میں سبزہ مالا
اس طرح گوشوارے
کس قہر کی حسیں ہیں
تسخیر ہیں یہ آنکھیں

پھر پیکرِ جمالی
رعنا عروسِ فطرت
عہدِ نیاز و الفت
ہر تختۂ سمن ہے
مخمور یاں ہوا میں
آنکھوں میں چھا رہا ہے
نیرنگ سے کسی نے
اک گوشۂ چمن میں
نظارہ سوز جلوہ
اُڑتی ہوئی پری کا
پروازِ اوّلیں میں
اچھی طرح ٹٹولا
پھر بخیتوں میں بکسر
شعریتِ حسیں میں
تب یہ حسین فتنہ
گر بے خیال دیکھے
سادہ بیاضِ گردوں
وُہ زہرہ فلک سی
جس طرح جھلملائیں
کاجل نہیں لگایا
تقدیر ہیں یہ آنکھیں

یہ تیرہ خاکداں ہے
پھر سُکرا رہی ہے
لیتے ہیں سبزہ و گل
صد ماہتاب خرمن
تب دیل ہو گئی ہیں
جام و سُبو کا عالم
رو کی ہے صبح گویا
جھولا پڑا ہوا ہے
بُرہان لن ترانی
ہوتا ہے اسپہ دھوکا
طیارہ حُسن کا ہے
اپنا ہر اک ترانا
رنگینیاں بسائیں
داخل کیا ترنم
ان سے ہوا مرتب
رہ جائے آہ بھر کے
اک خندۂ سحر ہے
گُردِ قمر یہ بالا
وقتِ سحر ستارے
ایسے ہی سرمگیں ہیں
تقدیر ہیں یہ آنکھیں

بس کہر بائیت کی جادو ہے نام ان کا
بیتاب دلوں کے یا یہ فرازِ سینہ
یا حسنِ شرمگیں تھا الفاظ و حرفِ سینہ
یہ ولولہ نہیں ہے ہلکی سی اک اُداسی

نغمہ یہ آنکھیں روح نسائیت کی
کہتے ہیں موہنی بھی شغل مدام ان کا
شاید اسی سبب سے ناز شباب بھی
پس یہ اُٹھان گویا ایں ہست علم سینہ
سنگست و آگینہ غم بھولتا نہیں ہے
چہرے سے آشکارا ہے دل کی ترجمانی

تصویر ہیں یہ آنکھیں افسوں بھی رہزنی بھی
سینہ اُبھر گیا ہے راز شباب سمجھو
ہے شانِ خود نمائی گنجد نہ در سفینہ
غم کو بھلا رہی ہے یہ دلگداز نغمہ

"نغمہ"

بھیگی ہوئی ہوائیں چھریاں سی چل رہی ہیں
اک دل نشیں ادا سے کوئل کا کوک اُٹھنا
شبہائے تار و تنہا باکار کر رہی ہوں
تم آؤ گے تو کچھ بھی تم سے نہیں کہوں گی
اللہ کیا کہوں میں الفت کی پیرہ دستی
تنہائیوں نے لوٹا سامانِ دلنوازی
بدلا ہے عاجزی سے آئینِ خود پسندی
اب میں خفا نہیں ہوں اور روٹھ جانے والے

فریاد کی صدائیں دل سے نکل رہی ہیں
اس نشتریں صدا سے یاں دل میں ہوک اُٹھنا
اک موتیوں کی مالا تیار کر رہی ہوں
یہ ہار میں تمہاری گردن میں ڈالوں گی
غائب پرست ہوں میں غائب ہے خود پرستی
مدت ہوئی کہ ٹوٹا پندار بے نیازی
اس وقت کوئی دیکھے میری نیاز مندی
آؤ تو مجھے منالے میں تجھے منالوں

مقالات:۔

(۱) سال وفات آبرو۔ از قاضی عبدالودود
(۲) دیوان جوشش۔ از قاضی عبدالودود
(۳) دریائے لطافت۔ از قاضی عبدالودود
(۴) میتر لنک کے خاموش ڈرامے۔ از آرزو جلیلی

سال وفات آبرو

از قاضی عبدالودود

آبرو کے معاصر اور قریب العصر مصنفین[1] کے لکھے ہوئے شعرائے اُردو کے جو تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ آبرو کے سال وفات کی تعیین سے قاصر ہیں، زیادہ سے زیادہ جو ان تذکروں سے معلوم ہو سکتا ہے یہ ہے کہ آبرو محمد شاہ[2] کے شاعر تھے، اور اس بادشاہ کے زمانۂ حکومت کے ختم ہونے سے قبل ہی سفر آخرت اختیار[3] کر چکے تھے، یہی وجہ تھی کہ اشپرنگر[4] آبرو کے سال وفات کی تعیین کی کوشش نہیں کی، اور ان کے زمانۂ حیات کی انتہائی حد متعین کرنے پر قانع رہا۔ دتاسی[5] کو بھی اس سے زیادہ کامیابی نہ ہو سکی، لیکن، المانی فہرست نگار اور فرانسیسی مورخ کے جو یہاں کمی رہ گئی تھی، وہ ایک انگریز قاموس نگار، بیل[6] نے پوری کر دی، ۱۱۹۱ھ کو جو اشپرنگر کے نزدیک آبرو کے زمانۂ حیات کی انتہائی حد سے زیادہ نہ تھا، آبرو کا سالِ وفات

---

[1] یعنی زمانۂ محمد شاہ، واحد شاہ، و عالمگیر ثانی و شاہ عالم کے مصنفین قلمی کتابوں کے ساتھ اگر کتب خانے کا نام نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ کتب خانۂ مشرقی بانکی پور کی ہیں [2] نکات الشعرا میر ص ۹ "غرض مستغنی وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ باشد [3] گلزار ابراہیم قلمی "بعہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ، رحلت نمود [4] فہرست ص ۱۹۶ اشپرنگر نے اپنی فہرست کتب خانۂ شاہان اودھ کے ساتھ ۱۴ تذکروں کا خلاصہ بھی شائع کیا ہے۔ وہ تذکرے حسب ذیل ہیں۔ مخزن نکات قائم، نکات الشعرا میر، تذکرہ گردیزی۔ تذکرہ شورش، گلزار ابراہیم خلیل، تذکرہ ہندی مصحفی، تذکرہ عشقی، تذکرۂ سرور،

قرار دے دیا۔ بیل کے ماخذوں کا یہی صحیح علم نہیں، لیکن اتنا یقینی ہے کہ نکات الشعراء اور ذکر میر کے مطالعے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا، ورنہ اسے یہ معلوم ہوتا کہ آبرو[۵۴] میر کے دہلی آنے سے قبل وفات پا چکے تھے، اور میر ۱۱۵۳ھ[۵۵] اور ۱۱۵۵ھ کے درمیان دہلی آئے ہیں، بیل کی غلطی پر تو چنداں تعجب نہیں، یہ کچھ ممکن ہے کہ محض سہواً ۱۱۶۱ھ کے قبل لکھنے کی جگہ ۱۱۶۱ھ لکھ گیا ہو، لیکن حیرت یہ ہے کہ ہمارے عہد کے مصنفین شکیب[۵۶]، فطامی[۵۷] اور سیلی[۵۸] نے بلا تامل بیل کے قول کو قبول کر لیا، اشپرنگر[۵۹] اور بیل کے بیانات میں جو اختلاف ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی، بیل کے قول کو غلط ثابت کر دینے اور آبرو کے زمانۂ حیات کی آخری حد کو ۱۱۵۵ھ تک پہنچا دینے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس سے آگے بڑھ کر آبرو کے سال وفات کی تعیین کر سکتے ہیں یا نہیں، حسن اتفاق سے یہ بہ آسانی ممکن ہے، اور شعرائے اردو کے تذکروں میں جو بات نہ حل سکی تھی وہ شعرائے فارسی کے تذکروں میں حل ہو سکتی ہے، ان تذکروں میں سب سے پہلے تذکرۂ خوشگو[۶۰] کا نام لینا چاہیے، اس کا مصنف آبرو کا دوست اور خویش تھا، اور اس کا بیان ذاتی علم پر مبنی ہے، ذیل میں ہم بجنسہٖ آبرو کا ترجمہ تذکرۂ خوشگو سے کر درج کرتے ہیں اس سے صحیح تاریخ وفات معلوم ہونے کے علاوہ آبرو کے متعلق اور قیمتی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، خوشگو کے بعد لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ گل رعنا[۶۱] میں، اور علی ابراہیم نے صحف ابراہیم[۶۲] میں آبرو کا سال وفات درج کیا ہے، یہ بادر کرنے کی قوی وجہ موجود ہے کہ ان دونوں کا بیان خوشگو سے ماخوذ ہے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ آبرو کے معاصر اور قریب العہد مصنفین نے شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے ہیں، وہ آبرو کے سال وفات کی تعیین نہیں کرتے، اور یہ صحیح بھی ہے، لیکن عہد اکبر ثانی کے

گلشن ہند لطف، تذکرۂ عشق میر علی، مجموعۂ نغز قائم، عیار الشعراء، گلشن بیخار شیفتہ، گلشن بے خزاں باطن،

۵۵ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی طبع دوم، جلد اول ص ۱۰۰ متعدد قدیم تذکرے جن کے حوالے دتاسی نے دیے ہیں، وہ ان کے لیے اشپرنگر کا ممنون ہے، لیکن اس سے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا ماخذ صرف اشپرنگر ہی ہے۔ بہت سی کتابیں، سرکاری ریویوز، کتب خانوں کی فہرستیں جو فہرست اشپرنگر کے بعد شائع ہوئی ہیں دتاسی کے پیش نظر تھیں، اور بعض قدیم تذکروں تک بھی جن کے مطالعے سے اشپرنگر محروم رہا تھا، اس کی رسائی تھی، مثلاً مسرت افزا، مجمع الانتخاب اور دیوان جہاں

۵۶ اردو نیشنل یا یونیورسٹی کل و کشنری طبع ۱۸۹۴ ص ۱۵ و ۵۸ نکات الشعراء ص ۹ "می گویند کہ طبیعے شوخ داشت"

اگر میر کو خود آبرو سے ملنے کا موقع ملا ہوتا تو بھلے کو "می گویند" شروع نہ کرتے، آبرو، آبرو کے قریبی رشتہ دار اور استاد تھے، میر صاحب آبرو کے گھر میں مقیم اور ان کی بہن کے سوتیلے بیٹے تھے، اگر آبرو بقید حیات ہوتے تو میر کو ان سے ملنے کا موقع ضرور ملتا

۵۸ ذکر میر ص ۹۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امیر الامرا، صمصام الدولہ خان دوراں کے میدان جنگ میں مقتول ہونے کے بعد دہلی آئے ہیں، صمصام الدولہ نادر شاہ سے لڑتے ہوئے ۱۱۵۱ھ میں مارے گئے ہیں، نکات الشعراء ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ترجمہ عارف علی خاں عاجز "وہ دو آزدہ سال شدہ باشد کہ در شاہجہاں آباد تشریف داشت، بندہ شور اوشنیدہ بودم"

ایک ہفت وتذکرہ نگار خیراتی لال بیجگوتھلص نے گل، حنا کے حوالے سے آبرو کا سال وفات دیا ہے، اور اپنی طرف سے قطعہ تاریخ کا بھی اضافہ کیا ہے، مادہ تاریخ "مرد را آبرو کو" ہے، ٹھیک ۱۱۴۵ھ نکلتے ہیں، ترجمہ "آبرو مقتول" تذکرہ خوشگو ...

"آبرو از پیرزادگان گوالیار بود، از شاگردی جناب سراج الدین علی خاں صاحب آرزو بہایۂ معنی" رسیدہ۔ غیر طبع بلند داشت، لیکن در ریختہ گوئی کہ زبان ہندی بایارسی می آمیزد مطرف تمام بود" چنانچہ مرام دیگر، ریختہ صائب وقتیل می خواندند، دیوانے ضخیم وخوب ومازہ ازیں عالم جمع کردہ، فقیر ایں نقرہ نثر، تعریف او گفتہ، ہر رویش خواندہ بود م، ریختہ آبرو آبروئے شعر ریختہ! بر فقیر بسیار مہربانی می فرمود، اکثر بہ دیرانہ قدم نجدمی نمود وشبہا می ماند، در شعر فارسی ہم زبان درست داشت۔ بست وچہارم، جب سال ہزار وصد وچہل وششم ہجرت حق پیوست۔ نزدیک مزار سید حسن، رسول نما واقع شاہ جہان آباد مدفون گشت۔ ایں سہ بیت، خط خود، بہ مشاعرہ در سفینۂ فقیر نوشتہ بود۔

نگہ بچشمہ تو دارم تا کے دل ما	گرمی بروز کنم ہم چو جام مے دل ما
بجائے نالہ ہمہ نغمہ خیز از لب وے	بہ بوئے بنوازی اگر چو نے دل ما
ساختم شب بر آرزوئے شراب	چوں سبوئے تہی بہ بوئے شراب

نکات الشعرا کا سال تکمیل ۱۱۶۵ھ ہے، اس سے دس سال قبل ۱۱۵۵ھ اور بارہ سال قبل ۱۱۵۳ھ ہوگا۔ خواہ بصورت خواہ دو صورت، یہ ثابت ہوگیا کہ ۱۱۶۱ھ آبرو کا سال وفات نہیں ہوسکتا۔ ۵۹ تاریخ ادبیات اردو ص ۴۰۹ تا ۴۱۰ مکتبہ ۔ ہجری سن ۱۱۶۰ھ اور عیسوی ۱۷۴۵ء یا ہے، حالانکہ ۱۷۵۰ء، ۱۱۶۰ھ کے مطابق ہیں۔ ۶۰ فانوس الشاعر طبع اول ۶۱ حاشیے کا آخری حصہ دیکھئے ۶۲ آرزو کا شاگرد تھا، تذکرہ ہائے بارہویں صدی کے عشر وششم میں کمل ہوا، قلمی نسخہ کتبخانہ مشرقیہ باکی پور میں ہے۔ ۶۳ قلمی نسخہ ۶۴ جلد اول قلمی، ۶۵ یہ عنایت کیا ب تذکرہ ہے، اس کے ایک ہی نسخے کا پتا چلا ہے جو فقیر ہند لندن میں موجود ہے۔ ملہا، نے اپنی فہرست مخطوطات اردو وفقیر ہند کے ص پر اس کا ذکر کیا ہے، لیکن تذکرے کو نظر نگاہ سے نہ دیکھنے کی وجہ سے اسے مصنف کا نام نہ معلوم ہو سکا۔ اس تذکرے کے ۴ ماخذ دں کا راقم کو پتا چلا تھا، تذکرہ ہندی مصحفی، تذکرۂ گل وحنا، نشتر عشق، اور تذکرہ عشق سرخوشی۔

۶۶ یہی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں سال وفات ۱۱۷۰ھ لکھا ہے جو ۱۱۶۰ کے مطابق ہے۔

دیوان جوشش

از قاضی عبدالودود

مصنف، تذکروں[1] میں جوشش تخلص کے دو شاعروں کا ذکر ہے، ایک کا نام محمد روشن لکھا ہے اور دوسرے کا محمد عابد۔ یہ تذکرہ نگاروں کی غلطی ہے، محمد عابد جوشش کے برادر اعیانی کا نام تھا، یہ بھی اچھے شاعر تھے، اور دل تخلص کرتے تھے، محمد روشن جوشش کے بعض شعر بھی ارباب[2] تذکرہ نے دل کی طرف منسوب کر دیے ہیں، اور وہ دیوان جوشش میں موجود ہیں۔ کاتب دیوان نے کتاب کے ایک سادہ صفحے میں مصنف کا نام روشن علی بھی لکھا ہے، اس کی سند اس وقت تک تذکرہ حسن کے سوا کسی اور تذکرے میں نہیں ملی۔ علی ابراہیم خلیل، اور محمد وجیہ الدین عشقی نے محمد روشن کے علاوہ کوئی اور نام نہیں بتایا، میر حسن نے بھی جوشش کے ترجمے میں محمد روشن ہی نام لکھا ہے، محمد عابد دل کے ترجمے میں ضمناً جوشش کا ذکر آیا ہے تو البتہ ان کا نام میاں روشن علی بتایا ہے۔ دیوان سے مصنف کے حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے ایک قطعہ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۱۶ھ تک ضرور زندہ تھے، یہ بھی حال لکھتا ہے کہ بہت آسودہ حال نہ تھے اور اہل دول کے سامنے دست طلب دراز کرنے میں انھیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، ایک بازکاری جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ معاصرین میں ثروت، بسمل اور خدوی (غالباً مفتی غلام مخدوم پھلواروی، وجیہ، علی ساکن پٹنا، اور محمد علی دہلوی) کے مصرعوں کو غزل کے مقطعوں میں داخل کیا ہے۔

مصرع ثروت نے جوشش مست دیوانہ کیا — دشت دشت و بیشہ بیشہ شیشہ شیشہ شراب

مصرع بسمل پہ جوشش ایک مرتے ہیں ہمیں — ورنہ یاں کس کو نہیں ہے اپنی اپنی جاں عزیز

نقش دل پر مصرع خدوی ہے جوشش جوں نگیں — اب نکلنا خوشش نہیں آسا کہیں ٹھہرے مجھے

کاتب اور زمانۂ کتابت۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے "تمام شد بتاریخ چہارد ہم شہر شعبان سنہ ۱۲۳۸ فصلی بمکان شیخ فرحلی سنہ بر محلہ گوکھ پور سن محلات شہر پٹنہ، بروقت گرشت یک پاس شب تحریر یافت۔ جملہ اوراق این کتاب زرنگار یک صد و پنجاہ و یک، انجا شمار غزل کہ جوشش بخط تحریر خود نوشتہ بود تحریر شد از بندہ بسحان علی ۔ من نوشتم طرف کردم، وزگار، بدمن خاطر این بیچارہ یاد گار بد من سبحان علی ولد شیخ دھو من، ساکن موضع نبی پرگنہ خیاث پور ضلع پٹنہ ۱۲۳۸"

کاتب کا حال جو ان کے خلف الرشید مولوی ظہیر احسن شوق نیموی مرحوم نے اپنی کتاب یادگار وطن[3] میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۲ھ میں بمقام نبی پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ کاتب نے کتاب صحیح

[1] گلشن بیخار، شیفتہ، مطبوعہ نولکشور، طبع دوم ص ۵۱۔ [2] سخن شعرا، ص ۱۶۱ و ۱۶۲، [3] ص ۲۹ تا ۳۵

نہیں لکھی، غلطیاں کثرت سے ہیں، املا کی بھی غلطیاں موجود ہیں، ان کے عہد کا املا اُس طبقے کے املا سے مختلف بھی ہے، اس سے مفصل بحث مقدمۂ دیوان میں کی جائے گی۔ کاتب کی ضخامت۔ کاتب نے خاتمے میں لکھا ہے کہ اوراق کی تعداد ۱۵۱ ہے، میرا خیال ہے کہ کاتب نے قصائد کو دیوان سے الگ لکھا تھا، اور قصائد کے اوراق اس کے علاوہ ہیں، شوق مرحوم نے کتاب کی ضخامت انیس جزو بتائی ہے، جس کے ۱۵۲ ورق ہوتے ہیں۔ آج کل اس کتاب کے اوراق کی تعداد قصائد، دیوان ۱۳۷+۱۴۵ ہے، میری رائے میں قصائد کے جو اوراق غائب ہیں، ان سے قطع نظر کر کے دیوان کے ۱۴ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔

قصائد۔ چار مکمل قصیدے، اور پانچویں کے چھ شعر ہیں، پہلا قصیدہ جس ورق سے شروع ہوا ہے اس کے اوپر اور نیچے کا ٹکڑا ضائع ہو گیا تھا، شوق مرحوم نے کاغذ چسپاں کر دیا ہے اور بسم اللہ، قصیدے کا عنوان مطلع کے بعض الفاظ اور درمیان سے چند شعر خود لکھے ہیں، بہت ممکن ہے کہ یہ پہلا ورق نہ ہو اور شوق مرحوم نے اسے پہلا ورق بنا دیا ہو، پانچویں قصیدے کے صرف ۶ شعر ہیں، اشارہ کاتب نے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اور اشعار تھے، اس قصیدے کے کتنے اشعار ضائع ہوئے، نہیں کہا جا سکتا اس کی بھی خبر نہیں کہ اس کے بعد اور بھی قصائد تھے یا نہیں، قیاس کہتا ہے کہ امام حسنؑ کے بعد کم از کم امام حسینؑ کی شان میں تو ضرور قصیدہ لکھا ہوگا، اہل دول کی شان میں بھی لکھا ہو تو عجب نہیں۔

قصیدہ اول نعت، اشعار ۳۵، دوم حضرت علیؑ کی شان میں اشعار ۶۴، سوم ایضاً ۷۶، چہارم امام حسنؑ کی شان میں ۶۵، پنجم ؟

قصیدۂ اول ؎ جو کوئی در گہہ عالی کا تیرے ہو زوار — لگے پلک سے پلک اس کی پھرے نہ آئینہ وار
ہر ایک زینۂ دیہ کہ رشک پایۂ عرش — ملائکان مقرب کا واں نہیں ہے گزار
دوم ؎ صاف طینت نہ کیا چاہیے گردوں کو خیال — عکسِ مکتا ہے یہ ہر ایک کے آئینہ مثال
تا تواں میں ہے نہ رکھ چشم توقع اس سے — پست ہمت ہے نہ کر اس کی بندگی پہ خیال
سوم ؎ نقش کو نجر کے تو صفحۂ دل سے کر حک — دیکھ لے جلوۂ حق ارض سے تا بہ فلک
چہارم ؎ عطا کیا ہے مجھے حق نے وہ دل روشن — کہ رشک شمع حرم ہے میان ظلمت تن
دیا وہ دیہ و شناسائے معنی و الفاظ — کہ روشن اس کی بدولت ہوا سواد سخن
عنایت ایسی ہی کی زبان تیز بیاں؟ — کہ تیغ قاطع برہاں ہے درمیان ہن
ہوا ہے وہ سر شوریدہ مرحمت مجھ کو — کہ میرا دشت و بیاباں عشق ہے مسکن
پنجم ؎ یہ چرخ کہنہ تو ہے اس طرح کا صاف ضمیر — کہ شکل آئینہ ہوتا نہیں ہے عکس پذیر
ششم ؎ غرض کسی کی ترقی سے نے تنزل سے — وزیر بادشہ ہو یا ہو بادشاہ وزیر

دیوان[1] قصایہ کے بعد ایک صفحہ سادہ ہے جس پر دیوان جوشش لکھا ہے۔ دوسرے صفحے سے غزلیات شروع ہوتی ہیں، یہ ورق شوق مرحوم کا لگایا ہوا اور لکھا ہوا ہے، اس کے بعد کے پانچ اوراق کے اوپر کے ٹکڑے ضائع ہو گئے تھے، شوق مرحوم نے انھیں بھی درست کیا ہے اور کسی صفحے میں ۲ کسی میں ۳ شعر خود لکھ کر لگائے ہیں، دسویں ورق پر ۱۲ کا ہندسہ دیا ہوا ہے اور اس کے بعد دو ورق تک اسی حساب سے چلا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ ابتدا کے دو ورق غائب ہو گئے ہیں، اور اصل میں اس دیوان کا اختتامی شعر ؎ جو دل کہ جلوہ گاہ ہوا اُس کے نور کا ہے شتاق وہ نہیں ہے تجلّی طور کا، بلکہ یہ ہے ؎ کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا، وہ قدرتِ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا[2]

[1] شوق مرحوم نے دیوان کے اوراق ضائع ہونے کے متعلق یادگار وطن میں کچھ نہیں لکھا۔ اس دیوان کے متعلق ان کی طویل تحریر کے اقتباسات درج ذیل ہیں ص ۳۰ تا ۳۱: "اس دیوان کو جناب والا مرحوم نے .... نقل کیا ہے، ہر صفحے میں ۱۷ شعر ہیں، ۱۹ جزو میں تمام کیا ہے، اس دیوان میں قصایہ بھی ہیں، آخر میں ایک آدھ تاریخ بھی ہے جس سے ثابت ہے کہ میر و میرزا کے ہمعصر تھے ... افسوس کہ دیوان کی نایابی سے عظیم آباد کے شعرا بھی جوشش سے واقف نہیں۔ جناب شاد عظیم آبادی نے نوائے وطن میں جوشش کا ذکر تک نہیں کیا، سبب کیا وہی گم نامی اور اس دیوان کی نایابی۔ ورنہ ضرور جوشش کو وسیع مرحوم کے پہلو بہ پہلو جگہ دیتے، بہرکیف یہ دیوان ہر چند پرانا ہے مگر کلام پاکیزہ، اور اُستادانہ ہے، میں نے اس دیوان کو بہت قدر کے ساتھ اپنے کتب خانے میں جگہ دی ہے،، شوق مرحوم کا یہ قول صحیح نہیں کہ ہر صفحے میں ۱۷ شعر ہیں، کسی صفحے میں ۱۹، کسی میں ۱۵، کسی میں اس سے بھی کم، کم ہی صفحے ہوں گے جن میں ۱۷ شعر ہیں، شوق مرحوم نے کتاب پر کہیں کہیں حاشیے بھی لکھے ہیں، اور کہیں کہیں کاتب کی غلطی کی اصلاح بھی کر دی ہے، جوشش نے ایک غزل میں طور کا قافیہ شور، بانہ، حاہے اس پر لکھتے ہیں، حور، وطور، وغیرہ کے ساتھ شور لیے تو افی اساتذہ کے کلام میں جا بجا موجود ہیں۔ البتہ اکثر فصحائے حال احتیاط رکھتے ہیں" جوشش نے علی ابراہیم خاں کو اپنے دیوان کا جو انتخاب بھیجا تھا وہ انھوں نے غالباً بجنسہٖ شائع کر دیا تھا۔ گلزار ابراہیم نسخہ قلمی کے الفاظ یہ ہیں۔" ہنگام تدوین ایں تذکرہ دیوان منتخبہ دیوان خود در ۱۱۹۳ھ بر راقم آثم فرستادہ کہ ثبت تذکرہ نماید" یہ اشعار اسی مطلع سے شروع ہوتے ہیں، اور اس غزل کے اور اشعار بھی ہیں، از انجملہ یہ شعر ہے ؎ عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت ؎ جناب کو دیکھے نہیں مقدور کس کا ہے، دیوان میں یہ غزل تو موجود نہیں، لیکن کتاں کے قافیے کا شعر بہ تغیر داخل ہے اور تلمذ کا شعار ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ شعر مطلع سر دیوان ہوگا۔ گلزار ابراہیم میں، ردیف الف کی دو غزلوں کے منتخب شعر اور بھی ہیں۔ یہ غزلیں بھی دیوان میں نہیں ہیں، یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض غزلیں دیوان اور گلزار ابراہیم دونوں میں ہیں، لیکن گلزار کے بعض شعر دیوان میں نہیں، مثلاً ایک عالم کی جاں خراش ہے یہ آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ، یار جوشش مت رو دل و جگر کو، کس کا کس کا تو غم کرے گا۔ گلزار ابراہیم مطبوعہ ص

ان دو دورقوں کے علاوہ میری، اے میں ۱۲، ۱۰، اق اور حسب تفصیل ذیل غائب ہیں[1] اور اق ۷۲ و ۷۳ و ۷۴، ورق ۷۱ اس مصرع پر تمام ہوتا ہے ؎ سرار کھتے ہیں مستاں شیشۂ پیمانہ پہلو میں۔ کاتب کا اشارہ ہے کہ بعد کا ورق نہ ہو یہ اس کی بڑگاں سے شروع ہونا چاہیے لیکن وہ اس مقطع سے شروع ہوتا ہے ؎ غرور، بندگی دل سے اٹھا دے خاکساری کو ؎ خدا ملتا نہیں جو شش کسی کو خود نمائی میں۔ (۲) ورق ۸۲، مصرع آخر ورق ۸۱ ؎ مہرباں نامہرباں ہم پر بھلا آخر نہ ہو' خلاف اشارہ کاتب' بعد کا ورق دوسری زمین کے مقطع سے شروع ہوتا ہے، پہلا مصرع ٹھیک پڑھا نہیں جاتا۔ دوسرا ؎ جو کوئی اپنے فعل سے یاں منفعل نہ ہو (۳) ورق ۱۰۶ و ۱۰۷، مصرع آخر ورق ۱۰۵ ؎ جو خدا چاہتا ہے ہوتا ہے ؎ بعد کا ورق اشارہ کاتب کے خلاف شعر ذیل سے شروع ہوتا ہے، پہلا مصرع اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا۔ دوسرا ؎ مرنے کا تعجب نہیں جینا ہی عجب ہے۔ (۴) اور اق ۱۱۹ تا ۱۲۳، مصرع آخر ورق ۱۱۸ ؎ ہم خانہ بردوشوں کا جو شش ہم سفر ہووے، بعد کا ورق کاتب کے اشارے کے خلاف یوں شروع ہوتا ہے، پہلا مصرع ٹھیک نہیں پڑھا جاتا، دوسرا ؎ کس کی مجال ہے جو ترے رو برو رہے ؎ (۵) ورق ۱۳۸، ورق ۱۳۷ کا آخری مصرع ؎ خدا جانے یہ الفت کیا کرے گی ؎ بعد کا ورق خلاف اشارہ کاتب مصرع ہذا سے شروع ہوتا ہے ؎ کس کو میں منصف ہوں تک آپ ہی انصاف ہے ؎ غزلوں کے کل اشعار ۵، ۳۷ ہیں، ان کے علاوہ ۵ اشعار ہیں جنھیں لکھ کر کاتب نے قلمزد کر دیا ہے، ممکن ہے منقول عنہ میں ان کے متعلق کوئی ہدایت درج ہو۔ ان اشعار میں سے چند درج ذیل ہیں ؎

کس طرح نظر اپنی رخ یار پہ ٹھہرے — خورشید کو ٹکھے نہیں مقدور کتاں کا
کیا مسجد و میخانہ میں کیا دیر و حرم میں — تھا نظر تو ہی اگر نظر تھا
بتانِ سنگدل کی بزم میں تو قہر ہوی پیدا — ہماری آہ بے تاثیر میں تاثیر ہوی پیدا
لگے سنگ ملامت چلنے عاشق ہوتے ہی اس پر — یہ کیا تقصیر تھی جو ساتھ ہی تعزیر ہوی پیدا

غزلیات کے بعد ۴۱ متفرق اشعار ہیں، پہلے شعر کا مصرع اول یہ ہے ؎ دیکھی ہے جب سے یار تری زلف خواب میں ۴۱، باعیاں ہیں۔ پہلی رباعی ؎ لے ساری خدائی کی خبر زیر گلیم + انعام یتیمی میں کرے لد یتیم
احمد ہے بلا میم محمد میرا + ذات اس کی بلاشبہ شکات کریم

لے دل جو تجھے ہے ہوس مے خواری + ہر بزم میں اتنی ہی ہے ہشیاری
ہر چند کوئی پلائے تھوڑی پیجیے + تا ہو نہ خط جام خط بیزاری
اے واقف اسرار خبر لے میری + ہوں دکھ میں گرفتار خبر لے میری
بیماری صعب نے ستایا ہے مجھے + یا حیدر کرار خبر لے میری

۷ بند مخمس بر دعائے زاہد و دعوت نہ کنم سوئے بہشت ۵ بند مخمس غزل ؎ لے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی۔

۶، بند مخمس ۵ نہ ۱ تہ اُٹھائے خلک گو ہمارے کینے سے۔ ۶۲، اشعار مثنوی ہجو نگاری ۵ ہے یہ چرخ کمینہ دوں پرور +
دشمن خاندان اہل ہنر + اتفاقاً نگاری جانا ہوا، جگہ پسند نہ آئی، ہجو کہنی کسی خاص شخص کا ذکر نہیں آیا،
۱۷، اشعار مثنوی ہزل نقل کبوتر بازی ۵ اک محلے میں تھے کبوتر باز ۵ اپنے فن میں سبھوں سے تھے ممتاز +
۱۹، اشعار مثنوی ہزل نقل افیونی ۵ اک افیمی کی نقل کرتا ہوں + نقل کرتے بھی اس کی ڈرتا ہوں +
۱۷، اشعار مثنوی در وصف مغنیہ خورشن ۵ اے صاحب حُسن و خلق تجھ سا + پیدا نہ کوئی ہوا نہ ہوگا +
۷، اشعار قطعہ تاریخ وفات میر وارث علی نالاں، ماده تاریخ میر وارث علی نالاں ۱۱۹۹ھ
۱۰، اشعار قطعہ تاریخ وفات محمد علی خاں، مشتاق، ماده تاریخ ۵ اب گیا مشتاق ارم میں، ۱۲۱۶ھ

ذیل میں دیوان کی چند غزلیں اور منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں ۵

بن دونوں سینہ ہمارا ابلہ گاہ طور تھا — یہ تجلی نیز دل تجلت وہ صد طور تھا
کیوں نہ شاکی ہو نیاز عشق ناز حسن سے — لے کے دل کو پھیر دینا کون سا دستور تھا
اٹکھیلیوں سے چلنے کا تجھ کو مزا ملا — تیری بلا سے خاک میں کوئی ملا ملا
منت تاثیر لے آہ سحر گاہی نہ کر — پر جو تجھ سے ہو سکے اس میں تو کوتاہی نہ کر
منزل اول ہی میں رہ جائیگی تھک کر کہیں — رہروان عشق کی لے مقل ہمراہی نہ کر
گاہ گاہ ہے تجھ بھی جایا کر ہو راحت نصیب — آتش دل رات دن پہلو میں سلگا ہی نہ کر
اے مرغ بے کسی پہ ہماری نظر نہ کر — جو کچھ کہ تجھ سے ہو سکے تو در گزر نہ کر
اس حسن صندلی کی ثنا اور تیرا منھ — دیوانہ کیوں ہوا ہے تو یہ دردسر نہ کر
غیرت یہ مقتضی ہے کہ اے غنچہ باغ میں — مرجھا ہی جا پہ منت باد سحر نہ کر
راغب نہ ہو طبیعت گو حور رو برو ہو — اپنی یہ آرزو ہے دُنیا ہو اور تو ہو
گر آرزو ہے دل میں اتنی ہی آرزو ہے — تاراج بے نیازی اقلیم آرزو ہو
راہ طلب میں اس کی وا ماندگی کہاں تک — اے پائے سعی کامل سرگرم جستجو ہو
بے رشتہ نگہ ہے بے سوزن مژہ ہے — چاک جگر ہمارا کس طرح سے رفو ہو
شمع حرم کا طالب اے بت میں کس طرح ہوں — میری کنشت دل میں جب جلوہ ساز تو ہو
عریانی پر ہماری مت طعنہ زن ہو زاہد — یہ دلق وہ نہیں جو محتاج شست شو ہو
جو بوشش بہار ہستی اک آن میں خزاں ہے — جوں گل نہ اس چمن میں پابند رنگ و بو ہو
آشنا جب کا گل شکیبی سے دست شانہ ہو — یہ دل صد چاک دیوانہ بھلا ہو یا نہ ہو

نہیں بھاتا کچھ اس انداز وہ گیں کو
یہاں سے لے چل اے وحشت کہیں کو

لے، رشک آفتاب ترا کیونکہ دیدہ ہو
پھرتی ہے درمیاں سے نظر نا اُمید ہو

الم کیا کیا نہ ہم پر گردش ایام سے گزرے
تعلق دل سے اُٹھ جائے تو کیا آرام سے گزرے

وہ خار تگر نظر آتا نہیں جس کے لیے ہم نے
دل و دیں سے اُٹھایا ہاتھ ننگ و نام سے گزرے

نہ مُنھ اس کا نظر آیا کبھی نے زلف ہاتھ آئی
ہم ایسی صبح سے باز آئے ایسی شام سے گزرے

نہ رونے کے ہے قابل نہ لائق آہ کرنے کے
ہوئے ناکام اے ہم اے ضعف اب سب کام سے گزرے

عناد و بغض جو کچھ کفر ہے شیخ صاحب کو
یہی اسلام ہے جوشش تو اس اسلام سے گزرے

آئے دو چار باتیں دل آزار کر چلے
کیا خوب تم عیادت بیمار کر چلے

اوروں کی سُنتے پائے نہ اپنی سُنا چلے
کیا آئے اس جہان میں ہم اور کیا چلے

غیروں پہ تلطف ہے ترا بلکہ کرم بھی
یار اک نظر لطف کے مشتاق ہیں ہم بھی

جوں نقش قدم تو ہوے پامال خلائق
دیکھیں گے ان آنکھوں سے کبھی اس کے قدم بھی

اس دل سے تو جانے کی نہیں دیر کی الفت
بالفرض اگر ہم نے کیا طوف حرم بھی

خندا ں ہے اُدھر برق اُدھر ابر ہے گریاں
شادی ہے زمانے میں تو ہے ساتھ ہی غم بھی

اُس کے لب میگوں کا لگھوں صف تو جوشش
لغزش ہی میں آجائے ابھی پائے قلم بھی

سحر کا وقت ہے اور پی چکا ہوں جام کئی
ابھی نہ گھر سے نکل ہیں خدا کے کام کئی

گل اور لالہ و سرو صنوبر و شمشاد
ترے غلاموں میں نامی ہیں یہ غلام کئی

میں کیا کہوں تری تیغ نگہ کی خونریزی
کئی سسکتے ہیں اور ہو گئے تمام کئی

اِدھر ہے عشوہ و غمزہ اُدھر ہے ناز و ادا
کھڑے ہیں آگے ترے بہرا ہستمام کئی

پھرا نہ ایک بھی ہرگز کسی سے قاتل کی
گئے ہیں لے کے مرا نامۂ پیام کئی

یہ سچ ہے کہ اور دل ہی کو تم یاد کرو گے
میرے دل ناشاد کو کب شاد کرو گے

چشم خوں بار کی اپنے وہ تراوش نہ رہی
ابر و مژگاں میں کسی نوع کی کاوش نہ رہی

خلق ہم جب سے ہوئے درد و الم سے کام ہے
یہ سمجھتے ہی نہیں آرام کس کا نام ہے

چمن میں یار بن رہنے کو تو کیا ہے، بلا کیجے
دلیکن جی نہیں لگتا ہمارا اس کو کیا کیجے

کیا بہار حسن پر موقوف میرا عشق ہے
جب تلک جیتا ہوں میں ہوں اور تیرا عشق ہے

دریائے لطافت

از قاضی و

آزاد[1] یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ گلکرسٹ نے قواعد اردو ۱۲۱۷ھ کے لگ بھگ لکھی، آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ "اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۱۰ھ میں قواعد اردو لکھ کر بیاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے۔" یہ تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ کہ گلکرسٹ کی کتاب کو تقدم زمانی حاصل ہے، دریائے لطافت کو قواعد اردو کی پہلی کتاب قرار دینا آزاد ہی کا حصہ تھا شاید انھیں خود ہی اس کا احساس ہوا کہ دونوں بیان صحیح نہیں ہو سکتے، چنانچہ جب انشا کا حال لکھنے لگے تو انھوں نے اس دعوے میں ترمیم کر دی اور صرف یہ کہنے پر قناعت کی کہ "یہ پہلی[2] کتاب قواعد اردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان نے اردو میں لکھی ہے"، میر فرد واحد صغیر بلگرامی جو اپنے عہد کے باغبر شاعر اور قابل قدر مصنف تھے آزاد کے دعوے کو نہ اس کی اصلی شکل میں تسلیم کرتے ہیں نہ ترمیم شدہ شکل میں ان کا اعتراض ہے کہ صرف[3] قواعد گلکرسٹ ہی نہیں بلکہ شمس البیان مصنفہ طپش دہلوی بھی دریائے لطافت سے پہلے شائع ہو چکی ہے، اور چونکہ طپش کو اہل زبان کے زمرے میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، آزاد کا دعوائے غلط ہے، ہمارا خیال ہے کہ صغیر مرحوم نے اپنا زور قلم بیکار صرف کیا ہے۔ گلکرسٹ کے تقدم کا اقرار خود آزاد کو ہے، اور ایک گلکرسٹ پر کیا موقوف ہے قواعد اردو کے متعلق بکثرت کتابیں اہل فرنگ نے دے سے پہلے لکھی تھیں۔ ان کا ذکر گریرسن نے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ میں کیا تھا۔ مدت ہوئی رسالۂ اینتی کو تری میں چھپا تھا، اور اب گریرسن کی یادگار زمانہ تصنیف لسانی جائزہ ہند و ستان میں شامل ہے۔ رہی شمس البیان، اس میں شک نہیں کہ زمانے کے لحاظ سے وہ بھی مقدم ہے، لیکن وہ دوسرے سے قواعد کی کتاب ہی نہیں، اس کا موضوع محاورات و مصطلحات ہیں، اور اس کا علم خود صغیر مرحوم کو بھی تھا۔ پھر یہ ثابت کر دینے سے کہ شمس البیان دو سے پہلے شائع ہو گئی تھی، آزاد کا قول کیونکر باطل ہو گیا۔ اور انشا کی طرف سے نقارۂ فخر پر جو چوب انھوں نے لگائی تھی اس کی آواز کیونکر دب گئی۔؟

اصل یہ ہے کہ صغیر مرحوم کی غرض یہ دعویٰ کہ گلکرسٹ اور طپش کے جائز حقوق غاصب انشا سے واپس دلوا دیے جائیں بلکہ اپنے استاذ الاستاذ تاسخ کی طرف سے یہ بانگ دہل یہ اعلان کرنا تھا کہ اردو ناسخ کا مقبوضہ علاقہ ہے، اور اس میں کسی دوسرے کی مداخلت گوارا نہ ہوگی، تاسخ نے اگر انادلا فخیری، کا دعوے کیا ہو تو اس کی بیں خبر نہیں۔

---

[1] آب حیات طبع نہم ص ۲۹۔ [2] آب حیات ص ۲۷۸۔ [3] جلوۂ خضر جلد ۲۔ ص ۲۴۱ تا ۲۴۳۔

کیونکہ کسی معاصر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن صفیر مرحوم جہاں تک اصلاح زبان اُردو، و انضباط قواعد اردو کا تعلق تھا، ناسخ کے علاوہ کسی کا نام بھی اس سلسلے میں سننا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ وہ یہ لکھنے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکے کہ "گو انشا کو اصلاح ناسخ کے مطابق اپنے کلام کی درستی کا موقع نہ ملا، لیکن دکا ماہ[۵] ناسخ کے طرز کلام سے حاصل ہوا اور انشا کی سمجھ میں جس قدر آیا اُس قدر قواعد پر ان کو عبور ہوا، اور جو سمجھ میں نہ آیا اول جلول طرح سے لکھدیا"[۶]

صفیر مرحوم نے اپنے دعوے کی بنیاد مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچے اور ایک قطعے پر رکھی ہے، دیباچے میں ناسخ کا نام موجود ہے، اور قطعہ میں ایک بسر شخص کی طرف اشارہ ہے جس سے اہل اردو نے فیض پایا ہے۔ دیباچے کے الفاظ یہ ہیں "حصہ نعمت الوان اس خوان پر شیخ ناسخ مقسوم گشت۔ تخلص خود را اسم بامسمّے انگاشتہ، بر طرز ریختہ گویان سادہ کلام در عرصۂ قلیل خط نسخ کشید"۔ ظاہر ہے کہ اس قول کا تعلق تجدید زبان سے نہیں بلکہ تجدید طرز سے ہے رہا قطعہ اس میں سرے سے ناسخ کی طرف اشارہ ہی نہیں، مفصل طور پر اس کے متعلق آیندہ لکھا جائیگا۔ یہاں پر ہم صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہماری نظر سے مصحفی کے کل دواوین اور اکثر تصانیف نثر گذری ہیں، لیکن ایک لفظ بھی ایسا نہ ملا جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ مصحفی ناسخ کو زبان اردو کا مصلح و مجدد سمجھتے تھے، ہاں یہ اعتراف مصحفی نے کئی جگہ کیا ہے کہ ناسخ نے سادہ گوئی ترک کر کے معنی بندی اختیار کی تھی، اور اس طرز کو مقبول عام بنا دیا تھا، یہاں تک کہ خود مصحفی بھی جو معنی بندی کو سخت ناپسند کرتے تھے، بادل ناخواستہ ناسخ کے تتبع پر مجبور ہوئے تھے۔ راقم کا خیال ہے کہ ناسخ کی اصلاح زبان کو زیادہ از ضرورت اہمیت دی گئی ہے، یہ صحیح ہے کہ ناسخ کو صحت الفاظ کا اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ خیال تھا، اور وہ آزادی جو نظم میں دوسرے شعرا اپنا حق سمجھتے تھے اس سے انھوں نے اپنے کو بطیب خاطر محروم کر لیا تھا، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُردو کوئی مصنوعی زبان نہیں، جسے ایک یا چند آدمیوں نے ملکر ایجاد کیا ہو اور اس کے قواعد وضوابط جب جی چاہے بناتے رہتے ہوں، اردو زندہ زبان ہے اور دوسری زندہ زبانوں کی طرح ہمیشہ معرض تغیر میں رہتی ہے، جس طرح سودا و میر کے عہد میں، آبرو و مضمون کی زبان ایک حد تک بدل گئی تھی، اسی طرح انشا کے زمانے میں، سودا و میر کی زبان بدل چلی تھی، مزید براں یہ کہ دہلی کے سیاسی زوال کی وجہ سے زبان کا مرکز لکھنؤ ہو چلا تھا، اور پچاس برس کے عرصے میں ایسے محاورات اور روزمرّے یہاں پیدا ہو گئے تھے جن کی دہلی والوں کو خبر بھی نہ تھی، لیکن انشا کے وقت تک لکھنؤ نے دہلی کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا، اور دہلی و لکھنؤ کی زبان کا اختلاف اس قدر نمایاں نہ تھا، جتنا ان کے بعد ہوا، دریائے لطافت کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ہمیں زبان کے سیلان اور تغیر پذیری کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے، اگر عشرۂ سوم کے اوائل کے بجائے یہ کتاب

[۵] حلوۂ خضر جلد ۲ ص ۳۷۳ [۶] حلوۂ خضر ص ۳۶۳ و ۳۶۴

عشرۂ چہارم کے اواخر میں لکھی جاتی تو باوجود اس کے کہ اس کے قواعد زبان حال سے قریب تر ہوتے، لیکن، اس کی اہمیت کم ہو جاتی۔ جو سودا و ناسخ کے درمیانی دور کی تصنیف کی حیثیت سے اسے حاصل ہے، رہا یہ سوال کہ ناسخ کا انضباط قواعد اردو سے کیا تعلق ہے، اس کا جواب ہم کسی دوسرے موقع پر دینے کی کوشش کریں گے، یہاں پر انشا کو تقلید ناسخ کے الزام سے بچانے کے لیے صرف اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ جن لوگوں کی نظر سے دیوان ناسخ کے قدیم نسخے گزرے ہیں، ان کی رائے ہے کہ ۱۲۳۳ھ تک ناسخ کی زبان وہی تھی جو مصحفی اور انشا کی تھی، سید انشا کی کتاب ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی ہے، ناسخ سے استفادہ بالکل خارج از بحث ہے۔

زبان سے متعلق قدما کی تصانیف میں جو غیر معمولی اہمیت دکھائی دیتی ہے، اس کا اندازہ کر کے آج سے کچھ کم سو سال پہلے کانپور کے ایک بزرگ مولوی سمیع الدین علی خاں بہادر نے جو اس زمانے میں مرشد آباد میں مقیم تھے، وہیں کے مطبع آفتاب عالمتاب میں اس کتاب کو طبع کرایا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خود لکھنؤ نے جو عہد ناسخ میں شعر کی مصنوعی خوبیوں کے مقابلے میں زبان کی درستی کی طرف زیادہ مائل تھا، اس کتاب کو قابل اعتنا نہ سمجھا، اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اہل لکھنؤ کا حاسۂ تاریخی (ہسٹوریکل سنس) بہت کمزور تھا، اپنے عہد کی زبان سے انھیں ضرور دلچسپی تھی، لیکن یہ سوال کہ زبان اُردو نے کن ارتقائی منازل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کی ہے، ان کے لیے بے معنی تھا، مولوی سمیع الدین علی خاں کی ژرف نگاہی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے کسی حد تک سہی، کتاب کی اہمیت کو سمجھا، اور اس کی ترتیب و تہذیب کا بھی معقول انتظام کیا،

انجمن ترقی اردو کی عنان انتظام جب ہمارے فاضل دوست عبدالحق صاحب کے ہاتھ میں آئی، تو ان کی نظر انتخاب پر بھی پڑی، اور انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اسے انجمن کی طرف سے شائع کیا، لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ شاید انجمن کا ابتدائی زمانہ تھا، اور کچھ اس وجہ سے کہ جو مطبوعہ نسخہ انجمن میں تھا، اس میں وہ غلط نامہ جو مرتبین نسخہ مرشد آباد نے شامل کیا تھا، نہ تھا، نسخۂ مطبوعہ انجمن میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ نسخہ مرشد آباد = م، اور نسخہ انجمن = ن کا مقابلہ کرنے سے حسب ذیل اختلافات کا پتا چلتا ہے۔

۱۔ احمد علی گویا موی کی تمہید، ن میں نہیں ہے،

۲۔ انشا کا خطبہ ن میں نہیں ہے۔

۳۔ دروازۂ اول کے ابتدا کی عبارت بقدر ½ ص ن میں نہیں ہے۔

۴۔ منطق عروض و قوافی کا بیان جو قتیل کا لکھا ہوا ہے ن میں نہیں ہے۔

۵۔ م میں جو اغلاط رہ گئی تھیں، ان کی تصحیح کے لیے ۴ صفحات کا غلط نامہ شامل کتاب کیا گیا تھا، ن میں اس سے

لہ مقدمۂ مثنوی ناسخ شائع کردہ کتابستان الٰہ آباد۔

بالکل فائدہ نہیں اُٹھایا گیا، اور م کی اغلاط اپنی جگہ پر رہیں۔

۶- جا بجا سے الفاظ اور عبارات فحش یا مبتذل ہونے کی وجہ سے ن میں خارج کی گئی ہیں اس میں تو چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن جن مقامات سے الفاظ خارج کئے گئے ہیں وہاں اس عمل کا کوئی نشان نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ کاتب ن کی غلطی کی وجہ سے بعض مقامات پر ضروری الفاظ خارج ہو گئے ہیں، جس سے مصنف کے منشا کے خلاف مطلب پیدا ہو گیا ہے ان اختلافات کو دیکھکر، اور کتاب کی اہمیت کا احساس کرکے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ کتاب پر بالتفصیل نظر ڈالی جائے اور جو اغلاط ن میں رہ گئی ہیں، ان کی تصحیح بھی ضمناً کر دی جائے، لیکن ایک مضمون کی وسعت اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ پہلے مضمون میں ہم کتاب کی تقسیم و تبویب احمد علی کی تمہید، انشا کے خطبے، دروازۂ اول کی ابتدائی عبارات اور کتاب کی ظاہری حالت سے بحث کریں گے۔

م- تقطیع کے معمولی سفید کاغذ پر، ٹائپ میں چھپا ہے۔ سرورق کے بعد ۶ ص پر احمد علی گویاموی کی تمہید ہے، ۴ ص پر فہرست مضامین ہے، اصلی کتاب اس کے بعد شروع ہوتی ہے، جو ۴۷۶ ص پر ہے، ۴۱ ص غلطنامے کے اس کے علاوہ آخر میں ہیں۔ انشا کا خطبہ ۸ ص میں ہے، حصہ منطق نوشتہ قتیل ۳۰۹ سے شروع ہو کر ص ۳۹۸ پر ختم ہوتا ہے، حصہ قافیہ و ردیف ص ۳۹۹ تا ۴۱۵، حصہ صنائع و بدائع و اقسام نظم ص ۴۱۵ تا ۴۷۰۔ خاتمہ جون میں موجود ہے ۴۷۰ تا ۴۷۶۔ کتاب میں بالعموم ۱۸ سطریں ہر صفحے میں ہیں۔

سرورق دریائے لطافت | در علم صرف و نحو زبان اردو ے شاہ جہاں آباد و منطق | و بدیع و بیان و عروض و قوافی بالتفصیل محاورات | و دیگر فوائد نظم و نثر زبان مذکور نصف اول آں تصنیف | میر انشاء اللہ خاں مرحوم و نصف ثانی مولفہ | مرزا محمد حسن قتیل مرحوم | کہ در تحقیقات ایں زبان از ابتدائے رواج | اردو تا حال ہیچیک تالیف بریں تفصیل و تتبع نشد | در بلدۂ مرشدآباد بمطبع | آفتاب عالمتاب طبوع شد | در ماہ رجب المرجب ۱۲۵۶ھ ہجری الناس پانچ سطروں میں الناس ہے کہ کتاب حسب منشائے خاقون جستم ۱۸۳۵ء "داخل بی جسٹری گورنمنٹ" ہو چکی ہے۔ بے اجازت کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں۔

تمہید نوشتہ احمد علی گویاموی۔ ابتدا ہوالودود والحمید سے ہوتی ہے اور سطر اول یہ ہے" بہترین فاتحہ کہ فصحاً بدیع البیان محفل زبان ارائی و بلغائے۔

اس کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں" از ابتدائے ترویج زبان ریختہ کہ بنام اُردوئے معلی موسوم و مشتہر شدہ تا حال کہ صد ہا سال می گذرد کتابے حاوی جمیع قواعد آں زبان ... مولف نشدہ بود، لہذا در مشہور ۱۲۱۲ھ میر انشاء اللہ خاں تالیفے بکار بردہ حسب و منع خود کہ مائل بمزاح و تمسخر بود، ضبط اصول و قواعد صرف و نحو اردو بقیاس قواعد مقررہ عربی و فارسی و ہم بایجاد طبیعت خود قرار واقعی نمودہ، و برائے نصف ثانی آں کہ

مراد از منطق و عروض و قوافی و بیان و بدیع باشد مرزا محمد حسن متخلص بہ قتیل، اشریک تالیف آں گردانید و کتابے مہذب کرد ..... و اگرچہ مرزا ممدوح ہم انضباط و تالیف ایں علوم .... از کتب متداولہ نمودہ، حسب لیاقت خود بانجام رسانید الا در عروض و قوافی وغیرہ مستخرا ز استہزا بے مزہ نمودہ و علم منطق را بسبب جہالت و ناواقفیت اناں مسخ کردہ تا بحدیکہ علمائے ذی شان را ... ا عتنا ہم بآں سواد تصحیح و غیرہ ازاں جنس نیست کہ اطفال چند مشغول بہ بناہا، و ہی امکنہ باشند و چکیے بر سر وقت آثار رسیدہ تصد ہموار ی خطوط و سطوح نا ہموار ش نمایند و رہا منطق اگرچہ بعضے گفتگوے علوم و دیگر ہم باسلوب احسن لیاقت جرح و تعدیل ازکیاد ارد و چند جا زلہ و لغزش واقع شدہ، الا انصاف ایں ست کہ برائے تعلیم و تربیت مشتغلین تعلم زبان اُردو و شعرائے ایں زبان بس نسخہ عجیب و تالیفے غریب ہست ..... و دریں عرصہ کہ نیات ا راکین سلطنت برطانیہ مصروف ترویج ایں زبان است و برائے اگر تران جدیہ الوجود ہندوستان ... ایں کتاب نہایت مفید و بکار آمد ہست و بہمیں نظر زعرصۂ قریب پنجاہ سال مکرر مردمان ہم در کلکتہ و ہم در بلاد دیگر ہم طبع آں نمودند گر بسبب اشتمال آں بر مصطلحات جدیہ چوں دقتے پیدا نمودہ و ہم مسیح کتاب ایں نسخہ ہر جا کہ دیدہ شد مانا یکسق مستی بود کذا فی بالفعل ... مولوی محمد سمیع الدین علی خاں بہادر، او امر شیستہ و برکانہ دیوان ذیو ر طبعی جناب عالیہ متعالیہ نواب امیر النسا بیگم صاحبہ دام اقبالہا بنظر شدت فہرست نسخ متعددہ بہم رسانیدہ ..... بر شدت تمام تصحیح ایں بعمل آوردند .. و بندہ عاصی .... احمد علی الگو پاموی وعفنا والعمی نسبتاً را شریک تصحیح و مامور باہتمام طبع آں ساختند، و اگرچہ در تصحیح آں زمان کثیر صرف شدہ و در حقیقت: یادہ از تصنیف و تالیف صعوبت و محنت بہم رسید مگر الحمد للہ کہ حسب خواہ مہذب و مطبوع شد "

تمہید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حصہ منطق کے اغلاط اس قدر زیادہ تھے کہ مولوی سمیع الدین علی خاں نے اس کی تصحیح کی طرف بالکل توجہ نہ کی، لیکن مولوی احمد علی نے تمرا د مصنف کو مد نظر رکھ کر کاتبوں کے اغلاط کو رفع کر دیا، پروف پڑھنے، اور کتاب کے چھپوانے میں مولوی محمد سعید جائسی اور منشی وارث علی پنڈوی نے بھی اعانت کی تھی۔ کتاب کے چھپوانے کی نوعیت بھی تھی کہ ہنری ٹارنس صاحب بہادر ایجنٹ نواب گورنر جنرل رشد آباد کی وساطت سے نواب منتظم الملک محمد الملک فریدوں جاہ سید منصور علی خاں بہادر نصرت جنگ ناظم بنگالہ کی خدمت میں پیش کی جائے۔ قصیدہ کے آخر میں ۴ بیت کا ایک قطعہ تاریخ مرزا آغا جان سفیر تخلص کا لکھا ہوا ہے، آخری بیت یہ ہے ؎

سفیر فتہ بہر سال طبعش بگفتا "ایں ست دریائے لطافت"

اس سے ۱۲۶۰ھ نکلتا ہے، لیکن بہت ممکن ہے کہ شاعر نے ایں ہست، میں الف کو حذف کر دیا ہو۔ اصل کتاب قصیدہ اور فہرست کے اوراق کو نظر انداز کر کے صفحہ اول سے شروع ہوتی ہے۔ ص اول ۱۱ سطریں۔ سطر اول خالی بے اندازہ دو دو سے زائد اور ہست کہ زبان آدمی را۔ مختصر حمد و نعت کے بعد مصنف لکھتا ہے،

امابعد فقیر آتم تراب اقدام فصحا، انشا، اللہ تخلص بہ انشا، ابن حکیم سید ماشاء اللہ جعفری بخفی گوید کہ چوں بعنایت قادر متعال ... بفیض مجالست ... اعظم الامرا و اجل الوزرا، یمین الدولت ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر میاں زنگ .... سرافتخار از طارم نیلگوں گذرانیدم، ... وزے ایں بندہ بے ریا و شاد شد کہ زبانہ انان پیشین ... قواعد زبان عربی و فارسی، ابرشتہ تحریر کشیدہ اند .... اکثر بخاطر می گذرد کہ قواعد زبان اردو کہ محکم کل جدید لذیذ، زیادہ لاز زبان دیگر تا گی بخش جاں ساسعان ہست و تا امروز در کتابے طراز آستین کتابت نگردیدہ، اگر بسعی تو ... بشرح و بسط تمام گلگلہ چہرہ شاہد کاغذ گردد، ہرآئینہ خالی از ضیافت طبع معاصران و طالبانے کہ بعد ازیں بوجود آیند نباشد بناءً علی ہذا چنیں اصوب می نمایہ کہ رسالہ چند بہ تحریر تحریک قلم کشیدہ و بتالیف نسخہ مشتمل بر تحقیق لغت و محاورہ و صرف و نحو و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع ایں زبان پروازی، ہمیں کہ از زبان مبارک برآمدہ انستم کہ آں حضرت را غرض از صرف توجہ بایں ارشاد نفع، رسانی فصیحان ہند و القائے نام ایں غلام مستہام ست، خلاصہ کلام ایں کہ، بمثال امر عالی را... و ذخیرہ خیر جاودانی دانستہ دست بہ امن توفیق آویختم و ازیں سبب کہ در عالم استغراق تحصیل لذات روحانی ابدی بر عکس رائی بار یافتگان محفل عالی حضرت پیرو مرشد، و یاد کردن لطائف حضور اقدس کہ ہر دو بلا فصل دو سہ چار از زبان معجز بیان ترشح می نمود و می نمایہ و آں را خود بخود در کتاب لطائف السعادت کہ تا قیام قیامت بہ تمامی مرساد، می نوشتم و می نگاشتم و خواہم نوشت ... ایں ہمہ فرصت بدست نیامد کہ نگارنگ، چہرہ ایں نقش بدیع کشم، میرزا محمد حسن قتیل، انیز کہ در گروہ ادبے تامل، و کرہ کمن پسندیدہ او پسندیدہ ایں گزمژ بیاں بود، دلست، و از صغر سن میاں دمن و او در ہر چیز حصہ برادرانہ قرار پذیرفتہ، شرکیاں دولت بدت سانتم و با ہر چنیں مقرر شد کہ خلبہ کتاب لغت و محاورہ اردو و ہر صحت و ستم آں باشد و مصطلحات شاہ جہاں آباد و علم صرف و نحو ایں زبان را، اتم ... بنویسد و منطق و عروض و قافیہ و بیان بدیع، او در بقصد قلم، آور، چوں بندہ را بیشتر با نظم سروکار ماندہ و او را با نظم و نثر ہر دو چند سطرے کہ می نویسم نگاہ واشتن آں ہم نیز موقوف بر پسند اوست سوائے لفظ و محاورہ و اصطلاح او دیگر خلش در عبارت ہمہ قبول خاطر فقیر گزشتہ "

سید انشا یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب کا ایک نام، انشا دلپذیر، رکھا کہ ناظم الملک بہادر کے حکم سے لکھی گئی ہے، ۱۱، دوسرا نام بحر سعادت قرار دیا قتیل نے بھی دو نام رکھے، ایک دریائے لطافت اور دوسرا حقیقت اردو، اس کے بعد سند رجات کتاب کی تشریح کی ہے۔ یہ اس فہرست کے مطابق ہے جو ان میں موجود ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جزیرہ سوم و جزیرہ چہارم و جزیرہ پنجم جا منطق، عروض، قوافی پر مشتمل ہیں، اس فہرست میں درج نہیں، خطبہ مصنف کے بعد پہلا درجہ شروع ہوتا ہے، اس کا عنوان "در بیان کیفیت زبان اردو" ہے مصنف نے اولاً حروف تہجی کے دو نئے نام تجویز کیے ہیں جو سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے ہیں، اور یہی نام کتاب میں ہر جگہ برتے گئے ہیں، حروف تہجی کے نئے نام یہ ہیں، اقبال بخشش، پاکی طینت، ترحم، ثبات قدم، جوانمردی حکمت، خدا ترسی، چارہ سازی، دولت، ذکاوت، فہ ویزی، ژرف نگاہی، سطوت، شجاعت، صولت، ضبط، طرز بیان، ظہور برکات، علو نسب، غیرت، فتوت، قدرت، کرم دانائی، گشادگی، مروت، نفاست، وزارت، ہمت بلند، یاد حق۔

میٹرلنک کے خاموش ڈرامے

از "آرزو" جلیل

خاموش ڈراموں میں واقعات کا اظہار زیادہ تر خاموش عمل سے ہوتا ہے۔ "خاموش عمل" کرداروں کی نقل و حرکت پر منحصر ہے، اور اسی نقل و حرکت سے سامعین کل واقعات کو سمجھ جاتے ہیں۔ خاموش ڈرامے کو کامیاب بنانا مشکل کام ہے، کیونکہ خاموشی سامعین کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس لیے خاموش ڈرامے میں انتہائی کشمکش ہونی چاہیے ایسی کشمکش جس سے سامعین کے جذبات پر گہرا اثر ہو۔

بسا اوقات خاموشی گفتگو سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ شعرا کے نزدیک خاموشی ایک بحرِ بیکراں ہے جس میں گہرائے معنی پوشیدہ ہیں۔ اس خیال کو ڈاکٹر اقبال نے اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

ہیں منت کشِ تاب شنیدن داستاں میری ✦ خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

خاموشی کی اس اثر انگیزی کا تجربہ ہمیں ڈرامے کے ذریعے بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ روزمرے کی زندگی میں ہمیں اس قسم کے تجربے کا موقع مل سکتا ہے، لیکن زندگی کی تمثیل زندگی سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ جب ہم کوئی ڈراما دیکھتے ہیں تو ہماری توجہ صرف ڈرامے ہی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ ڈرامے کے واقعات کا ہم غائر مطالعہ کرتے ہیں، ہر مثل کے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات پر ہم غور کرتے رہتے ہیں: ممثلین کی خاموشی ہمیں اُن کی گفتگو سے کم دلچسپ نہیں معلوم ہوتی۔

خاموش ڈراموں پر میں نے محض سرسری طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ کیوں کہ میرا اصل مقصد میٹرلنک کے خاموش ڈراموں پر تبصرہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے اُس کے دو ڈراموں (اندھے[1] اور لاں تیر یز[2] کا انتخاب کیا ہے۔

"اندھے" ایک ایکٹ کا ڈراما ہے۔ اس کے افراد اندھے مرد اور اندھی عورتیں ہیں۔ یہ سب رات کے وقت ایک جنگل میں اپنے راہب کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جنگل سمندر کے کنارے ہے۔ گہری خاموشی طاری ہے۔ کبھی کبھی خاموشی کا طلسم ٹوٹتا ہے اور سوکھی پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اندھے وقتاً فوقتاً بات چیت کرتے ہیں پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ وہ پریشان ہیں کہ راہب اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔

---

[1] اس ڈرامے کا ترجمہ جناب شاہ احمد مدیر ساقی نے کیا ہے ملاحظہ ہو سالنامہ ساقی ۱۹۳۶ء

[2] اس کا ترجمہ "سکون" کے عنوان سے "معیار" کی اسی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔

گھٹا جنگل، اندھے لوگ۔ آدھی رات کا وقت۔ ہوا کی سائیں سائیں، اور کبھی کبھی اندھوں کی آواز ..... اسی خاموش ماحول پر ڈرامے کی کشمکش منحصر ہے۔ یہ راہب کون ہے؟ بارہ بجے رات کو اندھے، اُس کا انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ ..... سامعین کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کتا آتا ہے اور اندھوں میں سے ایک شخص اُس کے اشارے پر چلتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک لاش سے ٹھوکر کھاتا ہے۔ (خاموش عمل!)۔ اُسے تشویش ہوتی ہے کہ یہ کس کی لاش ہے۔ سب اندھوں کو وہ فرداً فرداً پکارتا ہے۔ اس طرح اندھوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن میں سے کوئی نہیں مرا۔ اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اُن کا اندھی پیشوا مر گیا۔ اس کے بعد اندھوں کو قدموں کی آہٹ سُنائی دیتی ہے، اور بچہ جو اُن کے ساتھ ہے رونے لگتا ہے۔ قدموں کی آہٹ بہ تدریج قریب تر آتی ہے اور اندھوں کے درمیان آکر معدوم ہو جاتی ہے۔ "نوجوان اندھی عورت" پوچھتی ہے۔ "تم کون ہو؟" تھوڑی دیر تک سناٹا چھایا رہتا ہے۔ پھر "سب سے بوڑھی اندھی عورت" کہتی ہے۔ "ہم پر رحم کرو!"۔ اس کے بعد خاموش وقفہ ہے۔ بچہ چلّانے لگتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔ خاموش نے سامعین پر جو اثر کیا ہے، اُس کو میترلنک شور و غوغا سے درہم برہم ہونے دینا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ ڈرامے کو عین اُس وقت ختم کر دیتا ہے۔ جب بچے کی چیخ فضا میں گونجنے لگتی ہے۔

"لاں تیریہ" کے مرکزی کردار ابتدا سے انتہا تک خاموش رہتے ہیں۔ افراد تمثیل حسب ذیل ہیں:۔

باغ میں: بوڑھا آدمی، اجنبی، میری دمارتھا (بوڑھے کی پوتیاں)

گھر میں: باپ، ماں، دو بہنیں، بچہ۔ (خاموش ہستیاں)

ڈرامے کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک لڑکی دریا میں ڈوب کر مر گئی ہے۔ اُس کی لاش لوگ اُس کے گھر کی طرف لا رہے ہیں۔ بوڑھا آدمی جو لڑکی کے والدین کا دوست ہے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ وہ شش و پنج میں ہے کہ اُن لوگوں کو کس طرح مطلع کرے کہ لڑکی ڈوب کر مر گئی۔ باہر سے مکان کا ایک کمرا نظر آ رہا ہے۔ جس میں گھر کے لوگ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھریلو زندگی کا پُرامن منظر ہے۔ بوڑھا آدمی شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے اور اسی عرصے میں کسانوں کا مجمع لاش لیے ہوئے مکان کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ بوڑھا آدمی مکان کے اندر جاتا ہے اور خبر بد سنا دیتا ہے۔

اس ڈرامے میں انتشار کا مقام یہ ہے کہ گھر والوں کو لڑکی کے ڈوب جانے کی خبر کس طرح سُنائی جائے وہ مکان کے اندر آرام سے بیٹھے ہیں۔ لڑکیاں کپڑے سی رہی ہیں۔ ماں کی گود میں بچہ سویا ہوا ہے۔ سب کے سب خاموش اور بے فکر بیٹھے ہیں۔ انھیں کیا خبر کہ لڑکی دریا میں ڈوب گئی! ۔ یہ لڑکی دریا کے اُس پار اپنی دادی سے ملنے گئی تھی۔ گھر کے لوگ اُس کا انتظار بھی نہیں کر رہے تھے۔ غالباً اس وقت اُن کے دلوں میں لڑکی کے متعلق

کسی قسم کا خیال ہی نہ ہوگا۔ اس وقت بوڑھا آدمی ایک اجنبی کے ساتھ باغ میں داخل ہوتا ہے۔ دونوں مکان کے اندرونی منظر سے متاثر ہوتے ہیں اور لڑکی کے متعلقین کو اُس کی موت کی خبر سُنانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ وہ آپس میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں:۔

اجنبی۔ اگر ہم باپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں اور اُس کو اشارہ کریں؟ اُس نے اپنا سر اس طرف پھیرا ہے میں کسی در پیچے پر دستک دوں؟ ان میں سے کسی ایک کو دوسروں کے پہلے یہ خبر سُننی ہی پڑے گی۔

بوڑھا آدمی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کس کو انتخاب کروں .... ہمیں بہت ہشیار رہنا چاہیے۔ باپ بوڑھا اور مریض ہے۔ ماں بھی علیل ہے۔ بہنیں بہت کم سن ہیں .... اور سب اُس سے ایسی محبت کرتے تھے جیسی محبت وہ پھر کبھی نہیں کر سکیں گے۔ میں نے کبھی اس سے زیادہ خوش و خرم گھرانا نہیں دیکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اجنبی بوڑھے کو تنہا جانے کی ہدایت کرتا ہے۔ مگر بوڑھا اجنبی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اُس کا خیال ہے کہ "بدقسمتی" جس کا اعلان ایک ہی آواز کرتی ہے، بہت زیادہ نمایاں اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے خیال میں کسی بُری خبر کا اظہار اس طرح کرنا چاہیے کہ "غم کی پہلی موج اپنی طاقت غیر ضروری الفاظ پر صرف کر دے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کے گرد لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق جمع ہونے دیا جائے۔ بہت سے غیر متعلق لوگ بھی غم کے کچھ حصے کو بغیر محسوس کیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں"

اس عرصے میں مکان کے اندر کی فضا میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ گھر کے لوگ اس قدر مطمئن اور بے فکر نظر آتے ہیں کہ دوسروں کو اس بات کا احساس بھی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سکوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔

بوڑھے اور اجنبی میں گفتگو جاری ہی ہے کہ بوڑھے کی پوتی میری آتی ہے اور خبر دیتی ہے کہ لاش آ رہی ہے ان کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ کس طرح مکان کے اندر جا کر موت کی خبر سنائیں۔ میری بوڑھے آدمی سے کہتی ہے:۔

"اُن سے آج رات کو نہ کہیے دادا جان!"

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے کی دوسری پوتی بھی آتی ہے۔ وہ دادا سے خفا ہوتی ہے کہ اُس نے اب تک لڑکی کے والدین کو مطلع کیوں نہیں کیا۔ پھر کسانوں کا مجمع لاش لیے ہوئے قریب پہنچتا ہے۔ بوڑھا آدمی مکان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ مجمع میں کانا پھوسی ہونے لگتی ہے۔ سامعین کا انتشار بڑھ جاتا ہے کہ بوڑھا "خبر بد" کس طرح سُنائے گا اور لڑکی کے متعلقین پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ بوڑھا جب مکان کے اندر داخل ہوتا ہے تو "ماں" اُس کے استقبال کے لیے اُٹھتی ہے۔ ایک لڑکی اُس سے آرام کرسی پر بیٹھنے کی گزارش کرتی ہے، مگر وہ انکار کرتا ہے۔ بوڑھا باہر کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر گذارتا ہے۔ باپ بڑی بے تکلفی سے بات

چیت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بوڑھا آدمی کچھ بوکھلا ہے، گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں ماں چونک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور بے قراری میں بوڑھے سے سوالات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بوڑھا کچھ کہتا ہے اور بستر چلاتا ہے۔ بچے بھی مچلنے ہوتی ہے۔ "اس نے اُن سے کہہ دیا!" باپ، ماں اور دونوں لڑکیاں باہر کی طرف دوڑتی ہیں۔ بچے مکان کے اُسی جانب جاتا ہے جدھر سے یہ لوگ باہر نکل رہے ہیں۔ اجنبی تماشہ جاتا ہے۔ مکان کے اندر بچہ چیں سے سو یا ہوا نظر آتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اجنبی بھی چلا جاتا ہے۔

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس ڈرامے میں کشمکش کا موقع یہ ہے کہ لوگ کے ڈوب جانے کی خبر اُس کے متعلقین کو کس طرح سُنائی جائے۔ مکان کا اندرونی منظر اس قدر پُرسکون ہے کہ بوڑھا آدمی خبر یہ کا قاصد بننے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آخر کار تھوڑی دیر کے بعد وہ ہمت کر کے مکان کے اندر جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر گھر کے لوگ اسٹیج پر ہوتے چلاتے نظر آتے اور موت کی خبر سننے پر وہ بلند آواز سے اظہار غم کرتے تو ناظرین پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا اُن کے خاموش عمل سے ہوا۔ بوڑھا آدمی اُن کو موت کی خبر سناتا ہے۔ اُن کے چہروں سے پریشانی کے آثار واضح ہیں۔ وہ مکان کے باہر نکلتے ہیں۔ سامعین کا اضطراب انتہائی درجہ تک بڑھا ہوا ہے۔ کیوں کہ مکان کے اندر کا منظر وہ صرف بچوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ بوڑھے نے اُن سے کیا کہا؟۔ اُنھوں نے اُس سے کیا پوچھا؟ لڑکی موت کا اثر اُن پر کیا ہوا؟ جب یہ "خاموش ہستیاں" مکان کے باہر نکلیں گی تو ہم انھیں دیکھ بھی سکیں گے؟ ان کی گفتگو بھی سُن سکیں گے؟ ناظرین کے دلوں میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اگر انھیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملتا۔ کیونکہ عین اسی وقت پردہ گرتا ہے۔ اس وقت سامعین کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اس کا اندازہ ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

صوبۂ بہار

گیارہویں صدی کی اُردو کا نمونہ

از قاضی عبدالودود

سید عارستہ اینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے جو حضرت عماد الدین قلندر کی طرف منسوب ہے اور جس کا سالِ تصنیف ۱۰۰۰ھ ہے۔ یہ رسالہ بقول جناب تمنا "انھیں کتب خانۂ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب شہر پٹنہ سے ملا ہے، خلتے میں کاتب کا نام درج نہیں لیکن جناب تمنا کا بیان ہے کہ حضرت شاہ وجداللہ قلندر خواہرزادۂ حضرت شاہ نور الحق (بقول تذکرۃ الخواص سالِ ولادت ۱۰۲۱ھ سالِ وفات ۱۰۷۳ھ) کا لکھا ہوا ہے کیونکہ ان کے خط سے ان کا خط ملتا ہے۔ یہ رسالہ ازابتدا تا انتہا خطِ نسخ میں لکھا ہے، اور بظاہر گم از کم ستر اسّی برس قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی نقل نورالحسن صاحب نے کی ہے (اور اس کا مقابلہ اصل سے جناب خیال نے فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں صاحبوں کے شکر گزار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس رسالے کا ایک نسخہ حضرت مصنف کا لکھا ہوا بھی کہیں دیکھیں موجود ہے، جناب تمنا اس کی تلاش میں ہیں، رسالے کی مندرجہ ذیل نقل بالکل اصل کے مطابق ہے۔ ابتدا میں ہو، خاتمہ ہے، اس کے بعد اس طرح شروع ہوتا ہے۔

سید عارستہ

اما بعد بس جانو اے سلطان بہبن آدم بیٹی سب کہ اللہ تعالے ایک ہیں اون کے تیئں دھڑ، بدن، ہاتھ اوڑ، پانوں ناکہ کان پیٹ پیٹھ کچھ نہیں ہے، دھڑ بدن میٹی سے نہیں ہیں، وے میٹی پانی آگ ہوا، سب کے نہیں تو آپی ہستا نہیں ہیں، آسمان زمین پاتاڑ ندی دریا سب اون ہی ہستا نہیں ہیں، اُن کی تیئں صورت بھی نہیں ہے، صورت بدن کی ہووے ہے، جب اُون کے تیئں بدن نہیں تو صورت کیسے ہوسکی۔ اللہ تعالے کے ایسا کوئی نہیں ہے، اور نہیں ہوسکے ہے، اللہ تعالے کا کوئی شریک ساتھی سنگھاتی نہیں ہے۔ اور نہیں ہوسکے ہے، نہیں اُن کے تیئں کوئی جنس ہے۔ اور نہیں اون نے کسو کی تیئں جنن ہیں۔ اُون کے تیئں جورو جاتا، بال بچہ نہیں، نہیں وے عورت ہیں، نہیں مرد، نہیں ہیجڑا، نہیں خنثی، نہیں وے لڑکا ہیں، نہیں بوڑھا۔ نہیں جوان، وے ہمیشہ سدا ایسی ہیں۔ اور سدا اتنک رہیں، جیسے تھے ویسے ہی ہیں، اور ویسی ہی رہیں، وے دیکھیں بنا آنکھ کے اور سونے ہیں بنا کان کے، اور بولے ہیں بنا مونھ اور زبان کے وے سرد گرم، کڑوا نرم کچھیں ہیں بنا ٹوٹے کے

غیب یعنی چھپی بات سب جن کی تئیں کوئی نہیں جانیں، اللہ تعالے ہی جانیں ہیں اُن کی سوائے کوئی نہیں جان سکے ہے، وہ سب ستی بڑی اور بزرگ ہیں، اُن ستی بڑا اور بزرگ کوئی نہیں ہے، وہ سب بات کے تئیں سدا ستی جانیں ہیں کوئی بات اُن ستی چھپی نہیں ہے، کھانا پینا چلنا پھرنا اونگھنا بیٹھا سونا اونگھنا اور ان کے ایسی تمام سب بات ستی اُن کی ذات پاک ہے ۔

فصل اللہ تعالے ہی کی تئیں پوجنا چہیے، ماتھا، سیر دوسری کیسو کی آگے نیوا، ہانا حرام اور شرک ہے، **شرک** یعنی کیسو کی تئیں اللہ تعالے کا ساتھی سنگھاتی بنانا اُن کے سوائے کیسو کی تئیں پوجنا، کیسو کی تئیں بیٹا بیٹی حاجت، مراد دیونہارا جاننا، کیسو بات میں اللہ تعالے کی ایسا کیسو کی تئیں جاننا کیسو کون ہر جاگہ کی بیچ حاضر ناظر سمجھنا، ایک چھوڑ دو چار، دس بیس معبود جاننا، سورج، چاند، سیتارہ کے تئیں اچھا، راکھنے ہارا جاننا کیسو دیوتا یا پیر یا پرن یا کیسو پیر بزرگ ستی حاجت مراد مانگنا، کیسو کی درگاہ یا مزار کے اوپر منت مُراد مانگنا، کیسو کی قبر چومنا یا قبر کی خاک سونگھ کلیجہ پر لگانا اور ملنا، قبر پر چادر، شرنی چڑھانا، غازی میاں، بالے میاں، شیخ سدہ میاں کو دُن ماننا، جن بھوت، خبیث کے تئیں راضی، کھی کو ن چڑھاوا چڑھانا، امام صاحب کی منت ماننا، چبوترہ کی اوپر نیاز نذر کرنا اور حاجت مراد مانگنا یہ سب شرک ہے اور حرام ہے جو بنا توبہ کرے کہ ہی معاف نہیں ہو سکے گا، نہیں موے پیچھے شرک کرے والی کے کو اللہ تعالے ستی شفاعت کرے گا، نہیں، دنیا کے بیچ شرک والی کی واسطے کیسو مسلمان کے واسطے بخشائش کی دعا مانگنا ناجائز ہے، اللہ تعالے ہر مسلمان کی تئیں شرک ستی بچاویں۔ آمین ثم آمین ۔

فصل سب آدمی کے ہدایت کے واسطے اللہ تعالے نے بہت سارے پیغمبر آدمی ہی میں ستی بنائیں۔ سب ستی پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی تئیں میٹھی سے بنائیں اور سب فرشتوں کی تئیں اُن کی اور سجدہ کرکے سجدہ کرے کو کہن کہن **ابلیس** شیطان کی تئیں بھی حکم ہوا، سو اُس کمبخت نے سجدہ نہیں کیس سو ایسی واسطے راندا گیا اور مردود ہو گیا دیکھو اللہ تعالے کے حکم نہیں مانے ستی کیسا ہووے ہے، ابلیس جو کتنا بڑا بزرگ تھا سو ایک حکم کو نہیں مانے ستی راند ڈالا گیا۔ تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی پسولی پھر کر کے حضرت حوا کے تئیں اللہ تعالے نکالیں اور پھر ان دُوں کی بیچ میں میاں بی بی کا رشتہ کھڑا کر کے بکاح باندھ کر کے اِن دُوں ستی اللہ تعالے نے بہت سارے آدمی پیدا کیہن جن کے بیچ کچھ پیغمبر بھی ہوئیں۔ سب سے پہلے بڑے مشہور پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام ہوئیں، جن کے وقت میں بہت بڑا طوفان آیا تھا جو ساری دنیا ڈوب گئی تھی ان کے بعد اور بھی بہت سے پیغمبر جن میں ستی حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے پیغمبر ہوئیں، پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے اگلے بھائی سب، پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ذکریا علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام، پیغمبر سب اُن ہی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد ستی ہوتیں گئیں۔ جو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھوٹے بیٹے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم کو انڑی تھیں، اللہ تعالےٰ نیں اپنی قدرت کا تماشا اپنے بندوں کے تئیں دیکھلائن کہ حضرت مریم کے تئیں بنا شوہر کے بیٹا عنایت کیہن، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تب حضرت مریم کے قوم نیں حضرت مریم کے اوپر بوہتان لگائن اور طعنہ مارن کہ بنا باپ کے یہ بیٹا کہاں سیتی آگیا، تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو چھ دین کے تھیں اُن کی گود سی میں اللہ تعالےٰ کے حکم سیتی گواہی دیہن کہ ہم اللہ تعالےٰ کے ایک بندہ ہیں میرے کون اللہ تعالےٰ نیں کتاب دیہن ہیں، اور میری تئیں مبارک بنائن ہیں اور، جیتے جی ملک اپنے عبادت کا حکم کیہن ہیں، اور میری اماں سیتی نیک کار ہیں، اور اللہ تعالےٰ میرے تئیں ہتھیارا، سنگدل نہیں بنائن ہیں۔

فصل بڑے بڑے پیغمبروں کون اللہ تعالےٰ نے معجزہ بھی دیہن تھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے حکم سیتی مُردہ کوُن زندہ اور کوڑھی اندھلے کے تئیں دم بھر کے بیچ چنگا اور انکھیا، اندھا دیہن تھیں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ کے بیچ لوہا موم بن جاتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کا تخت ہوا کے اوپر اُڑتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تئیں یہ بیضا اور عصا ملا تھا یعنی جب کہ ہی وے اللہ تعالےٰ کے حکم سیتی اپنے جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر کے نکالیں تھے تو اُن کی تل ہتھی سورج کی طرح سیتی چمکنے لگی تھی۔ +

فصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل کی اولاد سیتی عرب کے ملک کے بیچ مکہ شہر میں پیغمبری کے ختم کرنے والے آخری پیغمبر اور آخری رسول حضرت **محمد** مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاین لگے پیغمبروں میں سیتی بعض بڑے بڑے پیغمبر جو تھے اُن کے اوپر اللہ تعالےٰ نے کتاب بھی اوتارن تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کے اوپر زبور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر توریت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر انجیل اوتارن تھا، ہمارے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر قرآن شریف اوتارن، پہلے پیغمبروں کی اُمت نے اپنے اپنے پیغمبر کے کتاب کی بیچ بیچ میں اپنے ہی سیتی بہت کچھ ملا جُلا اور، کم وبیش کر دیہن اسواسطے پہلے کتابوں کی اوپر کچھ بھروسا اعتبار نہیں، بلا اللہ تعالےٰ قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ خود اپنے فرمائن ہیں، اسواسطے قرآن شریف کے بیچ میں کوُ بھی کچھ ملا جلا اور کم وبیش نہیں کر سکا، اور قیامت تلک نہیں کر سکے گا، جس طرح سیتی اوتارن تھا اُسی طرح سیتی آج تلک قرآن شریف ہے اور قیامت تلک رہے گا۔ قرآن شریف اللہ تعالےٰ کا کلام ہے جس کو اس اللہ تعالےٰ نے اپنے فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھ سیتی اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر **وحی** کر کے اوتارن اسواسطے اللہ تعالےٰ کے اوپر اور اُن کے سب رسولوں کے اوپر، اور اُن کے سب فرشتوں کے اوپر جو اُن سب بھی اللہ تعالےٰ کے بندہ ہیں، اور نہیں وہ عورت ہیں، نہیں مرد اور اُن سب کتابوں کے اوپر جن کون اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبروں کے اوپر اوتارن سب کے اوپر ایمان لانا ہر مسلمان مرد عورت کے واسطے فرض اور ضروری ہے۔ +

فصل - دنیا کے بیچ میں جو کچھ جو آدمی کرے ہے سب کے واسطے ایک دین حساب کتاب کا ہے جس کون قیامت کا

دین کہن ہیں، اُسی دین سب کیسو کی بو، بھلے کام کا حساب ہووے گا، بہوت سارے مسلمان گنہگار بخشے جاویں گے ہمارے نبی صاحب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بہت سارے گنہگار اُمتی کی شفاعت فرماویں گے۔ اُس دین جو جو ذرہ ذرہ نیکی کا حساب ہووے گا، کافر اور مشرک لوگ دوزخ کے بیچ اوندھے مونہہ ڈھکیل دیے جاویں گے، نیک کار مسلمان اور جو گنہگار بخشا گیا ہووے گا وے سب جنت کے اندر جاویں گے، دوزخ میں بہوت طرح کا عذاب ہووے گا۔ جنت کے اندر ہر طرح کا آرام ہووے گا۔ ان سب بات پر ایمان لانا ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے۔ +

فصل۔ ہر مسلمان کے اوپر **چوبیس گھڑی** کے بیچ میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے **فجر** کے وقت دو رکعت **ظہر** کے وقت چار رکعت، **عصر** کے وقت چار رکعت، **مغرب** کے وقت تین رکعت، **عشا** کے وقت چار رکعت، جو نماز کے تئیں چھوڑ بیٹھا وہ کفر کرے ہے۔ اپنے دین کی عمارت کے تئیں آپلی ڈھاوے ہے، اور ہر سال بارہ مہینے کے بیچ بیستی ایک مہینہ رمضان شریف کا بھر مہینہ، روزہ رکھنا بھی فرض ہے۔ جو بیمار ہووے جب اچھا ہووے تب دوسرے مہینے میں قضا رکھے اور جو مال والا ہووے اور نصاب والا تو سال پورا ہووے پیچھے سونا چاندی یا مال تجارت کے اوپر مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ نکالنا بھی اُس کے اوپر فرض ہے جس کے پتے میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہووے یا ایک دو سرے کی کمی کے تئیں پورا کر دیوے تو وہ نصاب والا ہے اور جس کے تئیں اللہ تعالےٰ اینا دین ہیں کہ وہ مال بچہ کی ضرورت بھر گھر چھوڑ کر کے مکہ شریف تلک جا سکے اور رستہ بھی صاف ہووے بیچ میں ڈر خوف کی کو وبا بات نہووے تو عمر بھر میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ کا حج اُس کے اوپر فرض ہے۔ +

فصل۔ اپنے باپ۔ شوہر کے فرماں برداری کا حق ادا کرنا۔ برادری والوں، پروس والوں سیتی اچھا سلوک کرنا۔ بال بچوں کے تئیں اچھی تعلیم دینا۔ اپنے بدن اور اپنے بدن کے کپڑوں کے تئیں پاک رکھنا۔ یتیم۔ غریب۔ مسکین۔ محتاج پر رحم کرنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور کیسو کی بے قصور جان مارنا ظلم کرنا۔ مارنا۔ پیٹنا۔ مال چھین لینا۔ امانت کے بیچ خیانت کرنا اپنی جان کو ڈالنا۔ اور ڈاکا۔ چوری۔ زنا کاری۔ ڈاہ۔ حسد۔ کینہ۔ غرور۔ اپنے تئیں دُنیرے بیستی اچھا جاننا۔ دُنیرے کے تئیں اپنے بیستی بورا یا کمتی جاننا۔ تین دین بیستی کیسو مسلمان بیستی دل میں قصہ یا عداوت یا بغض یا کینہ رکھنا۔ کیسو کے تئیں کوسنا۔ کاٹنا ہر وقت تاکہ بھوں چڑھائے رکھنا۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت بیستی نراس ہونا۔ کیسو کا احسان نہیں ماننا۔ کیسو کے اوپر اپنا احسان جتلانا اور کیسو جاں کی تئیں اپنا دشمنگارا اور احسان مند سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اور ہر مسلمان کے اوپر بالکل حرام ہے۔ ان سب بات بیستی بچنا ہر مسلمان کے واسطے فرض ہے۔ اللہ تعالےٰ ہر مسلمان مرد۔ عورت کے تئیں نیک کام کی توفیق دیویں۔ اور ہر بورے کام بیستی بچاویں۔ اور اس فقیر **عماد الدین** کے تئیں جو شاہ برہان الدین کا بیٹا ہے اور اُن دونوں کے مائے باپ کے تئیں اور سب مسلمان مرد عورت جیتے موئے کون اپنی کرم بیستی بخشندہ ہویں۔ اور سب کے گناہوں بیستی درگذر فرماویں۔ اور موئے پیچھے اپنے حبیب، رسول کی شفاعت وآوزی فرماویں آمین ثم آمین۔

رباعی

یارب نگہِ عنایت ایدھر کردو — کانشاہے عمادؔ تم گلِ تر کردو
ہے رنگ گنہ سپتی رُخ اس کا کالا — تم غازۂ عفو سین منور کردو

تمام ہوا یہ رسالہ صراط مستقیم معروف بہ سیدھا رستہ بتاریخ ۲۲ ربیع الاول شریف بیچ وقت ظہر کے سنہ ۱۰۸۱ھ ایک ہزار اکاسی ہجری میں۔ ۵ +

الحمد للہ کہ این رسالہ در مدت دو روز حسب فرمایش اہل خانہ خود در زبان مروجہ دیار خود نوشتہ شدہ کہ مردمان و زنان ناخواندہ، اور زبان مادری ایشان ذریعہ معلومات ضروریہ دینیہ گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود۔ بنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ +

حضرت مصنف کے حالات جو تذکرہ الصالحین مصنفہ محمد حبیب اللہ صاحب عظیم آبادی میں مرقوم ہیں، ملخصاً درج ذیل ہیں (ص ۱۱۱ تا ۱۱۳)، "آپ کے حالات تذکرۃ الکرام اور رسالۂ معارف پھلواری بابت شوال ۱۳۳۵ھ میں مندرج ہیں۔ سال ولادت ۱۰۶۵ھ ہے، تکمیل تعلیم کے لیے اٹھارہ، انیس برس کی عمر میں دہلی گئے، اور نبیرۂ شیخ عبدالحق دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، اس زمانے میں حضرت سید محمد فاضل قلندر سادھوری سے فیض روحانی بھی پایا کیے، کچھ کتابیں باقی رہ گئی تھیں ان کی تکمیل کے لیے لاہور گئے، پچیس برس کی عمر میں اس سے فارغ ہوئے۔ اور دو سال وہاں کے مدرسے میں درس دیتے رہے، پھر سادھورے جا کر حضرت سید محمد فاضل قلندر سے بیعت کی، اور وہیں مقیم رہے۔ ۱۱۰۳ھ میں وطن تشریف لائے اور ۱۱۲۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ اور دو صاحبزادے، ایک ہشت سالہ دوسرے دو سالہ یادگار چھوڑے"۔

اصل نسخے میں بائے مجہول بالعموم یائے معروف کی طرح لکھی گئی ہے، کاتب معیار نے کہیں تو اسے اسی طرح رہنے دیا ہے، کہیں اصلاح کر دی ہے۔ وہ الفاظ جن کے املا میں کاتب کی غلطی کا امکان ہے، حسب ذیل ہیں:۔
اون، ان، اوس، اس، آوُر، اور، ناکھ، ناک، ہاتھ، ہاتھ، آپی، آپ ہی، میٹی، مٹی، بہوت، بہت
دُسرے، دوسرے، دُنوں، دونوں، بورا، بُرا، دیکھلانا، دکھلانا، پھیر، پھر،

مطبوعات جدیدہ

۱۔ دیوان معروف۔ از قاضی عبد الودود۔ ۲۔ دریاے لطافت۔ از قاضی عبد الودود۔ ۳۔ سحر بنگال از؟
۴۔ نیم بہار نمبر۔ از؟ ۵۔ مادر ہند۔ از آرزو جیلی۔ ۶۔ افکار عصریہ۔ از متعلم ۷۔ عیش اور اطالیہ از؟
۸۔ نکات الشعرا، از ق۔ ع۔ د۔

۱ دیوان معروف:۔ مصنفہ نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی، مرتبہ شاہ عبد الحامد صاحب قادری بدایونی، تقطیع ۵½×۸½ ص ۱۴ + ۲۲۰ + ۲۶ + ۲۶۰ (ملنے کا پتہ۔ عابد القادری مولوی محلہ بدایوں) قیمت عہ

معروف نے یوں تو حاتم و مظہر و درد کا زمانہ بھی پایا تھا، لیکن ان کی شاعری در اصل اس دور کی شاعری ہے جسے شاہ نصیر کے نام سے موسوم کرنا چاہیے، اس دور کے سب سے بڑے اُستاد نصیر تھے، ممنون احسان وغیرہ بھی اس دور کے اُستادوں میں شمار ہوتے ہیں، لیکن شاہ نصیر نے دہلی ہی نہیں بلکہ اودھ اور دکن میں بھی اپنی اُستادی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ ذوق نے اپنی اُستادی کا سکہ اس دور کے ختم ہونے کے قبل ہی بٹھا دیا تھا، اور مومن و غالب نے اس کے ختم ہونے پر نام نکالا۔ دہلی کی شاعری کے لیے یہ انحطاط کا زمانہ تھا، شاعری کا مرکز ثقل لکھنؤ کو منتقل ہو گیا تھا، اور دہلی کے شعرا عموماً لکھنؤ کے صاحب طرز شعرا جرأت و ناسخ کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ معروف کے دونوں دیوان میں تتبع جرأت و ناسخ کا اعتراف بکثرت موجود ہے۔ مرتب دیوان معروف کا خیال ہے کہ معروف درجۂ اول کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں، مصحفی سے لے کر نساخ تک جتنے تذکرہ نگار گزرے ہیں، ان میں سے ایک نے بھی ان الفاظ میں ان کا ذکر نہیں کیا جو درجۂ اول کے اساتذہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کی، اسے سے قطع نظر کرکے، اگر ان کے کلام کو دیکھا جائے تو وہ بھی انھیں اس مرتبے کا مستحق نہیں ٹھہراتا ہاں درجہ دوم کے اساتذہ میں، انھیں ممتاز حیثیت ضرور حاصل ہے، اور ان کا کلام خصوصاً وہ جو دیوان اول میں ہے لطف اور مزے سے خالی نہیں۔

کتاب کی ابتدا میں مرتب کا ۴۸ صفحوں کا مقدمہ ہے، جس میں معروف کے حالات بیان کیے گئے ہیں، اور کلام پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ مرتب نے مصنف کے حالات زندگی معلوم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، اور وہی باتیں لکھی ہیں جو متداول تذکروں میں ملتی ہیں۔ معروف کے اخلاف کے حالات البتہ مرتب نے زیادہ توجہ سے لکھے ہیں، حسب ذیل اقوال محل نظر ہیں: ۱۔ وفات کے وقت عمر ۸۰ سے متجاوز تھی، اس سلسلے میں خود مرتب کا دوسرا بیان پڑھیے کہ معروف کے والد عہد احمد شاہ میں ہندوستان آئے اور اسی عہد میں ان کی شادی ہوی، ۲۔ عارف جان نے دو لڑکے اپنی یادگار چھوڑے۔ آغا نے چار لڑکوں کا نام لکھا ہے، اور آزاد کا قول صحیح ہے۔ ۳۔ میرزا علی بخش خاں معروف کے اکلوتے

بیٹے تھے، میرزا طالب کے بیان سے جو کتاب میں شامل ہے اس قول کی تردید ہوتی ہے۔ خود مرتب نے ایک ہی سطر کے بعد لکھا ہے کہ مرزا صاحب مرحوم تو اب سرور الملک کے حقیقی چچا تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں بیانوں میں ایک ہی صحیح ہو سکتا ہے، لیکن طرہ یہ ہے کہ دونوں غلط ہیں۔ ۴۔ مرتب نے زمانۂ تصنیف دیوان کی تعیین کی بھی کوئی کوشش نہیں کی، دیوان میں ۱۲۳۳ھ کی لکھی ہوئی ایک مثنوی اور تسبیح زمرد مصنفہ ۱۲۳۶ھ شامل ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کم از کم ۱۲۳۶ھ تک کا کلام اس دیوان میں ہوگا، لیکن اس بنا پر کہ اس کے بعد دیوان دوم کی تصنیف کے لیے صرف ۶ سال بچ جاتے ہیں، اور یہ دیوان ضخامت میں دیوان اول سے کچھ بہت کم نہیں، یہ نتیجہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مرتب نے اس قلمی نسخے کے متعلق جس پر دیوان مبنی ہے سوا اس کے کہ میرزا نصر اللہ خاں نبیرۂ معروف سے حاصل ہوا ہے، کچھ اور لکھنا غیر ضروری سمجھا ہے۔

دیوان مطبوعہ کے اشعار کی تعداد ۲۹۲۰ ہے، بدیں تفصیل کہ غزلیات و مطلعات ۲۷۹۶، اشعار مثنوی ۶۲، قطعات و رباعیات ۶۲ (بعض اشعار ایسے بھی ہیں، اس عنوان کے تحت درج ہو گئے ہیں، جو نہ قطعہ بند ہیں اور نہ ان پر رباعی کا اطلاق ہو سکتا ہے)، تسبیح زمرد ۱۰۱، مخمسات ۱۸۶، آشفتہ اور ذوق کے لکھے ہوئے دو قطعے بھی شامل دیوان ہیں،

مرتب دیوان نظری حیثیت سے مرتب کے فرائض میں کن باتوں کو داخل سمجھتے ہیں، اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن عملی حیثیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کا فرض قلمی نسخہ خواہ وہ مکمل ہو یا ناقص، صحیح ہو یا غلط، کاتب کے حوالے کر دینے پر ختم ہو جاتا ہے، اب کاتب جانے اور کتاب، سپردم بتو مایۂ خویش، اب تو اتنی حساب کم و بیش را، ایسی صورت میں اگر کتاب اغلاط سے مملو نہ ہوتی تو تعجب ہوتا، کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والے کو بہ آسانی پتا چل جاتا ہے، بہت سی ایسی ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور کچھ ایسی ہیں کہ غور کرنے سے بھی ان کی تصحیح نہ ہو سکی۔ ہم نے ایسے اشعار کو جن میں غلطی کا احتمال ہے، اکٹھا کر دیا ہے، اور تبصرے کے آخر میں ہم انھیں درج کریں گے وہ الفاظ جو غلط یا مشکوک ہیں، ان کے نیچے نشان کھینچ دیا جائے گا، اور ان کی جگہ پر جو الفاظ ہم تجویز کرتے ہیں، وہ قوسین کے اندر جگہ پائیں گے۔ بہت سے اشعار جن میں یائے مجہول و معروف اور اسی قبیل کی معمولی غلطیاں تھیں ہم نے طوالت کے خوف سے درج نہیں کیے، اس پر بھی رسالے کے بہت سے صفحات ان اغلاط نے لے لیے ہیں، جہاں تک ہمیں ان کے مقدمے سے پتا چلتا ہے مرتب کے پیش نظر صرف ایک قلمی نسخہ تھا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ غلطیاں بہت رہ گئیں، دوسرا یہ کہ متعدد غزلیں اور اشعار جو دیوان اول کے دوسرے نسخوں میں داخل ہیں، مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے، یہ اشعار ایسے

لہ تذکرہ گلشن بیخار شیفتہ مطبوعہ نول کشور طبع دوم، اشعار معروف منتخب از دیوان اول ص ۱۴۰ تا ۱۴۱، قلمی نسخہ دیوان معروف در تصرف راقم سطور۔ غزل اس میں دیوان میں ہے، مقبول اس زمین میں دیوان میں نہیں ہے۔۔۔ تذکرۂ مصحفی، م، اگر کسی شعر کے قبل ہندسہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ بشمول شعر مندرجہ اس قدر شعر حافظہ میں موجود ہیں، بقیہ اشعار کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

بھی نہیں جن کے متعلق احتمال ہو کہ مصنف نے نظر ثانی میں نکال دیے ہوں گے :۔

کی وصیت یہ کچھ ارمان بھری آہ کہ رات — سلسلے گھر کو تجھے بیمار نے سونے نہ دیا (ش +)
چشم تر سے گرہ آمژگاں پہ پانی پھر گیا — اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں پہ پانی پھر گیا (ش -)
کہتا ہے جب وہ ہنس کر بے گریہ اختیاری — آتا ہے اور مجھ کو بے اختیار رونا (ش -)
سوگئے جو اس کی ہم دیوار کے سائے تلے — ہم کو اس تقصیر پر اس نے بٹھایا دھوپ میں (ش +)
آپ بیتی قسمتوں کی قسم کھاتے ہیں — ہم نصیبوں کی قسم کھاتے ہیں (ش -)
دیکھ کر فتراک اس خوش قد کی کہتی ہے نسیم — جان یہ کس نے تن سرو سہی میں ڈال دی (ش +)
دوسرے میں لگے حسن دل لگانے کا مزا — اس کا گھسنا اور لگانا دوسرے پہ بھی تو ہے (ش +)
کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل — کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جلے ہے (ش -)
تو ایک مجھ سے کاش وفا کر بھلا زیں — مقدور کیا جو کوئی تجھے بے وفا کہے (ش -)
لاغر ہوں یہ کہ سب سے باریک ہیں میں — گر میرے دست و پا کو کوئی دست پیا کہے (ش -)
عمر آخر ہو چلی قاتل نہیں ملتا کوئی — کاٹ ڈالوں جی میں ہے اپنا گلا تلوار سے (س -)
واں زخم جگر پر بھی ترحم نہیں کرتے — کیا فائدہ پھاڑا جو گریباں کسی نے (ش -)
۲ صید شاہیں کو ہے ہوں میں اسیر الفت — ذبح کرتا ہے مجھے جو کہ چھڑاتا ہے مجھے (ش -)
ہائے اس شوخ کا یوں روٹھ کے جانا معروف — اور یہ کہنا کہ ہمیں اب نہ منائے کوئی (ش -)
۲ ہم تو چھوٹے ہیں محبت میں مگر — استخواں بھی نہیں کرتا کوئی (ش -)
بعد مرنے کے بھی بیری سیہ بختی کی داد — نعش کے ہمراہ تھا وہ موئے سر کھلا ہے (ش -)
دم بدم پاؤں سے تو ہم کو نہ ٹھکرا چل جا — خیر ہم دیکھ چکے قدر تری پا اچھی ہے (ش -)
کس کی چشم شرگیں نے بے اجل مارا مجھے — سر پہ میرے جو قضا آئی تو شرمائی ہوی (ش -)
معروف اب تو دیکھنے ہو تم ہمیں غریب — مٹ مٹ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھیے (ش - ح)
دور جو بزم میں وہ آن کے بیٹھے ہم سے — کیا ہی پھبتا ئے کہ اگر بیٹھے ہیں کیوں نہ ہوئے (ش -)
روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے لیکن — مڑکے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے (ش -)
تا تواں مجھ سے کو کس طرح کرے قاتل دو — ہوں میں وہ عجز کہ آلہ تیز ہی ہو جائے (ش +)
کیا چھٹی اس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے — ہاتھ ملتا ہوں گئی سونے کی پڑیا ہاتھ سے (م -)
خون فرہاد نے بیرنگ نہ چھوڑے پتھر — لعل و یاقوت کیے کوہ کنے روڑے پتھر (ح +)

	غیر ممنوں کے ہی ٹوکوں نہ جھوڑے پتھر	تیرے دیوانے کو مارے نہیں تھوڑے پتھر	(ح +)
	ہر اگ سو تختہ لالہ پڑا دے ہے گلشن میں	کوئی دینی ہے تیری اوصبا سر چنگ آتش	(ح +)
	کہوں کیا کچھ نہ پوچھو اس بت بے پیر کا عالم	کہ بوٹا سا ہے قد اور شکل ہے تصویر کا عالم	(ح +)
۵	اول تو میں اکتا نہیں اور جس سے، کوں میں	نامشریہ ممکن نہیں پھر اس سے پھروں میں	(ح -)
۲	اُن کے گھر ہم ڈرے جا سو سو کی جائے نہیں،	جی تو چلتا ہے بہت پر دل چلا سکتے نہیں	(ح -)
۸	چپکے چپکے ایک تو ٹپس آپ جانی اور دن ہے	تس پر الٹی ہم کو تہمت آگے لگانی اور دن ہے	(ح -)
	کس برق وش کی تیغ نگہ نے کیا شہید	ہم سرد ہو گئے دل افگار گرم ہے	(ح +)
	کاہک ہوئی تھی جیسے کہ یوسف کی پیرزال	یوں آج یوسف اس کا خریدار گرم ہے	(ح +)
۴	یوں نگہ دل پہ پڑی داغ جگر کے ہوتے	کھائی تلوار صد افسوس سپر کے ہوتے	(ح -)
	ہم نے دیکھا نہ کچھ مگر دھوکا	سو بھی تیرے سوا دیا کس نے	(ح +)
۵	مژگاں کی چشم یار کے ہے بات میں چھڑی	لے دل کہیں نہ مارے اشارات میں چھڑی	(ح -)
	ہے دل میں ذلف یار کے عالم کو دیکھیے	پھنستے ہیں آپ دام میں ہم ہم کو دیکھیے	(ح -)
	میں ہی نہیں ہوں شیفتۂ حسن گندمی	آگے سے ہوتی آئی ہے آدم کو دیکھیے	(ح -)
۳	خوبرو لاکھ جہاں میں کوئی ہشیار چلے	پر تجھے دیکھے تو تنکے سر بازار چلے	(ح -)
	نہیں میری جبیں پہ خاک شفا	درد سر کی دوا لگا دی ہے	(ح +)
	محویاں تک ہوں تصور میں ترے از شوق	ہاتھ ہر دم ترے داماں کی طرف جاتا ہے	(ح +)
	جوش طغیانی باراں ہے فضا اچھی ہے	مے پرستی کے لیے آب و ہوا اچھی ہے	(ح -)

خاتمہ دیوان کے بعد نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کی ایک تقریظ ہے جس میں معروف کے حالات درج ہیں اور آزاد کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ معروف ذوق سے اصلاح لیا کرتے تھے[۱] اس کے بعد جناب احسن مارہروی کا تبصرہ، ایک اور تقریظ اور چند قطعات تاریخ ہیں۔

مرتب نے اس کی امید دلائی ہے کہ حالات مساعد ہونے پر دوسرا دیوان بھی شائع ہوگا، ہم انھیں مشورہ دینے کی جرأت کرتے ہیں کہ اول تو وہ جتنے قلمی نسخے ممکن ہو سکے، فراہم کریں، دوسرے یہ کہ کاپیوں کی تصحیح ایسے لوگوں کے ذمے کریں جو شعر فہم ہوں، ورنہ جس طرح انھوں نے دیوان اول شائع کیا ہے، اس سے تو دیوان کا پردہ گمنامی ہی میں پڑا رہنا بہتر ہے،

[۱] طالب مرحوم کی تقریظ کے بعض مقامات مرتب نے حذف کر دیے ہیں، ہم ان کی تقریظ کے خارج شدہ حصے آیندہ شائع کریں گے۔

ص ۱ ؎ روشن ہے چراغ اس کفر دیں کا (کفر دیں) ص ۱ ؎ کہاں جوں شمع فانوسی چھپے ہے (جوں) جوں کی جگہ چوں کاتب نے کئی جگہ لکھا ہے۔

ص ۲ ؎ لے نہیں سکتا ہے یک کروٹ بھی اے معروف آہ۔ ہاتھ سے افتادگی کی ہے یہ حال نقش پا (ایک) (ے) اس قسم کی غلطیاں بکثرت ہیں۔

ص ۳ ؎ دونوں جہاں میں خاک ہے یار اس پاشت کا (پشت) ص ۳ ؎ تیرا خال لب اے جان دو عالم نقطۂ کون ہے (ترا)

ص ۳ ؎ تیری دوری میں لے دریائے خوبی دل یہ مضطر ہے (تری)

ص ۴ ؎ مخنسب مستوں سے ابھایہ بھی کچھ بھیجا نہ تھا (بیجا)

ص ۴ ؎ اے ہفتہ دوست کی غلطی پہ مت جا اے رقیب ؎ چار دن کی بات ہے یاروں سے بھی یارانہ تھا (کے غلطی)

ص ۴ ؎ کیونکر ہو اس سرو قد سے مدعائے دل حصول (کیونکہ)

ص ۴ ؎ پہلے اے معروف صورت کا تماشا دیکھیے ؎ پھر وہاں سے کیجے قبلہ قصد بیت اللہ کا (سورت)

ص ۵ ؎ اور تو باتیں بری چھٹ کیں سب بیتے جی ؎ آنکھ مندے پر نہ چھٹا ایک مگر دیکھنا (پر چھٹا)

ص ۶ ؎ شب وصل ہے لے سحر گو تو سوی دوں (کہ) ص ۶ ؎ سحر کہ خواب سے اٹھا تو تھا دوران سر مجھ کو (اٹھا)

ص ۸ ؎ دل تاب و طاقت بھی اگر ملتا ہے تو ؎ عدم کو کوچ ٹھہرا ہے ترے بیمار ہجراں کا (ہے)

ص ۹ ؎ بڑا سنتے تھے ہم روز قیامت اور روز حشر ؎ قیامت ہے بڑا نکلا جو دیکھا روز ہجراں کا (رسے ؟)

ص ۱۱ ؎ پھر آیں بزم میں کیسوں تو تیر ابیز کروانا (تیر آویز) یہ ترکیب کلام معروف میں کئی جگہ پائی جاتی ہے۔

ص ۱۱ ؎ اٹھاؤں ہاتھ گر اب تیرے گھر کے آنے والے پر ؎ تو میری قبر پر بھی ہاتھ اٹھانے تو یہ ٹھہرانا (نہ پھر آنا ؟)

ص ۱۲ ؎ دل دیوانہ تبلا اس خیال چشم آہو کو ؎ پھرا جو دشت میں تو کھرے کھرے ہاتھ کیا آیا۔ (کھرے کھرے)

ص ۱۲ ؎ کرے انجم پہ کب یہ مرغ دل بن خال مہ و یاں (گرے) ص ۱۳ ؎ تو مجھے معروف ہم وہ جانیں سخنور ہو گیا۔ (وہ نہ ایہ ہے)

ص ۱۴ ؎ بعد ایک عمر کفن ہاتھ آیا (یک) ص ۱۴ ؎ کیا کرتے تھے باہم قہقہے جوں قلقل مینا (جوں)

ص ۱۶ ؎ لطف کیا جانے کور کر میرا کو رو کر) ص ۱۸ ؎ بناوٹ کی لگاوٹ ہے سمجھتے ہیں نہ ہم چھینٹا (یہ)

ص ۱۹ ؎ بالی مجھ کو بھر کر جام پر نے جا مے ساقی (پیا پے) ص ۲۲ ؎ تجھ سا کچھ لے چشم ہنا نہ دیکھا (پہ)

ص ۲۲ ؎ کبھی ہم سے سوائی اپ تنگ کرنے ؎ جہاں میں کوئی ہم سا سوا نہ دیکھا (ننگ)

ص ۲۲ ؎ خسرو دل ان سے چھائی جہاں میں ؎ کہیں عشق بازی کا چرچا نہ دیکھا (ایسی)

ص ۲۳ ۔ دل کو دیوان فغاں نے جو پڑھا بالائے عشق + کیا ستم تو نے یہ اس طفل پہ اُستاد کیا (فغانی)
ص ۲۴ ۔ آنکھ تک موند نے دے حیرت عشق + ایسی ہیں ٹکٹکی سے در گزرا (ملک)
ص ۲۶ ۔ ہم بھی لے معروف نہاں کرے بیٹھتے ہیں دل و سینہ ہوف + جب سے سُنا کماں ابرو کو اں شوق پہ تیر اندازی کا (یہاں کرے بیٹھے)
ص ۲۵ ۔ نقش و نگیں کی صورت پابند نام معروف + کب تک، بیگا یوں ہی لے، و سیاہ بیٹھا (نقش نگیں)
ص ۲۸ ۔ جب پر زہر مژگاں تیر ہے اے سیمبر کانٹا (سیمبر) ص ۳۲ ۔ ڈالتی پھلے تو گردوں میں کند (پھلے)
ص ۳۳ ۔ یہ کبھی اچھا نہ ہوتا عمر بھر اچھا ہوا (بھر) ص ۳۰ ۔ ہواں گیا سو مرا ہی ہمدرد ہو گیا (میرا)
ص ۴۲ ۔ یہ ہی ہے ہاتھ سے کس ظالم اظلم کے کام آیا (ہے) ص ۴۴ ۔ مفت برکون سا بیٹھا تھا میرے پہلو میں (مرے)
ص ۴۴ ۔ کبھی ایک چھڑکی نہ دی تھی سو یوں + سنو گالیاں اب سُناتے ہیں آپ (سو اں بھی سیکڑوں)
ص ۴۵ ۔ پر ہے ترے، روبرو اے فیرت گلعذار چپ (ترے، گلزار)
ص ۵۲ ۔ میری چاک جیب کے گرد پھرتے ہیں تم کو سیر (کی دیکھنی ہو) لفظ سیر معروف کی زبان پر مونث تھا۔
ص ۵۵ ۔ معروف آپ روتے ہیں سیلاب دیکھ کر + سابق ہیں کر گئے تھے جو ہندوستاں کی سیر (آج؟)
ص ۵۶ ۔ نلف و بروے دو کیا ہیں مصرع موزوں ہیں چار (ہی)
ص ۵۷ ۔ جام مصباد نے گلیاں مسی و رنگ پاس + یہ یہ کیفیت مرے زیب لب میگوں ہیں چار (ترکے)
ص ۵۰ ۔ میر و انشا و نصیر الدین و جرأت اور تم + جس طرح ہوں چار عنصر آج باہم۔ یوں ہیں چار (ہم)
کیوں نہ لے معروف ہو آباد اقلیم سخن + دوست باہم بادشاہ معنی و مضموں ہیں چار
(میر انشا) یہاں چار شاعروں کا بشمول معروف ذکر ہے، میر اور انشا کے درمیان اگر واور لکھا جائے تو پانچ ہو جاتے ہیں۔
ص ۵۸ ۔ آئینہ سازوں کی اب ہر یک دوکاں ہے مرے مصر (دکاں) ص ۵۹ ۔ اسی معروف کو ہم سو چھپائیں کب یہ چھپتا ہے (اسے، گو)
ص ۶۱ ۔ کرتا ہے نہ کچھ سوئے عدم تو ہی سفیر پیش (سفر) ص ۶۵ ۔ کام پروانے سوا رکھے نہیں بعل سے شمع (رکھتی)
ص ۶۶ ۔ لاکھ میرا ایک طرف ایک (س دل کی چاہ) ایک طرف (قہر)
ص ۶۰ ۔ عاشق کس دن کو رکے ہیں تو نے کروں تجھ کو لے دیہ تر تصدق + کہ آیا ہو مہماں غم یار اور تو + نہیں کرتے، دو، کے گو ہر تصدق + (کرتا)
ص ۶۶ ۔ یعنی پھر اکسیر بھی ہو جائے گر سیماب خاک (ہے)
ص ۶۹ ۔ دو نہیں معشوق عاشق شمع پروانہ کو دیکھ۔ (شمع و پروانہ)

ص ۷۴ ؎ غنچہ تو گوش گیر ہے زباں لال تنگ چشم (کر)
ص ۷۵ ؎ ایسے دیوانے نہ تھے گھر میں جو ڈرے، کھتے ہم (در)
ص ۷۶ ؎ عجب نہیں جو نہ دے اُٹھ کر نقش پا تعظیم۔ (کے)
ص ۷۸ ؎ اب جو نہیں کی تو جان لو پھر ہم نہیں۔ (تو یہ جان)
ص ۷۸ ؎ جب، ہاتھ کو باقی یہ گنہگار یہاں۔ (گنہگار)
ص ۷۹ ؎ جنھوں کی فرصت ایک دم پہ ہے نگاہ یہاں۔ (یک)
ص ۷۹ ؎ عاشقوں کے کیونکہ دل داشد کرے تصویر کے۔ (کی)
ص ۸۱ ؎ فلک کے ہاتھوں جدھر منھ اُٹھائے جاتے ہیں ؛ ادھر سے جوں گل بازی طپانچہ کھاتا ہوں۔ (جاتا ہوں)
ص ۸۱ ؎ تو اپنی آنکھ کو روکے میں سمجھا تا ہوں (سمجھاتا) ص ۸۲ ؎ مشتاق دیدہ چوں گل خورشید رو کریں (رجوں)
ص ۸۳ ؎ ڈرے اس احوال کے پہ مژگان کف دست دعا ہو حشر تک حرف دوئی آوے نہ یارب درمیاں۔ (اھول)
ص ۸۴ ؎ غلط ہے پشت فلک کو جو خم سمجھتے ہیں ؛ تو زمیں پکڑی ہے اس بل نے ہم سمجھتے ہیں۔ (بل)
ص ۸۵ ؎ جہاں سے لیتے ہیں کروٹ عدم کو چلتے ہیں ؛ مکان عشق کے بیماریوں بدلتے ہیں (مکان عشق بغیر اضافت)
ص ۸۵ ؎ کہ دن دھاڑے ہے چھاتی پہ مونگ دلتے ہیں (یہ) ص ۸۵ ؎ اگرچہ خاک ہیں پر شکل تو تھا معروف۔ (تو تیا)
ص ۸۶ ؎ بخدا وہ خدا کا دشمن ہے ؛ جو کہ ہے یہ شکال دروبیشاں۔ (بدسگال)
ص ۸۸ ؎ لگے آنے جو لخت دل ابھی سے تیز تر میں یار ؛ تو آگے دیکھیے ہاں اب وہ کیا کیا گل کرتے ہیں۔ (آگے)
ص ۸۸ ؎ گنا ہگار، اس گھڑی سب ہم کو ٹھہراتے ہیں حاکم کار (گنہگار)
ص ۹۰ ؎ خطر کی بات جو سوتے بھی ہیں تو وہ ہشیار سوتے ہیں۔ (وہ زاید ہے)
ص ۹۰ ؎ انھیں تیری گلی تھا ایسا پھر نا نیک تکیں ہے ؛ جو معشوقوں کے زیر سایہ دیوار سوتے ہیں (اے سایہ ننگ)
ص ۹۲ ؎ نظر تیز تر ہی دیتی ہے جو برق جلا ؛ خرمن وہم و خیالات و گماں نخر الدین۔ (جس)
ص ۹۵ ؎ وقت پیدائش کے کر یاں اس لیے ہوتے ہیں طفل (گریاں)
ص ۹۵ ؎ ہم بھی کوئی روز عالم سا تھ لیتے آئے ہیں۔ (زور)
ص ۹۵ ؎ جوں حباب اک دم کے ہیں پھر ہماں میں یہاں (میہماں)
ص ۹۶ ؎ کس طرح لوگوں میں حال راز میں تم سے کہوں۔ (زار)
ص ۹۷ ؎ سرگیں اس کی ہمیں یاد جو آئیں آنکھیں ؛ جب تلک بزم میں بیٹھے: اُٹھائیں آنکھیں (شرگیں)
ص ۹۸ ؎ بے بھی رونا اگر لے دیدۂ گریاں تو پھر ؛ سوجتا ہے اس کی نظروں سے گرا دونگے ہیں۔ (سوجھنا)

ص ۱۰۱ ؎ پروا نہیں ہے کچھ مجھے نام و نشان کی + پرگندہ دل جہاں میں ہوں نقش و نگیں سے میں۔ (پرگندہ)
ص ۱۰۱ ؎ معروف ہوں گدا میں در شاہ مرتضیٰ (گدا ئے)
ص ۱۰۳ ؎ سمجھ کہ مانگو کہا بی کی ہاں دکاں نہیں (کے، یاں)
ص ۱۰۵ ؎ دم بدم ڈھلتی رہے جیسے مناروں کی چھاؤں۔ (میناروں)
ص ۱۰۶ ؎ بشرہ بشر کا دیکھ کے کہتے ہیں ہند کو (پسند)
ص ۱۰۹ ؎ معروف درس عشق میں جاتے ہی ایک بار + ہم نے خرد کے طاق پہ رکھا کتاب کو (کی)
ص ۱۰۸ ؎ کیونکر تلاش در بدر کو بکو نہ ہو (در بدر و کو بکو)
ص ۱۰۸ ؎ سن کے کہا کہ کہہ بکو اُن سے میں نے مزا بس بھر پایا (کہ زاید)
ص ۱۰۹ ؎ اضطراب دل سے تیشہ اپنے سر پر مار کر + ہم سے بنک حاشقاں چاہے ہے اب کیا داد تو (ننگ)
ص ۱۱۲ ؎ ستم کشوں کو ہے تیرے نفس شماری آج + بس اب تو ہاتھ کہیں جور بے حیات سے دھو (بے حساب)
ص ۱۱۷ ؎ پھرتے ہیں یاں تک اس کے خریدار ساتھ ساتھ + گویا لیے پھرے تھے وہ بازار ساتھ ساتھ (ہے ؟)
ص ۱۲۳ ؎ غنچہ سا منہ کو بھی ڈالا نہ گریباں میں کبھی۔ (ساں)
ص ۱۲۴ ؎ آنکھ جھپکی ہو اگر ایک پل شب ہجراں میں کبھی (گراک)
ص ۱۲۶ ؎ بے تامل تاج تخت خسروان دے دوں ابھی۔ (تاج و تخت)
ص ۱۲۹ ؎ لب پر فغاں بغل میں دل آزار گرم ہے (زار)
ص ۱۳۰ ؎ روز پکا لگا دیا تو نے (زور) ص ۱۳۰ ؎ خیر و شر کو ہم اسی پہ دھر چلے (پر)
ص ۱۳۶ ؎ جو رسم مہر الفت یک بار بھول جائے۔ (مہر و الفت)
ص ۱۳۷ ؎ رہنما ہے یہی اور یہی تیرا ہادی ہے۔ (یہ ہی ترا)
ص ۱۳۷ ؎ ایسے خام کو لکھوں خاک کتابت معروف + قاصد وہ ہم بھی جائے تو وہ گھائل آئے۔ (قاصد و ہم)
ص ۱۳۹ ؎ شرمندہ بھرے نہیں قطرے کی جوں حباب (کے) ص ۱۴۰ ؎ جو تیرے پاس ہوائے خاخراب تو دے (خاخاں)
ص ۱۴۰ ؎ کیوں نہ ہو ممنوں سیل اشک میرا چشمۂ زار + اس کے کوچے کی طرف تنکا سا بہتا جائے ہے۔ (جسم)
ص ۱۴۴ ؎ کہ ہم کو یاد شرگاں میں کسی کے ملا نا ہے۔ (تملانا)
ص ۱۴۵ ؎ کہ حرف صلح میں گر خط میں لکھا تو تھا بگڑتا ہے۔ (تھا زاید)
ص ۱۴۰ ؎ دیا نقشہ جو اس نے کھینچ کر بہزاد اس کو تو اگے، کہ کے آئینہ وہ بولا یوں نہیں یوں ہے۔ (اس کا)
ص ۱۴۹ ؎ کیونچتا ہے یار کی کلک تصور سے شبیہ (یار)

ص ۱۵۰ ← واقعی معروف وہ ہے کہ گئے ہیں زندگی۔ (وہی)
ص ۱۵۰ ← کہا گیا ہے اب اس کا اثر خدا جانے (کہاں) ص ۱۵۴ ← کہانی آج ہے میرا قلم سحر آفریں (مانی)
ص ۱۵۵ ← سُنا گئی ہیں جو معروف کی فغاں شبِ روز ← ازیں سبب مرغ حافظ چو بیدلاں شب و روز۔ (کہے تھیں)
ص ۱۵۵ ← مار پہلو میں مرے دشتہ و خنجر لاکھوں (دشتہ) ص ۱۵۶ ← نے ربط ہے مجھ کو قد و لجے کسی کے ← کچھ واسطہ ہم کو نہیں گلزار سے کسی کے ← واقف نہیں چشم و لب و ابرو سے کسی کے۔ (نہ گل، و؟)
ص ۱۵۶ ← ہم عشق بتاں ترک ہی کر بیٹھے تھے کب کے ← لگ چلتے نہ تھے اور کھچے رہتے تھے سب سے۔ (سے)
ص ۱۵۸ ← نہ آپ میں ہے نہ معروف بیشِ و ساماں۔ (یہ لبِ سرو ساماں)
ص ۱۵۹ ← راضی ہے نیری خو سے خفا اور خفا سے ہم۔ (جفا)
ص ۱۶۰ ← وائے وا سوزِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک۔ (واہ وا)
ص ۱۶۱ ← کچھ تو کہہ لے بت اغیار کہوں یا نہ کہوں۔ (عیار)
ص ۱۶۳ ← لے دلِ چشم تو گر حقیقت بیں ہے ← چشمے بکشا ببیں حقیقت بین ہست (این ہست)
ص ۱۶۴ ← جس شخص کو چاہتا ہے اپنا دل وہ چاہ کا مطلق نہیں ہے مائل۔ (مصرع اول ناموزوں ہے کے بعد یوں کا اضافہ ہونا چاہیے۔)
ص ۱۶۵ ← خاموش ایک ہی رباعی کہکر ← ناچار بچھا کے چارپائی سو رہ۔ (خاموش ہوا یک)
ص ۱۶۵ ← ہر گل میں بو ہے بو میں ہے گل ← دیکھ لے بہار کیا گل میں جڑ ہے جڑ میں ہے گل دیکھ لے بہار ← (کل، جز، جز کل)
ص ۱۶۵ ← مرے سر پر جو رکھ کر پاؤں مجھ کو دفع کرتے ہیں ← مناسب تھا اگر اس پاؤں میں موزا چڑھا لیتے (پاؤں)
ص ۱۶۵ ← سو اب چلو ادھر ہے آخر ہر رنگ شبنم (ہی) ص ۱۶۶ ← ہم تو مر جاتے کچھ کے زیست کی ہے یہ وجہ (وجہ یہ)
ص ۱۶۶ ← ان کو نرگس نے جو گلشن میں اشارے سے کہا ← سچ ہے اے بت بے باک ترمی آنکھوں میں۔
← گھور کر بولے یہ قدرت تری سیقل بانسے ← ہم کو تو ٹوکتی ہے خاک ترمی آنکھوں میں۔ (شقل بانوی)
ص ۱۶۷ ← معلوم ہو گیا ہمیں احوال آپ کا ← غافل ہے جو کوئی اسے نکتہ کتاب ہے (عاقل نقطہ)
ص ۱۶۹ ← ناصحا کر پیرہن کے واسطے ہو عیب چاک ← باوجود حسنِ گل کا ہے کو رکھ جیب چاک (گر حسن نیز اطافت)
ص ۱۷۱ ← عزیزو شب جو یاں مستی میں اکثر لیس آتا ہے ← (اگر دیس لگاتا ہے)
ص ۱۷۲ ← چھنوں کو بیتے ہی زلف سیاہ مرغوب ہوتی ہے (سیہ)
ص ۱۷۳ ← عشق کے نام جو ہیں یہ سب حرف ← (عشق کے نام میں جو تین ہیں حرف)

ص ۱۷۵ ؎ ننگ و ناموس کو مت کرتہ خاک + (ناموس)

ص ۱۷۵ ؎ لاکھ لپٹے پر کروں میں جبر (ناموزوں ہے) اب یا اس قسم کا کوئی لفظ

ص ۱۷۶ ؎ اس نے پڑھنا کوئی سیکھا تھا عمل پڑھنا ص ۱۷۹ ؎ گاہ ہاتھوں سے بجھائی آتش - گاہ بستر میں لگائی آتش (بجھائی، لگائی)

ص ۱۷۷ ؎ کہ نہ کچھ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو (کچھ نہ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو۔ یا کہ نہ کچھ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو)

ص ۱۸۰ ؎ دشتِ شوق کے نکیں کی قسم (تکیں) ص ۱۸۱ ؎ کہ سمجھتا تھا اس کا مشکل کام (سمجھنا)

ص ۱۸۲ ؎ صائب و شوکت ظہیر و کلیم (صائب و شوکت و ظہیر و کلیم) ص ۱۸۳ ؎ بس کہ رائے حق و باطل ہے (واسطے)

ص ۱۸۴ ؎ لکھتے ہیں کچھ نہیں وہاں اور یہاں۔ (یاں) اس قسم کی غلطیاں اور بھی ہیں۔

ص ۱۸۴ یعنی کھولی کے بھی محل کو چھوڑ، (محل کو بھی)

ص ۱۸۵ ؎ آپ ہی دل میں رہو اپنے مخیل (رہوں) ص ۱۸۹ ؎ جس کو صید افکر مضامین رہے۔ (سدا)

ص ۱۸۶ ؎ جائیو اجمیری ہی دروازہ سے روک تو ہے واں بھی پر اندازے سے (جائیو دروازے، اندازے)

ص ۱۸۶ ؎ پوڑی والی کی دوکاں پہ الگ (دکان پر) ص ۱۸۷ ؎ جس سے کہ شرمندہ قصر بہشت (شرمندہ ہو قصر بہشت)

ص ۱۸۷ ؎ دکتے پائے نہ اس لیے چوبدار۔ (نہ لے چوبدار)

ص ۱۸۸ ؎ آپ سے مت سمجھ کچھ دور ہوں (سمجھو کہ یا سمجھیو) ص ۱۸۹ ؎ ان سخن کے معروف اب (سخن کو مرے)

ص ۱۹۰ ؎ تا نشیبی زندگانی مشکل بہت (نیری) ص ۱۹۰ ؎ اور ہے تقریر فرمانے لگے (ہی)

ص ۱۹۲ ؎ ہو گئی اس سرو قد پہ فاختہ (پر) ص ۱۹۶ ؎ سب اطبا ایک قلم حیران کار، (یک)

ص ۱۹۷ ؎ کاہ ہشیار آئے کاہ دیوانہ آئے (گہ) ص ۱۹۸ ؎ الغرض ہنگامہ آرائی یہ تھی، وہ قضائی کارفرمائی نہیں تھی (آدائی)

ص ۱۹۹ ؎ پھر لگی کہنے کہ اے حیران کار، خلق کو کب ہے خدا پر اعتماد (اعتبار)

ص ۱۹۹ ؎ آپ ہی انصاف کر بولے خریں (کر یو؟) ص ۲۰۲ ؎ دیکھ کر اس طبع کرم التجا۔ (گرم)

ص ۲۰۵ ؎ اہل ماتم کا زبس غوغہ ہوا (غوغا) ص ۲۰۷ ؎ گاہ بہاتے چشم سے دریائے اشک (گہ)

ص ۲۰۷ ؎ تھی اور اثبات کو وہ شاہ دیں + کر دکھانے تھے وہاں عین الیقیں۔ (تھی)

ص ۲۰۸ ؎ جس سے دل بستا خاسب کا دمبدم۔ (بستا تھا)

ص ۲۰۹ ؎ چاک دامن تک گریباں چاک تھا دل گداز وہ یہ ویران تھا۔ (میر تناک)

ص ۲۰۹ ؎ تھی وہ عرق عنبریہ ساحل پہ تھا (عرق) ص ۲۰۹ ؎ تبر میں ناچار اس کو گاڑ کر (گاڑا)

ص ۲۰۹ ؎ گو رکھتی تھی اسے در گور تو۔ (کہتی)

ص ۲۱۴ ← کیا کہوں اُڑ گئی طوطی سی مرے ہاتھ سے، رات (گئے طوطے سے)
ص ۲۱۵ ← ہے چشم سبزہ رنگ نشے میں مدام سُرخ + یا سُرخ مے سی ہے پہ زمرد کا جام سُرخ، (سے ہے یہ)
ص ۲۱۶ ← ہے صدا اس آئینے میں جلوہ گر طوطی کا عکس۔ (سدا)
ص ۲۱۶ ← ساقی نہیں ہے سبزہ مینا سے کیا غرض۔ (ہمیں)
ص ۲۱۷ ← مہدی کا اب تلک نہ سُنا تھا مزاج گرم۔ (منہدی)
ص ۲۱۸ ← اس سبزہ رنگ سے جب کھو بیٹھے راز کچھ ہم (کہو سینگے)
ص ۲۱۸ ← کہو سے ہے ہر سبزہ رنگ اس سے ہری جگ ہیں۔ (چگ)
ص ۲۱۸ ← بھیجے سبزہ رنگ پشت ستر کی تختی ہیں۔ (ریشب)
ص ۲۱۸ ← یا رب اس دبر کی کرد سے نیب جتنی عمر ہو + بلکہ سبزہ رنگ ہے وہ اس کی خضری عمر ہو (کرد سے نیب)
ص ۲۱۹ ← سبزہ رنگ اس تیرہ خط رکھنے سے نادانی نکلے (کھلی)
ص ۲۱۹ ← ہم دم کب آئے بیٹھ ہو بن اس سبزہ رنگ کے۔ (نیند)
ص ۲۲ ← سیاہ کاری معروف نے سیاہ روں + جو ہو سیاہ روں اس بشر کا منھ کالا (سیاہ کار ہے)
ص ۶۴ ← منزل عشق میں یوں دل کو ہے بن آ کے شوخ + بے عصا کو رکے جوں دم، فشار لحاظ (سوچ)
ص ۱۹ ← اسیر دام الفت ہو گئے یک بار جان و دل + کلی میں تیرے نمہ جب سے دکھلائے دو دامی کا (گلے)
ص ۶۰ ← صحبت کا یہ اثر ہے کہ معروف اپنے رنگ + کر دی ہے، دیکھ تو نیرنگ زرگر میں زر کو آگ (دے، بوتہ)
ص ۹۱ ← سوں میں عشق میں کیونکر دعا بتیں + گمان کی ہیں نرالی جہان سے باتیں (کمال؟)
ص ۱۲۳ ← اے خواب عدم دیکھ کے سب نے یک دست + نقش پا سے کف پر خال ہیں در بند کیا (خاک)
ص ۳ ← یہاں تو داغ خوں دامن سے دھویا تو نے قاتل + وہاں اک دن گلے کا گل ہمارے بے گناہی کا (کھلے)
ص ۵۱ ← تمام منزل مقصد کو ہم رفیق + میں ناتواں چلتے ہی دو گام رہ گیا۔ (ہم رہاں؟)
ص ۱۵ ← اہل دل کے بغیر اب میرے + دو سمجھے ہر اک بشر میرا (اب کی جگہ تو کب معلوم ہوتا ہے، لیکن لفظ میرے صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس کی جگہ میرا ہو تو یہ خرابی ہے کہ ردیف بھی یہی ہے)
ص ۱۰ ← بلبل روح تازہ دے معروف + گر سنے ایک شعر تو میرا (ہو)
ص ۱۲۰ ← معروف کے جو دل میں الفت نہ ہو حیا کی (غنیا) ۴۲ ← یکے اس کے ہزار ڈھونڈیں لوگ (کمر، کی)
ص ۶۱ ← عنان شعلے نے مطرب پسر اب تو + بھڑکتی ہے مرے دل میں تری آہنگ سے آتش (لے)
ص ۱۴ ← بلا سا رہے اس کی چشم کے سرنے کا، نالہ کرے ہے نیرہ ناز شاہ ترکستان پر جادو۔ (نیزہ باز؟)

دریائے لطافت مصنفہ سید انشاء و مرتبہ عبدالحق صاحب و مترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، ص ۸+۲۴+۳۹۶+۴۲۸ قیمت مجلد ہے غیر مجلد ؎ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۸۳۔ دریائے لطافت، ۵ کے اس وقت تین مطبوعہ نسخے ہیں، نسخہ مرشد آباد، م، جو مکمل اور سب سے صحیح ہے، نسخۂ انجمن ترقی اردو ۱۹۱۶ء جو بعض تصرفات کے ساتھ شائع ہوا تھا، ان نسخہ ۱۹۳۵ء مزید تصرفات کے ساتھ اصل کا ۱/۱۰ ترجمہ ہے۔ ت۔ عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمے میں غلط نہیں لکھا کہ اس سے پہلے کسی نے اردو صرف و نحو اور تحقیق زبان پر اس اصول و ترتیب کے ساتھ کوئی کتاب نہیں لکھی تھی، زمانۂ حال میں بھی جو کتابیں لکھی گئی ہیں (۱۹۱۵ء) کی تحقیق کو نہیں پہنچیں، اور بعض چیزیں تو وہ ایسی لکھ گئے ہیں کہ اگر وہ نہ لکھتے تو ہمیں ان کا کبھی علم نہ ہوتا، کتاب کا مطالعہ کرنے سے واقعہ یہ ہے کہ بقول مرتب "سید انشا کی ذہانت، باریک نظری، زبان دانی، اور زبان فہمی کا قائل ہونا پڑتا ہے" لیکن کتاب کو جیسی چاہیے ویسی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی۔

ابتدا اگر بے اعتنائیوں سے قطع نظر بھی کر لیجائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ ن کے ہزار نسخے اٹھاء انیس سال میں بکے، اب اس خیال سے کہ شاید اس کی مقبولیت کی، اور میں اس کی زبان حاج ہوا، انجمن نے اس کا اردو ترجمہ شائع کرایا ہے۔ فاضل مرتب کا، اور وہ اس کتاب کے ان مقامات کے متعلق جن میں گفتگو، بحث اور تشریح کی گنجائش ہے، بتفصیل لکھنے کا تھا، اس موضوع پر ان کی تحریر واقعی قابل دید ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ کثرت مشاغل سے انھیں اس کا موقع نہ مل سکا۔ کیفی صاحب کا ترجمہ بھی سلیس، بامحاورہ اور شگفتہ ہے، کتاب کے مضامین کی تقسیم بھی اب اس طور پر کی گئی ہے کہ ن اور م کے مقابلے میں اس سے فائدہ اٹھانا بہت آسان ہو گیا ہے، اور اب بھی اگر یہ کتاب مقبول عام نہ ہوئی تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ یہ اہل اردو کی بدذاقی کی بڑی دلیل ہوگی۔

ت کی خوبیوں کے متعلق اس وقت جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں صرف عام ناظرین کے نقطۂ نظر اور ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور ہم اپنے تبصرے کا یہیں خاتمہ کر دیتے لیکن اس وجہ سے کہ کیفی صاحب جو عموماً اہل نظر سے داد طلب ہوا کرتے ہیں اور عوام کی پسندیدگی کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے، اس قسم کے سرسری تبصرے کو بے توجہی پر محمول نہ فرمائیں، ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے ہم ان کے ترجمے کو جانچتے ہیں۔ اگر ہم کیفی صاحب کی انصاف پسندی کے قائل نہ ہوتے، اور انھیں اہل نظر میں نہ شمار کرتے تو ان کے ترجمے کو دیدہ ریزی سے پڑھتے، اور نہ چند سطروں سے زیادہ اس کے متعلق لکھنے کی ضرورت سمجھتے۔

۱۔ ن میں کتابت کی جتنی غلطیاں تھیں، وہ سب کی سب باستثنائے بعض ت میں موجود ہیں۔

۲۔ بہت سے الفاظ اور عبارتیں ن سے فحش و مبتذل ہونے کی بنا پر خارج کر دی گئی تھیں، وہ اب بھی خارج ہیں، یہ امر قابل اعتراض نہیں، لیکن ن میں کہیں کہیں اس عمل کے ساتھ کاتب کی غلطی شامل ہو گئی ہے

جس سے بعض محاوروں اور روزمروں کے غلط معانی درج ہو گئے تھے، کیفی صاحب کو ان کی تصحیح کرنی چاہیے تھی۔

۳۔ کیفی صاحب اپنے دیباچے میں عنوانوں کے نام بدل دینے کے علاوہ کسی اور قسم کے تصرف کرنے سے منکر ہیں لیکن انھوں نے جا بجا تصرفات کیے ہیں الفاظ اور عبارت بے سبب حذف کر دی ہیں، ضروری مثالیں ترک کر دی ہیں، مصنف نے بعض الفاظ کی جو تشریح کی تھی وہ خارج کر دی ہے۔

۴۔ ترجمہ بہت آزادی بلکہ ناجائز آزادی کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ م اور ن کے مطالعے سے جو ضمنی معلومات حاصل ہوتی تھیں، ت کے دیکھنے سے اس حد تک حاصل نہیں ہو سکتیں۔

۵۔ یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہوگا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض مقامات پر ترجمہ مصنف کے منشا کے بالکل خلاف کر دیا گیا ہے۔

۶۔ مصنفین کے حالات سے جناب کیفی بڑی حد تک ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ مترجم کی زبان پر بعض ایسے الفاظ اور تراکیب بھی ہیں جو نہ ہونی چاہئیں

اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ مترجم کی کل غلطیاں چن چن کر دکھائی جائیں، محض چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۱) عبارت ذیل م سے ماخوذ ہے، ن اور م کا فرق بھی دکھا دیا گیا ہے، کیفی صاحب کا ترجمہ بھی اس کے بعد درج ہے۔

"سعادت یار خاں رنگیں تخلص پسر اوسط طہماسپ خاں کہ در شیوہ آشنا پرستی و صفت شجاعت و سواری اسپ و دیگر مراتب علی سپاہی عدیم المثل بہت از بس کہ در عنفوان شباب در اوای امتحان قوت بازو در میدان جلادت و بیشتر بازنان پردہ نشیں سروکار داشتہ، بندے از مصطلحات شاں در فصلے از کتاب تالیف نمودہ خود نوشتہ بلکہ دیوانے در اں گفتگو بہ نظم در آوردہ، بہ دیوان ریختی کہ ایجاد او دست موسوم ساختہ، الحق کہ یادی شعر ہندی در یں زبان خان مذکور بہت۔ راقم آثم ایں مصطلحات را باسرہا در یں جا نقل می کند، زیرا کہ از دوستان بے ریا و با صفا است، راقم را با وصف سچ مزاجی مسلم الثبوت بہتر از شعرائے حال و ماضی زبان ریختہ می داند۔"

ن میں عدیم کی جگہ نعم، اور قوسین کے الفاظ خارج ہیں، "سعادت یار خاں رنگیں خلف طہماسپ خاں جو دوستدار ی کے شعار اور سپاہگری و شجاعت وغیرہ مراتب اشغال میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے، اس کو پردہ نشیں مخدرات سے واسطہ رہا ہے، ایک جزو اس نے اپنی تالیف کی ہوئی کتاب میں ان کی زبان میں لکھا ہے، بلکہ اسی زبان میں ایک دیوان بھی کہا ہے، وہ ریختی کا موجد ہے اور اس دیوان کا نام بھی ریختی رکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس زبان (ریختی) میں ہندی شعر کا موجد خان مذکور ہے۔ راقم آثم، یہ اصطلاحیں وہیں سے نقل کرتا ہے، کیونکہ موصوف میرے سچے اور مخلص دوستوں میں ہے، اور راقم کو باوجود سچ مزاجی کے مسلم الثبوت اور گزشتہ اور حال کے شعرا میں بہتر سمجھتا ہے

(۱) عدیم المثل ہست، کا ترجمہ "اعلیٰ درجہ" کہتا ہے، کیا گیا ہے، ب زنان پردہ نشیں سے مصنف کی مراد شریف عورتیں دکھتیں بلکہ بہ مقابل زنان بازار، خانگی عورتیں تھیں، اس کا ترجمہ پردہ نشیں محذوف بالکل مدعا مصنف کے خلاف ہے، ج، رنگیں کے پسر اوسط ہونے، عیاشی کی طرف بہ شدت مائل ہونے اور ان کی سواری اسپ میں باہر ہونے کا ذکر مترجم نے کیوں غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ د مصنف نے یہ نہیں لکھا کہ دیوان کا نام رنجنی، کھا بلکہ دیوان کا نام دیوان رنجنی، کھا، ہ "باسرا" کا ترجمہ مترجم نے نہیں کیا۔ و مصنف نے صرف اتنا لکھا تھا کہ رنگیں مجھے ماضی و حال کے شعرائے ریختہ میں سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ مترجم نے لفظ ریختہ کو اڑا دیا، اور اب دنیا مترجم کی ذرا سی بے پروائی کی وجہ سے یہ سمجھے گی کہ رنگین کی رائے میں انشا دنیا کے تمام شعرا سے بڑھ کر تھے۔

(۲) "چوں ... در وقت والد مرحوم تحصیل کتب درسیہ منطق و حکمت بہ عمل آورد و بوم و از مدتے ..... اچنخوانده بودم بہ سواد اسما میده بود۔" سوائے اختلاط شعر و سخن اطبا، مقدمات علمی در حضرت ایشاں محل بر تنگ ظرفی خود کردہ ہیں۔ "چونکہ ... والد مرحوم کے وقت میں منطق اور فلسفے کی درسی کتابیں پڑھی تھیں اور مدت سے ..... ان موضوعوں پر جو کچھ پڑھا تھا بھول گیا تھا، موصوف کی خدمت میں علمی مسئلوں سے متعلق گفتگو کے بدلے شعر و سخن سے صحبت گرم کرتا میں نے تنگ ظرفی خیال کیا، ت، ص ۷۸، ۷۹۔ مصنف کا مدعا اس کے بالکل برعکس ہے، مولوی حیدر علی انشا جن سے ملنے کے لیے گئے تھے حیدر عالم تھے، چاہیے تھا کہ انشا ان سے عالموں کے مذاق کی باتیں کرتے، لیکن چونکہ انشا کو اب علوم میں حسب دلخواہ دستگاہ نہ رہی تھی اپنے علمیت کے بتانے کو اس قسم کی گفتگو کرنا انشا نے تنگ ظرفی پر محمول کیا، اور شعر و سخن سے متعلق بات چیت کو ترجیح دی۔ تنگ ظرفی علوم سے متعلق گفتگو کرنے میں تھی نہ کہ شعر و سخن سے متعلق گفتگو کرنے میں۔ کیفی صاحب کا مصنف کے مدعا کو نہ سمجھنا حیرت انگیز ہے۔

(۳) مصنف نے دہریہ مذہب والے سید صاحب کا ایک لطیفہ لکھا ہے، جس میں سید صاحب کا جواب فارسی میں ہے، ت ص ۱۰۴ و ۱۰۵، سید صاحب کا جواب "قبلہ خیرست" سے شروع ہو کر "مباحثہ می کند" پر ختم ہو جاتا ہے، مترجم نے اس کے بعد کی متعدد سطروں کا ترجمہ نہیں کیا، فارسی ہی رہنے دیا ہے اس گمان میں کہ یہ بھی سید صاحب کی تقریر کا جزو ہے، حالانکہ مباحثہ می کند کے بعد کی عبارت کو سید صاحب سے کوئی تعلق نہیں، اور ان کا ترجمہ کرنا چاہیے تھا۔

(۴) "دو ملا میں مرغی مردار۔ ت ۱۳۹، اگر مترجم نے م کے مطالعے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ انشا کی زبان پر دو ملا میں مرغی حرام ہی تھا، "دو ملا میں مرغی مردار" کاتب ن کی ایجاد ہے!

(۵) پانی پت کے رہنے والے ہیں، اس کی تشریح یوں کی ہے کہ نرم اور میٹھے ہیں، ص ۱۶۰ ت حالانکہ م میں لکھا ہے

پالی پت کے، بہنے والے ہیں اور نرم ہیں اور بیٹھے ہیں یعنی مفعول ہستند، ان محاورات کو خارج کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے، لیکن غلط معنی بتلانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

(۶) الاچی، دوگانہ، وغیرہ کی تشریح میں انشا نے صاف لکھا ہے کہ "ایں ہمہ الفاظ ہندی باشد کہ باہر شغل مسامحت دارند" ص ۹۹ ن عبدالحق صاحب نے اس تشریح کو خارج نہیں کیا تھا، لیکن کیفی صاحب کی شقارت پر داشت نہ کر سکی ص ۱۷۳ ت، انھوں نے اصلی الفاظ تو رہنے دیے، لیکن ان کی تشریح عبارت بالا کو حذف کر کے ناقص کر دی اور اب اگر لوگ سمجھیں کہ یہ الفاظ انشا کے زمانے میں پاکباز شریف خواتین ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتی تھیں، تو اس کی ذمہ داری کیفی صاحب کی ثقاہت کے سر ہوگی۔

(۷) فن بیان کے متعلق جو قتیل کا مصنف باب ہے وہ مترجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجنسہ، بہنے، یا گیا ہے، لیکن، اس میں مترجم نے بہت کچھ قطع و برید سے کام لیا ہے۔ کم از کم ناظرین کو انھیں اس سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا مثالوں میں جن کی اہمیت کا انھیں اعتراف ہے، بہت سی انھوں نے ترک کر دی ہیں میر حسن کا شعر ذیل جو ص ۲۱۲ ت میں موجود ہے، انھیں متروکات میں سے ہے، حالانکہ میر حسن کے مراثی (شعر مرثیے کا ہے) نہایت کمیاب ہیں، اور دیوان حسن کے قلمی نسخوں میں بھی نہیں پائے جاتے، ؎

تم تو سر دینے رن میں سدھارے فاطمہ کے پیارے حسینا
آج آفت ہے گھر پر تمھارے فاطمہ کے پیارے حسینا

(۸) قتیل کا نام مترجم نے میرزا محمد احسن لکھا ہے اور ان کا وطن قریہ آباد بتایا ہے، ت ص ۲۵۹۔ قتیل کا نام محمد حسن ہے اگر سند کی ضرورت ہوئی تو بہ کثرت سندیں پیش کی جا سکتی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ قتیل کے قریہ آبادی ہونے کی سند کیفی جیسا پیش کریں مگر معاصرین کا قول ہونا چاہیے،

(۹) مترجم نے، انشا کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے، حاشیہ ص ۳ ت۔ لیکن، انشا دہلی کے رہنے والے تھے اور یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کا قیام کب سے کب تک دہلی میں رہا۔ انشا مرشد آباد سے شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے تھے، اور ان کی وفات کے بعد فیض آباد سے رخصت ہو گئے تھے، ان کے کلام سے مختلف السنۂ ہند سے واقفیت کا پتا چلتا ہے، اور تعجب نہیں کہ کسی ایک جگہ جم کر رہنے کے بجائے مختلف اقطاع ہند کی سیر کرتے رہے ہوں، دہلی میں ان کا خیر معلوم مدت تک قیام مسلم، لیکن محض اس بنا پر ان کا شمار مہاجرین دہلی میں کیونکر ہو سکتا ہے،

(۱۰) اہل ہنود چگا ڈٹ صفت اور ایزادی کے سے الفاظ اور ترکیب مترجم کی زبان پر ہیں،

سحر بنگال از ظاہر و دیوی شیرازی، ص ۱۲۷، تقطیع ۷×۱۲، قیمت عہ؎ ملنے کا پتا ساقی بک ڈپو دہلی

عورتوں کا مردانہ نام اختیار کرکے کتابیں لکھنا کوئی نئی بات نہیں، جورج ایلیٹ اور جوزف سان کے اصلی نام سے لوگ عام طور پر واقف نہ ہوں، لیکن مغربی ادب سے سرسری شناسائی رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ عورتیں تھیں جو مردانہ نام سے اپنی کتابیں شائع کیا کرتی تھیں، زمانے کا انتقام بھی عجیب ہوا کرتا ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ دونوں اب بھی مشہور ہیں، ان کی کتابیں اب بھی پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کے اصلی نام ادبیات کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والوں کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کو معلوم ہوں، عورتوں کا اپنی تصانیف کے لیے مردانہ نام اختیار کرنا بے سبب نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ عورتوں کی ذہنی صلاحیتوں کی طرف سے عام بدگمانی تھی، وہ عورتیں جو ادبی شہرت حاصل کرنے کی آرزومند تھیں ڈرتی تھیں کہ اگر کتاب کے اصلی نام سے شائع ہوئی تو نقاد اس سے منصفانہ برتاؤ نہ کریں گے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے عورتیں بہت سی باتیں آزادی کے ساتھ کہتے ہوئے جھجکتی تھیں، اور سلامتی انھیں اسی میں نظر آتی تھی کہ جو کچھ کہیں بظاہر وہ مردوں کی طرف سے ہو۔ تیسرا سبب نفسی ہے، اور اسے بھی اس تبدیل نام میں بڑا دخل معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں اپنی پستی (انفی ریوریٹی) کا شدید احساس رکھتی ہیں، یہاں تک کہ بعض میں تبدیل جنس، کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، نام بدل لینے سے وہ عورت سے مرد تو نہیں ہو جاتیں، لیکن وہ یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ اس ظلم کی جو فطرت نے ان کے ساتھ روا رکھا ہے، فی الجملہ تلافی ہو گئی۔

اس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ کسی مرد نے زنانہ نام اختیار کرکے کتاب شائع کی ہو، اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان کے رجعتی گو شاعروں نے زنانہ تخلص رکھے، لیکن اپنا کلام خود ہی پڑھتے رہے۔ تاریخ ادبیات میں پیرلوی شاید پہلا شخص ہے، جس نے اپنے نتائج فکر ایک عورت کی طرف منسوب کر دیئے۔ پیرلوئی نے اپنی نظموں کا مجموعہ نغمہائے بلیتیس، کے نام سے شائع کیا تو اپنی حیثیت صرف مترجم کی بیان کی، اور اصلی مصنف ایک قدیم یونانی شاعرہ کو قرار دیا۔ پیرلوئی کا بیان اپنی جگہ پر اتنا مضبوط تھا کہ عامۃ الناس کا کیا ذکر ہے، علمائے یونانیات بھی دھوکا کھا گئے اس کتاب کے ۲۰ سال بعد اور دو میں سحر بنگال شائع ہوئی ہے، سرورق پر مصنف کی حیثیت سے ظاہر و دیوی شیرازی کا نام ثبت ہے، دیباچے میں ان کی داستان حیات بیان کی گئی ہے، اور اہل شک کی حماقت قلب کے لیے مصنفہ کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے۔ لیکن ان اہتمامات کے باوجود ظاہر و دیوی شیرازی کو عالم آب و گل کی کوئی ہستی سمجھنا ضرورت سے زیادہ سادہ لوحی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ کتاب کسی عورت کی بساط سے باہر ہے یا کسی ہیروئن کو اردو پر یہ قدرت نہیں ہو سکتی۔ وہ دیکھی جا چکی ہیں، ہمارے زمانے میں، اور خود بنگالے ہی میں سروجنی نائیڈو موجود ہیں، جن کو ایک بیرونی زبان انگریزی پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ بہت سے انگریزوں کے لیے باعث رشک ہو سکتی ہے۔ ظاہر و دیوی شیرازی کے وجود خارجی کو تسلیم نہ کرنے کی اصلی وجہ ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولف خود بھی

اس کے زیادہ خواہش مند نہیں کہ طاہرہ دیوی شیرازی، ان کی مخلوق ذہنی سے زیادہ سمجھی جائیں، اور وہ خود سحر بنگال کی تصنیف کے شرف سے محروم کردیے جائیں۔ ان کے لیے یہ آسانی ممکن تھا کہ طاہرہ دیوی کی داستان حیات میں ایسی باتیں درج کرنے سے جو بعید الاحتمال ہوں گریز کرتے، لیکن ایک ایسی بنگالی نژاد ہندو عورت، جو شانتی نکتن کی تعلیم یافتہ، بنگلہ، ہندی، اردو، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں مضمون نگاری کی بھی قدرت رکھتی ہو، سب سے بڑھ کر یہ ایک ایسے مسلمان کی بی بی ہو جو ۱۹۳۵ء میں عہدۂ سفارت پر فائز ہو کر ایران گیا ہو، اور جو اب افسانہ نگاری سے یہ بوگی کا غم غلط کر رہی ہو، افسانوں کے صفحات میں مل سکتی ہے، لیکن مادی دنیا میں اس کے وجود سے انکار کرنے کے لیے بہت زیادہ مشکل ہونے کی ضرورت نہیں۔

مولف نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ "پیش نظر مجموعے میں چند افسانے طبعزاد ہیں، اور باقی ماخوذ یا ترجمہ" لیکن جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے، صرف ایک ہی افسانے کے مصنف کا نام بیان کیا ہے، باقی افسانوں کے متعلق مولف کی طرف سے ناظرین کو حق حاصل ہے کہ انھیں طبعزاد سمجھیں یا ترجمہ۔ مولف کو شاید اس کا احساس نہیں ہوا کہ ان کی اس فروگزاشت کی وجہ سے اس کتاب کے متعلق ناقدانہ حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر دشوار ہو گیا ہے۔ ہم کسی افسانے کی تعریف بھی کرنا چاہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولف کو اچھا افسانہ لکھنے کی داد دیں یا اچھا ترجمہ کرنے کی۔ ادبیات میں مصنف اور مترجم کا مرتبہ ایک نہیں ہو سکتا، اور وقت آگیا ہے کہ ہمارے اہل قلم ان دونوں میں جو فرق ہے اسے محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ مولف نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ انھوں نے اصل افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے بہت کچھ بدل دیا ہے، مولف کے حق میں ہم اس سے بہتر دعا نہیں کر سکتے کہ انھیں بھی اپنے طبعزاد افسانوں کے لیے انھیں کے سے مترجم ملیں۔

دوسری بات جو اس کتاب میں کھٹکتی ہے وہ دفتر کفش دوز کی عریاں نگاری ہے۔ اگر مولف نے اپنے نام سے یہ کتاب شائع کی ہوتی تو یہ بات چنداں قابل گرفت نہ ہوتی، لیکن ایک عورت کی زبان سے (خواہ وہ مولف کے تخیل کی موج ہی کیوں نہ ہو) اس خفیف اختلاف کا بیان جو صنف نازک کو صنف گرفت سے جدا کرتا ہے، عضویات کی بحث میں موزوں ہو تو ہو ادبیات میں قطعی بے محل ہے۔ شائد مولف کی نگاہ اس پہلو پر بالکل نہیں پڑی کہ یہ وہی بات ہے جسے سبزی فروش اپنی زبان میں مٹر چھوڑ کر[1] بیچنا کہتے ہیں۔ ذوق سلیم ہمالی نقطۂ نظر سے اسے پسند نہیں کر سکتا، اور کچھ تعجب نہیں کہ مسز چودھری[2] نے اپنی تقریر میں اس افسانے کو خاص طور پر قابل اعتراض قرار دیا تھا۔

---

[1] انشا کا شعر ہے ۔ ؎ دل کو لے کر گرہ امن و امان تر بیچے ۔ یعنی اپنا مال ہے اس کو چھڑک کر نہ بیچے ۔
[2] اردو کی حمایت میں بھٹکنے کی عورتوں نے ابھی حال میں ایک جلسہ کیا تھا۔ صدر مجلس استقبالیہ مسز چودھری تھیں۔

سحر بنگال میں ایک افسانہ "بنگالی ادب اور ایک گمنام شاعرہ" کے نام سے بھی ہے۔ مولف کو اس کے افسانہ ہونے سے انکار ہے، اور اس انکار کے جواز کی انھیں بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک بار اس انکار کے بعد ان سے بجا توقع تھی کہ وہ آخر تک اس پر قائم رہیں گے، اور کوئی لفظ ان کی زبان سے ایسا نہیں نکلے گا جس سے سربالا دیوی کے وجود میں شک پیدا ہو جائے، لیکن مولف نے یہ لکھ کر کہ سربالا دیوی کے والد کو کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری دی تھی، اپنی بنائی ہوئی عمارت خود مسمار کر دی ہے۔ ڈی او ایل کی ڈگری پنجاب یونی ورسٹی سے ملتی ہے۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے نہیں ہے تو ذرا سی غلطی، لیکن اس کا اثر بڑا ہے۔

سحر بنگال کے دیباچے میں دو رائیں بھی نقل کی گئی ہیں، 'خواب رنگین' کے متعلق ایک ذمہ دار رسالے کے مرتب جو خود بھی ترجمے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں "اگر آج موپاسان زندہ ہوتا تو یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ ترجمہ کون سا ہے اور اصل کون سا" موپاسان تو آج زندہ نہیں، لیکن اس کے افسانے زندہ ہیں، پیرائے ژاں، کا دیباچہ بھی موجود ہے، جس میں زبان اور اسلوب بیان کے متعلق موپاسان نے اپنے خاص مسلک کی توضیح کی ہے۔ 'خواب رنگین' کی رنگیں بیانی کی ایک خاص نقطۂ نظر سے تعریف کی جا سکتی ہے، لیکن ہمیں بہت شبہ ہے کہ اگر موپاساں اردو سے واقف ہوتا تو اسے اپنے نام سے منسوب کرنے کی اجازت دیتا۔ 'ہم جلیس' کی ترکیب موپاساں کی زبان پر نہیں ہو سکتی، اور روزمرہ اردو کے خلاف موپاساں 'سفینے' کو کشتی پر ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ میرزا غالب نے سفینے کو کشتی کے معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن سوال موپاساں کی زباں کا ہے، میرزا غالب کی زبان کا نہیں۔

دوسری رائے 'سکون کی جستجو' کے متعلق ایک بزرگ کی ہے، 'جو اردو کے مشہور انشا پرداز اور ایک رسالے کے "رئیس التحریر" ہیں، آپ کا خیال ہے کہ اس افسانے میں 'جس اعلیٰ پیرایے میں تجزیۂ نفسی (سائیکو اینلی سز) کیا ہے، اردو میں اس کی مثال ملنی محال ہے" ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ افسانہ اچھا ہے، اور اگر طبعزاد ہے تو اس کی تصنیف سے مولف کے بہت سے ادبی گناہوں کا کفارہ ہو گیا ہے، لیکن اس افسانے کو قابل تعریف سمجھنا اور بات ہے اور اس کو تجزیۂ نفسی (سائیکو اینلسز) کے نمونے کے طور پر پیش کرنا اور بات ہے۔ اگر سائیکو اینلی سز یہی ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تحصیل کے لیے دیانا اور زورچ جانا بے سود ہے، اور پھر لکھنؤ ہے بھی کس قدر قریب۔ سائیکو اینلی سز کے متعلق فرواڈ، ایڈلر اور ینگ نے جو کچھ سکھایا ہے اسے حرف غلط کی طرح خاطر سے محو کیجیے اور اس ہمہ دان بزرگ کے آگے زانوئے ادب تہ کیجیے، جس کے دماغ کی ہمہ گیری کے سامنے عمرو عیار کی زنبیل بھی بے حقیقت ہے۔

ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۵ء مرتبہ جناب انجم، تقطیع ۷×۱۰، ص ۳۳۲ تصاویر ۲۲ قیمت عہ

کہتے ہیں کہ بہار کی آب و ہوا اُردو کے رسالوں کے لیے سازگار نہیں، ندیم سے اُردو کی کوئی اور خدمت بن پڑی ہوتی جب بھی اس کے لیے یہ فخر کچھ کم نہ تھا کہ اس کے کارکنوں کے حوصلے اور استقلال نے اس ہمت شکن قول کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ یہ معلوم کر کے بھی ہمیں بڑی مسرت ہوئی ہے کہ یہ رسالہ صرف اہل قلم کی ایک جماعت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی مالی بنیاد بھی مضبوط کر لی ہے۔ اس صوبے کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم جناب انجم کو مبارک باد دیتے ہیں۔

ندیم چند سال سے، سال بھر میں غیر معمولی ضخامت کا ایک پرچہ بہار نمبر کے نام سے نکالا کرتا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کل مضامین بہاری اہل قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، یہ قید بقول جناب انجم "صرف اس غرض سے لگائی گئی کہ اپنے صوبے کے اہل قلم حضرات کو کسی طرح عملی میدان میں کھینچ کر لایا جائے اور اُردو ادب کی خدمت پر آمادہ کیا جائے صوبجاتی تعصب کو اس میں کچھ دخل نہیں" ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جناب انجم کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

زیر نظر نمبر میں جائے امتیاز سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون 'نوجوانان بہار اور خدمت ادب' کو دی گئی ہے۔ سید صاحب کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے مخاطب اس مضمون سے برا نہ مان جائیں، برخلاف اس کے، ہماری رائے ہے کہ سید صاحب کی ہر دل عزیزی میں اس مضمون کی اشاعت سے معتد بہ اضافہ ہو جانے کی توقع ہے۔

سید ریاست علی صاحب کا مضمون 'سید غلام حسین مصنف سیر المتاخرین' اور سید ابو ظفر صاحب ندوی کا مضمون 'شاہ رائے' قدر کے قابل ہیں۔ یہ دونوں مضمون زیادہ تر سیر المتاخرین سے ماخوذ ہیں، لیکن 'سیر ایک ضخیم کتاب ہے، اور ان دونوں کے حالات اس کتاب میں کسی ایک مقام پر نہیں ملتے بلکہ منتشر ہیں، ان کو تلاش کر کے نکالنا، اُردو میں ترجمہ کر کے ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرنا بھی محنت کا کام تھا۔

پہلے مضمون میں تین نقص ہیں، ایک تو یہ کہ تکمیل سیر کے بعد مصنف پر کیا گزری، اور کب تک وہ زندہ رہا، اس کے متعلق مضمون نگار نے کچھ نہیں لکھا، اس کے لیے ہم انھیں الزام نہیں دے سکتے، کیونکہ ایک آدھ موقع یا تذکرہ نگار کے سوا کسی نے اس کا حال نہیں لکھا، دوسرے یہ کہ اخلاف غلام حسین کا حال بہت ہی تشنہ ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے، تیسرے یہ کہ غلام حسین کی ادبی زندگی کا بیان بالکل ناکافی ہے۔ غلام حسین کا تخلص وفا تھا اور اس کا دیوان فارسی اور مثنوی اب تک موجود ہیں، اور راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

دوسرے مضمون کے متعلق ہمارے اضافات زیادہ وسنگین ہیں، ایک تو یہ شتاب رائے کے متعلق کچھ لکھنا اور جہاراجہ کلیان سنگھ کی کتاب خلاصۃ التواریخ کی طرف رجوع نہ کرنا ویسا ہی ہے جیسے غلام حسین کے حالات لکھنا اور سیر سے منہ موڑنا۔

دوسرے یہ کہ اگر ادبیات اردو کی تاریخ کے مطالعے کا انھیں موقع نہیں ملا تھا، تو جب شتاب رائے کی ادبی تاریخ کی طرف توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی ان کا مختصر سا بیان اغلاط سے بھرا ہوا ہے۔

۱۔ شتاب رائے کا ادبی ذوق بہت بلند تھا۔ اور خود بھی شاعر تھا، ۲۔ حزیں۔ نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ۳۔ عظیم آباد میں۔ شعر و سخن کا خوب چرچا تھا، اور یہ تمام ذوق ادب راجہ رام نرائن اور مہاراجہ شتاب رائے کا پیدا کردہ تھا، ۴۔ راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کا شیفتہ تھا، دہلی اور دوسرے مقامات سے شعرا اور ادبا آتے تھے اور گوہر مراد لے کر مالا مال واپس جاتے۔ اور اس طرح اکناف ہند میں پٹنے کا نام، نور روشن کی طرح مشہور ہو گیا"، ۵۔ فغاں احمد شاہ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ۶۔ راجہ شتاب رائے کے صاحبزادے راجہ بہادر، راجہ تخلص کرتے تھے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے۔ شتاب رائے کے شاعر اور ادب نواز ہونے کا ذکر کسی تذکرے اور تاریخ میں نہیں، اور نہ محض شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کے انعام پانے والوں کا ان کی قدردانیوں کا حال سنکر پٹنے کی طرف کھنچنے کا کہیں ذکر ہے۔ لے دے کر ایک فغاں ان کے یہاں ملازم تھے، اور وہ بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مصاحب کی حیثیت سے ورنہ دربار دہلی سے شتاب رائے انھیں ظریف الملک مصاحب الدولہ کے خطاب نہ دلواتے۔ (یہ خطاب بھی اسی قسم کا ہے، اس وقت یاد نہیں آتا) فغاں احمد شاہ کے سوتیلے بھائی بھی نہیں بلکہ کوکہ تھے۔ سعادت جنگ نامی کوئی رئیس پٹنے میں نہ تھا، اور نہ حزیں اس نام کے کسی رئیس کے ملازم تھے۔ حزیں کو صولت جنگ سے تعلق تھا اور وہ کسی طرح بھی عظیم آباد کے رئیس نہیں کہے جا سکتے۔ حزیں کا انتقال بھی شتاب کے بہار آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، راجہ رام نرائن کے یہاں اگر کوئی اردو گو شاعر ملازم تھا تو اس کا نام رائج الوقت تذکروں میں نہیں ملتا۔ اس کے تین شعر البتہ اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں، اس بنیاد پر جتنی بڑی عمارت جی چاہے کھڑی کر لیجیے۔ شتاب رائے کے تین بیٹے شاعر تھے ایک کا تخلص عاشق، دوسرے کا مجبور، اور تیسرے کا گریاں۔ راجہ کسی کا تخلص نہ تھا۔

رسالے کی جان سید وحید احمد بلگرامی صاحب کا مضمون "سرشک" ہے جو رسالے کے ۱۰ صفحات پر آیا ہے۔ اس سے قبل ہمیں بلگرامی صاحب کے کسی مضمون کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن ہم ان کے ایک ہی مضمون کو دیکھ کر، اپنی ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ، یہ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ صرف نثر نگار نہیں بلکہ انشاپرداز بھی ہیں۔ لیکن ان کی انشا میں تشابیہ و استعارات اور دوسرے صنائع کا بہت خرچ ہے، اور یہ طرز تحریر ایسا ہے کہ اگر کافی احتیاط نہ کی جائے تو حقیقت سے انحراف بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ضرورت سے زیادہ لفاظی ممکن ہے کہ ابوالفضل کے عہد میں پسند کی جاتی ہو، آج کل تو وہ لٹریچر کے اس قول پر عمل ہے کہ اپنی تحریر کو زوائد سے بھرا کرو۔ طرز تحریر سے قطع نظر کر کے ان کے مضمون پر یہ اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے کہ مضمون میں بہت سی بیگار، اور خارج از بحث باتیں درج کر دی ہیں۔ داستان بیجوے کے سلسلے میں حضرت شفق کے قطعے کی کیا ضرورت تھی، اور اس مضمون میں جو سلطان شاہ صفیر کے متعلق ہے حضرت بدر کے

انکسار کے ثبوت میں ان کا خط نقل کرنے کا کون سا محل تھا؟ تاہم یہ ان کی انشا پردازی کا کمال ہے کہ باوجود ان غیر ضروری باتوں کے داخل کر دینے کے، ان کے مضمون کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جو دلچسپی سے نہ پڑھا جا سکے۔ وہ بھولی بسری داستان کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اشخاص افسانہ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے نظر آتے ہیں، رہا ان کا دعویٰ کہ شاد مرحوم نے صفیر مرحوم سے اصلاح لی تھی، اس میں اگر پہلے کچھ بولنے کی گنجایش بھی رہی ہو تو شاد مرحوم کے اس اعتراف کے بعد کہ صفیر اُستاد من بود کچھ کہنا مدعی سُست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ دسمبر کے خدم میں حق گوئی نے اس اعتراف کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کرنا چاہا ہے کہ یہ اعتراف اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ بظاہر حق گو صاحب کے اخلاقی معیار سے ہمارا معیار جدا گانہ ہے، ورنہ ایک ہی فعل انھیں اخلاقی کمزوری کا نتیجہ اور ہمیں اخلاقی جرأت کا نتیجہ نظر آتا۔ جناب نہال کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاد کے خط کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں لفظ اُستادی الحاقی ہے، لیکن ان کا یہ دعویٰ کہ سلطان مرحوم مرقع فیض کے مصنف ہونے سے منکر تھے ثبوت کا محتاج ہے، ظریفانہ مضامین میں آپ ٹوڈیٹ شاعری، لطف سے خالی نہیں، لیکن مان پوری صاحب نے دہات کی سیر کے بعض مناظر ایسے بھی دکھا دیے ہیں، جن پر پردہ ہی ڈالنا بہتر تھا۔

مثنوی مادرِ ہند

مصنفہ خاں بہادر میر علی محمد صاحب شاد مرحوم، و مرتبہ ظہیر احمد صاحب مجروح عظیم آبادی ص ۱۸+۵۱=۷۰ تقطیع ۱۰×۲۴ قیمت ۱۲ ارلٹے کا پتا، شاد بک ڈپو، چوگھڑا، پٹنہ سیٹی

شاد عظیم آباد کے مایۂ ناز شاعر تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی تصانیف کی اشاعت کی غرض سے ایک مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں بڑے ذی اثر اور با اقتدار اصحاب شریک تھے، لیکن اس مجلس کا عدم وجود برابر ثابت ہوا اور چند تجویزیں منظور کرنے کے سوا اس نے کچھ نہ کیا۔ اب ان کے تلامذہ ان کی تصانیف کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، چنانچہ مثنوی مادرِ ہند جناب حمید عظیم آبادی کی تعہید، جناب رشید احمد صدیقی صاحب اور سیماب صاحب اکبر آبادی کے مقدموں کے ساتھ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، یہ مثنوی ملکہ وکٹوریا کی پہلی جوبلی کے موقع پر لکھی گئی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا زمانۂ حال میں مقبول ہونا ذرا مشکل ہے۔

صدیقی صاحب اور سیماب صاحب کے بعض بیانات محلِ نظر ہیں، مثنویوں کی اتنی طویل فہرست کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور اگر اس کی ضرورت سمجھی گئی تھی، تو اس کو صحیح اور مکمل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، دکنی زبان کی بیسیوں اہم مثنویوں کا سیماب صاحب نے ذکر ہی نہیں کیا، مصحفی نے بیس کے قریب مثنویاں لکھی ہیں، سیماب صاحب کو صرف ایک کا علم ہے۔ حسن کی مثنوی کا نام گل ارم نہیں، گلزار ارم ہے۔ دریائے لطافت مصنفہ انشا کو مثنوی سمجھنا حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ سیماب صاحب نے قطب شاہ کو اُردو کی پہلی مثنوی کا مصنف اور خواجی کو دوسری مثنوی کا مصنف قرار

دیا ہے۔ قطب شاہی خاندان میں اس لقب کے بہت سے بادشاہ ہوئے ہیں، سلطان قلی قطب شاہ، ابراہیم قلی قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ وغیرہ۔ محمد قلی قطب شاہ نے ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک حکومت کی اور اسی کے نام سے بعض حضرات نے اُردو کی پہلی مثنوی کو منسوب کیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا تخلص کئی زبان میں معانی تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ۱۰۲۰ھ تک صرف قلی قطب شاہ کی مثنوی لکھی گئی تھی۔ اسی سال وجہی نے مثنوی قطب مشتری لکھی۔ اس کے بعد متعدد شعرا نے بیسیوں مثنویاں لکھیں۔ غواصی کی مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال ۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی۔ غواصی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" کا سن تصنیف ۱۰۴۹ھ ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ "یورپ میں دکنی مخطوطات" مرتبہ نصیر الدین ہاشمی)۔ صدیقی صاحب "خاور نامہ" کو اُردو کی دوسری مثنوی قرار دیتے ہیں حالانکہ ۱۰۵۹ھ کے پہلے کی متعدد مثنویاں موجود ہیں۔

مثنوی مادر ہند کا مختصر قصہ یہ ہے کہ مادر ہند کے دو بیٹے رام اور رحیم تھے، ان میں اتفاقاً پھوٹ ہو گئی ہندوستان میں غیر ممالک کے بعض تجار آئے اور مادر ہند کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ رام اور رحیم کے پردے میں ہندو راجا اور مسلمانوں کی نااتفاقی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ غیر ملکی تجار انگریز ہیں، جنھوں نے آخر کار ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اور اسے بڑی ترقی دی۔ ذیل میں مثنوی سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:-

ساقی نامہ

ساقی قدح شراب لا جلد — اک آگ لگی ہے مے پلا جلد
جلتا ہے جگر جو اس بیاں پر — شعلہ ہے سخن مری زباں پر
اُٹھتا ہے دُھواں جو اپنے سر سے — اوجھل ہے جہاں مری نظر سے

مادر ہند کا بیٹوں کو سمجھانا

وہ چارہ گر شکستہ حالاں — وہ بانوئے دل فگار و نالاں
سوچی کہ رہوں خموش اگر میں — کھ بیٹھوں گی آپ اپنا گھر میں
دونوں بیٹوں کو تب بُلایا — شفقت سے بلی گلے لگایا
الفت سے ہر ایک پر نظر کی — کس جوش سے لیں بلائیں سر کی
پھر گرم سخن ہوی وہ اس طرح — ہے ہے مجھے نیند آئے کس طرح
سُنتی ہوں کہ بھائیوں میں ہے سو — پھیلی ہوئی یہ خبر ہے ہر سو
کم بخت نفاق رنگ لایا — آخر کو یہ دن تمھیں دکھایا
اس پر بھی نہ تم کو ہوش آیا — آپس میں لڑے یہ جوش آیا

خطاب بہ ساقی

ساقی ہے فلک کو انقلاب اب — چکر میں ہے عقل مے شراب اب
اک جام میں مجھ کو بے خبر کر — مے ڈھال کے قصہ مختصر کر

بے دَرد ذلال ہے یہ مے — مشرب میں حلال ہے یہ مے
پھر ہوش نہ آئے اب جو بہکوں — بلبل کی طرح سے خوب چہکوں

مثنوی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔

افکار عصریہ

مصنفہ چارلس آر گبسن۔ مترجمہ محمد نصیر احمد عثمانی۔ سلسلۂ دار المصنفین اعظم گڈھ نمبر ۲۶۸ ص ۲۵۰، تقطیع $\frac{7}{8}$ ۷ قیمت درج نہیں ہے۔

اس کتاب میں جدید سائنس کے بعض انکشافات کو عام فہم پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ابتدا میں جوہروں کی تعمیر، اور برق اور مقناطیسیت کی حقیقت سے بحث ہے۔ پھر لوز کی ماہیت اور اس کے مختلف نظریوں کا بیان ہے۔ تیرھویں باب میں رنگ کی اصلیت سے بحث ہے۔ اس کے بعد لطیف (اسپکٹرم) ستاروں کی پیدایش، زمین کی عمر، ریڈیم، تجاذب (گراوی ٹیشن) اور شست شعاعوں (پوزیٹو ریز) کے متعلق مختصر مقالے ہیں۔ مصنف نے مندرجہ بالا موضوعات پر محض عام فہم پیرایے میں اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کا علمی پایہ بلند نہیں ہے۔ سائنس کی جدید ترین انکشافات سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ نظریۂ اضافیت۔ نظریۂ دقائق (کوانٹم تھیوری)، ویو میکانکس، نور کے متعلق سر رسی وی، امن کی دریافت۔ لاسلکی مراسلت، اور ٹیلی ویژن کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف خود کوئی بلند پایہ مفکر یا سائنس کا ماہر نہیں ہے۔ اس کتاب کو لکھے ہوئے بھی عرصہ گزرا۔ سائنس کی ترقی اتنی سرعت سے ہو رہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے متعلق اگر کوئی کتاب آج لکھی جائے تو وہ کل پرانی ہو جائے۔

اس کتاب کا ترجمہ اردو جاننے والوں کے لیے بہرحال مفید ہوگا۔ کیونکہ سائنس کے مشکل مسائل کو سمجھنے کے قبل بنیادی مسائل کی واقفیت ضروری ہے۔ عامۃ الناس کے لیے بلند پایہ علمی کتابوں کی نہیں بلکہ عام فہم کتابوں کی ضرورت ہے۔ "افکار عصریہ" میں ان کے لیے معلومات کا کافی ذخیرہ ہے، ترجمہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ بعض اصطلاحات بہت اچھی ہیں مثلاً "زیمین ایفکٹ" کے لیے "زیمینی مظہر"۔ "میڈیم" کے لیے "واسطہ" "ایٹم" کے لیے "جوہر"۔ لیکن بعض اصطلاحات سے غلط معنی پیدا ہوتے ہیں۔ "اوورا" کا ترجمہ شفق نہیں ہو سکتا۔ بیٹری کو "مورچہ" کہنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ "فیلڈ" کا ترجمہ "میدان" مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے ادبی دنیا میں جناب آرزو جلیلی کا ایک مضمون بعنوان "مصطلحات علمیہ" شائع ہوا تھا۔ صاحب مضمون نے فیلڈ کا ترجمہ "فضا" کیا تھا۔ "الیکٹرک فیلڈ" کے لیے برقی فضا" زیادہ مناسب اصطلاح ہوگی۔ اس کی توجیہ مضمون نگار نے اس طرح کی تھی کہ "الیکٹرک فیلڈ" اس حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک برقی طاقت کا اثر محسوس ہو۔ بیٹری کا ترجمہ انھوں نے "بیٹیری" ہی کیا ہے۔ کیوں کہ

ایلکٹرک بیٹری کو مورچہ نہیں کہتے۔ لڑائی کا مورچہ جس کو انگریزی کی فوجی اصطلاح میں بیٹری کہتے ہیں، برقی بیٹری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اگرچہ سائنس کی اصطلاحات وضع کرنا مشکل کام ہے اور غلطیوں کا ہونا لازمی ہے، لیکن مترجم کو ایسی فاش غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ "بیٹری" کو مورچہ اور "فیلڈ" کو میدان کہنا فاحش غلطیاں ہیں۔ مجھے ایک اصطلاح بہت پسند آئی۔ صفحہ ۱۸۵ کی تیسری سطر میں مترجم نے "ایلکٹرو میگنیٹک فیلڈ" کا ترجمہ "برقاطیسی میدان" کیا ہے۔ برقاطیسی "برقی مقناطیسی" کی مخفف شکل ہے۔ یہ نہایت ہی موزوں اور آسان لفظ ہے۔ صرف لفظ "میدان" قابل اعتراض ہے۔ "برقاطیسی فضا" بہتر اصطلاح ہوگی۔

جشن اوالطالیہ :- مرتبہ اختر حسین صاحب، اپوری سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو، ص ۱۹۲ قیمت عہ

ماضی سے بے تعلقی اگر سطحیت کی دلیل ہے تو حال سے بے پروائی مردہ دلی کی علامت ہے۔ انجمن ترقی اردو کا ایک رُخ اگر ماضی کی طرف ہے تو دوسرا مستقبل کی طرف، اور یہی وجہ ہے کہ قدیم تذکروں اور دواوین کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ اور حالات حاضرہ سے متعلق کتابیں بھی وہ شائع کیا کرتی ہے۔ اردو کے تبصرہ نگار کا قول ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں جشن کے متعلق ایسی پر از معلومات کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ اور زبانوں کا حال تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ہندوستانی زبان میں جشن دوالطالیہ کی اشاعت سے قبل، اصغر صاحب کے ایک مختصر سے رسالے کے سوا جو انھوں نے کئی سال ہوئے بچوں کے لیے لکھا تھا، کچھ موجود نہ تھا۔ اس کتاب کے مرتب اردو کے ہونہار مضمون نگار اختر حسین صاحب ہیں، لیکن اس کے مختلف ابواب مختلف اشخاص سے لکھوائے گئے ہیں۔ جشن اور عرب ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے، اس باب میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ انگریزی کتابوں میں بھی نہیں مل سکتیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ خیال کہ ابرہہ کا ہاتھی محمود نامی در اصل میمتھ تھا اور محمود میمتھ کی خرابی ہے، مزید تحقیق کا محتاج ہے۔ بقیہ ابواب کے عنوانات درج ذیل ہیں، اس فہرست سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے: جغرافیہ، تاریخ، معاشرت، جشن کا دور حاضر، جشن اور اطالیہ، لیگ استعمار اور جشن، مستقبل۔ ضمیمے میں دارالدول جنگ اور مجلس اقوام کے میثاق کی چند دفعات درج ہیں کتاب میں متعدد تصاویر اور جشن کا نقشہ شامل ہے۔ نقشے میں بہت کم مقامات کے نام ہیں۔ طبع ثانی کی نوبت آئے تو اس کی طرف توجہ مناسب ہے۔ اختر حسین صاحب کی تحریر میں کہیں کہیں سلفانہ رنگ آگیا ہے، کیا انھیں اپنے ناظرین کی سمجھ پر اتنا بھروسا نہیں کہ صرف واقعات کے پیش کرنے پر قناعت کر سکیں؟

نکاتُ الشعرا

مصنفہ میر تقی میرؒ، مرتبہ عبدالحق صاحب، سلسلۂ انجمن ترقی اردو، طبع ثانی
ص ۱۲ + ۱۹۰، قیمت مجلد ۴ر، غیر مجلد ۳ر

میر کا دعویٰ ہے کہ نکات الشعرا سے قبل شعرائے اردو کے حالات میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا، لیکن یہ دعویٰ تمام کا بھی اپنے تذکرے کے متعلق ہے، اور گلشن گفتار تو مسلم ہے کہ زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے نکات الشعرا سے مؤخر نہیں ہو، دعویٰ اولیت سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو یہ قبول کرنے میں ذرا تامل نہیں ہونا چاہیے کہ نکات الشعرا شعرائے اردو کے قدیم ترین اور اہم ترین تذکروں میں سے ہے ..... قدیم تذکرہ نگاروں میں سے اکثر نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا چنانچہ قائم، گردیزی، شفیق، حسن، خلیل، عشقی کمال کے تذکروں سے میر کے استفادے کا پتا چلتا ہے، قاسم نے بھی میر کا حوالہ دیا ہے لیکن نکات الشعرا کے معلوم نسخوں میں وہ الفاظ نہیں ملتے جو قاسم نے میر کی طرف منسوب کیے ہیں اس لیے یہ امر مشکوک ہے کہ نکات اس کی نظر سے گزرا بھی تھا یا نہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ قاسم نے وہ نسخہ دیکھا ہو جو میر نے ابتدا میں لکھا ہو، بعد کے نسخوں میں ان الفاظ کے نہ پائے جانے کی وجہ یہ ہو کہ میر نے اپنے معاصرین کے اعتراضات سے تنگ آکر انہیں نکال دیا ہو۔ بہرحال اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا میر حسن کا اس تذکرے سے استفادہ مسلم ہے، تذکرے سے اس کا بہ کثرت ثبوت ملتا ہے لیکن یقین کے ترجمے میں میر صاحب کے حوالے سے حسن نے جو کچھ لکھا ہے وہ نکات کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا۔ حسن نے سہواً کاتب کی جگہ سودا سو رکھ دیا ہے، یا کسی نسخے میں جو حسن کے پیش نظر تھا اسی طرح لکھا تھا ایک امکان جس کا حل موجودہ مواد کی مدد سے نہیں ہو سکتا، نکات الشعرا قدماء میں جس قدر مقبول رہا اسی قدر متوسطین و متاخرین نے اس سے بے اعتنائی کی چنانچہ اب سے بیس پچیس سال قبل تک شعرائے اردو کے جو مطبوعہ تذکرے عام طور پر دستیاب ہوتے تھے ان کے مصنفین[1] باستثنائے صفیر (صفیر کا تذکرہ زیادہ مقبول نہیں ہوا) نکات سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ آزاد نے اس کا حوالہ دیا ہے لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس کے مطالعے کا انہیں اتفاق نہیں ہوا تھا۔ شبلی اپنے زمانۂ نظامت انجمن ترقی اردو میں اس کی اہمیت کا اندازہ کرکے اسے شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اسے کچ گھاتی سے سنطاعام پر لانے کی سعادت عبدالحق صاحب کی قسمت میں تھی[2] اور یہ تذکرہ پہلی بار انجمن ترقی اردو کی طرف سے آج سے کوئی بیس ۲۰ برس قبل شائع ہوا لیکن شاید اس وجہ سے کہ متن کی درستی کے لیے ایک سے زیادہ نسخہ ہاتھ نہ آیا، اور کاپیوں کی تصحیح کا گمان مطبع کے سپرد کر دی گئی مطبوعہ نسخے میں اتنی غلطیاں رہ گئی تھیں کہ بجائے انجمن کے نول کشور آنجہانی کا چھپوایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب انجمن نے اسے دوسری بار شائع کیا ہے، اور متن کی تصحیح ایک ایسے نسخے سے کی ہے جو میر کے معاصر اور شناسا عبدالولی عزلت نے تکمیل کتاب کے کچھ ہی بعد ۱۱۷۶ھ میں اپنے لیے لکھوایا تھا۔ طبع اول اور طبع ثانی میں جو فرق ہے اس کا مفصل ذکر کرنے سے قبل ہمارا کہنا چاہتے ہیں کہ مطبع ثانی سے انجمن نے اپنی سابق سہل انگاری کی بہت اچھی طرح تلافی کر دی ہے، اور یہ نسخہ ان لوگوں کے پاس بھی رہنا چاہیے جن کے پاس طبع اول موجود ہے۔

[1] ممکن ہے کہ محسن نگیں سے واقف ہوں۔

(۱) طبع ثانی سے وہ مقدمہ جو مرتب سابق نے لکھا تھا نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ عبدالحق صاحب کے مقدمے نے لی ہے یہ بہتہ مختصر ہے لیکن کل ضروری باتیں اس میں آگئی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ روایت سے قطعی معرا ہے جو اس عہد کے مقدمہ نگاروں پر بلا کسی طرح مسلط ہے۔ تاہم کچھ باتیں ایسی درج ہوگئی ہیں جن میں اختلاف کی گنجایش ہے۔ سید امام الدین خاں کے تذکرہ شعرا کا نام جس کتاب میں سب سے پہلے پایا جاتا ہے وہ تذکرہ حسن ہے بعد کے مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسن ہی سے ماخوذ ہے گو اس کا کوئی حوالہ جو حسن کی عبارت یہ ہے "سید امام الدین خاں ولد سید معین الدین خاں سرجوکی والا شاہی بود در وقت محمد شاہ.....

اور جہاں تذکرہ معاصرین خود نوشتہ ہت احوالش معلوم نخیلت" ص ۱۶۲ و ۱۶۳۔ اول تو یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ محمد شاہی عہد میں سرجوکی والا شاہی امام الدین تھے یا معین الدین (ہماری رائے میں حسن کی مراد معین الدین سے ہے) دوسرے یہ کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ امام الدین عہد محمد شاہی میں اس عہدے پر فائز تھے تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکل سکتا ہے کہ تذکرہ بھی محمد شاہی میں لکھا گیا' اور اس بنا پر نکات الشعرا سے مقدم ہے؟ فاضل مرتب نے میر صاحب کی سیرت کے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے' اس سے اتفاق مشکل ہے' میر صاحب کی رائے پر ذاتی تعلقات کا بہت اثر پڑتا تھا' اور وہ تمام شعرا جو ان پر اعتراض کرتے تھے' یا ان کے اتنے مداح نہ تھے جتنا وہ چاہتے تھے' ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ میر صاحب کے لیے ناممکن تھا۔ ان کے اعتراضات بے باکانہ ہوں' لیکن ہم انہیں غیر دوسروں کے ساتھ انصاف کیے ہوئے منصفانہ نہیں کہہ سکتے ان کی نکتہ چینیاں جائز حدود سے عموماً تجاوز کر جاتی ہیں' اور نکات الشعرا کے تذکرے میں قطعی بے محل ہیں' مفصل بحث کا یہ موقع نہیں' اس لیے ہم صرف فاضل مرتب کی توجہ تراجم حشت' و قائم و حاتم و قدرت و خاکسار و یقین کی طرف مبذول کرانے پر قناعت کریں گے۔ میر صاحب کی بے باکی بھی صلت اندیشی سے خالی نہیں ہوتی۔ میر صاحب کی حقیقی رائے آزردہ کے متعلق ذکر میر سے ظاہر ہوتی ہے' میر صاحب آزردہ سے اس قدر خفا ہیں کہ ان کی موت کا ذکر بھی کامل اطمینان بلکہ کافی ابھار اظہار مسرت کے ساتھ کرتے ہیں[1] تذکرے میں صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کے تمام شعرائے معاصر سے انہیں افضل قرار دیتے ہیں' بلکہ اس زمانے کے ایرانی شعرا پر بھی ترجیح دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں' یہاں تک بھی مضائقہ نہیں' میر صاحب ممکن ہے کہ آزردہ کے کمالات کے اسی حد تک معترف ہوں' لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ فقرات کے ترجمے میں جہاں ضمناً آزردہ کا نام آجاتا ہے' اور جہاں اظہار عقیدت کی چنداں ضرورت نہیں' انہیں استاد و پیر و مرشد بنا دہ لکھتے ہیں۔ یہ بیباکی نہیں کچھ اور چیز ہے' لیکن ادب یہ تبانے سے مانع ہے کہ کیا ہے۔

(۲) طبع ثانی میں کسی ایسے شاعر کا ترجمہ نہیں ملتا جو طبع اول میں نہ ہو' لیکن مضمون حاتم' یکرنگ' سجاد' کلیم غرلت' کے زاید اشعار ملتے ہیں' ان شعرا کے دواوین یا تو پیدیں یا کمیاب ہیں اس لیے طبع ثانی کی یہ خصوصیت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

(۳) طبع اول میں جا بجا بے الفاظ چھوٹ گئے تھے' اور غلطیاں بھی بہت رہ گئی تھیں' طبع ثانی میں یہ نقائص بڑی حد تک دور کر دیے گئے ہیں' گو بعض مقامات اب بھی مشکوک ہیں' اور بعض غلطیاں اب بھی موجود ہیں۔ ص ۳ حیرت۔ کی جگہ حیرہ' ص ۱۰۔ دوانا کی

[1] ذکر میر ص ۵۔

میں گھر میں رہوں اب چھوڑ کر صحرا۔ دوانا نہیں کریں اگر ۱۲ شیشۂ خالی کو کیا عزت ہے۔ بیواروں کے بیچ' طبع اول میں کوئی جگہ کی ہے' وہی اب تو معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم طبع ثانی میں اس اختلاف کا ذکر کر دیا تھا۔ ص ۱۵۔ دریں دلالیں طابک دیوان روزدہ نوشتہ می شود' حاشیے میں ہے کہ غالباً روزدہ کی بجائے نسخۂ ہو گا جو انتخابی اشعار کی تعداد کو بتاتا ہے۔ میر صاحب نے، انتخابی اشعار کی تعداد نہیں بتائی (سوا ان مقامات کے جہاں ایک دو شعر نقل کیے ہیں) ہماری رائے میں روزدہ کی جگہ از دست دادیا اسی قبیل کی کوئی عبارت ہو گی ۲۲۔ لکھتا ہے دو نین کہو تو نظر کرے۔ نذر ہونا چاہیے۔ ۲۲۔ شعر نیز ل خودی واندہ می خواند۔ ۱۶ تیری آنکھوں کے دو پلکے ہیں (غیر موزوں) ۳۳ کیا جانیے وصال ترا ہو کے نصیب' طبع اول میں دوسری طرح ہے' اختلف میں دکھا یا گیا۔ ۲۹ عطا کا شعر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۶۱ زبان طاقت بیانش = زبان طلاقت بیانش۔ ۶۴ بہت اس راہ کو گئے ہیں باپ = ناپ۔ ۶۷ کیا جانتے تھے ہم سے مل کر کے اس سے کل = گل۔ ۶۹ نویں سطر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۰۰ ایسا ہر رنگیں می گفت = رنگین یا رنگینی؟ ۱۰۰ انکن = کمن۔ ۱۰۰ از دیدن رنگ آتش = رنگ آتش؟ ۱۵۶ خزاں اُلفت اس پر نہ کرنی بجا حتی = آفت۔ اس کے علاوہ ممکن ہے اور بھی اغلاط ہوں لیکن کتاب کا لفظ لفظ نہیں پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ ان اغلاط کی طرف اس نیت سے توجہ دلائی گئی ہے کہ طبع سوم میں ان کی تصحیح ہو سکے۔ طبع ثانی کی منقصت قصور نہیں۔ موجودہ حالت میں بھی یہ شاید اس وقت تک بتنے تذکرے پیچھے ہیں ان میں سب سے صحیح چھپا ہے۔

(۴) کتاب کے حسن ظاہر کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ میر کے شایان شان ہے۔ کاش انجمن کلیات میر کا کوئی نقادانہ نسخہ کی اہتمام سے طبع کرانی تو شیدائیان کلام میر پر جتنی بھی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے بڑا احسان ہوتا۔

رسید کتب :-

(۱) خطبات گارساں دتاسی	انجمن ترقی اردو' اورنگ آباد
(۲) دیوان تاباں	
(۳) داستان عجم	شاد بک ڈپو
(۴) اشعار میر	رام نرائن لعل
(۵) اشعار مومن	

اقتباسات

(۱) غزل میرزا غالب ماخوذ از دیوان معروف مطبع نظامی بدایوں
(۲) میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس ماخوذ از اردو اکتوبر ۱۹۳۵ء

غزل میرزا غالب

اپنا احوال دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں

شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوال گرفتارِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے کہے دشمن جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہے در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس

احسن الاخبار بمبئی سے ۹ نومبر ۱۸۴۴ء کو نکلا۔ یہ فارسی کا اخبار تھا۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود بیشتر دہلی و قلعہ معلی کی خبریں صحت کے ساتھ شائع کرتا تھا۔ دہلی میں اس کے نامہ نگار موجود تھے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس اخبار سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

جلد ۴ نمبر ۲۶ مرقومہ ۲۵ جون ۱۸۴۱ء میرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ منظور الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ کچھ ہوا جو محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دہا کہ مقدمہ دیوان میں سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جلد ۴ نمبر ۲۷ مطابق ۲ ماہ جولائی ۱۸۴۷ء۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر ہوا

اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا دیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ میرزا صاحب عرصے سے علیل، بتے ہیں، سوا پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قید مصیبت و مشقت کا برداشت کرنا میرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر شومئی قسمت سے عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت خود ہوا داری سے مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے بااکمال، بیمثل شخص کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، ایسے معمول سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے،

استفسارات

۱۔ ذیل کے متعلق ناظرین معیار کو اگر کچھ معلوم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ نہایت ممنون ہونگا۔ عبدالودود

۱ وزیر علی عبرتی کا لکھا ہوا ایک تذکرہ نکلتے میں ہے، اس میں وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کا بھی ترجمہ ہے۔ وفات کا جہاں پر ذکر آیا ہے سن کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، کیا دوسرے نسخوں میں سال وفات درج ہے؟

۲ دیوان اشرف علی خاں فغاں کے قلمی نسخے نسخہ دسنہ و لاہور (مملوکہ پروفیسر محمد شفیع) کے علاوہ کہاں کہاں ہیں؟

۳ مصحفی نے اردو میں سند رجہ ذیل مثنویاں لکھی ہیں کیا اس کے علاوہ بھی ان کی مثنویاں ہیں؟ کیا آخری مثنوی کا قلمی نسخہ کسی صاحب کی نظر سے گزرا ہے؟ ذیل میں مثنویوں کے نام یا ابتدائی مصرعے لکھے جاتے ہیں۔ ۱۔ بحر المحبت مطبوعہ ۲۔ گلزار شہادت مطبوعہ (رسالہ اردو) ۳۔ شعلۂ عشق مطبوعہ ۴۔ زلیس آئینہ رو ہے طفل خجام۔ ۵۔ یہ جو ہم پاس چار پائی ہے۔ ۶۔ گھنٹوں کی زلیس کہ ہے افراط۔ ۷۔ کیا کروں وصف تیری ابرو کا۔ ۸۔ اپنے رہنے کو جو ملا ہے مکاں۔ ۹۔ یہ جو موذی خانہ ہے سہ کارکا۔ ۱۰۔ اب کے سردی کا جو ہوا ہے زور۔ ۱۱۔ کیا کہوں سوزش ہوائے تموز۔ ۱۲۔ شورِ آتش ہے کس قدر اس سال۔ ۱۳۔ یہ جو بکری کی پٹھ ہے اپنے پاس۔ ۱۴۔ یہ جو اترا ہے چرخ سے میڈھا۔ ۱۵۔ عشق ہے جو ہر محیط جہاں۔ ۱۶۔ یہ جو قوم شیخ ہے اے دوستاں۔ ۱۷۔ تو نہ ہے جو یہ زمرد میں بال۔ ۱۸۔ تو نہ بولن نے جو کہ پالا تھا۔ ۱۹۔ دل میں تھا مدت سے یہ مذکور ہو۔ ۲۰۔ ہے سزاوار ستایش وہ الٰہ ؛

۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین :-

اُردو اورنگ آباد مرتبہ عبدالحق صاحب جنوری ۱۹۳۶ء "سرسید احمد خاں مرحوم کی تجویز و نیکلر یونیورسٹی" (مرتب ص ۳ تا ۳۵ (برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی درخواست سے سید احمد خاں نے ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک گورنمنٹ میں بھیجی تھی' ورنیکلر سے مراد اردو تھی) اس کے متعلق جو مراسلات ہوئے وہ اس مضمون میں درج ہیں معیار)

"بادۂ کہن' گلدستۂ رنگین" (مرتب ص ۳۶ تا ۱۴۳ (۱۲۸ شعر کی مثنوی 'سعادت یار خاں رنگین کی تصنیف سے صنعت تجنیس میں ہے۔ شعر ابتدائی 'محمد سے کہ جو کہ ہے جاں آفریں ۔ تا کہیں سب تجھ کو لے جاں آفریں' شعر آخر "مثنوی گلدستۂ رنگین ہے یہ ۔ نظر نگار رنگ سے رنگین ہے یہ" ۱۲۰۵ سال قبل اردو کے معلی علی گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ معیار) "ایک ہندی شعراء اردو شعر پر مولانا محالی کا محاکمہ" (مرتب ص ۱۵۲ تا ۱۵۵ (حالی کا خط بھی منقول ہے۔ معیار)

"کلام جوشش عظیم آبادی" از قاضی عبدالودود صاحب ص ۱۹۶ تا ۱۹۹ مختصر حالات اور منتخب کلام مرتب تو برائے شمل توسیہ مجاز کی بجگہ تب تک اخوار" و ہو بوانے سے کیا کم ہے ہو ایسے دل کو دل جانے' کی بجگہ دو دیوانے سے اخوہ ہو جاتا ہے۔ (معیار)

نیرنگ خیال لاہور مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب' سالنامہ ۱۹۳۶ء "ندر سے پہلے کی اُردو شاعری پر ہندوستانی تمدن کے زوال کا اثر" از جناب عزیز احمد صاحب بی اے ص ۱۰۱ تا ۱۰۸۔ (۱) دکنی شاعری بھی تنقیدی تھی' لیکن اس میں زندگی اور حقیقت نمایاں ہے' تصنع کے باوجود جذبات میں سچائی اور گہرائی تھی' زبان وہی تھی جو عوام الناس بولتے تھے۔ ولی کی خوبیں فارسی کی نقل معلوم ہوتی ہیں' اور اس کا شمار دور انحطاط کے شعراء میں ہے۔ اس کی ابتدا تقلید سے ہے اور اس کی بنیاد غلط رکھی گئی ہے۔ متقدمین شعرائے اردو کے کلام میں زندگی کی صحیح عکس کہیں نظر نہیں آتا' مذبات مصنوعی ہیں اور انفرادی جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی (۲) فارسی کی تقلید میں اُردو شاعری اور آزاد اور ذاتی اسالیب بیان سے محروم ہو گئی' طرح طرح کی تیود سے جذبات کی لطیف کیفیات شاعری سے محو ہو گئیں' اور ان کی بجگہ خیال آرائی نے لے لی' ہندوستانی الفاظ زبان سے خارج ہوتے رہے اور فارسی الفاظ ان کی بجگہ داخل ہوتے گئے۔ (اگر متقدمین سے مراد آبرو' مضمون وغیرہ ہیں' تو کم از کم زبان سے ہندوستانی الفاظ کے اخراج کے متعلق مضمون نگار کا قول صحیح نہیں معلوم) صنائع لفظی و معنوی کو غیر ضروری اہمیت دی گئی۔ شاعری میں ان وجوہ سے جمود پیدا ہو گیا' اور جس کے یہاں جمود و متانت کے درجے سے گر کر انجماد کی حد تک پہنچ گیا۔ (۲) امیر پیوا کے دور میں تین جماعت بہت نمایاں ہیں' "یا یعیت" تصوف' ریخ اور عبدت طرازی کرنے کے بجائے سادہ اور ابتذال اور تصنع میں غرق ہونے لگا۔ یحیی رجحان سودا کی شاعری پر پہچایا جو ابے' زوال و انحطاط کی نشانی ان جماعتوں کو سونپا ہے۔ (۳) مغلوں کی تہذیب نے لکھنؤ آرسٹنڈا لایا تھا' لیکن عرض اس قدر شدید تھا کہ عوام نے مایوس ہو کر بھی کھول کر پہ نہیں شروع کریں۔ زندگی کی تمام ترجمی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں' عیش و عشرت اور تعیش خیال کی ایک چھوٹی زندگی رونما پانے لگی۔ مرغ بازی وغیرہ کی ایجاد کے ساتھ شاعری کے تخیل کو بھی فروغ ہوا۔ شعر فارد و خواندہ اصحاب کے لیے ذہنی عیاشی کا اس سے بڑھ کر کیا سامان ہو سکتا تھا

لکھنؤ کی مخصوص معاشرت کا اثر شاعری پر کلی حیثیت سے پڑا۔ شاعری زندگی، جذبات اور تخیل سے معرا رہی، ساری توجہ انداز بیان اور لفظ زبان پر صرف ہوئی، روح تو پہلے ہی سے تقریباً مفقود تھی اب وہ ایک بے جان سرد لاش ہو گئی، تکلف اور تصنع کا زور ہوا، زندگی میں باوجود نفاستوں کے انتہائی درجے کا جو انتذال شامل تھا وہ شاعری میں داخل ہو گیا۔ تیر و تلوار ابھی لکھنؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، لیکن لکھنؤ کی اصل شاعری انشا و جرأت سے شروع ہوتی ہے (صاحب مضمون نے انشا، مصحفی، رنگین، رنگین کی ایجاد کے متعلق اپنی رائے دی ہے، سیار) تاسخ نے ان الفاظ کو جو عوام الناس کی زبان پر تھے، خارج کر کے زبان کا دائرہ بہت محدود کر دیا، آتش کو قدرت نے غضب سے لکھنؤ میں پیدا کیا تھا۔ ان کا کلام کہیں کہیں لطیف بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ان دونوں کے جانشینوں میں متقدمین کے عیوب منتقل ہوئے لیکن خوبیاں منتقل نہ ہوئیں اور لکھنؤ کی شاعری پست سے پست تر ہوتی گئی۔ (۴۰) (مضمون نگار نے اسباب سے بحث کر کے دہلی کی شاعری ان عیوب سے نسبتہً کیوں کر محفوظ رہی، مومن و غالب و شیفتہ کی تعریف کی ہے، سیار) "مومن کی شاعری میں سچے احساسات اور خالص شخصی اور ذاتی جذبات پہلی مرتبہ بڑی حد تک نظر آتے ہیں" (۵) نظیر اکبر آبادی کی شاعری جنگل کا ایک خودرو پھول تھی، اس کے گانے میں انسان کی آپا دھاپی کا بہت کم دخل تھا۔ (مضمون نگار نظیر کی شاعری کے معترف ہیں، سیار) (۶) (ایک فصل لکھنؤ کی شاعری کے آخری دور کے متعلق تاسخ و آتش کی شاعری ہے، سیار) "مراثی کا غم ناک موضوع اس دور کی تنوعی ذہنیت کے لیے موزوں تھا" انیس کو طبعاً لکھنؤ کے رنگ سے مناسبت نہ تھی، مگر وہ مجبور تھے، لکھنؤ میں رہنا اور اہل لکھنؤ سے داد لینا، دوسرے کی ذہنیت کے مقابلہ زیادہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

(مضمون دو حصوں میں ہے، یہ حصہ اول کا خلاصہ تھا، دوسرے کا عنوان "اردو شاعری کے موضوع اور ان پر انحطاط کا اثر" ہے۔ ذیلی عنوانات یہ ہیں، عشق اور لوازمات عشق، معشوق، عاشق، رقیب، فراق و وصل، امرد پرستی، سیار)

شاہکار لاہور مرتبہ جناب ناجور "خواجہ آتش" از مرزا یاس یگانہ چنگیزی ص ۱۶، ۱۱ (ایک مختصری تمہید کے بعد آتش کے دشمنوں کی تشریح کی ہے، سیار)

ادبی دنیا لاہور مرتبہ منصور احمد صاحب سالنامہ ۱۹۳۰ء "تاریخ اردو کا مطالعہ" از جناب کیفی ص ۲۵ تا ۳۰ (۱) صاحب مضمون کا خیال ہے کہ دو باتوں کی اب تک کافی تحقیق نہیں ہوئی، ایک تو یہ کہ "اردو محض ایک بولی کی صورت میں اور ادبی زبان کی صورت میں کب اور کس سے ظہور پذیر ہوئی" دوسرے یہ کہ "جس مقام اور خطے میں اردو کی ابتدا ہوئی وہاں کی دیسی زبان اردو سے پیشتر اور اس کی پیدائش کے ترتیب کیا تھی۔ (۲) صاحب مضمون نے محمد بخش مہجور کی ہندی نوع "جس کی چھاپ ان کی غزلوں میں تھی" اور اس کے ہندو سنار دل سوئیدر اور تلک کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "ان واقعات کی بنا پر اگر کہا جائے کہ اردو کی ابتدا عالیاً غزل میں ہوئی تو اسے ناقابل غور نہیں قرار دیا جائے گا" صاحب مضمون نے راجا نند کے اشعار کا بھی ذکر کیا ہے جو محمد شاہ کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے، اور تحقیق الہند مصنفہ قاضی لاہوری کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے بہت قبل بھی ہندو راجاؤں کے دربار میں ایک فارسی داں ہوا کرتے تھے، جو بادشاہوں کو فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ صاحب مضمون نے راے پتھورا کے دربار کی شاعرہ "مدک الشعرا چند" کے کلام کی حفاظ کیے جانے کو مستند ذکر کیا ہے۔ (چند کے متعلق جو جدید تحقیقات ہوئی ہے، اس سے صاحب مضمون بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں، سیار)

(۳) صاحب مضمون کی رائے ہے کہ دکن میں اردو کا رواج دہلی والوں کی بدولت ہوا' انہیں محمد تغلق نے دہلی چھوڑ کر دکن جانے پر مجبور کیا تھا ثبوت میں یہ بات بھی پیش کی ہے کہ "اگر آج کوئی حیدر آباد' اورنگ آباد' دولت آباد اور گلبرگہ وغیرہ شہروں اور قصبوں میں جا کر گفتگو کرے تو وہ الفاظ محاورے اور کہاوتیں سنے میں آئیں گی جو ہم دہلی کے عوام الناس اور کم خواندہ لوگوں سے دہلی میں سنتے تھے' بلکہ کچھ نہ کچھ اب بھی سنتے ہیں" صاحب مضمون نے اورنگ آباد کے بہت سے محاورے اور روزمرے نقل کیے ہیں جو انہوں نے دہلی میں بھی اپنے بچپن میں ایک عطائی سے سنے تھے۔ اٹھاؤ چولھا (خانہ بدوش) پیارے (پوسنا) رسا (کہنا) تنے دانی' کچوئی' سیتا' ہی' ٹاک جاٹ کر بولتی ہوں' مٹھ تونا' بڑبولا' کھوداز' صفیل (فصیل) بروبر (برابر) بیگا' بھیاؤ (حوصلہ) منہ کا سواد گڑھ گیا' وغیرہ۔ (۳) اردو زبان دہلی سے دکن پہنچی' اور وہ دکنی الفاظ جو بعد کی دہلی کی زبان میں کھٹکتے ہیں انہیں اہل دہلی کے ذریعہ شمالی ہند میں آئے' جو اردو کو اپنے ساتھ جنوب میں لے گئے تھے" اردو یا ہندوستانی اس خطے میں پیدا ہوئی جہاں برج بھاشا کا رواج تھا' یہ مقام کن ہرگڑھیں ہو سکتا" (۴) صاحب مضمون کی رائے میں قطب شاہ موسیٰ سے ضرور واقف تھا' لیکن کب اور کہاں اس نے اس زبان کو سیکھا' اس کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں لکھا' صاحب مضمون کی رائے میں قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر نہیں لیکن اس کا دیوان "اردو یا کسی قسم کی اردو کا پہلا دیوان قرار دیا جا سکتا ہے" صاحب مضمون نے قطب شاہ کا یہ شعر "کھ نور پردے سے یوں مج خط عنبریں رو ہ جوں سوار پر ہے بادل ریحاں سوں گلستاں" نقل کر کے دعویٰ کیا کہ لفظ 'ہے' سورسینی زبان کا ہے' اور سورسینی کی ایک پرانی کتاب پاہڈ دوہا' از کلام رتم سمھا منی میں جو چند سال ہوئے شائع ہوئی ہے یہ صدر دستا مختلف زمانوں اور نسل کے صینوں میں کئی بار استعمال ہوا ہے۔ کتاب کا زمانہ تصنیف کم از کم ۱۰۰۰ء قرار دیا گیا ہے۔ (۵) اردو کے قدیم کے حوالے سے امیر خسرو کے دو شعر نقل کر کے صاحب مضمون یہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ "اردو کی نظم سے متعلق ایجاد و اختراع اور اولیت کا سہرا حضرت امیر خسرو ہی کے سر رہتا ہے" (۶) اردو شعر کی قدیم ترین کتاب جو اس وقت تک دستیاب ہے معراج العاشقین ہے' "ہندوستانی مشاعرے: از جناب احسن مارہروی ص ۳۲ تا ۳۴ (یہ مضمون تلاش سے نہیں لکھا گیا ہے' حکایات (واقعات بالکل آب حیات سے ماخوذ ہیں' مشاعروں کے سنین جو قائم کیے ہیں وہ بھی زیادہ تر غلط ہیں' کرم الدولہ کا زمانہ ۱۱۷۳ سے کم از کم ۲۰ برس بعد ہے' میر درد کے مشاعروں کا ذکر آیا ہے نے کیا ہے: نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۵ ہے' درد کے مشاعروں کا زمانہ ۱۱۶۵ کے قبل ہونا چاہئے نہ کہ بعد' یہی حال میر تقی اور سودا کے مشاعروں کا ہے جن کا زمانہ علی الترتیب ۱۱۷۹ء تا ۱۱۰۰ قرار دیا ہے۔ ۱۱۹۱ھ میں جس لکھنوی کوئی مشاعرہ ایسے نہ تھے جن کے مشاعروں میں میر و سودا و معاصرین میر' مصحفی' انشا جرأت شامل ہوتے ہیں' مصحفی تو ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ آئے ہیں' اور میر و سودا دو سال بھی ایک ساتھ نہ رہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ مصحفی سلطان شکوہ کے استاد تھے' اور نہ وہ اشعار جو اس سلسلے میں آزاد اور ان کے متبعین جناب احسن نے نقل کیے ہیں سلیمان شکوہ سے متعلق ہیں۔ 'معیار' اردو ادبیات پر غالب کا اثر' ص ۹۰ تا ۹۹۔ از ن۔ م۔ راشد۔ (۱) غالب کی ذات اور اس کی شاعری ہر چند عالی اور آزاد کی طرح شعوری نہیں' لیکن بے شبہ غزل میں ایک بالکل نئی تحریک تھی' جس کا احساس آج تک نہیں کیا گیا۔ غالب کی ذات ..... رہی شاعری کے خلاف ایک بہت بڑی بغاوت تھی جس نے حالی کی نئی تحریک کے لیے رستہ صاف کیا تھا۔ اس لحاظ سے مومن خاں کو ایک حد تک غالب کا بھی پیشرو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ وثوق کے ساتھ

نہیں کہا جا سکتا ہے کہ مومن نے اس قدیم شاعری کے پاؤں پر آخری ضرب لگائی کیونکہ اوائل میں وہ شاہ نصیر کا شاگرد تھا..... کچھ عرصے بعد وہ جرأت کی طرز معاملہ بندی کا شکار ہو گیا چنانچہ آخر عمر تک وہ ان ابتدائی اثرات سے پورے طور پر نجات حاصل نہ کر سکا..... لیکن غالب جو اوائل ہی سے تخیل کی شاعری کے رستے پر چل کھڑا ہوا تھا اپنی واقعیت نگاری اور یگانگت خیال کی بنا پر اس بات کا متحمل ہے کہ اسے زبان کی شاعری کا خاتم کہا جائے۔ (۲) ذوق کی اپنے زمانے میں اگر کوئی عزت تھی تو وہ اس اثر و اقتدار کی بنا پر تھی جو اسے خلیفہ دربار میں حاصل تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ اپنے زمانے کے مذاق پر حکومت کرتا تھا" "غالب کا فلسفیانہ تصور اور اس کا بے نظیر جمالیاتی احساس" اس کے معاصرین کے "فہم کی گرفت سے باہر تھا"..... وہ لوگ غالب کی بلند تر زبان اور چیستہ اسلوب کا اپنے نیم فلسفیانہ اور عامیانہ عشقیہ خیالات سے کوئی تعلق نہیں کر سکتے تھے' غالب کو صحیح طور پر نہ سمجھنے والوں میں ذوق کا درجہ سب سے بلند ہے"۔ صاحب مضمون کی رائے میں ذوق نے غالب کے ساتھ شوق مسابقت میں اپنے شعروں میں بیجا فارسیت بھر کر شروع کر دی' غالب کی شکل پسندی جہاں ابتذال سے بچنے کے لیے تھی ذوق کی شکل پسندی محض "مصنوعی تھی" "غالب طبعاً ایک فلسفیانہ رجحان کا مالک تھا اور اس کا اسلوب بیان نہ صرف ان مضامین کے لیے موزوں تھا بلکہ ناگزیر ... اس کی روح قدتہ ایسی تھی جو اس کی مخصوص پیچیدہ فکر زبان کے علاوہ کسی طرح صحیح طور پر واضح پیش ہو سکتی' غالب کے معاصرین نے غلطی سے اسی کو اس کی کمالات کچھ لیا تھا' حالانکہ اس کے لئے یہ چیز محض ثانوی حیثیت رکھتی تھی' ذوق کی شاعری صاحب مضمون کی رائے میں تاریخ سے قریب تر تھی۔ اس کی کائنات محاورہ اور روزمرہ اور ادنیٰ تبسم کے اخلاقی مسائل تھے۔ اس کی تقلیدی فارسیت 'کام' اور فلسفیانہ مسائل کے لیے اس کے دل و دماغ ناموزوں تھے۔ (۳) مومن کے اشعار میں فلسفیت اور جو یا فی ملایا جاتا ہے وہ یقیناً غالب کا اثر ہے نصیر' تاسخ' جرأت سے متاثر ہونے کے باوجود "غالب کی موجودگی نے اسے درستہ دکھایا جس کے لیے وہ موزوں تھا" آخر عمر میں غالب کے طرز تغزل میں جو تغیر ہوا تھا اس کا ایک سبب کلام مومن بھی تھا کہ "عکیمانہ نکات اور بلند پایہ پاکیزہ عشق کا اظہار کسی حد تک سنگین اور مغلق الفاظ سے دور رہ کر بھی کیا جا سکتا ہے' لیکن مومن بہت زیادہ غالب سے متاثر ہیں' ان کی "خدمت نگاری عکیمانہ بلند نظری' اشکال زبان' اور متانت اظہار... بہت حد تک غالب کی مرہون منت ہے"۔ (۴) غالب کا بہترین معترف اور بہترین نقاد شیفتہ تھا' اسے مغلق اور سہم زبان سے نفرت تھی لیکن عاشقانہ مضامین کے عامیانہ پہلو سے پرہیز' انداز بیان میں عکیمانہ متانت اور تیکھیوں کی حدت اس نے غالب سے سیکھی تھی۔ بعد وفات مومن 'شاگرد ی غالب اختیار کی' لیکن عکیمانہ متانت کے باوجود طرز خیال متفکرانہ نہ تھا۔ (۵) مومن ذوق کے شاگردان دنوں کی موت کے بعد یا تو غالب کے شاگرد ہو گئے یا تقلید غالب کے قلادہ خاص میں سالک 'مجروح' زکی' حالی' تابش' کر زکی نے سب سے زیادہ کامیاب تقلید کی' مجروح کی "جمالیاتی حس" گہری نہ تھی' لیکن غالب سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ (۶) غالب کی حقیقی عظمت کا احساس حالی اور آزاد کی نئی تحریک کے آغاز سے شروع ہوا۔ معاصرین غالب اس کی زبان اور اس کے خیالات کی ہم آہنگی کو نہ سمجھ سکے' اس کے شاگردوں نے اس کے اسلوب بیان کی تقلید کی' لیکن کوئی بھی اس کی روح کی گہرائیوں میں نہ اتر سکا' ان کے یہ طبعاً ایسی شاعری تھی جو بہ یک وقت دل و دماغ سے تعلق رکھتی ہو اور جس میں خیال کی انتہائی یگانگت انکار پائی

جاتی ہو اور جس کا مقصد محض مجادلہ یا تفاخر ہو۔" (حالی پر غالب کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ معیار) (۹) غالب کی "خطوط کتابت کا نرالا طریقہ اس کی ذہنیت، ادبی روح کا مظہر ہے" (۹) واضح رہے تسلیم بھی غالب سے متاثر ہیں "تسلیم کی مثنویوں سے خاص طور پر اس کا ثبوت ملتا ہے (۱۰) اقبال و غالب میں فرق بھی ہے اور مشابہت بھی "اگر گہرائی کو اقبال میں سے تفریق کر دیا جائے تو حاصل تفریق کے سوا کچھ نہ ہوگا لیکن ایسا غالب جو بیسویں صدی کے نصف سے بھی یکساں طور پر آشنا ہو" (۱۱) مضمون کا خاتمہ محمد حاضر کے متعلق ہیں پر غالب کے اثر، اور شارحین و ناقدین غالب کے ذکر پر ہوتا ہے۔ معیار) شاعری پر مقامی خصوصیات کے اثر: از قدر عظیم صاحب ص ۱۱ ۱۲-۱۳۔ (۱) صاحب مضمون کی رائے میں مصنفین نے اس اعتراض میں کہ اردو شاعری مقامی اثرات سے بے تعلق ہے اصول منطقی سے کام لیا ہے۔ کوئی شاعری ایسی نہیں جس پر مقامی اثرات نہ پڑیں اس لیے اردو شاعری بھی اس اصول سے الگ نہیں ہو سکتی (۲) تین کالموں میں مقامی اثر کے معنی اور مقصد کی تعیین کی ہے۔ "شاعر مقامی رنگ سے متاثر ہو کر جو شاعری کرے گا وہ نظرت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوگی جب انسان پر مقامی رنگ نے اتنا گہرا اثر کر رکھا ہے کہ وہ خود اس کی فطرت کا ایک جزو لطیف بن گیا ہے تو ظاہر ہے کہ جو چیز اس کے فطری جذبات سے متاثر ہو سکے گی وہ زیادہ قدرتی ہوگی" (۳) (دوسرے عنوانات "مقامی ادب اور زبان کا اثر" "مذہب اور اس کی روایات" "توہم اور خوشیاں" اور "عقائد" ہیں۔ مثالیں قطب شاہ سے لے کر واجد علی شاہی شعرا تک کی دی ہیں۔ عہد حاضر کے شعرا کا ذکر نہیں کیا ہے۔ معیار) عالمگیر لاہور مرتبہ حافظ محمد عالم، سال ۱۹۳۶ء۔ حضرت مخطر علیہ الرحمۃ از نیاز شاہ عطا الحق شاغل قریدی بہاری (۱) اخیر آزاد کی ادبی تاریخ میں پہلا اور غالباً گو شعرا محمد و مرشح سعد، حافظ شاہ شتاق، مشوق علی شاہ کا ہے اور دوسرا اور اردو گویوں کا منشی قدرت حسین قدرت، مظفر حسین شوقی، محمد جعفر رمصری، بہاری لال غاوری، مومن لال گرامی، الٰہی بخش نازش، بی بی سعید النساء حرماں تخلص، جو اہر مولانا فضل حق و مادر حضرت مضطر۔ تیسرا اور بسمل و مضطر کو ڈویسیم و ریاض کا دور ہے۔ (صاحب مضمون نے رسالہ الناظرین ۱۹۲۳ء کا ایک مضمون "ریاض سخن اور خیر آباد" کا حوالہ دیا ہے۔ معیار) (۲) مضطر کا نام سید محمد مختار حسین تھا۔ مختار سے سال ولادت ۱۹۰۲ء نکلتا ہے۔ ان کے خطابات اعتبار الملک، مختار الشعرا، اقتدار جنگ تھے۔ (یہ خطابات کہاں سے ملے اس کی تصریح نہیں کی گئی۔ معیار) ان کے والد کا نام مولوی تفضل حسین تھا۔ نجیب الطرفین سید تھے "مذہب حنفی، مشرب صوفی۔ (۳) احتشام الدین احمد حقی دہلوی کا ایک مضمون سنہ ۱۹۰۷ء کے بہارستان میں شائع ہوا تھا" اس کے حوالے سے صاحب مضمون لکھتے ہیں کہ مضطر نے ایک "اول تبیل جفا" نامی بھی لکھا تھا جو بہت کامیاب ہوا تھا" دیوان مجید یہ سنی بہ مذاق چھپ چکا ہے "غنیمت دیوان یاد مضطر کی زندگی ہی میں چھپنے کے لیے کسی مطبع کو دیا گیا تھا، لیکن مطبع کی بدعنوانیوں سے اب تک "معرض التوا میں ہے" عاشقانہ دیوان چھپ نہ سکا، "لیکن سخن صاحب کے پاس کچھ مخطوطہ کتابیں ہیں (کذا) کوئی صاحب دیوان مرتب فرمانا چاہیں تو مشکل ایں" (۴) مضمون نگار اور سخن صاحب کے شعلہ پر مضطر کی اصلاح کے نونے (۵) مضطر کے ۸۰ خطوط جن میں سوا ایک کے سب مضمون نگار کے نام ہیں ایک سخن اور مضمون نگار دونوں کے نام ہے۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ (الف) مضطر کی رائے میں وہ خطوط ہی اور مکتوب دونوں جگہ مذکر ہے نوشت ہیں اور بعض دوسرے شعرا نے نوشت باندھا ہے۔ معیار) اور اپریل کو وہ مذکر سمجھتے تھے (ب) جون ۱۹۱۳ء میں تبدیل ہو کر صدر شکر گڑھ ایلیا کی دشمن کی

پر آگئے تھے' ج' اور نا کے معنی ہیں تسلنے' سنبھالنے کے ہیں۔ یہ نا کے معنی بگاڑنے کے ہیں' د' اگست ۱۹۱۵ء سے قبل انہوں نے ایک سال کی رخصت لی تھی۔ ۰ کا تتبع دہرا اول کی سند حاصل کرلی تھی اور ملازمت سے علیحدہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ۵ آنکھ نہ لگنا' کوئی مخمار نہیں ح ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ گوالیار سے ریٹائرڈ ہو کر دس ماہ بھوپال میں رہا' اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں اندور آکر دربار کا مصاحب بن گیا اب اندور میں ہوں' ط تین ۳ کے ۱۹۲۵ء میں تین زاویہ کوں کا ذکر کیا ہے جن کے تخلص برتر' نشتر اور اختر ہیں' ی ۲۵ تا ۱۹۲۷ء میں بستر بیمار رہے' (۱۶) ۱۹ رمضان ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء تاریخ وفات ہے (۰) مضطر کے شاگردوں کی فہرست جس میں نواب ٹونک حافظ محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر کا بھی نام ہے۔

رفتار اردو ص ۱۲۴ تا ۱۴۰ از حامد حسن قادری (۱) شعرائے متقدمین کے تین دور قائم کیے ہیں (۱) شعرائے دکن ۱۵۵ تا ۱۷۰۔ (۲) شعرائے دکن ۱۷۰۰ تا ۱۷۵۰۔ اس دور میں بحری' ولی' آگاہ' سراج' عزلت' عاجز وغیرہ شامل ہیں (۳) متاخرین دکن ۱۷۵۰ تا ۱۸۰۰۔ اس دور میں ہاشمی' فائز' یکرنگ' کلیم' خاتم' نعماں' نظر' سجاد' بیداری ہیں۔ کلیم اور نعماں کو اس دور میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ دونوں میر و مرزا کے معاصر ہیں۔ معیار (۲) شعرائے متوسطین کا پہلا دور ۱۷۲۰ تا ۱۸۰۰ ہے۔ میر و مرزا' درد وغیرہ اس دور کے شاعر ہیں۔ یہ بیان صحیح نہیں کہ سودا نے قصائد کی ابتدا کی شعرائے دکن بھی انسان اس دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ معیار) متوسطین کا دوسرا دور ۱۸۰۰ سے ۱۸۲۰ تک' خاص شعرا مصحفی' جرأت' انشا' حسن وغیرہ اس دور میں لکھنؤ کا مرکز امتیاز فن مرثیہ گوئی کی ترقی ہے جس کے پیشرو خلیق و ضمیر ہیں۔ خلیق و ضمیر مصحفی کے شاگرد ضرور تھے' لیکن یہ دونوں تاریخ کے دور میں داخل ہیں۔ معیار) دور سوم ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۰ تک' ناسخ' آتش' نسیم' ممنون' نسیم' نظیر اکبر آبادی' شہید' دہلوی اشہد تخلص کا کوئی متقدم شاعر اس عہد کا نہیں' نظیر اکبر آبادی مصحفی و انشا کے دور سے تعلق رکھتے ہیں' ذوق و غالب' وزیر' صہبا کو اس دور میں نہیں رکھا تو نسیم کو بھی اس دور میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ معیار) (۳) شعرائے متاخرین کے بھی تین دور قائم کیے ہیں۔ ۱۔ دور اول ۱۸۲۵ تا ۱۸۷۵ء' ذوق' غالب' مومن' امیر' ظریف' رند' صہبا' انیس وغیرہ۔ ۲۔ دور دوم غنیمۂ دور اول ۱۸۵۰ تا ۱۹۰۵ء' داغ' امیر' تسلیم وغیرہ۔ ۳۔ دور سوم ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۵ء تک تلامذۂ داغ و امیر' شاد عظیم آبادی' نظم طباطبائی' اصغر' فانی' جگر' حسرت' عزیز' ثاقب' آزاد' وغیرہ (۴) شعرائے عصر حاضر ۱۹۰۰ء تا ۱۹۳۵ء' حسرت' عزیز' ثاقب' فانی' جگر' اصغر' یگانہ وغیرہ' تحقیق کے اعتبار سے مضمون میں بہ کثرت اغلاط ہیں' ناقدانہ حیثیت سے بھی ناقابل اعتنا ہے۔ معیار)

مدیم گیا جنوری ۱۹۳۶ء مرتبہ جناب نجم' غالب و اقبال' از سید شاہ ولی الرحمن صاحب ایم اے۔ ص ۱ تا ۳۰ (۱) غالب و اقبال کی مشترک خصوصیات' فارسی سے شغف اور فارسی تراکیب کی کثرت' فلسفہ' تصوف' حکمت طرازی' نازک خیالی' بلند پروازی' مبتذل اور عامیانہ خیالات سے احتراز' زبان و انداز بیان مشکل۔ غالب و اقبال میں فرق یہ ہے کہ "اقبال اسلامی شاعر ہے' ان کے پیغام کا مقصد اپنی غفلت قوم کو بیدار کرنا ہے" "غالب بیسویں المشرب اور آزاد خیال شاعر ہے' اس کے خیالات و افکار عالمگیر

(۲) غالب کے یہاں متشابہ خیالات اور ان کے اسباب (منشا مضمون نگار نے لکھا ہے کہ راقم علی خان اور حسین علی خاں غالب کی زندگی ہی میں داغ دے گئے تھے' یہ صحیح نہیں' دونوں کا استعمال غالب کے بعد ہوا ہے۔ معیار)۔ (۳) اقبال کی شاعری میں بھی ناکامی و افسردگی کا عنصر موجود ہے۔ (۳) غالب بھی اقبال کی طرح شک سے یقین کی طرف گئے ہیں۔ (۴) خود شناسی' تجدید آرزو' جوش عمل' سخت کوشی و تشکل پسندی کی تعلیم اقبال کی طرح غالب کے یہاں بھی ہے۔ دل عظیم آبادی (از حکیم سید احمد اللہ ندوی ص ۱۴۱ تا ۱۴۴۔ (۱) (دل کے والد کا نام جسونت نہ تھا' نہ بتایا ہے جو صحیح نہیں' غلط فہمی اول مصنف سے ہوئی اور اس کی ایک خاص وجہ تھی' معیار) (۲) غالبیہ نومسلم ہے" (یہ بھی صحیح نہیں' معیار) (۳) "آج ان کی تصنیف عنقا صفت ہے' ان کی تصنیف سے عوض الہندی اب تک موجود ہے' معیار) (۴) ۱۱۰۰ — ۱۹۲ میں دل کی عمر ۳۰ بتائی ہے اعوض الہندی کا سال تصنیف ۱۱۶۹ھ ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ پچیس تیس سال سے کم کی عمر میں یہ رسالہ نہ لکھا گیا ہوگا۔ معیار) (حیرت کی بات ہے کہ مضمون نگار نے کریم الدین کو گلزار ابراہیم کا مترجم لکھا ہے معیار)

ادب لطیف لاہور' سالنامہ ۱۹۳۶ء مرتبہ چودھری برکت علی و مرزا ادیب۔ غالب کے اُردو کلام کی چند نمایاں خصوصیات۔ ص ۶۰ تا ۷۰ از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (۱) "غالب شاعری کی صحیح رو سے باخبر ہے اس لیے اس کا تخیل ہر گوشۂ کائنات و حیات انسانی کے تمام مناظر و واقعات پر پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے" (۲) "اردو شاعری بالخصوص غزل کے اندر حسن و عشق کے معاملات تنگ محدود تھی جن لوگوں نے ان حدود سے تجاوز کیا وہ یا تو رکیک تخیلات میں ڈوب گئے۔ یا سطحیات ہی پر رہ گئے' غالب کے تخیل میں صرف وسعت ہی نہیں تعمق بھی ہے۔..... اس عمیق تخیل کے باوجود اشعار کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسی پر غالب کی شاعرانہ عظمت کا دارومدار ہے"۔ "غالب کے مشاہدات سطحی نہیں' وہ ہر شے کی تہ میں ایک اور ہی منظر دیکھتا ہے۔ اس دنیائے جہان کے اندر وہ ایک جہان معنوی تیار کرتا ہے اور پھر اس کو نیا نظام بخشتا ہے"۔ اس نظام میں موزونیت' حسن اور جاذبیت ہوتی ہے' اگر یہ جاذبیت نہ ہو تو اس کے تخیلات خشک فلسفیانہ مسائل بن کر رہ جائیں۔ (۳) غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علو تخیل کو جذبات کے ساتھ پیوست کیا ہے"..... غالب کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ محسوس سے محسوس خیال کو کیف حسن میں ملبوس کر کے ہمارے سامنے لاتا ہے' اس لباس حسن میں الفاظ کی آرائش چار چاند لگا دیتی ہے"۔ (۴) "اس کی شاعری فطرتاً بیتی خیال انگیز ہے' غالب کی عظمت کی بڑی دلیل یہی ہے کہ اس نے ایک ایسے وقت میں یہ غیر فانی نغمہ بلند کیا جب کہ ہندوستانی تمدن کی ہستی کے ساتھ ساتھ یہاں کی ہر چیز زوال پذیر ہو چکی تھی"۔ "غالب اپنے عہد کے معیار ذہنی سے بہت بلند تھا"۔ (۵) "غزل میں تسلسل جذبات کا امکان بہت کم ہے' لیکن غالب کی غزلیات میں بہت سی ایسی ہیں کہ اگر چہ اشعار کی انفرادی حیثیت جداگانہ ہے تاہم ساری غزل میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے (۶) اس کا تغزل شدید جذبات کا حامل ہے"۔ "غالب حسن و عشق کے میدان میں جب آتے ہیں تو اس کے شعر تیر و نشتر بن جاتے ہیں" (۷) غالب کے تغزل کی دوسری خصوصیت اس کی کیفیاتی کا عنصر ہے۔ یہ عنصر نفسیاتی ہے"۔ "اس کے عشقیہ اشعار کے مطالعے سے انسان کبھی نہیں اکتاتا بلکہ جتنا غور کیا جائے کیف آور ہوتے جاتے ہیں..... "یہ غور نفسی مشکلات کے متعلق نہیں ہوتا" بلکہ نفسیاتی وسعت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ جذبات و کیفیات کا سیلاب کہیں تھمتا نظر نہیں آتا..... "ایک شعر مضمون کی بلاغت اور اثر کی شدت کے اعتبار سے مستقل نظم کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے"

(۸) حسن و عشق کے متعلق غالب کے خاص نظریے ہیں: "حسن راحت ابدی ہے جس کے لیے ظاہری آرایش کی ضرورت نہیں۔ فطرت خود حسن کی شاطر گری کرتی ہے۔ عشق اپنے گرد و پیش کی اشیا کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ عشق ایک غیر فانی جذبہ ہے، غیر معین غیر محدود انسانی قلب فانی اور محدود دیدہ دریا اس ظرف تنگ میں کیونکر سما سکتا ہے۔ انسان کی بیتابی ہیچ کی زیر ہمت دلیل ہے اس کے فراق وصال پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ غالب کی عاشقانہ تنویت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے (۹) غالب کی شخصیت اس کے اشعار میں نمایاں ہے: "وہ کائنات کی عمیق گہرائیوں تک پہنچتا ہے، لیکن اپنی ہستی کھو نہیں بیٹھتا۔" (۱۰) عبدالحامد کی جدید نگاری" حالی و آزاد کی ممنون احسان ہے لیکن غیر شعوری طور پر اس جدت کا احساس غالب کی مجتہدانہ روش سے ہوا۔ مصحفی کا قیام دہلی ص ۱۰۸ تا ۱۱۱ از خواب افسر (مصحفی ۱۱۶۱ اور ۱۱۶۴ کے درمیان پیدا ہوئے / ۲) تعلیم و تربیت امروہے میں ہوئی، دہلی ۱۷ سے زیادہ کی عمر تک جب پہنچے (نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۳ مضمون نگار نے بتایا ہے) حالانکہ اس کا سال تکمیل ۱۱۶۵ ہے۔ سیار)۔ (۳) مصحفی ۱۱۸۶ میں دہلی گئے اور ۱۱۹۰ میں لکھنو۔

محکمہ:-

غزل آصف الدولہ و جواب شمس النسا بیگم: آصف الدولہ کا دیوان ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے اس میں ایک غزل چار شعروں کی۔ ہم دیکھتے ہیں، نم دیکھتے ہیں دلی زمین میں پائی جاتی ہے۔ غزل یہ ہے:-

تجھے غیر سے جب نہ دیکھتے ہیں — نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال اس کا — تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں
تو جلدی سے آ اور نہ میرے مسیحا — کوئی دن کو راہ عدم دیکھتے ہیں
گلی میں تو ں کی شب و روز آصف — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

شعر اول و سوم و چہارم تذکرۂ ہندی مصنفہ مصحفی ص ۵۷ و ۶ میں بھی موجود ہیں۔ شعر سوم میں کوئی دن کی بجگہ کوئی دم ہے۔ شعر چہارم میں گلی میں تو ں کی بجگہ تو ں کی گلی میں ہے۔

دیوان جہاں کا ایک قلمی نسخہ بھی اس کتب خانے میں ہے۔ بیگم کی غزل میں ایک شعر زاید ہے:

بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے — بھلا اب کے تیری قسم دیکھتے ہیں

ق۔ع۔د

عالم ادب

شاہ جارج پنجم کی وفات:

ملک معظم کی وفات کا غم عالمگیر ہے اور ہر طبقے اور ہر عقیدے کے لوگ خاندان شاہی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں معیار بھی اس غم میں شریک ہے اور نہایت ادب کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی پیش کرتا ہے۔ ملک معظم کو مستوی سلامت کا قابل مثال بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا وہ اپنے مشیروں سے اپنے وزرا کی اعانت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن امور انتظامی میں کبھی انہوں نے ایسی مداخلت نہ کی جو دستور کے خلاف ہو خاص خاص مواقع پر بادشاہ جو ہے کو اپنے مشیرات تیزی سے کام لیے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع آیا وہ اس طرح عمل پیرا ہوئے کہ دوست دشمن سب نے آفریں کی اور دستور انگلستان کا مسلمہ کہ بادشاہ غلطی نہیں کر سکتا ایک نئے مفہوم میں صحیح ثابت ہو گیا۔ ان کی فہم شناسی ضرب المثل تھی اور ان کی صیانت لئے بڑے بڑے ایثار ہو جاتے تھے۔ ذاتی قربانی سے انہوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔ اور وہ قوم کے دکھ سکھ کو ہمیشہ اپنا دکھ سکھ سمجھتے رہے۔ اگر وہ اپنی قوم میں ہر دل عزیز نہ ہوتے تو تعجب ہوتا۔ ان کے عہد میں جو ذہنی سیاسی اور معاشی انقلاب ہوئے وہ تاریخ عالم میں یاد گار رہیں گے۔ ان کے عہد کا ادب بھی صحیح معنی میں انقلابی ادب ہے اور یہ کہنا بالکل مبالغے سے خالی ہے کہ انسان کی مکمل تصویر کھینچنے کی اگر کوشش کی گئی ہے تو صرف اسی عہد میں۔ عہد وکٹوریہ کے مصنفین نے مشاہدات و محسوسات کے ایک چھوٹے سے جزیرے پر قناعت کر لی تھی۔ اور اعلیٰ درجہ کے ناظم ان کی نظروں سے پنہاں تھا۔ عہد اڈورڈ و ششم کے مصنفین نے نیسویں صدی کی علمی ترقی کے مادی نتائج کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوئے کہ خود انسان کو بھول ہی گئے۔ اور بات کے حدود کی یہ غیر معمولی توسیع تو اعداد میں غیر معمولی تبدل کی خواہاں ہے اور اس عہد کے مصنفین تو اعداد میں قدما کی پیروی سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ اس عہد کے اصلی نمائندے ہوائس، لارنس، فورسٹر، گیلسے، ورجینا، ولف، ایلیٹ، لٹن اسٹریچی وغیرہ ہیں اور اس عہد کی تصویریات کی تلاش میں کی تصانیف میں کرنی چاہیئے۔ ولز اور شاب بھی زندہ ہیں اور ان کے تخیل کا رشتہ اب تک منقطع نہیں ہوا۔ نٹ اور گزوردی کی بھی بہت ہی تصانیف اس عہد میں لکھی گئیں لیکن ان جیسوں کی تصانیف اس عہد کے میلانات کے صحیح مظہر نہیں۔

رڈیرڈ کپلنگ کی وفات:

انگریزی زبان کے نامور شاعر اور فسانہ نگار نے ۱۸ جنوری کو انتقال کیا اور وسٹ منسٹر ایبے میں دفن ہوا۔ اس کی وفات فرد واحد کی موت نہیں بلکہ ایک دور کے خاتمے کا اعلان ہے کپلنگ انگلستان کے مقبول ترین مصنفین میں ہے اور ایک زمانہ تھا کہ نوجوان اس کا لٹریچر پڑھتے تھے اب بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد کم نہیں لیکن نوجوان اس کے نقش قدم پر میل رہا نہیں سمجھتے اور ذہنی حیثیت سے اس کی رفعت گذشتہ سال کی نسبت سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کے متعلق جون میسفلڈ، ملک لشوا اور انگلستان کے اس قول سے اختلاف مشکل ہے کہ عہد وکٹوریہ کے شاندار کارناموں کی تصویر خوانی اس سے بڑھ کر کسی شاعر نے نہیں کی اور برطانی خلافت ارض کا تراشنے بلند سروں میں کسی نے نہیں گویا۔ اہل ہند کو اس سے بجا شکایت ہے کہ اس نے ہندوستان کی نئی نسل کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کی اور ان کی آرزوؤں کی ہمیشہ تضحیک کرتا رہا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تحقیر کوئی موقع روا نہ جانے دیتا اور ان کے معترضہ بیچنے کا ذکر سے کرتا ہے۔ وہی پرانا ڈسی ڈسٹرکٹ کا معاملہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ کپلنگ میں ہنر جانبداری

ہیں پائی جاتی جو اعلیٰ درجے کی صنعت کاروں کے لیے ضروری ہے اور اسی وجہ سے ہم پول موران کے اس قول کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ کپلنگ اپنے زمانے کا سب سے بڑا کہانی لکھنے والا ہے۔ کپلنگ کے والدین انگریز تھے۔ لیکن اس کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں بمقام بمبئی ہوئی۔ پچپن کا زمانہ ہندوستان میں گزارا اور تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا گیا۔ اس کی عمر ابھی ۱۵ ہی برس کی تھی کہ اس نے اپنی پہلی کتاب لکھی جسے اس کے والدین نے اپنے خرچ سے چھپوایا۔ ہندوستان واپس آکر یہ لاہور کے سول اینڈ ملیٹری گزٹ کے اسٹاف میں لے لیا گیا۔ لیکن اس نے تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ابھی کم سن ہی تھا کہ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ پہاڑیوں کی کہانیاں ہندوستان میں شائع ہوا۔ ابتدا میں یہ چنداں مقبول نہیں ہوا، لیکن سیزر ڈے یو یو کے تبصرے نے اسے مقبول عام بنا دیا۔ اس کے بعد کپلنگ انگلستان چلا گیا اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہو گیا۔ ۱۸۹۰ء میں کپلنگ نے انگلستان میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی اور ۱۹۰۰ء میں وہ عالمگیر شہرت کا مالک تھا۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۷ء تک انعام نوبل ملا۔ اس کی تصانیف میں سب سے مقبول وہ جنگل بک ہوئی۔ اس کے ۴ لاکھ سے زیادہ نسخے اب تک بک چکے ہیں۔ جسٹ سو اسٹوریز، کم، سکنڈ جنگل بک، اسٹوری اینڈ کو، پک اوف پوکس ہل دوسری مقبول کتابیں ہیں۔ ان کے ۱۲ لاکھ سے زیادہ نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ فرانسیسی اور المانی میں اس کی اکثر تصانیف کا ترجمہ ہوا ہے۔ رہی اردو اس میں دی جنگل بک کے سوا جہاں تک ہمیں علم ہے کسی کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ہم اس کی بعض کہانیوں کا ترجمہ اور اس کے متعلق ایک ناقدانہ مضمون جلد شائع کریں گے۔

رامول سیریا دل وال انگلاں کی وفات: وال انگلاں کا انتقال جنوری کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ روائٹر نے یہ خبر ہندوستان میں بھی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ وال انگلاں عدم حافظہ کے ہسپانی مصنفوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ ہسپانی زبان بولنے والے ممالک کے باہر وہ چنداں مشہور نہ تھا۔ اس کا سال ولادت ۱۸۶۹ء ہے اور اس کا ولد و منشا گیشیا ہے جس کی شعر پرور فضا جزیرہ ہسپانیہ میں اپنی آپ نظیر ہے۔ وال انگلاں مصنفین کی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو ۹۸ء کی نسل کہی جاتی ہے، اور جس کا موجودہ ہسپانیہ کی معنوی تعمیر میں بہت بڑا حصہ ہے۔ یونامانو، بیورو دخا، آزورین اسی گروہ کے لوگ ہیں، گو خیالات میں ایک دوسرے سے بہت اختلاف رکھتے ہیں۔ وال انگلاں ادیب، شاعر، افسانہ نویس اور تمثیل نگار تھا۔ بعض ناقدین کی رائے میں اس زمانے کا کوئی نثر نگار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فلسفیانہ دقت آفرینیوں سے اسے کوئی سروکار نہ رہا، اور باوجود ہمہ وریت کے ساتھ ہمہ وری کھنے کے سیاسی نگارشات آرائیوں سے گھبراتا تھا۔ اس کی شخصیت بڑی دل آویز تھی، اور اس کو ہر دل عزیز بنانے میں اس کا بھی کچھ حصہ کم نہ تھا۔ پرانی وضع کے شرفا کا لباس یعنی ڈھیلی ڈھالی ہوا میں اڑتے ہوئے بال، نورانی آنکھوں کو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ اس کی جنگ بوئی، اور جسمانی تکالیف سے حد درجہ بے پروائی اس پر طرہ، پچھلے واقعات کو چھوڑ کر، اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی، لوگوں نے ہزاروں تمغے گردن میں لٹکائے تھے۔ اور وال انگلاں کو ان کا ہیرو بنا دیا تھا۔ اسے بار بار ڈوئیل سے لڑنے کا اتفاق ہوا۔ اور ایک بار تو اسی کی ذرہ برابر بھی وقت ڈاکٹر اس پر حملہ کرنا تھا، وہ بے پروائی کے ساتھ سگرٹ پی رہا تھا۔ ہندوستان سے بھی اسے ایک قسم کا تعلق تھا۔ صاحبہ کپور تھلہ کی شادی ایک غیر معروف ہسپانی رقاصہ سے اسی نے کرائی تھی۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور فلوری سینڈ ڈے ہے۔ یہ علم میں کرانگریزی میں اس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے، لیکن فرانسیسی میں متعدد تصانیف کے تراجم موجود ہیں۔ اس کی شخصیت سے علاوہ ہیں، اور ہر کتاب میں خود ہی زندگی کی

گستاخیوں پر حیرانی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی کتابیں باوجود اس کے کہ مصنف کی شخصیت ہمیشہ ان میں مخل کرتی رہتی ہے شروع سے آخر تک دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہیں۔ ناقدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ بڑا صنعت کار تھا۔

عبدالراشد الخیری مرحوم: ہم نہایت افسوس کے ساتھ سنا کہ دہلی کے مقبول افسانہ نگار راشد الخیری نے ۲ فروری کو اس دنیا سے رحلت کی۔ مرحوم کا سال پیدائش ۱۸۸۶ء ہے۔ ان کے والد حافظ عبدالواحد مرحوم ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس میں کئی مشہور عالم گزرے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مرحوم کی پہلی تصنیف حیات معاشرہ شائع ہوئی لیکن یہ چنداں مقبول نہ ہوئی۔ ان کی شہرت کا سنگ بنیاد رسالہ مخزن کے مضامین اور مناظر النشاء کی اشاعت نے رکھا۔ ۱۹۰۸ء میں مرحوم نے سرکاری ملازمت ترک کر کے عورتوں کے لیے رسالہ عصمت نکالا جو کامیابی کے ساتھ اب بھی جاری ہے اور اپنی قسم کے بہترین پرچوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں مرحوم اور محمود کرام صاحب کی ادارت میں رسالہ تمدن نکلا لیکن یہ چند سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ ترک ملازمت کے بعد مرحوم نے اپنی زندگی خدمت ادب اور حمایت نسواں کے لیے وقف کر دی تھی چنانچہ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے۔ کم سن بچیوں کے لیے مرحوم نے پندرہ سولہ سال قبل ایک مدرسہ بھی قائم کیا اور ان کی سرپرستی میں عورتوں کے لیے عصمت کے علاوہ دو پرچے اور نکلے۔ مدرسہ اور یہ رسالے اب تک قائم ہیں۔ عورتوں کی حمایت مرحوم کی زندگی کا مقصد اعظم تھا۔ لیکن ابتدا میں آزادی نسواں کے متعلق ان کے خیالات انتہائی دقیانوسی قدامت پرستی پر مبنی تھے۔ زمانہ ایک ایسا معلم ہے جو بہ قدر استعداد سب کو سبق دیتا ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مرحوم کے خیالات میں بھی نئی روشنی اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تصانیف میں صبح زندگی کے سلسلے کی کتابیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان کی وفات سے ایک خاص عزائشپردازی کا خاتمہ ہو گیا اور حقوق نسواں کا ایک زبردست حامی اٹھ گیا۔ ہمیں بیگم راشد الخیری اور ان کے لائق فرزند ارتقی الخیری اور مرحوم کے دوسرے پوتے سے دلی ہمدردی ہے۔

آل انڈیا اوریئنٹل کانفرنس میسور: آل انڈیا اوریئنٹل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس بمقام میسور دسمبر کے آخری ہفتے میں زیر صدارت راجا سیمو کانتا، راؤ بہادر ڈاکٹر ایس کرشنا سوامی آیینگر منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ای۔ بی کوکاک داس چانسلر میسور یونیورسٹی صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر کے بعد مہاراجہ میسور کی تقریر ہوئی اور آپ نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ صدر کی تقریر سے ان کی قدامت پرستانہ تنگ نظری ابھی پوری طرح ہے۔ ہندو مسلمانوں کے تقاطع کو دور کرنے کے لیے جو تجویزیں ملک میں زور پکڑ رہی ہیں صدر صاحب کو ان سے بالکل ہمدردی نہیں۔ خطبہ انداز میں وہ اپنے سامعین سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر ان تقاطع کے باوجود قدیم زمانے کے ہندو ہندوؤں کی تہذیب کا سکہ ان ممالک میں بجا سکے جہاں یہ تقاطع نہ تھے تو پھر آج کیوں ہندوستان کی ترقی کے لیے ان کا دور کرنا لازمی شرط سمجھی جائے۔ خطبہ صدارت میں کافی بگڑے ہندوؤں کے مذہب کے مستقبل پر غور کرنے کے لیے نکالی گئی ہے لیکن ہندوستانی فارسی عربی سے متعلق ایک لفظ اس میں کاش کہنے پر بھی نہ ملا۔ ہمارا خیال ہے کہ صدر صاحب نے اپنے عہدے کے فرائض کو بھی صحیح طرح سمجھا نہیں۔ اس دھوکے میں کانفرنس کو ہندوؤں کی تہذیب اور ہندوؤں کے مذہب کے علاوہ کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ حیرت بھی ہمیں ہے کہ اس کانفرنس کے شعبے کا نام بدل کر شعبۂ اسلامیات رکھ دیا گیا ہے۔ ہندوستانی اور ہندی کے شعبے اس سال سے بند کر دیے

اور ہندوستانی زبان سے متعلق جتنے مقالات تھے وہ شعبۂ اسلامیات میں پڑھے گئے۔ کانفرنس کا یہ رویہ حد درجہ قابل اعتراض ہے اور حامیان زبان ہندوستانی کو بلاتاخیر مناسب حکومت اس پر اعتراض کرنا چاہیے تاکہ آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔ ذیل میں ہم ان مقالات کی فہرست دیتے ہیں جو کانفرنس میں پڑھے گئے۔ یا مقالہ نگاروں کا ارادہ تھا کہ ہیں پڑھیں لیکن کسی وجہ سے اس کا موقع نہ مل سکا۔ فہرست میں صرف وہی مقالات درج ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ ناظرین معیار کو ان سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

شعبۂ ایرانیات: صدر پنسیل: پی ای انگلیسریا: (۱) اکبر خیام بحیثیت صاحب فکر و فلسفی از جے ای سکلٹن الاہبی۔ خیام میں ربانیت کے بجائے نظرت کی وجہ تمی جو اہل تصوف میں ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے خیام اور تومس ہارڈی کے فلسفۂ زندگی کا مقابلہ کیا ہے ان کی رائے میں اگر استعارات سے قطع نظر کر کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو خیام حب الٰہی کے نشے میں سرشار نظر آتا ہے۔ براؤننگ اور خیام کے نظریہ ہائے محبت کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے)

شعبۂ اسلامیات: صدر: ڈاکٹر ابو العلم محمد نظام الدین پی۔ ایچ۔ ڈی (کینٹب) (۱) آدکن میں اردو شاعری کا احیا (عہد آصف جاہ ثانی از عبد القادر سروری ایم اے۔ دکن میں مغلوں کا عروج دکنی زبان کا زوال ابتدائے دور آصف جاہی میں شاعری کی حالت نظام علی خاں کے دربار میں دکنی شعرا کا شمالی عناصر سے میل جول اور اس کا اثر شعرائے تین گروہ جن کی سلطنت نے سرپرستی کی خاص کی خاص شمالی جو دہلی کے روزمرے کو برتتے تھے اور وہ دکنی شعرا جو مخلوط زبان استعمال کرتے تھے)

(۲) نظام الملک طوسی کی زندگی اور سیاسی کارنامے کا تاریخی مطالعہ از ابو نصر خالدی بی اے (عثمانیہ)

(۳ و ۴) شمس تبریز اور حافظ کی عرفی شاعری از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی (کسی مصنف نے شمس تبریز کے والد کا نام علاء الدین یا جلال الدین لکھ دیا ہے۔ یہ دونوں الموت کے اسماعیلی حکمراں تھے اس بنا پر بعض لوگوں نے شمس تبریز کو اسماعیلی سمجھ لیا ہے۔ شمس کے والد کا نام جیسا کہ قدیم نوادر سے معلوم ہوتا ہے محمد بن علی بن ملک داد یا ملک داؤد تھا اور شمس اسماعیلی نہ تھا۔ دولت شاہ نے نام علاؤ الدین لکھا ہے اس کی تردید)

(۵) مشرقی و مغرب کے مشرقی کتب خانے از ڈاکٹر محمد صبیح اللہ (عثمانیہ دیوبن و پیرس)

(۶) اردو شاعری کا لکھنوی اسکول از ڈاکٹر غلام محی الدین قادری (عثمانیہ ولندن)

(۷) احیائے ادب و ایران در حکومت پہلوی از صدر شعبہ (فارسی ادب کے پانچ دور ایک نئے دور کا آغاز شاہ پہلوی کی ہدف فنون و ادبیات ادب کے جدید میلانات عہد حاضر کے فارسی ادبیات کا مختصر جائزہ فارسی کا مستقبل)

(۸) شیر محمد خان (لسان) دکنی معاصر بیدر و سودا از سید محمد ایم اے۔

شعبۂ کلاسیکل سنسکرت: صدر: ڈاکٹر ایس کے اے (ڈی لٹ) (۱) آیا کلام انجام تشبیہوں کا نہ ہونا سنسکرت ادب کا نقص ہے؟ (بورڈ بھٹی ناٹک اور بھٹا ناٹک غیر مذہبی ہے سنسکرت ناٹکوں میں قوم والمرکے واقعات موجود ہیں۔ سنسکرت کے شاعروں کے نزدیک ادب کا جو مقصد ہے وہ ان کو فن انجام ناٹکوں کے لکھنے سے حاصل آتا ہے)

(۲) "کالی داس اندھرادیس کا باشندہ تھا" از گوبند چار یا سوامی مہاراجہ سنسکرت کالج وتراگرام
(۳) "رس کا ایک نیا تصور" از سی۔ آر۔ نارا سمہا شاستری مہاراجہ کالج میسور

(۴) "کالی داس کا پیام" از نارا سمہا شاستری، دیوودہ ایم۔ اے بنگلور (کالی داس اس خصوصیت میں بے نظیر ہے کہ اس میں انسان کے ادبی محاسن کے ساتھ مابعد الطبیعات کے عمیق مذہبی خیالات بھی ہیں۔ اس کی شاعری امید پرستوں کی شاعری ہے۔ شکست کو وہ نہیں جانتا لیکن کامیابی سے دیوانہ بھی نہیں ہو جاتا۔ وہ خوش دلی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں ہے۔ مصول کے منتظر اس کے نزدیک یہ نہیں کہ وہ چند جوہر دار ہیرے دور کی جائیں، دنیا کی مسرتوں میں وہ حصہ لیتا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ کوئی چیز ہے جو اس سے بلند تر ہے، اس لیے اس کی نگاہ میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ انسان اگر مناسب ذرائع اختیار کرے تو ہر بات میں کامیاب ہوگا)

(۵) "سنسکرت میں غم انجام ناٹک" از رام چندر راؤ ایم۔ اے، شعبہ سنسکرت میسور یونیورسٹی (چار ناٹک بورد بھیجا گیا۔ کارنا ٹھارا، بینی سمہارا، چنڈ کوسی کا مغربی معیار سے جانچنے کے بعد غم انجام ٹھہرتے ہیں۔ دوسرے ناٹک کو غم انجام کہنے کی وجہ یا وجوہ اس کے ہیرو اس میں مرتا نہیں۔ پہلے ناٹک میں ہیرو کی موت "ہوتے ہیں موت کو ایک خاص پیرایے میں ظاہر کرنا۔ تیسرے میں ہیرو کی موت۔ ان ناٹک کا ہیرو دوسرے دیوتا کو سمجھنے کی وجہ۔ ہیرو دو خاص قسم کے کردار کے لوگ "نامور اور عالی مرتبہ اشخاص ہوتے ہیں۔ تیسرے ہوتے "ناٹک شیکسپیر کے انداز کے ہیں" پہلے دوسرے یونانی انداز کے ان ناٹکوں اور یونانی تمثیلوں کی مشترک خصوصیات)

(۶) "ہندوستانی شعریات میں قوت تخیل" از ڈی این سری کنٹھیا ایم اے مہاراجہ کالج میسور۔
شعبہ پراکرت، صدر ڈاکٹر پی۔ ایل ویدیا ڈی لٹ (۱) جین رامائن (از اسمہاچار یا ایم اے میسور۔
شعبۂ تاریخ، صدر ڈاکٹر راد ھا مکرجی پی ایچ ڈی ایل ایل (۱) جہاں آرا بیگم "علم الدین سالک ایم اے لاہور۔

(۲) نواب علی وردی کی سیرت اور اس کی حکومت" از کالی کنکر دت ایم اے لیکچرر پٹنہ کالج پٹنہ۔ (مآثر السلاطین، فوائد الفواد، احوال علی وردی خاں یوسف علی، تاریخ بنگلہ، سلیم اللہ، ریاض السلاطین، غلام حسین سلامی، ؟) خلاصۃ التواریخ، کھیان سنگھ چند شائع شدہ، غیر شائع فرانسیسی انگریزی کاغذات)

(۳) پیشواؤں کی زندگی" از اگھ نندر راو ایم اے میسور (۴) گوبند پنت بندیلہ دیالی ست (زیر طبع)

(۴) "ٹیپو سلطان" از وکٹمنا سیا شاستری پی ایچ ڈی مہاراجہ کالج میسور (حال کے مصنف تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ٹیپو حامیا کا بھی خواہ تھا اور رعایا میں نامقبول نہ تھا۔ دونوں گھاٹوں کے درمیان جو ہندو رہتے ہیں ان کے ساتھ اس کا سلوک نارواداری کا رہا تھا صرف دیلزلی ہی سے یہ توقع نباہ سکا، لیکن عدیدہ شہادتوں کا لحاظ کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معمولی زمانے میں ٹیپو بھی معمولی قسم کا حکمراں تھا، لوگوں کے مذہب کا تبدیل کرانا سیاسی اغراض سے تھا۔ وہ اپنے ہندوستانی اور یورپی معاصرین سے زیادہ متحمل نہ تھا)
شعبہ اشریات، صدر کے این وکنکٹ ایم اے (۱) تاریخ و عمارات اورنگ آباد (زبیدہ احمد خاں اورنگ آباد
پاٹلی پترا میں کھدائی میں کون سی چیزیں پائیں از مسٹر جن گھوش پٹنہ میوزیم پٹنہ۔

شعبۂ فنون لطیفہ وغیرہ - صدر پروفیسر شاہد سہروردی بی اے۔ (۱) "قدیم ہندوؤں کی تماشا گاہیں" ہندوؤں میں غنائیت ہے اور قدیم ترین ویدوں میں ڈراما کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ صلجا دار و ہرا پا اور دوسرے مقامات کی کھدائیوں سے شہادت ملتی ہے کہ ویدوں کے وجود میں آنے قبل بھی باقاعدہ تھیٹر موجود تھے۔

شعبۂ السنہ و ادبیات، صدر آنریبل اسمتھا چاریار ایم اے (۱) تمثیلی کی صدیہ تحریک اس کا آغاز اور نشو و نما از ڈاکٹر سی نرائن راؤ پی ایچ ڈی۔

شعبۂ السنہ جدیدہ ہند۔ صدر ڈاکٹر ایس کے چٹرجی ایم اے ڈی لٹ۔ ہندی فورٹ ولیم کالج میں از پروفیسر بنجمن ایم اے۔

ہندوستانی اکیڈمی: ہندوستانی اکیڈمی کی چوتھی کانفرنس جنوری کے دوسرے ہفتے میں بمقام الہ آباد منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح صدر اکیڈمی رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کی تقریر سے ہوا۔ اس کے بعد مسٹر سچدانند سنہا سابق ریمن آف کونسل بہار و اڑیسہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ بہت مکمل تاریخ ہو چکا ہے اس لیے اس کا صرف خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ (۱) الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈمی کے قیام کے بعد بہار و اڑیسہ کی مجلس قانون ساز میں یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس صوبے میں ایک اکیڈمی قائم کی جائے حکومت نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی زیر صدارت سر علی امام بنا دی جس کی سفارش اکیڈمی قائم کرنے کے حق میں ہوئی لیکن اس کے بعد ہی حکومت کو کچھ ایسی مالی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا کہ اس سفارش پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ (۲) اکیڈمی نے اس وقت تک ۸ کتابیں ہندی میں اور ۱۹ اردو میں شائع کی ہیں۔ مشاہیر اہل علم سے لکھوانے کا انتظام بھی اکیڈمی نے کیا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ ۸ ہزار روپے اکیڈمی نے ..... اس وقت بطور انعام ہندی اردو کے مصنفین کو دئے ہیں۔ طلبہ کی ہمت افزائی کے لیے جو ۵۰۰ روپے دئے گئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اکیڈمی اردو ہندی کے سرحدی رسالے الگ الگ نکالتی ہے (۳) شمالی ہند کے ان اقطاع میں جہاں اردو ہندی بولی جاتی ہیں ان دونوں کی علحدگی کی وجہ سے بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں بنگلے میں بنگلہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہو سکتی ہے لیکن صوبجات متحدہ میں اردو ہندی کے جھگڑے کی وجہ سے کسی دیسی زبان کا ذریعۂ تعلیم ہونا ناممکن ہے۔ ان صوبوں میں کچھ عرصے سے ابتدائی مدارس کے لیے یہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ ایسی زبان میں تعلیم دی جائے جو ہندو مسلمان دونوں سمجھتے ہوں یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ صوبہ بہار میں بھی اس کی تقلید کی گئی ہے (۴) اردو ہندی تو دونوں نام فساد کی جڑ ہیں ان کو ترک کر کے ایک نام ہندوستانی رکھنا چاہیے۔ ہندی والے یہ سمجھتے ہیں کہ بہترین ہندی وہ ہے جس میں بیسی زبان کے الفاظ کیا خورد و زمرہ کے ہندوستانی الفاظ نہ آنے پائیں اردو والے اسے سہل سمجھتے ہیں کہ ہندی الاصل الفاظ جہاں تک ممکن ہو استعمال کریں اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ہو سکے بھروں۔ سر تیج بہادر سپرو فرماتے ہیں کہ اس طرف اردو میں نئے نئے عربی فارسی الفاظ داخل ہو رہے ہیں جو پہلے کبھی سننے میں بھی نہ آتے تھے، یہی ہندی میں کایہ حال ہے کہ کبیر، عبدالرحیم، تلسی داس، بہاری لال، ملک محمد جائسی کا کلام بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے لیکن آج کل کے لکھنے والوں کی کتابیں سمجھنے کے لیے قدم قدم پر لغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مقام مسرت ہے کہ اس رجحان کی مخالفت بھی ہو رہی ہے، چنانچہ ہندی کے ایک نامی پنڈت کے پوت میں ایسے لوگوں کی خوب ہنسی اڑائی گئی ہے جو خواہ مخواہ ہوئے پر

الفاظ زبان میں ٹھونستے ہیں۔ اُردو ہندی قدیم نام ہیں اور زبان کے ترک کرنے سے یہ ڈر ہے کہ لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ میر علی محمد شاد مرحوم، سید علی بلگرامی مرحوم اور سید سلیمان صاحب ندوی کی رائے ہے کہ اُردو کی جگہ ہندوستانی نام زیادہ موزوں ہے۔ شاد مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو قدیم نام زبان کا یہیں ہے، یکایک تیرھویں صدی کے وسط میں عالم وجود میں آگیا (میرے 'زبان اردوئے معلی شاہجہاں آباد' لکھا ہے، 'مصفی کے اشعار میں چودھویں صدی کی ابتدا کے لکھے ہوئے ہیں۔ 'اردو زبان' آیا ہے) اور دریائے لطافت جب تصنیف ہوئی ہے تو لفظ اردو زبان کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شاد کا قول صحیح نہیں۔ معیار۔ (۴) عوام کی زبان پر ہزاروں الفاظ ہیں جو خالص ہندوستانی ہیں لیکن شستہ فارسی زبان سے خارج ہیں۔ اکیڈمی کو ایسے الفاظ کا لغت تیار کرانا چاہیے۔ (۵) ہندی اردو کے مستند مصنفین کی کتابوں کے ناقدانہ نسخوں کا ایک سلسلہ شروع ہونا چاہیے جن کی قیمت ایک روپیہ فی جلد سے زیادہ نہ ہو۔ (۶) ایک مستقل سلسلہ ایسی کتابوں کا شائع ہونا چاہیے جو نہ معلق ہندی میں ہو نہ مشکل اُردو میں، بلکہ ایسی زبان میں جس کو اردو والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی والے بھی۔ انشا کی کہانی 'پنڈت شری دھر پاٹھک اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیا کی کہانیاں' نظیر اکبر آبادی اور آرزو کا منتخب کلام اس سلسلے میں شائع کیا جاسکتا ہے۔ کچھ روپے جو انعامات میں دیے جاتے ہیں ایسے مصنفوں کے لیے مخصوص کر لینے چاہییں جو اُردو ہندی کے فرق کو بڑھاتے نہیں بلکہ کم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ خطبہ صدارت کے بعد اکیڈمی کی کارگزاری کی رپورٹ پڑھی گئی اور اس کے بعد پنڈت گنگا ناتھ جھا صدر شعبہ ہندی اور عبدالحق صاحب صدر شعبہ اُردو نے اپنے اپنے خطبے پڑھے۔

عبدالحق صاحب کا خطبۂ صدارت رسالہ اردو جنوری میں چھپا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں گذشتہ صدی کی چار نظم تحریکوں کا ذکر کیا جن سے اردو زبان و ادب کا جدید شروع ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، اورنٹیل کالج لاہور پھر اس کی شکایت کی کہ ادبی اداروں میں باہمی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت سا وقت محنت اور روپیہ رائیگاں جاتا ہے۔ اگر سال میں ایک بار اردو کی خدمت کرنے والوں میں سے وہ لوگ جو اہل نظر اور صاحب رائے ہیں ایک جگہ جمع ہو کر 'کام کی نوعیت' 'کام کی تقسیم' اس کی ترقی و اشاعت اور جدید ضروریات کے متعلق غور کر کے کچھ امور طے کر لیں ان کے عمل میں لانے کی تدابیر سوچیں اور ان کے انجام دینے کے وقت کا بھی تعین کریں، تو یقین ہے کہ وقت محنت اور روپے کی بڑی بچت ہوگی۔ صاحب موصوف نے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ اکیڈمی ایسی کتابیں لکھوائے جو ایسی زبان میں ہوں جو بخشہ دونوں رسم الخط میں چھپوائی جاسکیں۔

قابل ذکر مضامین جو جلسے میں پڑھے گئے حسب ذیل ہیں:- ڈاکٹر زبیر احمد 'اردو قواعد' ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی 'اردو شاعری عہد آصفیہ میں'، مولوی ہیم الرحمٰن صاحب 'اردو کے اعراب'، عبدالماجد صاحب 'اردو کا واعظ شاعر'، ریاض الحسن صاحب 'قدرت اور حقیقت'، آفاق حسین صاحب 'قدیم اُردو ادب'، سیماب صاحب 'ہندوستان کی تربیت جدید میں اردو شاعری کا حصہ'، ڈاکٹر سید حسن برنی صاحب 'شاہ ولی اللہ'، ڈاکٹر نبارسی پرشاد 'گیتہ' دور سلطانی کے امرا'، محمد اجمل خاں صاحب 'لاطینی رسم الخط کے آنے سے ہندی اور اردو کا ملاپ'، پنڈت کشن پرشاد 'کول' 'اردو اور ہندی زبانیں'، عبدالسلام صاحب 'مدوی' 'اردو شاعری کے جدید انتخابات کی ضرورت'، میش پرشاد صاحب 'غالب کے خطوط'، خان صاحب سید افضل حسین 'نفیس لکھنوی'۔

انجمن ترقی اردو۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے کتب ذیل بہت جلد شائع ہونے والی ہیں۔ "تذکرۂ گل مجالب" (۱۱۹۲-۱۱۹۴) مصنفہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی، "ملا نصرتی" از عبدالحق صاحب تقریباً ۲۰۰ صفحے، "سودا" تحقیقی مقالہ از شیخ محمد چاند صاحب ۲۲۵ صفحات۔

دیوان جوشش عظیم آبادی۔ اس نامور شاعر کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب کا انتظام ہو رہا ہے۔ مثنویات مصحفی۔ مصحفی کی اردو مثنویاں تعداد میں بیس کے قریب ہیں۔ عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو کی فرمائش سے قاضی عبدالودود صاحب انہیں مرتب کر رہے ہیں۔ قرینہ ہے کہ اس سال ان کا مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہو جائے۔ تذکرہ میر حسن: یہ تذکرہ ایک بار چھپ چکا ہے، لیکن کتابت کی غلطیاں بہت رہ گئی تھیں اور زیادہ تر نسخوں کے مقابلے کا بھی انتظام نہ ہو سکا تھا۔ اب قاضی عبدالودود صاحب اسے کئی قلمی نسخوں کی مدد سے از سر نو مرتب کر رہے ہیں۔ اس کی طباعت انجمن ترقی اردو کی طرف سے بہت جلد شروع ہونے والی ہے۔ شمائلہ عثمانیہ: اس نام کی ایک کتاب کشف الظنون کے مؤلف حاجی خلیفہ رومی صاحب (مرحوم) کے بھائی صاحب نے لکھی ہے اور اب قریب تکمیل ہے۔ قرینہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اس سال یا سال آئندہ شائع ہو جائے۔ اس کتاب کو حکیم صاحب کی ادبی زندگی کا حاصل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، اس لیے کہ تکمیل میں ان کی زندگی کے بیس پچیس سال صرف ہوئے ہیں۔ شمائلہ عثمانیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اول تو کتاب نگلنے کے متعلق ہے، دوسرے اس کو تین زبانوں سے سروکار ہے۔ شمائلہ عثمانیہ میں تین کی رعایت تو ظاہر ہے، یہ بھی ناظرین کو معلوم ہوگا کہ یہ ترکیب حافظ کے ایک شعر سے ماخوذ ہے اور جس غزل کا یہ شعر ہے، وہ حافظ نے بطور امتحان بنگالے بھی بھیجی تھی، شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند، پڑیں قند پارسی بہ بنگالہ می رود۔ اس کتاب میں ان تمام کتابوں کا ذکر ہوگا جو تینوں زبانوں میں بنگالی مصنفین نے لکھی ہیں، بیرونی اشخاص نے بھی جو کتابیں زمانۂ قیام بنگالہ میں لکھی ہیں، وہ اس میں شامل ہیں۔

دنیا کے بہترین انسائی، مصور احمد صاحب (مدیر ادبی دنیا) کی یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اب متعدد اضافوں اور مقدمے کے اضافے کے ساتھ دوسری بار چھپ رہی ہے۔ اپریل تک شائع ہو جانے کی توقع ہے۔

رسول کریم، مصور احمد صاحب کے قلم سے امیر علی مرحوم کی روح اسلام کے پہلے حصے کا ترجمہ اپریل تک شائع ہو جائے گا۔

تذکرۂ عرب، سید علی بلگرامی مرحوم نے گستاولیوں کی اس کتاب کا ترجمہ اصل فرانسیسی سے کیا تھا اور ۹۰ء میں اس کا مختصر نسخہ شائع کیا تھا۔ کتاب عربی سے کباب تھی، سید عبدالقادر صاحب، مالک اعظم اسٹیم پریس، چار مینار حیدرآباد دکن اسے طبع کرا رہے ہیں۔ قیمت طبع اول کے مقابلے میں کم لکھی گئی ہے۔

کتاب الہند بیرونی: سید حسن برنی صاحب بی اے (ایل ایل بی) علیگ، بیرونی کی مشہور عالم کتاب کا بظاہر اصل عربی سے ترجمہ کر رہے ہیں، اور بقدر ایک تہائی کے انہوں نے یہ کام انجام بھی کر لیا ہے۔ دوسرے باب کا ترجمہ انہوں نے سالنامہ عالمگیر ۱۹۳۶ء میں چھپوایا ہے، اور اہل نظر سے مستدعی ہیں کہ اس ترجمے کے حسن و قبح سے انہیں آگاہ کریں۔

ہوں بڑہ کر مُتعارف کو خود سے پڑھ لیں۔ (۲) یہاں پر صرف ہی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں ستر جم اپنی خواہش کے مطابق رد و بدل کر دیتا ہے نہ شائع ہوں گے۔ ہر ترجمے کے ساتھ مصنف اور اصل افسانہ نگار یا مضمون کا نام ضرور درج ہونا چاہیے۔ (۳) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرما دیں۔ (۴) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

معاصرین سے۔ جن معاصرین کو تبادلہ منظور ہو وہ (یہ صرف ادبی رسائل کے لیے ہے) براہ کرم سال رواں کے کل پرچے روانہ فرمائیں تاکہ معیار میں ہم ان کے ادبی مضامین کے خلاصے درج کر سکیں اس معاصرانہ نوازش کے لیے ہم نہایت ممنون ہوں گے۔

مشتہرین سے۔ مشتہرین میں رسالے کو مقبول بنانے کے لیے اجرت بہت کم رکھی گئی ہے اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی اشتہار شائع ہو سکتے ہیں۔ نرخ نامہ طلب کرنے پر بھیجا جائے گا۔

نمونہ۔ خاص خاص اصحاب کی خدمت میں معیار کا پہلا پرچہ نمونۃً حاضر ہو رہا ہے امید ہے کہ وہ اس کے مطالعے کے لیے وقت نکال کر ہمیں شکر گزاری کا موقع دیں گے۔ اس کے حسن و قبح سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے اور بشرطِ پسند ہمیں اجازت دیں گے کہ ان کا نام خریداروں کی فہرست میں درج کریں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسرا پرچہ بے طلب تعمیل اوقات کا باعث بنے گا۔

مندرجات معیار ماہ مئی

مئی کے معیار میں اس کی مخصوص عنوانات کے علاوہ حسب ذیل مضامین ہوں گے۔

۱۔ اشعار غیر مطبوعہ مرزا غالب۔ ۲۔ دیوان دوم معروف از قاضی عبدالودود مدیر معیار۔ ۳۔ پنجیف از لے سی ڈارو
۴۔ قدیم فارسی شاعری از ڈاکٹر نظام الدین استاذ فارسی جامعہ عثمانیہ۔ ۵۔ امانت کی اندر سبھا کے متعلق غلط فہمیاں از آرزو جمیلی۔ ۶۔ حسن رُخ گاں۔ از کی دموپاسان۔ مترجمہ آرزو جمیلی۔

امیر مینائی اور ان کے خاندان کے بعض افراد کی ایک مجموعی تصویر ہمیں مل گئی ہے۔ ہم اس نایاب تصویر کو مئی کے معیار میں شائع کریں گے۔ یہ تصویر ہمیں جناب ریاض حسن خاں خیال کی عنایت سے مل گئی ہے۔

مقام اشاعت:۔ مراد پور بانکی پور (پٹنہ) "منتظم"

دیوانِ جوشش

جوشش عظیم آباد کا نامور شاعر ہے۔ اور اس کی نغز گوئی کے گل تذکرے معرضِ بیں۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جو بڑی کوشش سے دستیاب ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو اس کا متعدد نسخوں شائع کرنے کی غرض سے مرتب کرا رہی ہے۔ اس کو صحیح اور جامع بنانے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ قول تذکروں سے جن میں سے متعدد دور پہ میں ہیں ایڈیٹر صرف کر کے جوشش کے حالات اور ان کے اشعار کی تفصیل منگوائی گئی ہیں مقطعے میں جوشش کے علاوہ ان کے بھائی محمد جلد ول کے حالات بھی ہونگے اور ان کے صدی کی زبان سے بھی مفصل بحث کی جائیگی دل کا کلام جوشش کے کلام کی بھی جائے گی۔ ان کے اشعار بڑی کوشش سے حاصل کیے گئے ہیں اور بطور تحریر دیوان جوشش شائع ہوگی۔ یوں آئینہ دیوان ہندستان بھر کے ارباب ذوق کی قدر شناسی کا مستحق ہے لیکن اہل بہار سے خاص طور پر توقع ہے کہ وہ اس کی خریداری فرمائیں گے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ بہار کے قدیم باقاعدہ شعرا میں سے کسی کا کلام اب تک بلیع میں نہ آیا۔ اگر یہ کلام شائع ہو جائے تو اور دیوان جوشش بھی اس حالت میں ہو کہ اگر انجمن اس کی اشاعت کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو بہت جلد گمنامی کی نذر ہو جاتا۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ تذکرہ عشقی تذکرہ شورش اور دونوں کے مصنف عظیم آبادی ہیں) اور بعض دوسرے دواوین بھی شائع کیے جائیں لیکن اس ارادہ کا تعلق ہے تعلق میں اس صورت میں عمل ہو گا دیوان جوشش کے خریدار کافی تعداد میں ہم پہنچیں دیوان عمدہ کاغذ نفیس گھاٹن چھپائی کے ساتھ ۲۰۰ صفحات تا ۲۵۰ صفحات ہوگا۔ ماہ اپریل کے آخر تک جن صاحبوں کی درخواستیں دصول ہوں گی ان کے قیمت فی صدی کم چھپائی قیمت ۲ روپے کے قریب ہوگی۔

درخواستیں بنام منتظم معیار بانکی پور (پٹنہ)

اصلاحیہ بک ڈپو

مہندر و پٹنہ

مغل اور اردو۔ داستان اردو کا ایک دلچسپ باب۔ از جناب ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال۔ قیمت صرف ۱ روپیہ

داستان عجم۔ قیمت صرف ایک روپیہ عمدہ

فکر بلیغ۔ از حضرت شاد عظیم آبادی قیمت عمدہ

ظہور رحمت " " عمدہ

مادر ہند " " عمدہ

تاریخ شعرائے بہار جلد اول مؤلفہ عظیم آبادی مادر زاد بہار و اردو شاعری کی تاریخ بیان کرنے کے بعد صوبہ جات کے تین سو شعرائے متقدمین اور متوسطین کا تذکرہ اور ان کے ادبی کارناموں کی فہرست مع نمونہ کلام تین سو صفحہ دوروں میں بالتفصیل مذکور ہے قیمت عمدہ

تذکرہ بہار اور اڈیسہ۔ مرتبہ محمودہ خاتون مرحومہ سررس گرلز اسکول پٹنہ۔ بہار کے جغرافی تاریخی ادبی حالات درج ہیں۔ قیمت صرف دس آنہ۔ عمدہ

اس کے علاوہ بھی کتابیں اردو ادب کی رہتی ہیں۔

خرچ ڈاک و پیکنگ وغیرہ ذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ

منیجر اصلاحیہ بک ڈپو

(مہندر و پٹنہ)

نور الحسن پرنٹر و پبلشر نے برقی سٹین پریس مراد پور بانکی پور سے چھپوا کر دفتر معیار مراد پور بانکی پور سے شائع کیا۔

انجمن ترقی اُردو (شاخ پٹنہ) کا ادبی رسالہ

معیار

مرتّب :- قاضی عبدالودود معاون :- آرزو جلیلی

اپریل بانکی پور (پٹنہ) سنہ ۱۹۳۶ء

معیار

سالانہ چندہ
للعہ
ممالک غیر سے معہ
(جنوری۔ مارچ۔ مئی۔ جولائی۔ ستمبر اور نومبر میں ۱۱۲ صفحات۔ باقی مہینوں میں ۲۴ صفحات)

فی پرچہ ۱۲ر
انگریزی ایڈیشن (دھوئی کاغذ) فی پرچہ ۴ر
ضمیمہ (۲۴ صفحات) فی پرچہ ۲ر

بانکی پور۔ (پٹنہ)

مرتب:۔ قاضی عبدالودود
معاون:۔ آرزو جلیلی

جلد | اپریل ۱۹۳۶ء | نمبر ۲

نمبر	مندرجات	نگارندہ	صفحہ
۱	تعارف	ادارہ	۱۱۳
۲	آثار ادبیہ:۔	———	۱۱۵
۳	صوبہ بہار:۔	———	۱۱۷
	مطبوعات جدیدہ:۔		
۴	اشعار میر	آرزو جلیلی	۱۱۹
۵	اشعار مومن	آرزو جلیلی	۱۲۱

نمبر	مندرجات	نگارندہ	صفحہ
۶	رسائل کے سالنامے اور خاص نمبر	مستقیم حسین سلیم	۱۲۱
۷	۱۹۳۵ء کے ادبی مضامین	ادارہ	۱۲۶
۸	محکمہ:۔	ق۔ ع۔ و۔ ثمر، و۔	۱۳۴
۹	مراسلت:۔	عبدالحفیظ ثمر	۱۳۶
۱۰	عالم ادب	ادارہ	۱۳۷

تعارف

میر حسن کے اشعار کلیات حسن کے اسی نسخے سے ماخوذ ہیں جس کا ذکر گزشتہ اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ سراج و مضمون و میر کی غزلیں تذکرۂ عیار الشعراء مصنفہ خوب چند ذکا سے نقل کی گئی ہیں۔ اس کا صرف ایک نسخہ دنیا میں ہے، اور وہ دفتر وزارت ہند لندن میں محفوظ ہے۔ دل فیلم آبادی کے اشعار تذکرۂ عشقی سے لیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی بہت کمیاب ہے، اور اس کے صرف دو نسخوں کا اس وقت تک پتا چلا ہے۔ مولت، مومن کے اشعار ان کے مطبوعہ دیوان سے انتخاب کیے گئے ہیں۔ سید محبوب شیر مولت مرحوم اور ان کے استاد حسن بلگرامی کا ذکر دسمبر ۱۹۳۵ء کے معیار میں اپنے مشہور مضمون "س ش ص" میں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ حسن اپنی لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھا کر اپنے شاگردوں کو مہینے دو مہینے میں شاعر بنا دیتے تھے۔ مولت کا کلام مشاہیر اساتذۂ فارسی کے مقابلے میں

نہیں مٹ کی جاسکتا، لیکن جو قدرت انہیں شہر گئی ہے اگر وہ حسن کی کتاب کے رسالہ کا نتیجہ ہے تو حسن کی کرامت میں کوئی شبہ نہیں۔ سوالات کے حالات بھی ہم کسی موقع پر لکھیں گے۔

مراسلت:- یہ باب اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ ادبیا زبان کے متعلق وہ مسائل جو وقتی اہمیت رکھتے ہیں ان سے بحث کی جائے۔

تصحیح

مارچ کے پرچے میں کتابت اور طباعت کی غلطیاں اس قدر تھیں کہ ان کی مکمل تصحیح غلطنامے میں نہیں ہو سکی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناظرین کو دوبارہ زحمت دینی پڑی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ پرچے صحیح چھپیں۔ اگر کسی پرچے میں غلطیاں رہ جائیں تو ان کی تصحیح دوسرے ماہ کے پرچے میں کی جائے گی۔

ص الف س ۲۳ چھپائے۔ چھپوائے۔ — ص ۱ (مندرجات بابت ۱۰ مارچ ۱۹۳۶ء) (نمبر شمار = شمار) — اقتباسات کے بعد فہرست میں ایک عنوان "استفسارات" چھوٹ گیا ہے۔ اس کا شمار ۲۷ ہوگا، اور اس کے بعد ۲۷ کی جگہ ۲۸، ۲۸ کی جگہ ۲۹ اور ۲۹ کی جگہ ۳۰۔

ص ۳ س ۱۲ پسند = پسند، ہیں۔ ۴ ساتھ = سے۔ ۵ زمان = کس زبان = بعض = انہوں نے بعض۔ ۶ ص ۴۴ = ص ۳۰۔ ۶ سکے گی = سکی۔ ۴ فروری = فروری ہے۔ ۵ سے باہر = باہر۔ ۶ ط = منقطہ۔ ۷ پر = پر بھی۔ ۸ بھی ہم = بھی ۱۱ لیے = اپنے۔ ۱۲ یمن = ممن۔ ۱۳ بالخانہ = بالخانۂ۔ ۱۴ زمانہ = زمانۂ۔ ۱۵ ہوئی = ہوے۔ ۱۶ تمہاں کی منزل = جس کی پوری منزل۔ ۱۷ کا پیارہ = کو پیارہ۔ ۱۸ منہ = منہ دایاں = دہنا۔ ۱۹ الا = ا۔ ۲۰ سکینہ = سکینہ۔ ۲۱ رضا = رضا۔ ۲۲ سے نکلے ہیں = ۱۲۰ الکھتا ہے۔ ۲۳ بھی حال = حال بھی۔ ۲۴ مزا = مزہ۔ ۲۵ ملوہ = جلوہ۔ ۲۶ این ست = این است — ۲۷ بودوست = بود و است۔ ۲۸ لڑکی = لڑکی کی۔ ۲۹ لکھا ہے = ہے۔ ۳۰ وطلعات = اور مطلعے۔ ۳۱ پھروں = لوں۔ ۳۲ کیا = کی۔ ۳۳ لیکن = / ۳۴ اشتاب = شتاب۔ ۳۵ یہ = یہ کہ۔ ۳۶ مقدہ = ہفتدہ۔ ۳۷ لینا = لیناھی۔ ۳۸ دکوریہ = دکوڑیا۔ ۳۹ (لارنس = لارنس) (دربینا = دربینا) (اسٹروجی = اسٹراچی) ۴۰ ارض = ارضی۔ ۴۱ جزیرہ = جزیرہ نمائے۔ ۴۲ راجہ = راجا۔ ۴۳ مقالا = مقالہ۔ ۴۴ روپیہ = روپیا۔ ۴۵ ہو = ہوں۔ ۴۶ زبیر = زبید۔ ۴۷ (شاہ = شاہ) ۴۸ اس کتاب کو ..... دی جائے = یہ کتاب ..... دی جائے۔ (اس کی جو تصحیح سابق میں ہوئی تھی وہ غلط ہے) ۴۹ استحان = ارتحان۔

ص ۱۰/ ۲۹ صحیحت = اصابت

آثار ادبیہ

(۱) مثلثات میر حسن (۲) ترکیب تضمین ایجاد میر حسن (۳) غزلیات سراج اورنگ آبادی، ممنون دہلوی و قمر الدین منیر دہلوی۔

مثلثات میر حسن

گزر ہر دل میں ہے از بس کہ تیرا ' زخود ہرگز نیازارم دلے را کہ می ترسم ز دل جائے تو باشد' نظیری
سوا اس کے نہیں درکار کچھ شے ' جلانے مختصر خواہم کہ در دے ہمیں جائے من و جائے تو باشد' لاعلم
کسی کے درد کو سمجھے گا تو خاک ' ترا ہرگز گریبانے نشد چاک چہ دانی لذت ریوانگی را' حیاتی
نکالا اب کہاں کا اُس نے یہ بیر ' چناں آمیزشے کردہ است با غیر کہ بے او در خیال ما نیاید' لاعلم
مجھے ٹھہرا گیا نہ آخر کار ' رفتم از خویش و قت رفتن یار او چناں رفت و من چنیں رفتم' ''
سب طرف سے ہاتھ اُٹھا کے اکدم ' سر بر قدمت نہادہ بودم افسوس کہ روزگار نگزاشت ''
کیا حال ہے اس میں اب خاک ' از بس کہ فزود یم و شد چاک ایں سینہ ہمہ بود حسرتی رفت' لاعلم
ٹک دیکھ کے راہ چل ستم گر ' از نقش قدم بسے فزوں تر در راہ تو چشم انتظار است' عزیز
وفا کیسی کہاں کی بے وفائی ' شکایت را بود شرط آشنائی چہ بایہ گفت آں نا آشنا را' پیارے کبرآبادی
اس بت کی ادا نے مجھ کو مارا ' گفتم کہ نگاہ کن خدا را گفتا کہ خدا نگاہ دارد' نسبتی
گر سفر پر کرے ہے تو نے کسی ' بہ غریبانِ شہر او چو رسی نسبتی را سلام ما برساں' ''
دید و دید ہو گئی کل واں ' حشم با چشم شد پیام رساں از میان منت زباں برخاست' ''
یہ کج فہمی ہے تیری میں کہوں کیا ' خطوری شکوہات از یار بیجا تو بے طالع فتادی ہم اگویست' خطوری
ایک دل ہو کہ ہر کہ ہر لے گل ' یک طرف ذلف و یک طرف کاکل جان من در کشاکش افتادہ است' ''
بے شرکت غیرآہ یک چند ' بودیم بہ دو ستیش خورسند آن نیز نصیب دشمناں شد' امید

ترکیب تضمین ایجاد میر حسن

بلندی پر کوئی گو پنے نکرائے (۱) پہ تیری سی یہ چھپ تختی کہاں پائے
اگر سرنے پہ بالائے تو باشد ز چوں قد دل آرائے تو باشد

مرتبہ کسی کو ہوئے سودا یا نہ سودا، ' خوش است اندر دل دیوانہ سودا' بہ شد مطے آں کہ سودائے تو باشد،
شاہ زدہ نظر آیا ترے جلوے کا جب رنگ ' مو دو عالم را بیک بار از دل تنگ بروں کردیم تا جائے تو باشد
ابھی نکلو تو کچھ نکلے مرا کام ' یک امروزاست ما را فقط ایام مرا کے صبر فردائے تو باشد

خوشی کے واسطے کوئی کسی کے پاس جاتا ہے (۲) وہ مجھ کو دیکھ کر آگے ہی اپنا منھ بناتا ہے
'روم ہر گہ بہ بزم یار تا خوشنود برخیزم نہ گوید با من بیدل سخن تازہ در برخیزم'
جو کوئی بوالہوس ہو وہ ڈرے لے سر و یہیں تن 'ز بیداد تو کے خواہم جدائی بر گرفتن من
کہ از بزمت بہ یک حرف عتاب آلود برخیزم'
اشارے سے مجھے کہہ دے کہیں کتنا ہوں اٹھا غم 'بے ترتیب بزم خاص مجلس می زنی برہم
اگر من ہم دریں مجلس نہ خواہم بود برخیزم'
خدا جانے کہ کیا عالم ہو اور کیسی پڑے پھر ان 'ز رشک غیر می ترسم چہ داہم سر ز دامن
ز بزمم او ہمیں بہتر کہ امشب زود برخیزم'

غزلیات سراج ممنون دمثیر

چمن میں گل بدن جب قامت رعنا سے آتے ہیں (۱) بہشتی چھوڑ جنت سایۂ طوبیٰ سے آتے ہیں
مراد خاص اشک و آہ طوف کعبۂ دل ہے کوئی دریا سے آتے ہیں کوئی صحرا سے آتے ہیں
ہجوم داغ کے طرّے بنائے غم کے مالی نے عجب پھولوں کے دونے گلشن سوتلے سے آتے ہیں
نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف اس کے قامت کی یہی مضمون مجھ کو عالم بالا سے آتے ہیں
کہو کیوں کر رہے فوج خودی کا مورچہ قائم کہ یہ قلقل کے گولے قلعہ مینا سے آتے ہیں
سراج اس ہستی موہوم کا احوال کھلنے کو عدم کے صاف تختے کشور عنقا سے آتے ہیں

کوئی ہم درد نہ ہم دم نہ یگانہ اپنا (۲) رو برو کس کے کہیں ہم یہ فسانہ اپنا
نہ کسی جیب کے پھول اور نہ دامن کے خار کس لیے تھا چمن دہر میں آنا اپنا
فائدہ کیا جو ہوئے شیخ حرم اہب دیر نہ ہوا دل میں کسی کے جو ٹھکانا اپنا
ہیں وہاں ناز کے دنبال ہزاروں بیتاب دیکھیو پردۂ محمل نہ اٹھانا اپنا
باد خزاں سے کیا ورق گل الٹ گیا (۳) جس کے الٹتے ہی ہم بلبل الٹ گیا
مار اجو قہقہہ کبھی اس مست ناز نے مینائے کا دم دم قلقل الٹ گیا
شاید کسی کی روح پیاسی تھی لے صبا جو خود بخود صبوح خم مل الٹ گیا
ہما تھا قیس ناقہ لیلےٰ تری طرف زنجیر پا کا سنتے ہی وہ غل الٹ گیا
شکل کبوتران گرہ باز ہے مثیر یاں اشک جو مژہ سے گرا ڈھل الٹ گیا

صوبۂ بہار :۔ (۱) کلام شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی (۲) کلام سید محبوب شیر صولت عظیم آبادی

کلام دل

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا
اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

ہے تیغ نگہ کا ترے گھائل نہ بچے گا
میں سوچ چکا ہوں دل بسمل نہ بچے گا

اضطراب ہجر میرے دل پہ زور اور پڑا
صبر تیری اس توانائی پہ کیا پتھر پڑا

دھوکے میں ہم کنار و وطنا ز ہوگیا
یہ بھی اک اتفاق خدا ساز ہوگیا

کہہ نہ یوسف کو تو اس ماہ لقا سے بہتر
کوئی بندے کو بھی کہتا ہے خدا سے بہتر

ان لبوں سے کہیں کہ کام نہیں
اتنے بھی تو نمک حرام نہیں

دل مضطر کو مارے درد و غم ناحق جدائی میں
یہی انصاف ہے کیا اے خدا تیری خدائی میں

اے ابر ہم تو وہ ہیں اگر چشم نم کریں
طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو کم کریں

نہ دیکھ اس طرف وہ ظالم سبا داد دیکھتا ہی ہو
دل اپنی جان کا دشمن تو مت خواہی نخواہی ہو

پہنچے پائے نہ عارض تک اس یار کے ہاتھ
زلف نے باندھ دیے جیسے گنہگار کے ہاتھ

کلام صولت عظیم آبادی

از سر نام گذشتن ہمہ نام ہست ایں جا
دست از کام کشیدن ہمہ کام ہست ایں جا

بادہ خم خم بکش و لغزش مستانہ بسنج
کہ ہمہ عشرت کونین تمام ہست ایں جا

زہے زغار رہت گل بہ جیب آبلہ ہا
عبیر خلد بہ کوئے تو گرد قافلہ ہا

نقاب حسن فزاید بہ رخ فرنگ ترا
کند دو آتشہ مینا شراب رنگ ترا

دمے قرار نہ گیرد بہ کنج سینۂ من
مگر پر از رم آہو بود خدنگ ترا

بود بنمائے تو خوشتر ز لطفہائے دو گوں
بہ صلح کل نہ فروشم ادائے جنگ ترا

خدنگ تو نہ ہمیں می کشد دلم بہ خودش
دلم بدام بہ خود می کشد خدنگ ترا

چکد از طرۂ ہر عقوبت لے سر خیل آفتہا
بلا ہا فتنہ ہا کا فرادائیہا شرارتہا

بہ خواب اندر ز بس مہ رفت را بگرم شب
بود تار شعاعی تار و پود بستر شب

بپرس از روئیدا و بزم ما و رود راز لب ملت
فغاں خیزد بجائے موج مے از ساغرم امشب

گل آب در رنگ یافتہ موج خون ہست
صبح بہار پنبۂ داغ جنون ہست

تسخیر عالمے بہ تخاعت نمودہ ایم
آواز پاشکستگی ما فسون ہست

بے لبت جامے از دیدۂ پرنم کم نیست
در صہبا کدہ از حلقۂ ماتم کم نیست

بس کز عارض رنگین تو ترگشت بہار
گل بہ صحن چمن از قطرۂ شبنم کم نیست

دلم ز ذوق طرب دیدہ از ضیا خالیست
بیا کہ جائے تو اے شوخ جا بجا خالیست

کدام نالہ چہ مطلب چہ مدعا چہ پیام
بہ عالمے کہ منم کوہ و از صدا خالیست

گذشتہ اند ازیں دشت با سر پرشور
زمین وادی الفت نقش پا خالیست

جہاں ز جلوۂ آں آفتاب لبریز است
نشان و بید کہ یک ذرہ از کجا خالیست

چناں نمودہ مرا از تمیدن شرگاں
کہ جائے اہل تو اضع بہ دیدہا خالیست

بہ رنگ نکہت گل صولت از سبک روی
بہ ہر مکاں کہ در آئیم جائے ما خالیست

سرخ پوشے نکہتے بت رعنائے ہست
بر سر بام بہ بینید تماشائے ہست

ما بسمل و زندگی ما تپیدن ہست
تسلیم جان نمودن ما آرمیدن ہست

من و سوزے کز دول تا بہ تفتیدہ رسا ماند
نفس تا رشتہ جاں ہوئے آتش دیدہ را ماند

شب کہ بے صبائے لعلت خاطرم دلگیر بود
تقطیع خیا بہ گوشم نالہ شبگیر بود

اگر ز خویش خودت را جدا توانی کرد
چہ گویمت کہ ازیں پس چہا توانی کرد

بہ دل ز ہجوم غم جاناں گلہ دارد
ایں خانہ ترا نبود ہی مہماں گلہ دارد

سازیاے کہ رواں در تن امید دمد
گریہ گیر کز و خندۂ جاوید دمد

از در شہر و نہ از راہ بیاباں رفتم
از رہ چاک جگر تا در جاناں رفتم

ذوقی نظارہ نگر تا بہ چہ عنواں رفتم
دل خود گشتم و خوں گشتہ بہ مژگاں رفتم

ہیچ دانی کہ دراں کو بہ چہ عنواں رفتم
پائے کوباں بہ دم خنجر راں رفتم

نہ نمی گردد جدا فکر سخن از طبع نا شادم
مگر کز خاک زمین شعر بنیادم

چہ گویم کز خود جلوۂ کیستم من
دریں پردہ گر او نیم چیستم من

بہ ہر محفل کہ ریز د جلوہ شرح روئے جانانہ
خط ساغر شود تار نگاہ و چشم پروانہ

از من چہ کم گردد لے فرتر سائی
یک جلوہ گرم در بر از ناز بفرمائی

مردم بہ تمنائے وقت است کہ باز آئی
لے آمدنت جان اعجاز مسیحائی

مطبوعات جدیدہ

۱۔ اشعار میر از آزاد دہلی ۲۔ اشعار مومن از آزاد دہلی ۳۔ "زمانہ" حالی نمبر از؟ ۴۔ ساقی جاپان نمبر از؟ ۵۔ ہمایون سالگرہ نمبر از؟ ۶۔ نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۳۶ء از؟ ۷۔ ادبی دنیا سالنامہ ۱۹۳۶ء از متعلم۔ ۸۔ ادب لطیف سالنامہ ۱۹۳۶ء۔ از سید حسن

اشعار میر۔ مرتبہ پروفیسر عبدالسلام ندوی ایم اے پٹنہ کالج۔ ناشر رام نرائن لال الہ آباد۔ تقطیع $\frac{20 \times 20}{16}$ ص۔ ۳۱ + ۱۱۸ قیمت ۸ر

جناب ندوی نے میر کے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ میر کے مختصر حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے یہ کتاب پٹنہ یونیورسٹی میں آئی اے کے نصاب میں داخل ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے ۳۱ صفحات کا تعارف لکھا ہے۔ اس تعارف میں انہوں نے مختلف موضوعات پر میر کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اور تقابل کے لیے دوسرے شعرا کا کلام بھی درج کیا ہے پیش لفظ کے عنوان سے ندوی صاحب نے کتاب کی وجہ تالیف بیان کی ہے۔ اس کے بعد ۶۶ صفحات میں میر کے حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ میر کی تصانیف ان کے معاصرین اور شاگردوں کی فہرست دی ہے' اور میر کے عہد کی معاشرت اور شاعری کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

انتخاب طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ کلام پر تبصرہ بھی اسی انداز سے کیا ہے کہ طلبہ کے لیے مفید ہو۔ بعض بیانات محل نظر ہیں:۔

(۱) صفحہ ۱۲ جناب ندوی نے آزاد کا قول نقل کیا ہے کہ "اردو میں دا سوخت کے موجد میر ہی ہوئے" آزاد کا یہ قول صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے قبل کا آبرو کا دا سوخت موجود ہے۔ (۲) "میر کی مثنویوں میں جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے کوئی مافوق الفطرت عنصر کارفرما نہیں"۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ میر کی مثنویوں میں مافوق الفطرت عنصر پایا جاتا ہے۔ مثنوی شعلہ شوق ملاحظہ ہو۔ جو کلیات میر کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔

جناب ندوی سے گزارش ہے کہ "اشعار میر" کی دوسری اشاعت میں میر کی مثنویوں کے حوالے دے کر اپنے اس قول کی تصحیح کریں۔ (۳) صفحہ ۱۳ راسخ عظیم آبادی کے سن وفات کے متعلق مرتب نے صرف کاہ سال وفاتی کا قول نقل کیا ہے' جو نہایت بے پروائی ذکر کیا گیا ہے۔ وفاتی نے سال وفات ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔ لیکن صحیح سال وفات ۱۲۴۳ھ ہے جو "سخن شعرا" مرتبہ نساخ میں درج ہے۔ یاس آردی کے دیوان میں راسخ کی

وفات کا قطعہ تاریخ ہے جس سے ۱۲۳۰ھ نکلتا ہے۔ (۴) انعام اللہ خاں یقین کے متعلق مرتب نے صرف مصحفی کے تذکرے کا حوالہ دیا ہے۔ کہ یقین ۲۵ برس کے سن میں مرے۔ دوسرے تذکروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین نے ۲۵ برس سے زیادہ کی عمر پائی تھی۔ (۵) ص۳۹ مرتب نے ہدایت دہلوی کا سال وفات ۱۲۱۵ھ درج کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ ۱۲۱۵ھ کریم الدین نے لکھا ہے جو تاسی کے تذکرے سے ماخوذ ہے بعض تذکروں میں ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۹ھ لکھا ہے۔ صحیح سال وفات کا تعین مشکل ہے۔ قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرے میں ان کو مرحوم و مغفور لکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا۔ اس لیے صرف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہدایت ۱۲۲۱ھ کے قبل مر چکے تھے۔ (۶) ص۴۱ میر الم کا سن وفات ۱۲۱۵ھ لکھا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ حقیقت میں الم کا سن وفات ۱۲۲۱ھ کے بعد ہے۔ مجموعہ نغز کی تصنیف کے زمانے میں یہ زندہ تھے۔ (۷) میر سوز کی ولادت کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا کہ ۱۱۴۳ھ میں ہوئی درست نہیں۔ صحیح سن ولادت اب تک یقین کے ساتھ معلوم نہیں۔ (۸) ص۳۹ "میر محمد بیدار" ان کا نام میر محمد بیدار نہیں بلکہ میر محمدی بیدار ہے۔ اصل نام میر محمد علی ہے۔ (۹) ص۴۲ "مرزا محمد علی فدوی دہلوی ۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔" یہ صحیح نہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ فدوی کا قیام کبھی فیض آباد کبھی مرشد آباد کبھی عظیم آباد میں رہا ہے۔ میر حسن کے تذکرے کی تصنیف ۱۱۸۶ھ کے قریب شروع اور ۱۱۹۰ھ کے قریب ختم ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۱۹۰ھ کے قبل ہی سے فدوی عظیم آباد سے تعلقات قائم کر چکے تھے۔ (۱۰) تصانیف کی فہرست نامکمل ہے۔ خصوصاً "ذکر میر" (میر کی خود نوشتہ سوانح عمری) جیسی اہم تصنیف کا ذکر نہیں ہوا چھپ بھی چکی ہے۔

مرتب نے خصوصیات کلام میر کی جو تشریح کی ہے اس سے مجھے چنداں اختلاف نہیں لیکن عیوب کلام جو مرتب نے لکھے ہیں وہ میر کے مخصوص عیوب نہیں۔ یہ عیوب ہر غزل گو شاعر کے کلام میں بہ کثرت موجود ہیں۔ مثلاً نقلی صرف میری کا شیوہ نہ تھا بلکہ ہر شاعر کا۔ میر پر مرتب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ایک شعر اعلیٰ ہوتا ہے تو دوسرا بالکل پست۔ یہ کمزوری تو صنف غزل ہی کی ہے۔ ضرورت شعری اور قافیے کی پابندی کی وجہ سے غزل میں اس قسم کا انبذال پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔

مرتب نے میر کے لکھنؤ آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور نہ طلبہ کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی خاص ضرورت تھی لیکن میں آنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میر اور سودا سے لکھنؤ میں ملاقات نہیں ہوئی۔ بعض بے پر کی حضرت یہ لکھ دیا کرتے ہیں کہ میر اور سودا کا لکھنؤ میں کیجا ہونا تحقیق طلب ہے۔ جناب نیاز فتحپوری نے جنوری ۱۹۲۵ء کے نگار میں لکھا ہے کہ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ میر اور سودا سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی یا نہیں۔ جناب نیاز کا یہ خیال ان کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ "تاریخ ادب سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ میر ۱۱۹۶ھ اور سودا ۱۱۹۰ھ کے

درمیان لکھنؤ آئے۔ سودا کا سن وفات ۱۱۹۵ھ ہے جس میں شک کی مطلقاً گنجایش نہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ سودا اور میر لکھنؤ میں یکجا ہوئے ہوں؟

اشعار مومن۔ مرتبہ پروفیسر عبدالسبحان بیدل۔ ناشر رام نرائن لال الہ آباد۔
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ص ۱۷۲۔ قیمت ۔

جناب بیدل نے پٹنہ یونیورسٹی کے آنرز اے کے طلبہ کے لیے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ یہ کتاب بھی اشعار میر کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ مومن کے حالات اور اس کے کلام پر تنقید ۵۲ صفحات میں ہے۔ انتخاب ۱۴۴ صفحات میں ہے۔ انتخاب میں رباعیات غزلیں اور قصیدے ہیں۔ مومن کے متعلق مرتب لکھتے ہیں (صفحہ ۲) "مومن نے شاعری میں کسی کی تقلید نہ کی۔ بلکہ عام روش سے بالکل الگ اپنا راستہ نیا یا جو عام طبائع کو ناموافق تھا۔ شاعری کی پرانی شاہراہ سے الگ چلنے والا دلیر اور جدت پسند مومن جا بجا ٹھوکریں بھی کھاتا ہے مگر اس پر بھی اپنی طبیعت سے نکالے ہوئے نئے رستے کو نہیں چھوڑتا ....." اس کے بعد لکھتے ہیں (صفحہ ۲۱) "ناسخ کے تتبع کی وجہ سے کلام میں جا بجا خشکی سی آگئی ہے"۔ مجھے حیرت ہے کہ مرتب نے اپنے پہلے قول کی بیخ تردید چند سطروں کے بعد ہی کس طرح کر دی! ۔ شاعری میں کسی کا تتبع نہ کرنے والا "دلیر اور جدت پسند" مومن ناسخ کا تتبع کس طرح کر سکتا تھا۔ یا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ناسخ کا تتبع کرتا تھا، تو وہ دلیر اور جدت پسند کس طرح ہو سکتا تھا؟

نیرنگ خیال۔ سالنامہ ۱۹۳۶ء مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب جازی تقطیع ۱۶×۲۴ علاوہ تصاویر قیمت عہ
نیرنگ خیال مدعی ہے کہ اردو میں سالناموں کی ابتدا اسی نے کی ہے، اور اس دعوے کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ رہا یہ سوال کہ یہ بدعت حسنہ ہے یا بدعت سیئہ اس کے جواب میں اختلاف کی گنجایش ہے لیکن اس بحث میں ہم یہ بحث پھر بھی نہیں چاہتے۔ ۱۹۳۶ء کے سالنامے کو ملا کر ۹ سالنامے نیرنگ خیال نے نکالے ہیں، اور زیر نظر سالنامہ اپنے پیشروؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ خود نیرنگ خیال کی رائے میں یہ ایک محیر العقول کارنامہ ہے دوسرے رسائل تو کسی شمار میں نہیں، نیرنگ خیال کے سابق سالناموں سے بھی بازی لے گیا ہے۔ نوزائیدہ بچے کو پہاڑ اگر ان سے زیادہ ہو جو پروان چڑھ چکے ہیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں یہ قول حسن یہ بھی "رفتہ رفتہ اپنے قرینے پر آ ہے گا"

دو دن کے چاند جو خود حسن کے بھی ہو چکے
پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آ ہے

زیر نظر سالنامے کو دلچسپ اور مفید بنانے میں شاعر، افسانہ نگار، انشاپرداز، اہل تحقیق سب کا حصہ ہے۔ شاعروں میں "حفیظ" "ساغر" "فراق" "اشفتہ" "فانی" "ذوقی" "جوش" "اثر" کے اشعار موجود ہیں۔ جوش کا دماغ تشبیہ سازی کا ایک کارخانہ معلوم ہوتا ہے جہاں ہر رنگ اور ہر وضع کی تشبیہیں ڈھلتی رہتی ہیں۔ ایک غزل جناب راجا صاحب محمود آباد کی بھی

کلام الملوک ملوک الکلام کے عنوان سے چھپی ہے ممکن ہے کہ کلام اس تعریف کا مستحق ہو لیکن یہیں اب تک علم نہ تھا کہ والی محمود آباد کو حکومت برطانیہ نے امیر افغانستان اور مہاراجا نیپال کی طرح بادشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ اگر یہ خطاب حکومت برطانیہ میں بلکہ نیرنگ خیال کے دربار سے عطا ہوا ہے۔ تو حکیم صاحب کو تاج بخش تسلیم کرنے میں اب عذر نہ ہونا چاہیے۔ افسانوں میں پہلا امتیاز محاب امتیاز علی صاحبہ کے 'تحفے' کو دی گئی ہے۔ موصوفہ کے اکثر افسانوں میں ایسی لڑکیوں اور ناتجربہ کار لڑکوں کا عشق دکھایا جاتا ہے۔ اشخاص افسانہ عالم محسوس سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس خیالی دنیا کے باشندے ہوتے ہیں جہاں کی سیر کرنے کی موصوفہ خوگر ہیں اور تو اور ان کے خلوقات ذہنی کے نام بھی ساری دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ جنسی محاورات کے ترجمہ اس پر مستزاد! موصوفہ کی تصانیف میں جو دماغی حیثیت (اکزوٹزم) نظر آتی ہے وہ پیرپوتی کی یاد دلاتی ہے لیکن پیرپوتی کبھی جاپان کبھی ترکی کبھی حبش کی سیر کراتا ہے۔ موصوفہ نے صرف ایک 'ملک' پر اور وہ بھی ایسا جو دنیا کے موجودہ نقشوں میں نہیں مل سکتا، قناعت کر لی ہے۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ پیرپوتی الفاظ سے مصوری کرتا ہے موصوفہ کو نہ تو وہ قدرت زبان پر حاصل ہے اور نہ انہوں نے اتنی مشق شناس نظر پائی ہے۔ ٹھنڈی بجلی میں وہ کچھ جدت ہے وہ اس کے نام میں ہے' کنول' نام کی جدت کا بھی دعویٰ نہیں ہو سکتا' ایک بیوہ ون کا عروج' اور 'گناہ بے گناہی' اپنی قسم کے بڑے افسانے نہیں۔ 'آہیل مجھے مار' خالص وہ دو دیل ہے' اور نور الٰہی مرحوم کی موت کی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے تحقیقی مضامین میں سب سے بہتر خضر خاں اور دول دیوی سے تعلق سید حسن برنی صاحب کا مضمون ہے' اسلام اور عورت' ڈاکٹر سید نعیم الدین احمد بصری نے لکھا ہے۔ صاحب مضمون فرماتے ہیں کہ اسلام نے نسوانی مسئلے کا "مکمل ترین حل دنیا کے سامنے پیش کر دیا ..... اور اسلام کے دیگر حقوق کی طرح اس مسئلے کا حل بھی مساوات کی بنیاد پر قائم ہے" اس رائے کے پہلے حصے سے اگر اتفاق بھی کیا جائے تو دوسرے سے اتفاق بالکل ناممکن ہے۔ اور مساوات کو ثابت کرنے میں فاضل مضمون نگار نے تاویل بیجا سے کام لیا ہے اور ان کا استدلال بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اگر طلاق کے معاملے میں مرد و عورت کے حقوق اسلام نے یکساں مقرر کیے ہیں تو پھر جہاں مرد کے حقوق کی تصریح کی گئی ہے عورتوں کے حقوق کی تصریح کیوں نہیں کی گئی؟ مرد کو پورا حق ہے کہ کوئی وجہ بتائے بغیر عورت کو طلاق دے دے' یہ فعل بہت برا سہی' لیکن مرد کے قانونی حق سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح کہ عدم رسالت میں ناموافقت زوجین کی بنا پر عورت کی درخواست پر نکاح فسخ کر دیا گیا' لیکن کوئی حکم عام اس بارے میں نہیں دیا گیا کہ فسخ نکاح کے متعلق ہر عورت کی درخواست عام اس سے کہ کسی بنا پر ہو' منظور کی جائے گی۔ اگر بفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ عدم رسالت میں جو فیصلے ہوئے وہ آئندہ کے لیے بطور نظیر پیش کیے جا سکتے ہیں اور قاضی کا فرض ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ جب بھی مساوات نہیں قائم ہوتی مرد بغیر عدالت میں گئے ہوئے خود فیصلہ کر سکتا ہے اور عورت کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے مرد کو تعدد ازدواج کی جو اجازت ہے اس کے متعلق محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ عورت پابند نہیں کہ شادی شدہ شخص سے نکاح کرے۔ مساوات

جب ہوتی کہ عورتوں کو بھی اس کی اجازت ہوتی کہ ایک سے زیادہ شوہر کریں۔ ترکے کے متعلق بھی صاحب مضمون نے فیصلہ کر دیا ہے کہ "باپ کی جائیداد میں بیٹی کا حصہ جو کم رکھا اس کی تلافی شوہر کی جائیداد سے حصہ لاکر کر دی" اور یوں بھی شوہر کو تمام اخراج کا کفیل بنا کر باپ کی جائیداد میں سے حصے کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی" اس دلیل کا آخری ٹکڑا اگر صحیح ہو تو شادی شدہ عورتوں کو سرے سے باپ کا ترکہ ملنے کی ضرورت ہی نہیں۔ فاضل مضمون نگار نے کافی غور نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ آزاد عورت کے لیے شوہر کا کفیل ہو جانا کافی نہیں۔ ہم ذیل پر انہیں غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں باپ کی سالانہ آمدنی تیس ہزار ہے۔ لڑکے کا حصہ ۲۰ ہزار اور لڑکی کا ۱۰ ہزار ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی ایک غریب شوہر سے ہوتی ہے۔ کیا مالی حیثیت سے لڑکا اور لڑکی دونوں برابر ٹھہر سکتے ہیں؟ دلیل کا پہلا ٹکڑا بھی اسی قدر کمزور ہے جتنا کہ دوسرا۔ شوہر کی جائیداد میں اگر بی بی کا حصہ ہے تو کیا بی بی کی جائیداد میں شوہر کا حصہ نہیں ہوتا؟ پھر مزید برآں یہ کہ عورت ۴ مرد کی مقدار ہے شوہر ۴ کا۔ اور اگر شوہر ۴ بیویاں رکھتا ہے تو کسی بی بی کو آدھ آنے سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ اگر مساوات یہی ہے تو اس لفظ کا مفہوم ہمارے اور فاضل مضمون نگار کے ذہن میں الگ الگ ہے۔ فاضل مضمون نگار کو شکایت ہے کہ "ہماری سرشت میں دوسرے مذاہب کے تمدن کا بہت گہرا اثر ہو گیا ہے" اس آئینے میں تو ہمیں انہیں کی تصویر نظر آتی ہے۔ عورت مرد کی مساوات کا تصور تہذیب نو کا پیدا کردہ ہے، کیا ضرورت ہے کہ کھینچ تان کر اسلام کے احکام عصر حاضر کے مزعومات کے مطابق ثابت کیے جائیں۔ عزیز احمد صاحب کا طویل مضمون نقد سے پہلے کی اردو شاعری پر جتنا طویل ہے اتنا بصیرت افروز نہیں۔ پرویز صاحب نے خالد کی شاعری کا تعارف مناسب طریقے سے کرایا ہے، جاپانی شاعری پر ایک مضمون لطیف الدین احمد صاحب کے قلم سے نکلا ہے، یہ بھی لطف سے خالی نہیں، اختر صاحب شیرانی اور اختر حسین صاحب کے تراجم بھی اچھے ہیں۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا مضمون اصغر کی شاعری پر سنجیدگی اور ظرافت کے اجتماع کا کامیاب نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ صدیقی صاحب اگر "مرشد" کی ہدایت کے بغیر مضمون لکھا کریں تو شاید زیادہ کامیاب ہوں۔

زمانہ کان پور حالی نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم صاحب ص ۹۰ علاوہ تصاویر۔ قیمت ۱۲ر۔ رسالہ زمانہ کی بڑی وقعت ہماری نظر میں ہے، اور ہم اس کا مقابلہ بازاری رسائل سے نہیں کر سکتے۔ اپنی زایدا رسی سال زندگی میں اس نے متعدد خاص نمبر کامیابی کے ساتھ نکالے ہیں، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حالی نمبر حالی کے شایان شان ہے، اور نہ اس معیار کے مطابق ہے جو خود اس رسالے نے قائم کیا ہے۔ مضامین زیادہ تر سرسری طور پر لکھے ہوئے ہیں ان کا معتد بہ حصہ پہلے بھی کہیں نہ کہیں شائع ہو چکا ہے، اور حالی کی ادبی زندگی کے صرف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ نگم صاحب کی یہ رائے کہ حالی کی شہرت کا دارومدار بہ نسبت نظم کے نثر پر ہے، شاید ہی اہل نظر میں قبول کی جا سکے۔ ایک مضمون زمانہ کی کسی گذشتہ اشاعت سے نقل ہوا ہے، مضمون نگار کا نام منشی عبدالرحمٰن

سیوہاروی درج ہے، ہمارا قیاس ہے کہ یہ مرحوم عبدالرحمٰن بجنوری ہیں۔ حالی کی تحریر کا عکس اور تین غیر مطبوعہ خطوط بھی شاملِ رسالہ ہیں۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو ان خطوط کی وجہ سے قدر شناسانِ حالی کو حالی نمبر کی خریداری کرنی چاہیے۔

ساقی دہلی جاپان نمبر، مرتبہ شاہد احمد صاحب و نور الحسن برلاس صاحب، ص ۴۰۰ علاوہ تصاویر و قیمت عہ

جاپان گذشتہ صدی میں ایک غیر معروف ملک تھا جس کا نام صرف کتابوں میں ملتا تھا، اب اس کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے، پہلے ایک ناقابل التفات دور افتادہ جزیرہ تھا، اب دنیا کی بڑی طاقتوں میں اس کا شمار ہے، اور اس کی ہم سایہ اقوام اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں جب جاپان نے روس کو شکست دی ہے تو ایشیا میں مشرق کا نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا ہندوستان میں اس ملک سے جو عقیدت پیدا ہو گئی تھی اس کی ادنیٰ یادگار ظفر علی خاں کی تمثیل خنگ روش جاپان ہے۔ اس کے بعد مشرقی اقوام کے ساتھ جاپان کا جو سلوک رہا، وہ ایسا نہ تھا کہ اس عقیدت کو قائم رکھنے میں مدد دیتا چنانچہ عہد حاضر کے مشہور شاعر حسرت موہانی نے اپنی مایوسی اور بدگمانی کا اظہار اس طرح کیا:

ہے چین و کوریا کے مٹانے پہ مستعد — جاپان بھی ہوا ہے مگر مبتلائے حرص

اس بدگمانی اور مایوسی کے باوجود جاپان سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ روبہ تنزل نہیں بلکہ روبہ ترقی ہے چنانچہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کو چھوڑ کر تین مستقل کتابیں گذشتہ سال میں صرف اردو میں شائع ہو چکی ہیں ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی غالب ہے کہ اس معاملے میں اردو سے پیچھے نہ ہوں گی۔ ہم ساقی کے جاپان نمبر کا غیر مقدم کرتے ہیں، اور اس کی کامیابی پر اس کی جہت پسند مدیر کو مبارکباد دیتے ہیں۔ بعض رسائل میں یہ اقتراح ہماری نظر سے گزرا کہ چند مضامین سرسری طور پر لکھے ہوئے ہیں، ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اردو کے رسائل جس درجے سے گزر رہے ہیں، اس میں کسی اعلیٰ معیار کا ازاول تا آخر قائم رکھنا قریب قریب ناممکن ہے، اور قلیل قیمت میں ادارۂ ساقی نے ظاہری اور باطنی حیثیت سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ صد درجہ قابلِ داد ہے۔

ہمایوں لاہور، سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۳۵ء، مرتبہ بشیر احمد صاحب و حامد علی خاں صاحب، ص ۱۳۲، علاوہ اعلانات

پنجاب کے رسائل میں ہمایوں امتیاز خاص رکھتا ہے، اس کا سالگرہ نمبر ضخامت اور تعداد تصاویر میں دوسرے رسائل کے سالناموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن معنوی حیثیت سے کسی سے بھی نہیں، اس کے مضمون نگاروں میں دو بہیں خاص طور پر پسند ہیں، ایک تو فلک پیما، دوسرے فیاض محمود۔ فلک پیما کا تخیل فلک پیما یا نہ ہو تو درکی کوڑی ضرور لاتا ہے، اور اس کا انوکھا پن ممکن ہے عام پسند نہ ہو، لیکن اہل نظر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ فیاض محمود کی ادبی زندگی کی عمر چند سال سے زائد نہیں، لیکن ان کے اتحادانہ مضامین سے ان کی مکتسبی اور اضافتوں سے اصول فن سے باخبری کا پتا چلتا ہے۔ اگر وہ زبان میں صفائی پیدا کریں تو ادب اردو میں اپنے لیے مستقل جگہ نکال سکتے ہیں۔ شام کی نرم آرائیاں ہوش ربا ہیں

کی نظم ہے۔ موصوف کا ایک خط بھی ہمایوں میں چھپا ہے جس کے آخر میں کاتب کا نام جوش مرحوم لکھا ہے۔ اگر تخلص کے انتخاب سے شعر کی افتادِ طبیعت کا حال کھل سکتا ہے اور جوش صاحب کو اس پر بہت اصرار ہے' تو جوش کے بعد لفظ مرحوم کے اضافے کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ نظم کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو بھائی میں وہی اگلے برس کی پتلیاں ہیں جنہیں جوش صاحب سوختی قرار دے چکے ہیں۔ تصاویر میں ایک قابلِ غور ہے۔ چار پانچ آدمی مغربی لباس پہنے ہوئے قہقہہ زنی کی مشق کر رہے ہیں اور بشیر احمد صاحب بنفسِ نفیس اس مجمع کی صدارت فرما رہے ہیں۔ ایک تو ہنسنا دوسرے دکھا کر ہنسانا، ستم بالائے ستم! انیس باتوں سے لوگوں میں حسد کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بشیر احمد صاحب کو اس کا خود بھی کچھ احساس ہوا ہے' اور جس طرح نظر بد سے بچانے کے لیے بچوں کی پیشانی پر کالا ٹیکا لگا دیتے ہیں' انھوں نے اس تصویر کے ساتھ ایک بھدی سی نظم بھی شامل کر دی ہے۔ کئی تراجم قابلِ داد ہیں' لیکن ایک ایسے رسالے میں جس کے مرتب بشیر احمد صاحب ہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ مصنف بیچارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے' اور ان کی داغ سوزی کی اس طرح داد دی جاتی ہے کہ بعض تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا۔

ادبی دنیا لاہور' سالنامہ ۱۹۳۶ء۔ مرتب جناب منصور احمد صاحب تقطیع ۲۲×۲۹ ص ۲۰۹ تصاویر، قیمت ۔۔۔ (عظیم)

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس سال کے بہترین سالناموں میں ہے' اس میں ادبی مضامین کا اچھا ذخیرہ ہے۔ مضامین کے انتخاب سے ایڈیٹر کے سنجیدہ مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ سالنامے کے ممتاز مضامین یہ ہیں۔

(۱) شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر۔ از جناب وقار عظیم۔ (۲) تاریخ اردو کا مطالعہ۔ از پنڈت کیفی۔ (۳) اردو ادبیات پر غالب کا اثر۔ از جناب راشد وحیدی۔ جناب وقار عظیم نے اپنے مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ جو لوگ اردو شاعری کو مقامی خصوصیات سے مبرا سمجھتے ہیں انھوں نے نادانی سے کام لیا ہے۔ پھر صاحبِ مضمون نے مقامی رنگ کا مطلب بیان کیا ہے اور مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ اردو شاعری میں مقامی رنگ کی کمی نہیں۔

جناب حسن ہاربروی کے مضمون "ہندوستانی شاعری" میں متعدد تاریخی اغلاط ہیں اس مضمون کا بیشتر حصہ "آبِ حیات" پر مبنی ہے۔ مضمون نگار نے اس مضمون کے متعلق مزید مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ "سوسائٹی کلب اجارہ دار" کا بیاں تمثیل ہے' لیکن اس کی زبان میں سلاست اور روانی نہیں۔ زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ "مصنف کی بی بی" ایک فرانسیسی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس کے مصنف کا نام مترجم نے نہیں ظاہر کیا۔ اس ڈرامے کا مصنف ژوزژ کوتلین ہے۔ مترجم نے ڈرامے کی سرخی کے نیچے لکھا ہے "ایک فرانسیسی ڈراما ہندوستانی فضا میں"۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ محض گرداروں کے ناموں کو ہندوستانی بنا دینے سے ڈرامے کی فضا ہندوستانی کیوں کر ہو گئی؟ اگر مترجم کا اصول صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم گرداروں کے نام جاپانی نہیں بنا دیتے؟

اس ڈرامے کو "ایک فرانسیسی ڈراما جاپانی فضا میں" نہ کہیں۔ ترجمہ بھی اچھا نہیں مثلاً مترجم نے ایک جگہ لارڈ بائرن کا ترجمہ "ہندوستانی شیکسپیئر" کیا ہے۔ کیا شیکسپیئر ہندوستانی نام ہے کہ بائرن کا ترجمہ شیکسپیئر کر دینے سے ڈرامے کی فضا ہندوستانی ہو گئی؟۔

ادب لطیف لاہور سالنامہ ۱۹۳۶ء

تقطیع ۱۱×۸ ۲۰۰ ص مع متعدد تصاویر۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتا مشہور ناشر لاہور

ادب لطیف ایک نیا رسالہ ہے، اس لحاظ سے اس کا سالنامہ بہت کامیاب ہے، ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے مجھے اس سالنامے کو ۱۹۳۶ء کے بہترین سالناموں میں شمار کرنے میں تامل نہیں۔ "میتر لنک" "کلام غالب کی نمایاں خصوصیات"۔ "اورنگ زیب کا قیام دہلی" قابل ذکر مضامین ہیں۔ "میتر لنک" کے مطالعے سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ میتر لنک کے تخلیق کردہ کرداروں کے نام بھی اس کی مثالیت کے آئینہ دار ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ جو لوگ میتر لنک کے ڈراموں کے ترجمے میں کرداروں کے نام ہندوستانی بنا لیتے ہیں وہ میتر لنک کے تخیل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جناب تبسم کی تنقید کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے کلام کو مہمل یا اس کے مغلق اشعار کو بھی شوریت کا مرقع کہنے والے دونوں گروہ نے کلام غالب کی حقیقی خصوصیات کو نہیں سمجھا۔ غالب کے وہ اشعار بھی جنہیں لوگ مہمل سمجھتے ہیں، پڑھنے والے کے دل پر خاص اثر ڈالتے ہیں۔ یہ اثر غالب کے ہمعصر شعرا یا ان کے متقدمین کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ غالب کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تخیل ہے۔ دوسری خصوصیت تفکر اور تیسری علو تخیل ہے۔ غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علو تخیل کے ساتھ جذبات کو پیوست کیا ہے۔ مضمون نگار نے غالب کے تصورات شعری اور نظریہ حسن و عشق پر بھی بحث کی ہے۔ اخیر میں غالب کی چند فارسی ترکیبیں نقل کی ہیں۔ جو ہر اندیشہ، گلبانگ تسلی، خمیازہ ساحل، موج نگاہ ..... جناب افسر نے مصنفی کے قیام دہلی کے متعلق صحیح رائے قائم کی ہے۔ تاریخی مضامین میں کوئی محققانہ مقالہ نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ادارے نے نذر اودھ میں جناب تبسم اور جناب افسر کے مضامین کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور بعض معمولی ترجموں کی تعریف کی ہے۔ "شالامار" اپنے طرز کی ایک دلکش نظم ہے۔ جناب علی اختر کی نظم "غنچۂ پژمردہ" بھی قابل ذکر ہے۔

ادب لطیف کا یہ سالنامہ اس قابل ہے کہ شائقین ادب اس کو اپنے کتب خانے میں جگہ دیں

سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

تنویر کراچی "شعرو سخن" فروری ۱۹۳۶ء مرتبہ عبدالحمید "جمیلیہ ری"۔ مجلس ماضی از خواجہ عشرت لکھنوی ص ۹ تا ۱۴۔ (۱) محمد حنیف علی رعب، متوطن شاہ آباد ضلع کرنال، فارغ التحصیل، داخلہ تحصیل اطب لکھنؤ ۱۹۰۸ء سند تکمیل، وملازمت شفا خانہ مدرسہ تقرر عہدہ طبابت در کلکتہ وچین۔ واپسی لکھنؤ پر سائیکل سے گرے، پاؤں کی ہڈی ٹوٹی، پھر لکھنے ملازم ہو گئے بیمار ہو کر لکھنؤ واپس آئے۔ وفات عمر ۴۱ سال، در دعوی ۱۹۱۰ء (۲ شعر) شاعر اردو و فارسی، ش جلال (۲) امیر ذاکر حسین، یاس لکھنوی، ش مونس در مرثیہ، بعدہ ش جلال، واقف عروض، پہلا تخلص ذاکر، پھر توقیر، گندمی رنگ، پستہ قد، پوگوشیا ٹوپی پہنتے تھے، خلیق بادضع، آغا ابو صاحب کے یہاں سلسلہ ملازمت تھا، صاحب دیوان مطبوعہ، شاگرد بھی تھے (۲ شعر) (۳) نواب مرزا صدی حسن خاں رفعت، صاحب دیوان مطبوعہ لکھنؤ، ارمدی لکھنؤ گورے دبلے، میانہ قد، ثقل سماعت تھا، متاسوے کیا کرتے تھے، ش جلال (۱ شعر) (۴) محمد قاسم، فانی، متوطن کڑہ، مانک پور، ہمشیرزادہ اماں علی سحر بقول خود لکھنؤ آکر فارسی پڑھانے کی نوکری کرلی تھی، امرا کے یہاں قصیدے لکھ کر دے جاتے، مشاہرے اور جا رکھنے پر معاش تھی۔ زمین کی بھی قلیل آمدنی تھی، جب عشرت سے ملاقات ہوئی ہے تو، سال کے تھے، بی بی بچے سب مر چکے تھے، صرف ایک نیم مجنوں لڑکا باقی تھا۔ لکھنؤ یا وطن میں انتقال کیا، تخمیناً ۷۰ برس قبل، زمانہ ملاقات تخمیناً ۴۰ سال (۲ شعر) (۵) خیراتی لال، شگفتہ، ساکن اشرف آباد لکھنؤ، ش نسیم دہلوی، پستہ قامت، سیاہ فام، لاغر، کمزور، فارسی میں تلمیذ ہے طہٰ، قادر الکلام، شاعری زیادہ فارسی آمیز، صاحب دیوان مختصر مطبوعہ تلامذہ، بکثرت ازاں جملہ تبسم کالیسنس کاپی لکھنے والا اور نواب کسری جاہ منا گیا ہے کہ شاگردوں کو غزل بھی کہہ کر دیا کرتے تھے۔ وفات ۳۰ ۳۲ سال قبل، ۲۱ شعر) طالع میں نا امیدی وحسرت ازل سے ہے ؎ اک بیوفا سے مجھ کو محبت ازل سے ہے جو زندگی ہے تو میسر مجھے راحت ہوگی ؎ لے میصیبت تجھے اک روز مصیبت ہوگی (۶) نواب کاظم حسین خاں، کاظم تخلص، ساکن سرائے معال خاں، لاغر، متوسط قد، سانولے، چیچک رو، دھعلڑ، ۳۰ ۴۰ روپے کا وظیفہ اور مصوری بھی آمدنی تھی، سنگ لاخ زمینوں کا بہت شوق تھا، آسان زمینوں میں شوخی نہ نکلتی، نازک مزاج تھے اور حفظ مراتب کا بہت خیال تھا، انتقال تخمیناً ۱۰ سال قبل بعمر تخمیناً ۷۰ سال (۱ شعر) (۷) حکیم شبیر علی خاں، رسا تخلص، ساکن ہوائی ٹولہ لکھنؤ، گورے، بھرے، دراز قد، کتابی چہرہ، کجی آنکھیں، خوش پوشاک، پہلے شوکت تخلص تھا۔ (۱) غلام محمد خاں، تپش تخلص، ساکن دہلی، دراز قد، فربہ، گول چہرہ، لکھنؤ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو کر آئے۔ اس کے بعد اپنا اخبار شیر قیصر جاری کیا، تین بیٹے مطبع کا کام کیا کرتے۔ عشرت کے یہاں اکثر جایا کرتے، خرچ زیادہ، آمدنی کم، دو بیٹیاں تھیں

خلیق، مزاج پسند، بے فکر، عالی زبان دہلی، اقترانات براہیر اللغات، آخر میں مشیر قعیر بند ہو گیا، طبع پر معاش تھی، پابند صوم صلوٰۃ، لڑکیاں بھی کئی تھیں، بڑے لڑکے کا نام نذیر احمد خاں تھا، شعر کم کہتے تھے، وفات ۱۹۰۰ء (۱۰ شعر) (۸) شیخ احمد علی، کامل تخلص، بنارسی، مقیم لکھنؤ، بش فارسی، چند اول بنگرزبان سے ترجمہ کیے۔ اس کے بعد اودھ اخبار میں مترجم انگریزی رہے، کالے، دبلے، میانہ قد، قیام الہ آباد، کشمیری ڈول، بعد کو گوالیار، نیک مزاج، مہذب، وفات تخمیناً ۱۹۰۰ء (۱۰ شعر) (۹) سید ہدایت اللہ خان، بہ تخلص، بیرہ، ماشاء اللہ خاں، کتابی چہرہ، سانولا رنگ، میانہ قد، چوگوشیا ٹوپی، اور چکن کا ڈال، مہذب، وضعدار، تقریر شستہ، ماہر علم نجوم، فارسی میں استعداد کامل، انشا ان کے پرتاثر تھے (یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا معیار) انتقال تخمیناً ۲۰ سال قبل (۴ شعر) آسیا کی طرح دست و پائے عاجت قطع کر، دیکھ کیونکر رزق بے وہم و گماں ملتا ہیں۔ (۱۰) شمس العلما سید علی محمد شاد، ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا (یہ خطاب شاد کو نہیں ملا، عمر بھی صحیح نہیں معیار) عشرت نے ابتدائے شباب میں پٹنے جانے کا ولی نواب تبسم شوخ تخلص کے اصرار سے مشاعرے میں شریک ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بانی مشاعرہ نجوت تخلص، وکالت پیشہ، میانہ قد، گندمی رنگ، چیچک رو، نہایت خلیق، وضعدار، بذلہ سنج، شہرت بھی شریک مشاعرہ تھے شادی کی عمر اس وقت تخمیناً ۹۰ سال کی ہوگی، سب سے آخر میں شاد نے اپنا کلام پڑھا (۴ شعر)

تنویر ماہ رح، قصیدہ عیدیہ، از مصحفی ص ۹ تا ۱۳ (۱) سال تصنیف ۱۲۰۸ھ (یہ صحیح نہیں ۱۲۰۷ اور ۱۲۰۹ کے درمیان یہ قصیدہ لکھا گیا ہے معیار) مطلع اول و شعر آخر، خطائے مصحفی ہیں کچھ بحث کا ہے تصور، کہ مجھ سے ہو رخصتیں نہیں مزاج حضور، جو میں غلام اُموں کو ہو حمید قربانی، جو خیرہ سر ہیں کلاہ[1] ان کا ہو تہ سا طور (اس قصیدے کے ابتدائی اشعار محمود سخن اور شعرالہند میں چھپ چکے ہیں، کتابت کی غلطیاں بہ کثرت ہیں معیار)

ادب لطیف جنوری ۱۹۳۶ء، لاہور قدیم کا علی، ادبی طبقہ از جناب نیاز فتحپوری ص ۱۰ تا ۱۵ (مضمون کا مقتدر حصہ پنجاب میں ادبی آثار کی تلاش و تدوی کے متعلق ہے قول میرے میں ہے کہ وہ اودھ شاہ کے زمانے میں ہوئی گئی تھا اس کے لکھنؤ جانے کا بھی کہیں ثبوت نہیں ملتا معیار) شاگرد ان غالب از جناب اشرف ۱۹۳۶ء، ۱۳۲ تا ۱۳۵ بسلسلہ ادب لطیف لکھنؤ ۱۹۳۶ء (۱) ابو محمد سمیع بیدل سہارن پوری، صاحب دیوان نعت ۲۰ شعر (۲) حکیم ذوالعلی بیگ بیخبر ی (۳) سید علی تپش بنیواری، خلف نجف علی بیکر آبادی، تپش اسیر، بیکر آبادی، غالب، مصنف عزیتہ القواعد، تاج الاذان، شریک مشاعرہ جمادالعلیا ان سکھ (۱۰ شعر) (۱۰ شعر آباد گاہ تسخیر میں غلام محمد تپش کو شاگرد غالب لکھا ہے۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا معیار) نواب اکبر علی خاں کے زمانے میں پانڈوی میں تھے پھر لکھنؤ گئے (۵ شعر) (۱۰ حافظ قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی (۱۲۹۴ فارسی شعر ۳۰) (۱۰ لقمۂ صاحب ۵ دیوان پ ۱۲۰۴ و ۱۲۰۵ و ۱۲۰۸ فارسی شعر ۶) محمد حسین تسلی، آگرہ آبادی، اردو میں نکی مراد آبادی فارسی میں غالب کے شاگرد تھے (فارسی شعر ۴) (۱۰ محمد حسین مرزا پوری شاگرد حزیں مرزا پوری و غالب، صفدر مرزا پوری ان کے شاگرد تھے۔ بیس پچیس سال قبل مرے۔

---

[1] کلاہ، غلط، کلا صحیح

کلیم دہلی فوری مرتبہ جناب ہرش بلیچ آبادی **حالی کی مصلحانہ شاعری**، از خواجہ غلام السیدین صاحب ص ۱۵۹ تا ۱۶۲،

(۱) "جو شاعر۔۔ تڑپ اور احساس سے محروم ہے، جس کا دل اپنے زمانے کی خرابیوں پر اور نا انصافیوں پر نہیں بلکتا، جو صداقت اور شرافت کی طرف سعی نہیں کرتا، جس کا خون حق و باطل کی جنگ کو دیکھ کر تیز تیز حرکت نہیں کرنے لگتا، ممکن ہے ایسا شاعر اپنے کلام میں محاورے اور روزمرے کا کمال دکھائے، لیکن نگاہ حقیقت بیں میں اس کی وقعت بازی گر کے کرتبوں سے زیادہ نہیں" (۲) "حالی کو حساس اور دردآشنا دل ملا تھا، اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا" طبیعت پر یہ داری کی طرف مائل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا دل پر گہرا اثر ہوا۔" حالی کی شاعری ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے، مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فرد واحد۔۔ کا دل نہیں، بلکہ ایک قوم و ملت کا، ایک تہذیب و تمدن کا دل ہے، جو اپنی وسعت میں ایک جہان درد و آرزو لیے ہوئے ہے۔" حالی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ذاتی جذبات و واردات کا آئینہ نہیں، "بلکہ ایک پوری قوم کی داستان عروج و زوال ہے" (۳) دوسری خصوصیت حالی کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔" حالی نے صرف مرض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ دوا بھی تجویز کی۔ انھوں نے اسلام کے بھولے ہوئے اصول یاد دلائے" اور مغرب کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو اس کی ترقی کا باعث ہوئی ہیں (۴) زوال مسلمانان ہند، اور ان کی قومی سیرت کا مسخ ہو جانا، سید احمد خاں کی تحریک اصلاح، حالی کا مسدس سید احمد خاں کی فرمائش سے، ہر طبقے اور ہر گروہ پر صحیح نکتہ چینی، قصیدہ و نعتیہ (عرض حال) میں اسلام کا صحیح تصور۔ (۵) حالی تمدن اور معاشرت کے "مختلف فیہ مسائل میں ادھر ہوتے ہیں" جو عدل و انسانیت اور انصاف کا راستہ ہے۔" اقبال کے اس شعر کو شیکسپیر کی شان میں ہے بدرجہ کمال حالی پر اطلاق ہوتا ہے، "حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن۔ دل انسان کو تر احسن کلام آئینہ" حالی کی شاعری میں قوم کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے" (۶) "حالی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی۔۔ بڑی وجہ ان کا خلوص ہے، ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا" تکلف اور تصنع کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا قول صحیح ہے کہ حالی "یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔" اس کی تائید جسٹس سید محمود کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو (بہ روایت سرسید راس مسعود) ان کی زبان سے سرسید کے سامنے نکلا تھا" ابا جان، اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، ان میں سے کوئی ایسا ہے جس کی پرستش کے لیے تو تیار ہے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے"

نیرنگ خیال لاہور مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب فروری، **عہد شاہ جہانی کا علمی و ادبی طبقہ** ص ۹ تا ۱۶، از سید نیاز احمد ترمذی صاحب (۱) چند، بھان برہمن اکبر آبادی

وفات ۱۶۶۲ء بیلیغ غزل اردو سے خدا نے کس شہر کے اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے، نہ لبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے، (یہ غزل اور لوگوں نے بھی برہمن سے منسوب کی ہے، لیکن یہ علم نہیں کہ کس سند سے معیار) (۲) ولی، رام ولی، عربی فارسی ہندی کستا تھا، دارا شکوہ کا شیر خاص، مثنوی ملقب پنشش وزن مطبع دارالعلوم میں چھپ چکی ہے، کلام ؎

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلا جانا ہے — چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
چو ہنگام اجل آید بہ کارت گھ نہ گھ آید — بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے

(اور لوگوں نے بھی اس شاعر کی طرف ان شعروں کو نسبت دی ہے، لیکن سند کا پتا نہیں چلتا، معیار)

معارف کے مخطوطات

اعظم گڈھ مرتبہ سید سلیمان حبتانہ وی فروری، کتبخانہ وفتر دیوانی حیدرآباد میں کرناٹک کی تاریخ، ازجناب محمد غوث صاحب ص ۱۱۷ تا ۱۲۲ مضمون میں ۳۶ کتابوں کا ذکر ہے جس میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

(۱) نواب سعادت اللہ خاں ۱۶۵۰ء تک کے حالات (۲) انور نامہ میر محمد اسمٰعیل ابجدی انور الدین خاں اور والاجاہ کے زمانے کی منظوم تاریخ۔ ۔ ۔

(مضمون نگار نے لکھا ہے کہ نشو و نما دیوریے میں پائی، اور اس کے بعد ہی تعلیم کا حال شروع کر دیا ہے۔ یہ صاف نہیں کھلتا کہ فارسی کی درسیات اور عربی کی مختصرات کہاں پڑھیں اگر دیوریے میں تو شہر کے، اور باب فضل سے کیا مراد ہے؟ معیار)

(۴) ان کا انتخاب خانقاہ برہانیہ کی سجادہ نشینی کے لیے ہوا تھا، لیکن اپنے ماموں، شاہ غلام ولی کے نواسے شاہ خادم علی کے حق میں دست بردار ہو گئے، (۵) لکھنؤ میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، فارسی کا ضخیم دیوان خانقاہ کمالیہ دیوریہ میں موجود ہے، اردو کی ایک مثنوی ہے، تعداد اشعار ۴۲۰ (سال کتابت مضمون نگار نے قیاساً ۱۲۱۳ بتایا ہے، لیکن جیسا کہ مدیر ندیم نے لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ کاتب نے مصنف کے نام کے بعد مغفور لکھا ہے، معیار)

(۶) کمال الحکمت (فلسفے میں) اور چہار درویش آپ کی دوسری تصانیف ہیں (۷) سید شاہ ولایت حسین صاحب دیوریوی کی زبانی روایت ہے کہ حزیں اسی مکان میں پٹنے آکر ٹھہرا تھا جہاں کمال مقیم تھے، مذاکرے سے مباحثے اور مناظرے کی نوبت آئی، حزیں بھی لو ہا مان گئے۔ فارسی دیوان کمال میں اس کی طرف اشارے ہیں (جب تک کوئی قدیم سنڈیو یہ قابل قبول نہیں، شاد نے حیات فریاد میں بہ زمانۂ طلب علم حزیں کی خدمت میں ان کی حاضری کا ذکر کیا ہے۔ یہ روایت بھی مضنوعی معلوم ہوتی ہے، معیار) (۸) کم و بیش ۸۵ برس کی عمر میں بماہ جمادی الثانی ۱۲۱۵ھ وفات پائی۔ صحیح سال ولادت معلوم نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ ۱۱ ہویں صدی کے ربع اول کے بعد پیدا ہوئے۔ اوائل جمادی الثانی میں آپکا عرس ہر سال ہوا کرتا ہے، درینجا سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ سید محفوظ الحق صاحب سے سال وفات، تاریخ وفات، تالیفات اور دیوریے کا وطن ہونا معلوم ہوا، اور وہ تذکرۂ شورش کا حوالہ دیتے ہیں (بحر العلوم کے شاگرد کا سال ولادت ۱۱۲۵ کے لگ بھگ خلاف قیاس ہے اس لیے کہ خود ان کی پیدائش ۱۱۴۳ھ یا اس کے بعد کی ہے۔ اگر شاعری کا شوق لکھنؤ میں ہوا تو یہ شباب کا زمانہ ہوگا اور لکھنؤ میں ۱۱۷۵ سے قبل شعر گوئی کا بالکل چرچا نہ تھا۔ شاد نے بھی جو کچھ لکھا ہے اس سے ۱۱۲۵ کے بہت بعد پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ تذکرۂ شورش کے حوالے سے کمال کا سال وفات ہرگز معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ۱۲۱۵ سے ۲۰ برس قبل شورش کا انتقال ہو چکا تھا۔ معیار) (۹) مثنوی فلسفہ آمیز تصوف میں ہے، مختلف سرخیاں مثل حمد و نعت وحدت الوجود، توکل، رضا، تسلیم، قضاء قدر وغیرہ قائم کر کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سلسلۂ کلام میں پنڈوے کا بھی ذکر آیا ہے، وہاں کے شاہ صفی اور ان کے ساتھ سعدی و مہدی کا نام بہت ادب سے لیا ہے۔ شعر اول ؎ الٰہی حمد تیری کب بیاں ہو اگر چہ موبہ موتن پر زباں ہو (خاتمہ جس شعر پر ہوتا ہے وہ صاحب مضمون نے درج نہیں کیا مثنوی خلاف قاعدہ ایک بحر میں نہیں، بلکہ دو بحروں میں ہے۔ صاحب مضمون کی نگاہ اس پر نہیں پڑی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں، یہ سرخی ہے تعریف بنگالہ میں کہ خوش شہید داں واقع ہے لازم طلب ہے اگر تجھ کو واں جلد جاد کرتے ہیں ہر دو میں اولیا۔ شاد مرحوم نے کمال کے حالات کچھ اس طرح سے لکھے ہیں کہ شبہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے کسی دوسرے کمال کا حال لکھا ہو، شاہ سلیم اللہ کا نام شاہ سلام اللہ لکھا ہے اور انھیں کمال کا جد نہیں بلکہ برادر جد بتایا ہے سال وفات بھی ۱۲۱۵ کے بجائے

ان کے مساب سے قرار پاتا ہے۔ مضمون نگار سے ہماری گزارش ہے کہ دیوان فارسی اور حیات فریاد کے مطالعے کے بعد کمال کے حالات پر لکھیں، اور ان کے اخلاف کا بھی ذکر کریں۔ معیار)

کنول (اکبرآباد) خاص نمبر جنوری ۱۹۳۶ء مرتبہ جناب منظر صدیقی، **سحر معنی** از جناب سیماب ص ۷۵ تا ۹۲۔ (۱) مولوی غلام امام ابن ولی اللہ ابن محمد علی نبیرۂ شیخ خیر الدین ابن خیر اللہ لعوی، گوپاموی، اسی خاندان سے ہیں جس کے رکن ارتضا علی خاں گوپاموی، اور مجتبیٰ علی خاں خوشدل تھے۔ مفتی انعام اللہ سے قرابت قریبہ تھی۔ آخر عمر میں شجاع الدولہ کے دربار میں منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وطن میں دفن ہوئے۔ (۲) انتظام اللہ صدیقی صاحب کی تصنیف سے ایک مثنوی سحر معنی ہے، جو آصف الدولہ کی بڑائی ہوئی کسی کو بھی گئے افتتاح پر لکھی گئی تھی، نسخہ مصنف کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے مصرع اول شعر آخر ؎ الٰہی پردہ صورت اٹھا دے + نہ کچھ قصہ ہے اس میں نہ کہانی۔ مگر یہ مثنوی ہے سحر معنی۔ (کاتب کا لکھا ہوا خاتمہ جو منقول ہے اس میں ان کی سکونت لبسوہ لکھی ہے۔ معیار)

یوپی میں اُردو (مسلسل) از انتظام اللہ صدیقی صاحب ص ۱۹ تا ۲۶۔ یہ کتاب، سالے میں کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ (۱) سعیدہ تخلص مفتی ابو سعید گوپاموی، بحوالہ تذکرۂ الانساب مصطفیٰ علی خاں و تاریخ خانہ ان مفتیان گوپاموی خطی بیاض، ہندی اور فارسی کے شاعر (۲) مولوی عبد الرب اکبرآبادی عہد محمد شاہ میں دہلی گئے، بین کی کتاب مساحت کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا، مہتمم صدر خانہ کی اعانت سے ترجمہ کیا۔ یہ نسخہ اب تک موجود ہے (نمونۂ عبارت بھی دیا ہے) اس سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب محمد علی شاہ کے وقت میں لکھی گئی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مصنف کو اتنا بھی علم نہیں کہ اس نام کا ایک بادشاہ اودھ میں گزرا ہے اور اس عہد میں علمی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوا تھا۔ کہاں بین اور کہاں عہد محمد شاہ!) (۳) مولوی غلام امام پیدائش ۱۱۰۵ کے لگ بھگ مفتی محمد ولی، شیخ غلام محمد وغیرہ سے علم حاصل کیا، شاعری میں فیض احمد سے مشورہ تھا سال وفات ۱۱۹۵ بحوالہ مواقیت الفواتح مرتبہ مجتبیٰ علی خاں خوشدل متوفی ۱۲۳۴ھ۔ سال وفات مصطفیٰ علی خاں ۱۱۹۸۔ (۴) حکیم محمد شریف خاں ابن حکیم محمد اکمل خاں۔ خانہ ائی حالات، ولادت ۱۱۲۷ کے قریب، خطاب اشرف الحکما، جاگیر ۲۵ ہزار از باد شاہ، ترجمہ مشکوٰۃ بزبان فارسی بنام کاشف المشکوٰۃ، ۱۱۹۳ء، حاشیہ نفیسی حاشیہ شرح اسباب، آثار نبوت، شرح حمد اللہ، ترجمہ فارسی قرآن مجید وغیرہ۔ اُردو میں بھی قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے جو مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا حکیم محمد احمد خاں صاحب دہلوی کے پاس موجود ہے۔ سال وفات ۱۲۲۲ء۔ نمونہ "جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے، لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا تمام عالموں کا" بخشنے والا وجود کا آخر تک یہ ترجمہ شاہ عبد القادر کے ترجمے سے تقریباً ۲۰ سال قبل کا ہے۔ (۴) ذخیرۂ دوراول کے عنوان سے ۱۱۰۰، اور ۱۲۰۰ھ

کی کتابوں کی فہرست دی ہے، لیکن اس فہرست میں اس سے بہت قبل کی کتابیں بھی موجود ہیں، اور بکثرت اغلاط ہیں آزاں جملہ، ناصر افضلی کا زمانہ ۱۰۵۰ نہیں، آبرو کا دیوان غدر سے قبل طبع نہیں ہوا، شاہ حکیم اللہ نہیں، نام شاہ کلیم اللہ ہے، عشرۂ کاملہ اردو میں نہیں، حسب ذیل کتابوں کے نام قابل ذکر ہیں) مراۃ المستہلین، ابن یمین محمدی خاں، روضہ کرم منشی عبدالغنی چراغ ابدی تفسیر شاہ عزیز اللہ، ہر سہ کتبخانہ آصفیہ۔ عین الحلاوت، سید محمد چشتی آزاد، ۱۱۵۴ کتبخانہ شعیب محمدیہ آگرہ، روضۃ الاطہار مصنفہ نوازش علی مشہدی" معرفت السلوک محمد ولی اللہ قادری" فقہ محفوظ خانی، قدر عالم بن بدر عالم ۱۱۹۹ ہر سہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، رسالہ تصوف نادر علی شاہ قادری ۱۱۹۰ کتبخانہ انجمن محمدیہ بمبئی ترجمہ منظوم، مثنوی مولانا روم از عبداللہ دہلوی، رسالہ نجیبی از محمد نجیب امیٹھوی (۵) تفسیر قرآن سوسومہ حقانی از سید شاہ حقانی نبیرہ شاہ برکت اللہ مارہروی، تحریر ۱۲۰۶ھ نمونہ" ہیچ میں نہ ڈالیگا اللہ، خدائے تعالےٰ کسی کو مگر موافق طاقت اُس کی کے اس کو بھی جو عمل کیا، اور اوپر اُس کے جو گناہ کیا" (۶) حکیم غلام امام اکبر آبادی، طبیب شاہی، ہے۔ اردو ترجمہ چہل حدیث ۱۲۰۶ھ منتخب النجوم علم ہیئت میں ۱۲۰۰ھ (۷) بلقیس فریہ آباد، نہیں بلکہ مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، کالیستہ نہ تھے، کھتری تھے، ان کے شاگرد کا نام امداد الدین تھا، ان کا سال وفات ۱۲۴۰ سے کئی سال قبل ہے، اور بھی اغلاط ہیں۔ معیار) (۸) انشا کے حالات میں یہ صحیح نہیں کہ ان کے اجداد سمرقندی تھے، سودا کے حالات میں بھی غلطیاں ہیں

ادبی دُنیا

لاہور، جنوری "غالب کا تصورِ حسن و عشق"، از صوفی تبسم صاحب ص ۳۰ تا ۳۷، غالب کی شاعری تصوف کی شاعری نہیں، اگرچہ ان کے نزدیک کائنات حُسن حقیقی کا مظہر ہے۔ حُسن روحانی شے ہے، ازلی اور ابدی، اس کی فطرت میں خود نمائی کا جذبہ ہے اور یہی کائنات کے عالم ظہور میں آنے کا باعث ہوا۔ انسان اس حسن کا بہترین مظہر ہے، اور حسن کی کشش سے متاثر ہونے کا نام عشق ہے یہ ایک جذبہ بے قرار، اضطراب پیہم ہے، مجازی جب جنسیت کی حدود میں مقید ہو اور حقیقی جب ایک ہستی دوسری میں کھو جانے کو ہمیشہ بیتاب ہو، غالب حقیقت کا مشاہدہ مادی عالم میں کرنا چاہتے ہیں، وہ اس پر تصرف حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنے ذاتی تشخص کو کھو دینا نہیں چاہتے۔ باوجود اس کے ان کا تصورِ حسن کبھی مادیت محض سے ملوث نہیں ہونے پاتا۔ ان کی مخاطبت در اصل روح حسن سے ہوتی ہے، اس لیے وہ معشوق کے مختلف اعضا کی تعریف نہیں کرتے، اور نہ حسن کے خارجی سامان آرایش ضروری سمجھتے ہیں، حُسن ابدی راحت" مقررہ خوبرو" علی، امانی، ابدی بنت فیض ازلی، امانی" کیٹس کی مشہور مقولہ" اے تخنگ اوہ ہوئی ازلے جوانے فوراور" کے مقابلے میں غالب نے حسن کی مسرت میں یاد و مست پیدا کر دی غالب کی روح حسن کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے لیکن نہیں کر سکتی، ایک شدید خواہش ایک تشنگی ہے جو نہیں بجھتی

شاہکار، لاہور فروری **تاریخ اردو زبان** ص ۶۰ تا ۶۴، از جناب ا۔ حق، (یہ غالباً ایک کتاب کا پہلا جزو ہے، ابھی تک بھی نہیں پہنچے۔ معیار)

محکمہ ۔ (۱) دیوان معروف از ق ۔ ع ۔ د ۔ (۲) نیم، بہار نمبر ۔ از مؔ ۔

دیوان معروف :۔ بیچ کی اشاعت میں ایسے اشعار نقل کیے گئے تھے یا ان کا حوالہ دیا گیا تھا جو مطبوعہ دیوان معروف میں موجود نہیں، لیکن دوسری جگہ ملتے ہیں۔ تذکرۂ قاسم ۔ ق، تذکرۂ گلستان بے خزاں ۔ گ کے مطالعے سے اور اشعار اس طرح کے ملے ہیں + ۔ سے مطلب یہ ہے کہ اس میں یہ غزل مطبوعہ دیوان میں ہے یا نہیں ہے ۔

ہے مثل اہل ماتم اپنا شعار رونا — دل کے بیان کرنے اور زار زار رونا — گ ۔
اک طرفہ بخشش اُس کی ہے معروف — میرے سارے گناہ ایک طرف — گ ۔
چشم تر سے گو کہ آ مژگاں پہ پانی پھر گیا — اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں پہ پانی پھر گیا — گ
کیا کریں گے جب سوا نیزے پہ ہوگا آفتاب — ہم تو اے معروف یاں جلتے ہیں گھر اور تو پ میں — گ +
جو بھیجتا مرے خط کا وہ دل فریب جواب — تو کاہے کو مجھے دیتا بھلا طبیب جواب — ق ۔
جو اُٹھائے قتل کو تھے عاشق بے دل کے ہات — رنگ ہے مجھ کو منا باندھے سو اس قاتل کے ہات (کذا) — ق ۔
جس کو نیکیہ ہے خدا کا اُن کو (کذا) کیا کیجے سے کام — سو رہے جب نیند آئی رکھ کے نیچے سر کے ہاتھ — گ +
مرے منھ سے جو اُس کا آ لگا منھ — تو ان نے پیٹ پیٹ اپنا لیا منھ — ق +
ساقیا دیکھے ہے کیا تار رگ ابر سیہ — ہر مژہ کرتی ہے یاں کار رگ ابر سیہ — ق ۔
دیکھ آئینہ مت دیدہ تر ہی تو ہے آخر — ڈر ہے نہ کرے کام نظر ہی تو ہے آخر — ق +
قد قیامت گات اچھی بات کیا اُس شوخ کی — خط دھواں چہرہ پری ابرو ستم تصویر زلف — گ ۔
جس کے مرقد پر کھڑی روتی ہے تو اب زار زار — صورتیں کیا کیا ملی ہیں دیکھو اس گل میں شمع — گ ۔
نالہ وہی ہے کہ ساتھ اس کے کلیجا پھٹ جائے — خو سی اک پڑ گئی ہے مرغ گرفتار کو تو — گ +
وہ تفتہ دل ہوں گرے اشک گرم گر سیدا — کباب بل کے ہوں دریا میں پھلیاں ساری — گ +
جان کر شیشہ دل پر دو پر، کھا تھا ہاتھ — یہ اثر دیکھو کہ دست شیشہ گر میں درد ہے — ق +
ہوگئی دن سے ہمیں اب، رات کا سونا حرام — جھوکے جھلکوں کے گوش بسم بر میں درد ہے — ق +
دور ہی سے دیکھ کر کہتا ہے بھائی اب تو جا — تو رُلائیگا مجھے آگے ہی سر میں درد ہے — ق +
جام بھر بھر کے جو ساقی تو پلاتا ہے مجھے — گردش چشم بتاں یاد دلاتا ہے مجھے — ق +
کیا ہوا چھوٹے قفس سے بھی اگر ہم ناتواں — رہ گئے بیٹھے کے بیٹھے یونہیں پر کھولے ہوئے — گ ۔
شکل آئینہ صفا اے دل اگر پیدا کرے — عکس رو ئے یار تیرے دل میں گھر پیدا کرے — گ ۔

ایک دن معروف برہم ہوگی یہ محفل تمام — حیف گل افسوس بلبل وائے قمری ہائے سرو
یوں ہے دل زلف میں زلف اس ستم ایجاد کے ہاتھ — صید جو رام میں ہو دام ہو صیاد کے ہاتھ

دیوان معروف میں ابھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں' ازاں جملہ: ۳ دی ہے تخت معرہ دے ہے تخت معرہ ۷ وش حال وہ کوئی چورہ ناکام رہ گیا = ہے جو ۱۰ تھوڑ چرخ ہیں ہو سرنج قرمیں خوزیہ اب کیونکر = نہ ۱۰ گل عارض کے تیری نازکی = کی تیسے تازگی ۳۰ ملے معروف نام اور یار ہر جائی کا بھرنے دے = پھرنے ۳۰ عشق کی راہیں نقش قدم و سوز خروش = شور و خروش ؟ ۴۰ قتل کر کے مجھ کو قاتل کیا ہوجہ بن گئے = بن گیا ۴۱ گونہ بھاڑ اور سے سکا کا معروف نے = در دسر ۴۴ گز برم و تقصیر و موجب سبب = (واو دونوں جگہ فاضل ہے؟) ۵۹ تیرے دیوانے کہ اس ہوش کا دیوانہ ہوں = کے ۶۳ جرم و تقصیر گر واسطہ پھر کیا باعث = واو فاضل ۷۲ ایک دم ہوتی ہیں پھر دل لگی بے ہودگر = ہے ۷۴ آخر اک روز تیرے گھر ہو ۷۰ ہر شہ پر شور ہے ۷۱ سگ در بان = سگ و در بان ۹۰ لیکن دل یہ تیرا = ترا ۱۰۱ حال میرا = مرا ۱۰۶ سیاہ صفت جو ہر اکسیر عنا ہوں = بنا ۱۰۵ خلد میں بھی وہ جنم = یہ ۱۱۱ پر گندہ دل جہاں کے ہوں نقش و نگیں سے میں = ہو کندہ ۱۱۱ جو کہ من = جوں ۱۱۲ پیچ تاب = پیچ و تاب ۱۱۴ شخص خوش الحان پر جادو = جوں ۱۱۴ بیان کو ... عمران پر جادو = گو ۱۱۵ نہ کیونکر ہوں میں ہر اک سے چھپا سنہ = کیونکہ ۱۱۵ روز ہیں نبد محس میں پری پیکر کے ہاتھ = ۱۱۶ آگ بھبکی ہو اگر ایک پل شب ہجراں میں کبھی = گر اک' ۱۲۰ سو زیدہ ہوں ازل ہوں ذہب ہے مجھے سیدا کی = شوریدہ' صدا ۱۲۰ کس کا وصف دہن کیا تھا تیج سخن میں خوشبو گلاب کی سی ہے = کہ تیج ۱۲۰ خیر و شر کو ہم اسی پہ دھر چلے = پر ۱۴۴ عاشق بیتاب = بیتاب ۱۴۹ روز مکلت یاد ہے = زور ۱۵۰ ہزار حسرت و صد حیف صد ہزار و دریغ = و صد ۱۵۰ ہنسا زیر لب اک بھر کے نہ سے دم سرد = نہ ۱۶۰ احیا کا گر یہ معجزہ آرائی ہے مسیح = آرائے ۱۶۲ دل میں باتیں ہوں بھری جیسے کے زیادہ از حد = کہ ۱۷۳ حق سے صحبت کا طلبگار رکھا میں = صحت ۲۲ رہے بے ثمر آہ جوں سرو معروف = جوں ۳۰ جو واں گیا سو مرا ہی ہو رو ہو گیا = تیرا؟

ندیم بہار نمبر: مولانا سید سلیمان ندوی نے دیباچہ کلام شاد میں لکھا ہے کہ شاد اے شاعر تھا اور شاد تخلص کرتا تھا۔ اس کے بیٹے کا تخلص زاہد تھا' اس کی سند مجموعہ نغز میں لاحظہ ہو۔ جد الحفیظ شمر۔

"جب تک یہ علم نہ ہو کہ سید صاحب نے کس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور نہ اپنی رائے بدلنے کی کوئی ضرورت سمجھتے ہیں مجموعہ نغز ہماری نظر سے گزرا ہے لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش' مستحسن' عبرتی نے کلیان سنگھ کا تخلص عرف عاشق لکھا ہے راجا کا ذکر نہیں کیا' اور ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ کلیان سنگھ کا راجا تخلص نہ تھا۔ اور قاسم نے غلطی سے ایسا لکھا ہے"۔ ؟

مراسلت

جناب مدیر معیار

تسلیم

میں آپ کے رسالے کے ذریعے محکمۂ تعلیم صوبہ بہار کی توجہ اسکولوں کی درسی کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اکثر درسی کتابیں غلط زبان اور غلط معلومات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں "رہنمائے اردو" حصہ اوّل مؤلفہ لطیف اللہ خستہ کے بعض اغلاط بتانا چاہتا ہوں، یہ کتاب اسکولوں کے درجہ ہشتم اور نہم کے لیے منظور شدہ ہے۔ اس کی بعض غلطیاں نہایت مضحکہ خیز ہیں:-

(۱) صفحہ ۵۳ "کولمبس دنیا کا زبردست تاریخ داں محقق و عالم فاضل گزرا ہے۔" (۲) صفحہ ۵۳ "ہومر دنیا کا زبردست تاریخ داں، محقق و عالم فاضل گزرا ہے۔" (۳) صفحہ ۵۴ "بن جانسن زبردست تاریخ داں اور صاحب علم تھا۔" مؤلف کی نادانی کا یہ حال ہے کہ تاریخ، شاعر اور تمثیل نگار سبھی کو زبردست تاریخ داں، عالم و فاضل اور صاحب علم سمجھتے ہیں!۔ ایک حدیث کی کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ کئی ہزار جلدوں میں ہے۔ "رہنمائے اردو" اس قسم کی فاحش غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ نکتہ یہ کہ کمیٹی کے اراکین اس کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کتاب اسکولوں کے نصاب میں کیوں داخل کی گئی؟۔

عبدالحفیظ شمر

عالم ادب

پیلیاس اور میلیساند:- میٹرلنک کے اس ڈرامے کا جناب تمنائی نے ترجمہ کیا ہے اور آمد و جمیلی نے مقدمہ لکھا ہے، جو ادب لطیف کے جدید سال نمبر میں چھپ چکا ہے۔ کتاب پنجاب بک ڈپو لاہور کی طرف سے زیر طبع ہے۔

مذہب اور باطنی تعلیم:- مرزا محمد سعید دہلوی سابق آئی ای ایس کی یہ تصنیف جس کے اکثر اجزا رسالہ شاہکار لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ کتابی شکل میں عنقریب آ جو صاحب کی طرف سے شائع ہوگی۔

کلیات سودا:- شیخ محمد جانباز صاحب ایم اے کلیات سودا کا ناقابل نسخہ جس ترقی اردو کی طرف سے اشاعت کے لیے مرتب کر رہے ہیں۔ انجمن نے ۱۹۳۰ء میں تلگی نسخے کلیات کے فراہم کر لیے ہیں اور سودا کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی حاصل کیا ہے۔

رام پور اور غالب:- مرزا غالب نے نوابان رام پور اور متوسلین ریاست کو جو خطوط لکھے تھے، وہ محفوظ ہیں اور ریاست کی جانب سے ان کا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے۔ امتیاز علی صاحب عرشی منتظم کتب خانۂ ریاست خطوط کے جمع و ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں۔

REGD. NO. P. 394. رجسٹرڈ نمبر پی ۳۹۴

انجمن ترقی اُردو شاخ پٹنہ کا ادبی رسالہ

معیار

قواعد

(۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں سہ دست صرف چھ پرچے نکالے گئے، یہ پرچے جنوری، مارچ، مے، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کریں گے۔ بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہوں گے۔ ۸۰ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، دسمبر میں شائع ہوا کریں گے۔ سال بھر میں معیار تصاویر و سرورق کے علاوہ کم از کم ۸۱۶ صفحات پیش کیا کرے گا۔

(۲) سالانہ قیمت بلیدانی پرچہ ۱۲ر۔ نمونے کا پرچہ ۱۳ر کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔ کچے پرچے محمولی کاغذ پر نوٹ بھیجنے کے لیے چھاپے گئے ہیں، قیمت فی پرچہ ۱۰ر۔ اگر دفتر سے منگانا ہو تو ۱۵ر کے ٹکٹ بھیجیے۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجنا چاہئیں۔

(۳) معیار خالص ادبی رسالہ ہے، جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے ہوں براہ کرم اپنے مخصوص عنوانات کو مدنظر رکھیں۔ یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق ردوبدل کر دیتا ہے، نہ شائع ہوں گے۔ ہر ترجمے کے ساتھ "مصنف" اور اصل افسانہ نگار یا مضمون کا نام ضرور درج ہونا چاہیے۔

(۴) جو اصحاب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں، مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرما دیں۔ (۵) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں، کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

جن حضرات کی خدمت میں معیار نمونۃً بھیجا گیا ہے وہ مطلع کریں کہ انہیں معیار کی سرپرستی منظور ہے یا نہیں۔

دیوان جوش دیوان جوش عنقریب انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک مبسوط مقدمہ بھی ہوگا۔ قیمت دو روپے کے قریب ہوگی، خریداری کی درخواست جلد بھیجیے۔

زر مجلہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ پریس مراد آباد۔ باگی پور سے چھپوا کر دفتر معیار مراد آباد، باگی پور سے شائع کیا۔

معیار

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

سالانہ چندہ ۱۲ر
مالک علیحدہ ۸ر
نمبر ۱ر

[جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر اور نومبر میں ۱۱۲ صفحات باقی مہینوں میں ۲۲۴ صفحات]

فی پرچہ
بھیجنے کا طریقہ

قواعد

(۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں دست صرف چھ پرچے نکلا کریں گے۔ یہ پرچے جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کرینگے۔ بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہونگے۔ ۲۲۴ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، اکتوبر اور دسمبر میں شائع ہوا کرینگے۔ سال بھر میں معیار تقاویر و سرورق کے علاوہ کم از کم ۱۶۸۰ صفحات پیش کیا کریگا۔ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوگا۔

(۲) سالانہ محصول علیحدہ فی پرچہ ۱۲ر۔ معیار کا ایک معمولی ایڈیشن بھی ہوتا ہے۔ جس کی قیمت فی پرچہ ۸ر ہے نمونے کا پرچہ ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔ یہ رسالہ سالانہ خریداروں کو نہیں دیا جاتا۔ جواب طلب مور کے لیے ٹکٹ بھیجنے چاہییں۔

(۳) معیار خالص ادبی رسالہ ہے جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے ہوں براہ کرم اس کے مخصوص عنوانات کو مدنظر رکھیں۔ یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق ردوبدل کر دیتا ہے، نہ شائع ہونگے، ہر ترجمے کے ساتھ مصنف اور اصل افسانہ، ناٹک، یا مضمون کا نام ضرور ہونا چاہیے۔

(۴) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں، مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرمائیں۔

(۵) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں، کو ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

(پٹنہ)
بانکی پور

مرتب:
قاضی عبدالودود
تصویر:- امیر مینائی اور اُن کے اعزہ

معاون:
آرزو جلیلی

جلد ۱ | مئی ۱۹۳۶ء | شمارہ ۳

شمار	مندرجات		صفحہ
۱	صہبر وفات	از قاضی عبدالودود	۱۳۸
۲	تعارف (۱)	از ق ع و	۱۳۹
۳	(۲)	از جناب اعجاز حسن صاحب خانقاہی	۱۴۰
۴	غالب	غیر مطبوعہ اشعار	۱۴۳
۵	آثار ادبیہ بشتوی تنبیہ عید	از میر حسن	۱۴۴
۶	نظم - شلوکی برکھا	از پریم پجاری	۱۴۶
۷	اقتباسات من رائگاں	از موباسان (مترجمہ آرزو جلیلی)	۱۴۸
۸	دہات کی جھونپڑی	از چیخوف (مترجمہ جناب عبدالغفار قریشی صاحب)	۱۶۸
۹	تمثیل - بدگمانی	از مولیر (مترجمہ آرزو جلیلی)	۱۷۰
۱۰	مقالات - میر تقی میر	از ق ع و	۱۷۹
۱۱	سال وفات حاتم	از ق ع و	۱۸۰
۱۲	صوبۂ بہار - عظیم آباد	از آقا بیہانی	۱۸۳
۱۳	ایک ایرانی متجدد	(مترجمہ جناب یوسف الدین صاحب بی اے)	
۱۴	عالم ادب	ادارہ	۱۹۶
۱۵	ادراق پارینہ - دیوان ہمایوں	از ق ع و	۱۹۴
۱۶	تعارف - مصنفہ نسخہ حمیدیہ	از ق ع و	۱۹۵

شمار	مندرجات		صفحہ
۱۶	حیدرآباد کی مخطوطات عربی کا کیٹلاگ	از جناب میر عبدالدین صاحب	۲۰۲
۱۷	استفسارات	از ق ع و	۲۰۶
۱۸	محکمہ دیوان مسعود و دیوان جوشش وغیرہ	از ق ع و	۲۰۸
۱۹	محض مصحفی وغیرہ	از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی	۲۱۲
۲۰	گومتی	از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی	۲۱۲
۲۱	معیار کی زبان	از جناب مجاز فیضی	۲۱۳
۲۲	اقتباس	از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی	۲۱۳
۲۳	مراسلت - بہار ٹیا	از خود از حیات و تصانیف	۲۱۴
۲۴	سابقہ پرشد کی حقیقت	از مصنفہ ڈاکٹر وحید مرزا	
۲۵	۱۹۳۶ء کے ادبی تعین	از جناب عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو	۲۱۷
۲۶	مطبوعات جدیدہ -		
۲۷	خطبات رتاسی	از ق ع و	۲۲۳
	سالنامہ سہیل	از ؟	
	کلیم عجم	از ؟	

محمد علیم الدین پرنٹر و پبلشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر معیار واقع انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ سے شائع کیا

معروضات

(از ق ع د)

عبدالحق صاحب اور دوسرے حیران ہیں کہ ہم ہندوستان کا خواب دیکھتے ہیں، لاکھ چاہیں کہ زبان کے مسئلے کو سیاسیات سے دور رکھیں لیکن یہ مسئلہ اب سیاست کا تخم بہشت ہو کر رہیگا، اردو ہندوں مسلمانوں کے ہزار سال میل جول کی یادگار ہے، لیکن ایک جماعت تنگ نظری سے اسے مسلمانوں کے گذشتہ سیاسی اقتدار کی نشانی سمجھ کر اسکے مٹانے پر تلی ہوئی ہے، یہ ہندوستان کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس جماعت نے گاندھی جی کی سرپرستی حاصل کرلی ہے، گاندھی جی کی شرکت نے اس جماعت کے حوصلے بڑھادیے ہیں اور یہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اردو دشمنی پر جٹ کر کرنے والی ہے، انگ پور میں گاندھی جی کا یہ بیان کہ "ملک کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے (وہی ہندی جس کا فرنچ ہنس کے صفحات پر نظر آتا ہے) اور مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے جو قرآن کے حروف لکھی جاتی ہے یہ زبان مسلمان بادشاہوں کی بنائی اور پھیلائی ہوئی ہے اور اس کا رکھنا اور پھیلانا خاص مسلمانوں کا کام ہے"۔ اردو کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ گاندھی جی کے بیان سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ اگر ہندوستان پر ان کا یا ان کے ہم خیال لوگوں کا قبضہ ہوا تو اردو کیا حشر ہوگا۔ گاندھی جی کے رائج میں اردو بولنے والوں کے لیے مزید سہولتوں کا حاصل ہونا درکنار، اس کی دوسری حیثیت بھی باقی نہ رہیگی، جو آج ہے، ہندی کو ملک کی زبان قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو دفتروں اور عدالتوں سے خارج کی جائیگی اور ہندی کے ذریعۂ تعلیم ہونے کے بعد ان لوگوں کو بھی جن کی مادری زبان اردو ہے مجبوراً ہندی سیکھنی پڑیگی، اردو بولنے والوں کو اپنے خاص مدرسے قائم کرنے ہونگے اگر بشرطیکہ حکومت ایسے مدارس کو فرقہ وارانہ مدارس قرار نہ دے جن کا اجرا غالباً ممنوع ہوگا، حامیان اردو میں سے بعض کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی سے اس مسئلے کے متعلق مزید گفت وشنید کی جائے، ہم اسے لاحاصل سمجھتے ہیں، تاریخ اور لسانیات کی مدد سے اردو کی ابتدا اور اس کی ترویج کے متعلق آپ گاندھی جی کے نظریے کو باطل ٹھہرا سکتے ہیں آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ گاندھی جی کا یہ جدید اعلان انڈین نیشنل کانگریس کی منظور کردہ قراردادوں کے مطابق نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ خود گاندھی جی کی سابق تحریروں ان کے موجودہ رویے کے خلاف پیش کرسکتے ہیں، لیکن کیا آپ ایسے شخص کو قائل کرسکتے ہیں جو عالم بالا سے براہ راست تعلقات رکھتا ہے اور جس کا ہر قول وفعل دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے؟ ہمیں یقین کامل ہے کہ گاندھی جی اپنے موجودہ طرز عمل اور پرانی روش میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتے، جنگ عظیم میں انگریزوں کے لیے رنگروٹ بھرتی کرانے کے بعد بھی اگر وہ اپنے کو عدم تشدد کا حامی تصور کرتے رہے، تو ہندوستانی اور ہندی۔ ہندوستانی کو ایک سمجھنا ان کے لیے کونسی بڑی بات ہے۔

حامیان اردو کو اس موقع پر کیا کرنا چاہیے، اس سے ہم آیندہ بحث کریں گے۔

تعارف

(۱) از قاضی عبد الودود، (۲) از جناب اعجاز حسن خاں صاحب۔

(۱)

از قاضی عبد الودود

میرزا غالب کے اشعار تذکرۂ اعظم الدولہ سرور سے ماخوذ ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ ہندوستان میں بھی ہے لیکن جو نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے وہ دفتر ہمدرد لائبریری میں ہے۔ اس تذکرے میں میرزا کے ۱۱ اشعار بھی ہیں لیکن ہم نے وہی نقل کیے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ مثنوی میر حسن کا ایک مصرع غلط ہو جانے خیال کی قیاسی تصحیح حاشیہ مثنوی میں درج ہے لیکن وہ بھی اس سے مختلف ہے۔ اگر کسی صاحب نے یہ مثنوی کہیں اور دیکھی ہو تو اس مصرعے کی طرف توجہ فرمائیں۔

حسن، اگاں لابوتے ان یوتیل کا ترجمہ ہے، باقی چھوپنڑی کا انگریزی نام لے کنڑی گوچ ہے۔ یہ گانی لاڑ الوزی کا ترجمہ ہے ایک جگہ مترجم کو سہل میں ترمیم کرنی پڑی ہے جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔

آقا احمد بن محمد علی بن محمد باقر الاصفہانی المشہور بہ بہبہانی کا مولد و منشا ایران تھا۔ وہ تیرہویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہندوستان آئے۔ ان کے سفرنامے کا نام مراۃ الاحوال جہاں نما ہے۔ اسکے تین قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں، دو پٹنے میں اور ایک کلکتے میں آقا بہبہانی تین بار عظیم آباد آئے۔ اس شہر کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ معیار میں بہ اقساط شائع ہوگا۔

معین الدین درد الٰہی صاحب کے مضمون میں بہت سے اشعار غلط معلوم ہوتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اصل نسخوں میں یہ اشعار اسی طرح درج ہیں۔ امیر خسرو کی ہندی شاعری ڈاکٹر وحید مرزا کی انگریزی کتاب لائف اینڈ ورکس اوف امیر خسرو کے ایک باب کا خلاصہ ہے ہم ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے زبان کے لحاظ سے معیار کو جانچا، اور اسکے اغلاط سے ہمیں واقف کیا۔ ان کے مفصل خط کا ایک حصہ اس بار شائع ہو رہا ہے، باقی آیندہ شائع ہوگا۔ صاحب موصوف کے اکثر اعتراضات صحیح ہیں، لیکن بعض غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ہم آیندہ مہینے اس خط کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر کرینگے۔

سالنامۂ سہیل کا حسن ترتیب ۱۹۱۰ء اس کی تصاویر اسے دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں، معیار کا تبصرہ ان خصوصیات کو اچھی طرح نمایاں نہ کر سکا۔ ہمیں اس فروگزاشت کا افسوس ہے۔

تصحیح

اپریل۔ صفحہ ۱۱۴ سطر ۱ مطالعہ، مطالعے، ص ۱۱۵ از میان منت زباں برخواست، از میاں منت زباں برخاست ص ۱۱۵ چھپ تختی، چھپ تختی ص ۱۱۷ طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو کم کریں، طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو ہم کریں۔ مارچ ص ۲۹ ٹھنڈھی ٹھنڈی ص ۱۰۵ صیابت، اصابت۔

(۲)

از جناب اعجاز حسین خاں صاحب

مفتی منشی امیر احمد امیر مینائی (۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ تا ۱۹ جمادی الاخرہ ۱۳۱۸ھ) کے محاسن و اوصاف اپنی شہرت کے باعث کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ عنفوان شباب ہی کے زمانے سے آپ کو اساتذۂ عصر قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ میرزا غالب مرحوم اپنے عزیز شاگرد منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو (جو رسالہ معیار الشعرا شائع کرتے تھے) ایک خط میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب دو دن رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اُس کے لکھنے سے اُن کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا ..... اس کو اپنے معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک دو روز قبل یا چہار روز قبل ان کے پاس بھیج دو اور سرنامے پر یہ لکھو کہ در رام پور بردوات حضور رسیدہ بہ خدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد۔ اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔ مرسلہ یکشنبہ ۱۲ رجون ۱۸۵۸ء۔" (اردوئے معلی مطبوعہ دہلی ص ۱۳۱)۔

جس وقت میرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہے امیر مینائی کی عمر کل بتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ غدر سے پیشتر لکھنؤ میں شاہ اودھ کے دربار میں مصاحبت کا انتصاص حاصل تھا۔ بادشاہی مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔

مولوی عبد الواحد سیماب مرحوم نے فارسی کی درسی کتابیں مفتی طالب حسن مرحوم (امیر مینائی کے برادر بزرگ) سے پڑھیں اور شاعری میں صبا کے شاگرد تھے۔ وہ مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں بادشاہ نے ان کو گلے سے لگا لیا اور چند بار ایسا ہوا کہ شال جو شانے اور ڈھے ہوئے تھے اُس کا ایک سرا منشی صاحب کے شانے پر رکھ دیا۔ یہ نوازش خوشنودی خاص کے اظہار کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ جب اودھ کی سلطنت کو زوال یا غدر کے زمانے میں آپ کا گھر تک لُٹ گیا یہ ہائی فرمائی ؎

گھر لُٹنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے — روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر — یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

گھر کے ساتھ گھر کا سامان اور پرایا دیوان بھی ضائع ہو گیا۔

غدر کے بعد آپ کو فردوس مکان نواب یوسف علی خاں ناظم تخلص فرمانروائے رامپور نے رامپور بلا لیا اور حاکم اللہ بنایا۔ کبھی کبھی مشورۂ سخن بھی آپ سے فرماتے تھے۔

فن سخن میں ان کی اُستادی اور قادر الکلامی مسلم الثبوت ہے۔ وہ آخری دور میں غزل گوئی کے سوا اگر اس صنف خاص میں میرزا داغ کو فضیلت تھی، جملہ اصناف سخن میں اپنے کل معاصرین سے افضل تھے۔

قطع نظر شاعری کے اخلاق حسنہ، صفات برگزیدہ، علم و عمل، زہد و ورع اور عبادت میں زبان اردو کا کوئی شاعر بہ استثنائے حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ آپ کے ایسا نہیں ہوا۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں حضرت سید محمد امیر شاہ سے بیعت تھی، پیر و مرشد سے خلافت بھی ملی تھی۔ شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ "شاعری کے سوا بھی ان میں ایسے اوصاف تھے کہ صرف اُن اوصاف کے لحاظ سے اُن کے سوانح لکھے جائیں"۔ افسوس ہے کہ منشی صاحب کے حالات میں اب تک کوئی مفصل کتاب شائع ہوئی۔ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے آپ کے مکتوبات چھاپے ہیں اُس کے ساتھ کچھ حال بھی لکھا ہے اور نواب فصاحت یار جنگ جلیل مانکپوری نے بھی ایک کتاب آپ کے متعلق تصنیف فرمائی ہے مگر اُس میں بھی حالات کا حصہ بہت کم ہے۔

منشی صاحب کے تصنیفات نظم کے علاوہ نثر میں بھی متعدد ہیں۔ اردو کے سوا فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے، عربی اشعار بھی کبھی کبھی فرماتے تھے۔ مگر بہ استثنائے معدودے چند آپ کے اور تصانیف ابتک چھپ کر شائع نہیں ہوئے۔

راقم الحروف کے خاندان سے تعلقات کا آغاز میرے والد ماجد حکیم محمد ہادی حسن خاں نایاب مرحوم و مغفور کے زمانے سے ہوا۔ والد مرحوم شعر و سخن میں حضرت اسیر (جو جناب امیر مینائی کے اُستاد تھے) اصلاح لیتے تھے۔ ۱۲۹۹ھ میں جب حضرت اسیر کا انتقال ہو گیا تو والد مرحوم نے حضرت امیر مینائی کی طرف رجوع کیا مگر اس کے بعد بہت تھوڑے دنوں زندہ رہ کر ۳ رجب کو ۱۳۰۰ھ میں انتقال کیا اس وجہ سے غالباً زندگی میں اصلاح سخن کی نوبت نہیں آئی۔ اگر آئی ہو تو دو ایک غزل کے سوا نہیں آئی ہوگی۔ جب میرے والد مرحوم کا انتقال ہو گیا، میرے چچا، محمد حسن خاں شاداب مرحوم (جو اپنے بڑے بھائی حضرت نایاب سے برابر اصلاح لیتے تھے) حضرت امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے اور میرے والد مرحوم کے دیوان کو بھی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا۔ عم مرحوم سے تعلقات بہت زیادہ ہو گئے تھے، منشی صاحب کے سیکڑوں خطوط اُن کے نام آئے جن میں بعض بعض چار چار چھ چھ صفحوں کے تھے۔ خطوط میں شاعری کے متعلق بیکراں باتیں ایسی تھیں جو عام کتابوں میں نہیں مل سکتیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ سب خطوط عم مرحوم کی وفات (یکم رمضان ۱۳۰۸ھ) کے بعد ضائع ہو گئے۔ صرف دو چار خط میرے ہاتھ آئے جن کو میں نے "خطوط منشی امیر احمد" میں طبع کرا دیا ہے

جناب امیر مینائی عظیم آباد صرف ایک بار، وہ بھی میرے عم بزرگوار کی خواہش پر تشریف لائے تھے تشریف آوری ۱۳۰۲ھ میں ہوئی تھی۔ عم مرحوم کے مکان لال کوٹھی میں (جہاں اب انجینئرنگ کالج ہے) ہفتے دو ہفتے قیام فرمایا تھا۔ اسی زمانۂ قیام میں امیر اللغات کے متعلق بھی لوگوں کو متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ اور کبھی تشریف آوری کا اتفاق نہیں ہوا

جناب امیر مینائی مرحوم بطور یادگار ایک مرقع جس میں ان کی اور ان کے اعزہ کی تصویریں گروپ کی شکل میں ہیں، میرے عم بزرگوار کو بھیجا تھا وہ حسن اتفاق سے میرے پاس تھا۔

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لاء نے جو ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں اور برخلاف دوسرے تعلیم یافتوں کے ان کو اردو زبان کی طرف توجہ اور اس سے شغف ہے اس کا شائع کرنا پسند کیا اس لیے وہ مرقع میں نے اُن کے حوالے کیا۔ گروپ میں مندرجۂ ذیل حضرات کی تصویریں ہیں۔

۱ منشی لطیف احمد (امیر مینائی کے منجھلے صاحبزادے) آپ کا تخلص اختر ہے۔ ریاست حیدرآباد دکن سے خطاب پاتے ہیں۔ سابق میں وہاں کسی معزز عہدے پر ممتاز تھے۔

۲ منشی مسعود احمد (امیر مینائی کے چھوٹے بیٹے) "ضمیر" تخلص۔ علیگڈھ کالج میں بھی تعلیم پائی ہے۔

۳ منشی لیاقت حسین (امیر مینائی کے بھتیجے)

۴ منشی ابرار احمد مینائی (خود)

۵ منشی محمد احمد (امیر مینائی کے خلف اکبر) پہلے "قمر" تخلص کرتے تھے پھر "محو"۔ اب "صریر" تخلص اختیار کیا ہے۔

۶ منشی عبدالرحمن (امیر مینائی کے نواسے)

۷ مفتی طالب حسن مرحوم (امیر مینائی کے برادر بزرگ)

۸ منشی خورشید احمد (امیر مینائی کے منجھلے صاحبزادے)

گروپ میں بھی اسی ترکیب کے ساتھ بند ہے ہیں۔ فقط

(یہ فقط خود اس گروپ کی پشت پر لکھا ہوا ہے، اس لیے استعمال کیا گیا)

[جلوۂ خضر جلد دوم (ص ۲۰۹ تا ۲۹۴) میں صفیر بلگرامی مرحوم نے امیر مینائی کے فیلم آباد آنے اور ان سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے: "رمضان ۱۳۴۵ھ میں امیر مینائی کچھ اپنے شاگرد جناب شاداب کی فرمائش اور کچھ سرانجام ملت کی نظر سے پٹنے آئے ان کے ساتھ ریاض گوشر بھی تھے۔ صفیر بلگرامی آنے سے بھولے گئے، انھیں دو ملاقاتیں ہوئیں۔ امیر کا ارادہ زیادہ قیام کا تھا لیکن ایک ہفتے سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ گھر سے لوگوں کی علالت کی خبر آگئی اور انھیں لپس جانا پڑا۔ شعرا امیر کی ملاقات کے لیے آتے رہے اور شعر و سخن کی انجمنیں ہوتی رہیں لیکن کوئی باضابطہ مشاعرہ منعقد نہ ہو سکا۔ ترک خیال میں جو سالہ جاودڈھاکہ میں کچھ دنوں باقساط شائع ہوتی رہی تھی مرحوم نصیر حسین خاں خیال نے لکھ دیا تھا کہ "امیر مینائی سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے، مشاعرہ ہوتا اور میرے گھر بھی وہ مرحوم برابر آیا کرتے (جاودجنوری فروری ۱۹۲۶ء ص ۱۵) یہاں تک برسال فیلم آباد آنے اور مشاعرہ کے انعقاد کا تعلق ہے، یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ امیر کے شاگردوں کی تعداد معمور بہار میں کچھ زیادہ تھی۔ اس صوبے کو انگریزی تعلیم سے زیادہ فیض پہنچا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے جناب شاداؔ کے علاوہ صرف دو شخص اور شاگرد ہوئے ہیں (یہ رسالہ ضیائے فیلم آباد کے بانی تھے) اور جناب شفق عظیم پوری] اضافہ از جانب ادارۂ معیار۔

غالب

اشعار غیر مطبوعہ

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بر رخسار سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمنی زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

محفل شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں

ہوئے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبکدوش کے رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جائے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

آثار ادبیہ

مثنوی میر حسن در تہنیت عید

فلک کی یہ تھا کج روی سے بعید
کہ دو سال ہو بھوکا بنگلے میں عید
کروں اس جگہ حمد پروردگار
کہ ٹھہرے مجھ کو لیل و نہار
یہ ہیں عید میں یاں میں آیا کروں
تمہ اپنے روزوں کا پایا کروں
سبب کے ٹھہرے جس کے یہ سات دن
رہا فکر دنیا سے میں مطمئن
سلامت رکھے اس کو پروردگار
کہ بنگلے میں ہے اس کے دم سے بہار
اسی سے یہ سرسبز ہے سارا زمیں
کہ ہیں ساتھ اس کے بہت مہ جبیں
جواہر علی خاں ہو اور یہ دیار
کہ بنگلے کو اس نے کیا سبزہ زار
سخاوت میں ہمت میں یکتا ہو وہ
عدالت میں، علی سے اعلیٰ ہے وہ
شجاعت تو ہمت سے وابستہ ہو
غرض خوبیوں کا وہ گلدستہ ہو
ہے وہ رہبر و راہ شرع شریف
قوی اس سے ہیں مومنان ضعیف
وہ جو شخص دنیا میں ہے متقی
اسے اتقیٰ سے اللہ ہے دوستی
غریبوں کی خاطر نجیبوں کی چاہ
ہر اک کے موافق کرم کی نگاہ
صلاحیت و اتقا بر ملا
نبی و علی پر وہ دل سے فدا
کہ صرف ہے تو اے ساقی لالہ فام
مے تہنیت سے پلا مجھ کو جام
کہ ہے آج دن عید کا میری جاں
خوشی ہر طرف ہے ترقی میں یاں
زمیں اب کے ساون میں آئی ہے عید
سو ہو یہ گہربار سال سعید
ہر رنگ گیاہ و مثال نہال
اگے ہے خوشی ہر جگہ اب کے سال
ہوئی ہے خوشی اپنے موسم میں یہ
کہ جوں دانہ کھلتی ہے اگ کر گرہ
برستی ہے اس طرح عیش و خوشی
کہ ہنسے ہے ہنسی کل ملک بے کلی
خوشی عید کی بس کہ پاتا ہے رعد
دمامے خوشی کے بجاتا ہے رعد
شفق سرخی پان پر ہے گواہ
مے ہے مسی منہ میں ابر سیاہ
زمیں شادیانے کی بجاتی ہے، واج
ہر اک عیدی اپنے سے مانگے ہے آج
پپیہا جو پی پی کرے ہے صدا
سو مانگے ہے عیدی یہ شہنا بجا
غرض ہر دوش ہو گلستاں میں سور
نفیری بجانے کو آتے ہیں مور
گل و غنچہ نے مشت میں زر لیا
ہوا نے بھی جگنو سے زر لیا
کچھ بلبلیں ہیں غزل خواں یہاں
پڑھے ہیں مری مثنوی طوطیاں
کہ جس کے معانی سے یہ ہے مراد
کہ بندہ کرے اپنے خالق کو یاد
رہے یاد حق میں جو ثابت قدم
انھیں عید کیوں کر نہ ہو دم بہ دم
بھلا کیونکر ہوئیں نہ خوش وزہ دار
جنھیں ابر رحمت کرے بار بار
یہ برسات میں عید کا جو ہلال
پڑا ہے نظر سو یہ ہے اس پہ دال
کرم پر ہے اس کے تقاطر گواہ
کہ دھوئے گئے مومنوں کے گناہ
پڑا مہر سے سایۂ بو تراب
کہ برج اسد میں گیا آفتاب
یہ سبزہ یہ موسم یہ آب و ہوا
یہ پاکیزہ دھویا مکاں جا بجا

تر و تازہ گل اور چمن آبدار
سحاب سیہ مایۂ خوش گوار
مکانوں کا ہونا یہ آراستہ
صفا اور نفاست میں پیراستہ
شفق کا یہ خیمہ یہ سبزے کا فرش
پئے عید گویا ہوا تا یہ عرش
نماز جماعت کی ہونا قطار
گلستان دین نبیؐ کی بہار
گھٹاؤں کا ہونا ادھر سے طلوع
مبارک سلامت کی یہ ہر شروع
پئے تہنیت موسموں کا ہجوم
ہر اک دم میں اٹھنا اٹھ کے ملنے کی دھوم
یہ نذروں کا لینا قرینے کے ساتھ
یہ قلقوں پہ کرنا نظر کے ساتھ

تجمل پنجیبوں کا کرنا نظر
نظر سب کی نذروں پہ کر سر بسر
نثار عطر ہر ایک کو بخشنا
اس انداز سے واں کہ صل علیٰ
غرض منصفی سے جو کیجے نظر
تو عالم ہے یاں عید کا خوب تر
یہ تیاری عید و ہنگام عید
یہ جاہ و یہ حشمت یہ اکرام عید
مبارک ہو نواب ناظر کے تئیں
کہ جو تم نہیں اس میں حاضر کے تئیں
موافق رہیں سب ملے یک دگر
سویوں میں جس طرح شیر و شکر
جو حق نمک اس کا بھولے رہیں
وہ سوجے رہیں اور پھولے رہیں

چھوارا ہو بھیگا ہوا جس طرح
ورم ان کے منہ پر رہے اس طرح
رہے جب تلک جگ میں ماہ صیام
رہے سبز نواب ناظر کا نام
دعا ہے حسن کی نہیں کچھ بعید
کہ خاطر ہے یاں شب و روز عید
محب و موالی سلامت رہیں
سلامت رہیں بے ملامت رہیں
مخالف جو ہوں اُن پہ ماتم ہے
سدا عید ان کو محرم رہے
رہے جگ میں جوں گندم ان کا بھگر
وہ فطرہ پھریں مانگتے در بدر
دعا پر یہ کی مثنوی میں تمام
کہے عید کی تہنیت اس کا نام

۱؎ بنگلہ فیض آباد کا دوسرا نام ہے۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ چلے جانے کے بعد فیض آباد کی رونق بہو بیگم، مادر آصف الدولہ کے دم سے تھی۔ ان کے بھائی سالار جنگ اور دوسرے اعزہ لکھنؤ اور فیض آباد دونوں سے تعلق رکھنے پر مجبور تھے؛ جواہر علی خاں، خواجہ سرا، بہو بیگم کا ناظر تھا، اور اس حیثیت سے فیض آباد میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ جس نے اس کی مدح میں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس کا سال وفات غالباً ۱۲۱۵ھ ہے۔

۲؎ ان کی جگہ۔ اس بہتر ہوگا۔ ۳؎ جناب خیال کے مجوزہ الفاظ یہ ہیں "گرہ بے گی ہنسی گل سے لے تا کلی"، ۴؎ شور بھی ہو سکتا ہے۔ ۵؎ کچھ بلبلیں ہی غزخواں ہیں یاں، بہتر ہے۔ ۶؎ رواج آج کل مذکر ہے۔ اصل نسخے میں 'کی' ہی ہے۔ ۷؎ اصل نسخے میں یہ کا لفظ نہیں، اور کرنا کی جگہ گرنا ہے۔ ۸؎ اصل نسخے میں یہ 'جاہ' کی جگہ یہ 'جاؤ' ہے۔

یہ مثنوی کلیات کے اسی نسخے سے ماخوذ ہے جس کا کسی دوسری اشاعت میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۹۲ھ کے بعد ہے۔ ✦ ✦ ✦

نظم
شعلہ کی برکھا

(از پریم پجاری)

ہاں وہ اُمنڈی کالی گھٹا سرشار، متوالی گھٹا
سرمایۂ دریا لیے
دریائے گوہر زا لیے
بس گوہر یکتا لیے
مستوں کی صورت جھومتا چھاتا، اُمنڈتا، گھومتا
ہاں وہ اُمنڈی کالی گھٹا
سرشار، متوالی گھٹا
گرنے لگیں لو بوندیاں گوہر نشاں، انجم فشاں
جانِ مجسم ہے پھوار
جوشِ نمو کی ذمہ دار
رُوحِ چمن، رُوحِ بہار
جس سے ہوا غمناک ہے رُوئے زمیں گلپوش ہے
گرنے لگیں لو بوندیاں
گوہر نشاں، انجم فشاں
بجنے لگے بارش کے تار فطرت نے چھیڑا ساز سنگھار
چھم چھم چھما چھم کی صدا
اِک نغمہ ہے فردوس کا
وجد آفرین و کیف زا
لیکن دلِ ہجراں زدہ ہے آج بھی ماتم کدہ
بجنے لگے بارش کے تار
فطرت نے چھیڑا ساز سنگھار
پڑنے لگا مینھ زور سے کہسار گونجے شور سے
اُلفت ری بھادوں کی بھرن
نالے بنے گنگ و جمن
سیلاب ہر سو موجِ زن
لیکن ابھی تھم جائے گا رنگ اور ہی جم جائے گا
پڑنے لگا مینھ زور سے
کہسار گونجے شور سے
ہر ایک شکل برشکال رکھتی ہے ندرت میں کمال
نیچے بخارات سحاب
اور حصل ہی آفتاب
تشبیہ شاعر لاجواب
یعنی ترا آتش دھواں حیرت کنندۂ مرد ماں
ہر ایک شکل برشکال
رکھتی ہے ندرت میں کمال
نیلا ابھی تھا آسماں کس طرح بدلا یہ سماں
اِک پل میں دھانی ہو گیا
پھر زعفرانی ہو گیا
اب ارغوانی ہو گیا
پھر لاجوردی رنگ ہے بینندہ و چنگ ہے
نیلا ابھی تھا آسماں
کس طرح بدلا یہ سماں
لو پھر برس کر کھل گیا فطرت کا چہرہ دھل گیا
عشوؤں سے بھر کر جھولیاں
زہرہ وشوں کی ٹولیاں
ہر عمر کی، ہر جھولیاں

محوِ حشرا ہم نازیں ورَ ہائے فتنہ بازیں
لو پھر برس کر کھل گیا
فطرت کا چہرہ دھل گیا
کچھ طور والی بجلیاں کچھ مستیاں کچھ شوخیاں
رنگِ شفق، نورِ سحر
شادابیِ گلہائے تر
دوشیزۂ فطرت کا اثر
سب مل ملا کر بن گئیں یہ بستانِ دل نشیں
کچھ طور والی بجلیاں
کچھ مستیاں، کچھ شوخیاں
چھپتے ہوئے خورشید کی اللہ ری جادوگری
پرتو سے جس کے ہشیار
بادل کے ٹکڑے شعلہ کار
جو سما میں بے قرار
آتش کی گویا کشتیاں ہیں بحرِ خضرا میں رواں
چھپتے ہوئے خورشید کی
اللہ ری جادوگری
یہ سحر یا اعجاز ہے یا اور کوئی راز ہے
سمتِ افق میں ابتدا
رنگِ شفق سے شعلہ زار
آتش نشاں یا کوہسار
اور پھر معلق در ہوا نیرنگِ فطرت مرحبا
یہ سحر یا اعجاز ہے یا اور کوئی راز ہے

فطرت کی نادر کاریاں کیا کیا کرے کوئی بیاں
ہر چند بادل پردہ دار
خورشید کی ضو آشکار
اک روشنی کا آبشار
جو سما میں جلوہ ریز ساکن فضا میں حشر خیز
فطرت کی نادر کاریاں
کیا کیا کرے کوئی بیاں
چشمِ تماشا کے لیے دستِ تمنا کے لیے
خاموشیٔ ہر جلوہ پاش
گویا صدائے دور باش
لیکن نظر گرمِ تلاش
دل دادگانِ حُسن کی وا ماندگانِ حُسن کی
چشمِ تماشا کے لیے
دستِ تمنا کے لیے
ایک ایک گوشہ ہال کا پھر انجمستاں بن گیا
یہ فتنہ کاروں کا ہجوم
یہ ماہ پاروں کا ہجوم
اتنے ستاروں کا ہجوم
اس راہ سے شرمائیگی اب کہکشاں چھپ جائیگی
ایک ایک گوشہ ہال کا
پھر انجمستاں بن گیا

ہال روڈ شملہ۔

افسانے :-

حسن رائگاں :-

(۱) حسن رائگاں - مصنفہ موپاساں - مترجمہ آرزو جلیلی

(۲) دہات کی جھونپڑی - مصنفہ چیخوف - مترجمہ عبدالحفیظ ناظر

حسن رائگاں

مصنفہ :- گی دُ موپاساں مترجمہ :- آرزو جلیلی

ایک عالی شان عمارت کی سیڑھیوں کے سامنے ایک نہایت نفیس کوپ گاڑی کھڑی تھی جس میں دو اعلیٰ نسل کے شکاری گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ماہ جون کا آخری دن اور ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ ان مکانوں کی چھتوں کے درمیان سے موسم کو گھیرے ہوئے تھے، آسمان تیز روشنی، حرارت اور شادابی سے معمور نظر آرہا تھا۔

کوچس دی سکارے سیڑھیوں پر تھیں اس وقت مچی جب اس کا شوہر بینک کے اندر داخل ہوا۔ اپنی بی بی کو بغور دیکھنے کے لیے وہ چند لمحوں تک رک گیا اور اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اس کی بی بی اپنے نئے بیضاوی چہرے، ہاتھی دانت جیسے سفید رنگ، بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور سیاہ بالوں کی وجہ سے بہت حسین، نازک اندام اور پروقار معلوم ہوتی تھی۔ وہ بغیر اپنے شوہر کی طرف دیکھے گاڑی کے اندر ایسے انداز سے داخل ہوگئی کہ وہ جذبۂ حسد و رقابت جو رت سے اس کے شوہر کو الجھن میں ڈالے ہوئے تھا پھر جوش میں آگیا۔ وہ اس کے قریب گیا.....

"تم سیر کے لیے جارہی ہو؟" اس نے کہا

اس کے لبوں سے جن سے حقارت ٹپک رہی تھی صرف چار الفاظ نکلے،

"تم دیکھتے ہی ہو!"

"بوا کی طرف جاؤ گی؟"

"غالباً"

"مجھے تمہارے ساتھ چلنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

"گاڑی تمہاری ہی ہے۔"

اس جواب کے بجے پر تعجب کیے بغیر وہ گاڑی کے اندر داخل ہوا اور بی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کوچبان کو حکم دیا۔

"بوا کی طرف!"

سائیس چپک کر کوچبان کے پاس بیٹھ گیا۔ اور گھوڑے جب تک سڑک پر نہ پہنچے جب عادت اپنے سروں کو ہلاتے رہے۔

شوہر اور بی بی ایک دوسرے کی بغل میں خاموش بیٹھے رہے۔ شوہر نے چاہا کہ گفتگو شروع کرے، مگر بی بی کے چہرے کے اس قدر غصہ اور غصے کے آثار نمایاں تھے کہ وہ ہمت نہ کر سکا۔

آخر کار وہ پچکے سے اپنا ہاتھ اپنی بی بی کے ہاتھ کے قریب لے گیا، جو دستانے میں ملفوف تھا۔ اور اس کو آہستہ سے اس طرح چھوا کہ گویا اس نے محض اتفاقاً ایسا کیا ہو۔ لیکن بی بی نے بڑی پھرتی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا جس سے ایسی سخت حقارت نمایاں تھی کہ باوجود اپنی فطری خودسری کے وہ پریشان ہو گیا۔

آخر کار اس نے کہا:

"گیبریل"

بغیر شوہر کی طرف دیکھے ہوئے اس نے پوچھا:

"کیا چاہتے ہو؟"

"تم حد درجہ قابل پرستش ہو۔"

اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور ایک غصے میں آئی ہوئی رانی کی طرح گاڑی میں تنی ہوئی بیٹھی رہی۔

اب وہ شانز الیزے کے راستے سے ارک دی ٹرایمف دلتوال کی طرف جا رہے تھے۔ یہ سرپہ فلک عمارت اس طویل رہ گزر کے اختتام پر تھی، سرخ آسمان کے مقابلے میں اپنا سر اٹھائے ہوئے تھی۔ آفتاب کی شعاعیں اس پر پڑ رہی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ افق سے آتشیں غبار اڑ رہا ہے۔

اور گاڑیوں کا ایک سلسلہ دو طرفہ قطاروں میں پارک اور شہر کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑیوں کے ساز اور ان حصوں سے جہاں چاندی اور تانبے کے پرزے جڑے ہوئے تھے، سورج کی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔

کونت دمسکارے نے پھر چیخ چلاّ شروع کی۔

"پیاری گیبرئیل"

اس نے آپے سے باہر ہو کر غصے کے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے چین سے رہنے دو۔ اپنی گاڑی میں بھی اطمینان سے بیٹھنے کی آزادی اب مجھے حاصل نہیں!"

"میری آنکھوں میں تم اب سے پہلے ایسی خوبصورت نہیں معلوم ہوتی تھیں"۔ اس نے اس انداز سے کہا کہ گویا اس نے گیبرئیل کا جواب سنا ہی نہ ہو۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکی اور بھلا کر بولی "اس سے تمہیں کیا بحث؟ میں عہد کرتی ہوں کہ آج سے میں تم سے کچھ بھی واسطہ نہ رکھوں گی"۔

وہ مضطرب اور حیرت زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی فطری بدمزاجی پر قابو پا کر کہا "کیا کہا تم نے؟" اس کے طرزِ تکلم سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محبت کرنے والا انسان نہیں، بلکہ ایک بے رحم آقا ہے۔

پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ کی وجہ سے لوگ اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے لیکن پھر بھی گیبرئیل نے دھیمی آواز میں کہا،

"کیا کہا تم نے؟ کیا کہا تم نے؟ میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں میں بتا دوں کہ تم کیا ہو؟"

"بتا دو"

کیا میں ان جذبات کا اظہار کر دوں جنہیں میں اپنے دل میں اس وقت سے لیے پھرتی ہوں، جب سے میں تمہاری خوفناک خود غرضی کا شکار ہوئی ہوں؟

تعجب اور غصے سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا،

"ہاں کہے جاؤ"

وہ ایک طویل قامت انسان تھا۔ اس کے شانے چوڑے تھے۔ داڑھی لمبی اور بھورے رنگ کی تھی۔ وہ حسین تھا، شریف تھا۔ اور دنیا کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا شہرادہ فرض کیا جاتا تھا۔

گھر سے روانہ ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گیبرئیل اس کی طرف پوری اور دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

"اچھا! اب تم بھی ناگوار باتیں سنو گے لیکن یہ سمجھ لو کہ میں سب کچھ سننے کے لیے تیار ہوں مجھے کسی بات

کا خوف نہیں۔ اور آج تو تمہارا اتنا بھی دُرنہیں جتنا کسی اور کا ہو سکتا ہے۔

اس نے گیبریئل سے آنکھیں ملائیں اور غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو!"

"نہیں میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر اب میں اس طرح ہمیشہ خاموش رہتی رہوں گی جس طرح تم نے مجھے پچھلے گیارہ سالوں میں بار بار بتایا ہے۔ میں اس طرح رہنا چاہتی ہوں جس طرح دنیا کی عورتیں رہتی ہیں۔ جس کی میں حق دار ہوں اور جس طرح دنیا کی کل بیویوں کا حق ہوتا ہے۔"

اس کا چہرہ دفعتہً زرد ہو گیا اور اس نے بھلا کر کہا۔

"میں یہ نہیں سمجھا۔"

"تم یقیناً سمجھ گئے ہو گے۔ ابھی تین ہی مہینے گزرے ہیں کہ مجھے بچہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن ہونکہ باوجود تمہاری کوششوں کے میں اب تک بہت حسین ہوں۔ جس کا اندازہ تم نے اس وقت کیا ہو گا جب تم نے آج دروازے کی سیڑھیوں پر مجھے دیکھا تھا۔ تم سوچتے ہو گے کہ میرے حاملہ ہونے کا وقت پھر آ گیا۔

"تم مہمل باتیں کر رہی ہو"

"نہیں ——— میرا سن تیس سال کا ہے اور میرے سات بچے ہیں۔ ہماری شادی کو گیارہ سال کا عرصہ گزرا تم یہ امید کرتے ہو گے کہ اگر آئندہ دس سال تک یہی سلسلہ جاری رہا تو اس کے بعد تمہیں مجھ سے حسد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

اس نے اپنی بی بی کے بازو کو زور سے دبایا۔

"میں تمہیں اس قسم کی گفتگو نہیں کرنے دوں گا"

"مگر میں بولتی رہوں گی جب تک سب کچھ نہ کہہ لوں جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ اگر تم مجھے بولنے نہ دو گے تو میں اپنی آواز اس قدر بلند کر دوں گی کہ دونوں خادم بھی سن سکیں جو باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے نزدیک اسی وجہ سے بیٹھنے دیا تھا کیونکہ ان خادموں کی موجودگی میں میری باتیں سننے اور اپنے جذبات پر قابو رکھنے کے لیے مجبور کرے گی۔ سنو! میں ہمیشہ تم سے نفرت کرتی رہی اور میں نے تمہیں اس کا احساس ہونے دیا، کیونکہ میں اب تک کبھی جھوٹ نہیں بولی ——— تم نے میری مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کی۔ تم نے میرے والدین پر دباؤ ڈالا جنہوں نے میری شادی تم سے کر دی، کیونکہ تم بہت امیر تھے۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ میرے آنسوؤں کی بھی پروا نہ کی۔

گویا تم نے مجھے خرید لیا۔ جب سے میں تمہارے قبضے میں آئی، اور تمہاری بی بی بنی، میں نے کوشش کی کہ تمہاری چکنیوں اور جابرانہ سلوک کو بھول جاؤں۔ کیونکہ میں ایک وفادار بی بی ہونا چاہتی تھی۔ جب میں تم سے حد درجہ

محبت کرنے لگی، تم سخت بدگمان ہو گئے۔ شاید ہی کسی اور کو ایسی بدگمانی ہوئی ہوگی۔ تمہاری بدگمانی ذہیل درجے کی تھی، تو تمہارے لیے ننگ اور میرے لیے توہین کا باعث تھی۔ شادی کو آٹھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ تم نے مجھ کو ہر قسم کی دغابازی کا مرتکب سمجھا۔ بلکہ تم نے خود مجھ سے اپنے شک کا اظہار کیا۔ کیسی شرمناک بات ہے! چونکہ تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے حسن اور دلفریبی سے محروم کر دو، گھر گھر میرا پرچار ہونے دو، اور اخباروں میں میری تعریف نہ چھپنے دو، تم میری طرف سے دوسروں کی توجہ ہٹانے کی کوئی صورت سوچنے لگے۔ تم نے یہ تاباں نفرت ترکیب سوچی کہ میں یکے بعد دیگرے بچے جنتی رہوں، یہاں تک کہ لوگ مجھ سے متنفر ہو جائیں، اس سے انکار نہ کرو۔ محبت دونوں تک تو مجھے اس کا شائبہ گمان بھی نہ تھا۔ لیکن پھر میں سمجھ گئی۔ تم نے اپنی ہی منہ سے بھی یہ بات تخریبہ کہی تھی۔ اس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی، اور تمہارے دیوانگی بھرے پن سے گھبراتی ہے۔ ہماری آپس کی لڑائیوں کو یاد کرو۔ دروازے زبردستی کھولے جاتے، اور تالے توڑ دیے جاتے تھے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ تم نے گیارہ سال سے مجھے کس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے! ایسی زندگی جیسی بچہ جننے والی گھوڑی مغل میں بسر کرتی ہے۔ پھر میرے حاملہ ہوتے ہی تمہیں مجھ سے رغبت باقی نہ رہتی، مہینوں تک تمہارے دیدار سے محروم ہو جاتی۔ میں واپس بھیج دی جاتی کہ دیہی جا کر بچے جنوں۔ جب میں واپس آتی، ایسی ہی حسین، دلفریب اور مرکز جاذبیت بن کر، جیسی پہلے تھی، میرے دل میں یہ تمنا ہوتی، کہ اب تھوڑے دنوں تک ایسی زندگی بسر کروں جیسی ایک نوجوان اور تندرست عورت کو بسر کرنی چاہیے۔ لیکن تم پھر شک کرنے لگتے اور وہی قابل نفرت خواہش سے مغلوب ہو کر، تم میرے درپے آزار ہو جاتے تھے، میں خواہش سے مغلوب ہو کر، تم ابھی میرے پاس بیٹھے ہوئے ہو، یہ میرے حسن سے لطف اندوز ہونے کی خواہش نہیں، کیونکہ میں نے کبھی تم سے انکار نہیں کیا، بلکہ یہ مجھے بدصورت بنا دینے کی خواہش ہے۔

"اس کے علاوہ ایک اور باعث سخت قابل نفرین و ملامت۔ عجیب و غریب بات جس کا احساس مجھے دیر سے ہوا، وہ تھا تمہارے افعال اور خیالات کی غایت کو محبت جلد سمجھ جاتی ہوں، تم اپنے بچوں سے محض اس لیے محبت کرتے ہو کہ جب تک میں اپنے جسم میں لیے پھرتی ہوں، تمہیں میری طرف سے بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ تم انہیں پیار اس لیے کرتے ہو، کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔ جب تم میری جوانی کو روز بروز ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہو، تو تمہارے شرمناک وسوسے عارضی طور پر معدوم ہو جاتے ہیں۔

"میں نے بارہا تمہاری اس خوشی کو محسوس کیا اور تمہاری آنکھوں میں اسے دیکھا ہے۔ تم اپنے بچوں کو اپنی فتح کی نشانی سمجھ کر پیار کرتے ہو۔ اس لیے نہیں کہ ان کی رگوں میں تمہارا ہی خون بہتا ہے۔ ہر بچہ ایک فتح ہے۔ جو تمہیں مجھ پر، میری جوانی پر، میرے حسن، میری دلفریبی اور ہر دلعزیزی پر حاصل ہوئی ہے۔ تمہیں ان بچوں پر فخر ہے۔ تم انہیں دکھاتے پھرتے ہو، دوستوں اور ماں سورا ان سی میں سیر کراتے ہو، اور تمہارے پر تھیٹروں میں لے جاتے ہو تاکہ لوگ تمہیں ان سے گھرا ہوا دیکھ کر کہیں، "کیسا اچھا باپ ہے۔" اور اس جملے کو بار بار دہرائیں۔ ۔ ۔

اس نے وحشیانہ انداز سے گیبرئیل کی کلائی پکڑ لی اور اس سختی سے دبائے رہا کہ وہ چیخ ہوگئی اور اس کے حلق سے گھرگھراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔

کونت نے دھیمی آواز میں کہا:

"مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے۔ تم تو ایسی باتیں کرتی ہو کہ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ ماں ہو کر ایسی باتیں! لیکن میں تمہارا مالک ہوں۔ مالک!... ..... میں جب چاہوں تمہیں اپنا حکم بجالانے پر مجبور کر سکتا ہوں، اور قانون بھی میری ہی مدد کرے گا۔"

اس نے گیبرئیل کی انگلیوں کو اپنی عیاری مردانہ مٹھی میں جکڑ کر دبا دینا چاہا۔ شدتِ درد سے بے چین ہو کر گیبرئیل نے اپنے ہاتھ کو اس سخت گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی، جس سے اس کا ہاتھ پسا جا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر ہانپنے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کونت نے کہا:

"اب تم محسوس کرتی ہوگی کہ میں تمہارا مالک ہوں اور تم سے زیادہ طاقتور!"

کونت نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ گیبرئیل نے جواب دیا:

"تم مجھے پارسا عورت سمجھتے ہو؟"

اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "بے شک!"

"تم یہ باور کر سکتے ہو کہ میں گرجا میں قربان گاہ کے سامنے جھوٹی قسم کھاؤں گی؟"

"نہیں"

"میرے ساتھ تم کسی گرجا میں چلو گے؟"

"کس غرض سے؟"

"وہاں پہنچ کر دیکھ لینا۔ چلو گے؟"

"اگر تمہیں اصرار ہے تو میں چلوں گا۔"

گیبرئیل نے بلند آواز سے کہا:

"نیلیپ!"

کوچبان نے گھوڑوں پر سے نظر ہٹائے بغیر اپنی گردن ایک طرف جھکائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے صرف اپنا کان اپنی مالکہ کی طرف پھیر دیا تھا۔ مالکہ نے کہا:

"سان نیلیپ دو دروں کے گرجا کی طرف گاڑی لے چلو"

اور وکٹوریا گاڑی جو بواد بوانوں کے چابک تک پہنچ چکی تھی پیرس کی طرف واپس ہوئی۔

گرجا پہنچنے تک میاں بی بی میں ذرا بھی گفتگو نہ ہوئی۔ جب گاڑی گرجا کے پھاٹک پر رکی تو مادام دسکارے کود کر باہر نکلی اور گرجا کے اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے کونت بھی داخل ہوا۔

وہ سیدھے کوائر کے کٹہرے تک گئی اور ایک کرسی کے سامنے دوزانو بیٹھ کر اس نے اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور عبادت کرنے لگی۔ وہ دیر تک عبادت کرتی رہی اور کونت نے اس کے قریب کھڑے ہو کر دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ خاموشی سے رو رہی تھی جس طرح عورتیں انتہائی رنج و غم کے لمحوں میں رویا کرتی ہیں۔ یہ رونا ایک قسم کا لرزہ تھا جو اس کے جسم پر طاری تھا اور ایک ضعیف سی سسکی میں ختم ہوتا تھا۔

لیکن کونت دسکارے نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کیفیت بہت دیر تک قائم رہ چکی ہے' اور اس نے گیبرئیل کے شانوں کو چھوا۔ گیبرئیل چونک کر کھڑی ہو گئی اور کونت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا:

"مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ میں تم سے نہیں ڈرتی۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ چاہو تو مجھے قتل بھی کر دو۔ ہمارے بچوں میں سے ایک بچہ تمہارا نہیں ہے۔ میں اس خدا کے سامنے تم سے قسم کھا کر کہتی ہوں' جو یہاں پر میری آواز سن رہا ہے۔ یہ ایک انتقام تھا جو میں تم سے لے سکتی تھی۔ تمہارے خلم سے بغاوت کرنے اور بار بار دردزہ میں مبتلا ہونے سے بچنے کی کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ میرا عاشق کون تھا؟ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ تم ساری دنیا پر شک کرو گے' لیکن اس شخص کا سراغ نہیں لے گا۔ میں نے آپ کو بغیر کسی احساس محبت یا خوشی کے' اس کے حوالے کر دیا تھا۔ محض تم کو غارت دینے کی غرض سے۔ اور اس شخص نے بھی مجھے ایک بچے کی ماں بنا دیا۔ وہ بچہ کون ہے؟ یہ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ میرے سات بچے ہیں' تم انہیں میں سے اس بچے کو تلاش کر کے نکال لو۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اس راز سے آگاہ کر دوں' کیونکہ محض بے وفائی سے انتقام مکمل نہیں ہوتا' جب تک کہ مرد ڈرنے بھی نہ لگے۔ تم نے مجھے آج یہ اقرار کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ بس! جو کہنا تھا میں کہہ چکی۔"

یہ کہہ کر وہ گرجا سے' اس دروازے کی طرف بھاگی جو سڑک کے قریب تھا۔ وہ یہ خیال کرتی ہوئی بھاگ رہی تھی کہ اب اپنے شوہر کے قدموں کی چاپ سنے گی' جو اس کا تعاقب کر رہا ہو گا۔ کیونکہ آج اس نے اپنے شوہر سے بغاوت کی تھی اور اس کے عقریب اس کے گناہوں کی زیر دست ضربیں کھا کر وہ خاک و خون میں لوٹتی نظر آئے گی۔

مگر اس نے کوئی آواز نہ سنی اور گاڑی تک پہنچ گئی۔ وہ اچک کر گاڑی میں بیٹھی اور اس نے گھبرا کر کوچبان سے کہا:

"گھر چلو۔"

۱؎ chair وہ جگہ جہاں پر گرجا میں نغمے گائے جاتے ہیں۔ مترجم

گھوڑے تیز چال سے روانہ ہو گئے۔

(۲)

اپنے کمرے کی تنہائی میں کونتس اسکارے کھانے کے وقت کا انتظار کر رہی تھی جس طرح سزا یافتہ مجرم اپنی پھانسی کا منتظر رہتا ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ وہ واپس آ گیا؟ وہ بالطبع تند مزاج تھا۔ ہر قسم کا ظلم ڈھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس نے گون سی تجویز سوچی تھی اور کیا فیصلہ کیا تھا؟ مکان میں کسی قسم کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ بار بار گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خادمہ اسے شام کا لباس پہنانے کے لیے آئی اور پھر واپس چلی گئی۔

آٹھ کا گھنٹا بجا اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر کسی نے دو بار دستک دی۔

"اندر آؤ" گیبریئل نے کہا۔

خان ساماں کمرے میں آیا اور اس نے کہا:

"کھانا تیار ہے مادام"

"کونت صاحب بھی ہیں؟"

"جی ہاں مادام، صاحب کھانے کے کمرے میں موجود ہیں"

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال گزرا کہ اس ڈرامے کا لحاظ کرتے ہوئے، جس کا خاکہ وہ اپنے ذہن میں تیار کر چکی تھی، اسے اس دیوار سے سلح ہو کر جانا چاہیے جسے کہ دونوں قبل وہ خریدکر لائی تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ پستول بھی وہاں موجود ہوں گے، اور تمنک کی شیشی کے سوا اس نے کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لیا۔

جب وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی، تو اس کا شوہر اپنی کرسی کے قریب کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ صرف سر کے اشارے سے ان دونوں میں صاحب سلامت ہوئی۔ پھر یہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تینوں لڑکے اپنے اپنے آتالیق اور حوان کے ساتھ ان کے دہنے بازو بیٹھے، اور تینوں لڑکیاں اپنی انگریزی استانی مس ہتھ کے ساتھ، بائیں طرف بیٹھیں سب سے ننھا بچہ جس کا سن محض تین مہینے کا تھا اپنی کھلائی کے ساتھ اپنے کمرے ہی میں رہا۔

تینوں لڑکیاں، جو سب کی سب حسین تھیں اور جن میں سب سے بڑی لڑکی کا سن دس سال کا تھا، نیلے رنگ کے فراک پہنے ہوئے تھیں، اور خوبصورت گڑیوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی کا سن ابھی تین سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ لڑکیاں حسین تھیں اور قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ جوان ہو کر وہ اتنی ہی حسین ہو جائیں گی جتنی حسین ان کی ماں تھی۔

دو لڑکیوں کے بال بھورے تھے، اور سب سے بڑے لڑکے کے بال جس کا سن نو سال کا تھا، تقریباً بالکل سیاہ ہو چکے تھے۔ قرینہ تھا کہ یہ تینوں جوان ہو کر بننے، ملاتور اور پھر تیلے ہو جائیں گے، اور ان کے شانے بہت چوڑے ہوں گے۔

یہ خاندان ہی کسی تندرست شخص کی نسل سے تھا۔

پادری نے حسب معمول دعا مانگی جس طرح وہ ہمیشہ مانگا کرتا تھا جب کھانے پر کوئی مہمان نہ ہوتا تھا کہ مہمانوں کی موجودگی میں بچے کھانے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ دعا کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کونتس جو ایسے جذبے سے مغلوب ہو رہی تھی جس کی توقع اُسے نہ تھی' نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ کونت تینوں لڑکوں' تینوں لڑکیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تجسس نگاہیں پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں ایک سے دوسرے پر جاتی تھیں۔ یکایک اس نے اپنے گلاس کو زور سے گرا دیا۔ گلاس ٹوٹ گیا اور سُرخ سیّال میز پر بہہ گیا۔ کونتس اس زور سے چونکی کہ وہ اپنی کرسی پر اچھل پڑی۔ اب گیبرئل نے پہلی بار اپنے شوہر کو دیکھا۔ دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن اس حقارت کے باوجود' جسے وہ اپنے ماتھے کے بل اور دل کی دھڑکن سے محسوس کر رہے تھے' وہ بار بار ایک دوسرے کو گرم نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

اگرچہ پادری اس کشیدگی کی وجہ نہیں سمجھ سکا' مگر فضا کو کدر محسوس کر کے اس نے بات چیت کا سلسلہ چھیڑنا چاہا۔ اس نے مختلف موضوع پر اظہار خیال شروع کیا۔ مگر اس کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

کونتس نے اپنی فطری ہشیاری اور حسن اخلاق سے پادری کی باتوں کا جواب دینا چاہا' مگر ناکام رہی۔ خیالات کی الجھن میں اسے مناسب الفاظ نہ مل سکے۔ اس وسیع کمرے کی خاموشی میں جہاں چھریوں اور کانٹوں کی آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی تھی وہ خود اپنی آواز سُن کر ڈر رہی تھی۔

یکایک اس کے شوہر نے' اس کی طرف جھک کر' کہا:

"یہاں' اس کمرے میں' اپنی اولاد کی موجودگی میں' تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا' وہ سچ کہا تھا؟"

وہ حقارت' جس کا خمیر اس کی رگوں میں تیار ہو رہا تھا' یکایک بھڑک اٹھی۔ اس نے اس کے سوال کا جواب بھی اسی جوش سے دیا جس سختی سے اس کی نگاہوں کا جواب دیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے' دونوں ہاتھ لڑکوں کے سر کی طرف اور بایاں ہاتھ لڑکیوں کے سر کی جانب بڑھایا۔ پھر اس نے بغیر ہچکچائے ہوئے' ایسی آواز میں' جس سے عزم راسخ کا اظہار ہوتا تھا' کہا:

"میں اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے تم سے حقیقت بیان کی تھی۔"

کونت کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر اس کی الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے رومال کو میز پر پھینک دیا' اور اپنی کرسی کو دیوار کی طرف دھکیل کر' کچھ بولے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس پر کونتس نے اس طرح گہری سانس لی گویا اس نے پہلے بار سانس پائی ہو۔ وہ مطمئن لہجے میں بولی:

"میرے بچو! تم پریشان نہ ہو' تمہارے باپ کو کسی بات کا زبردست صدمہ ہے۔ اس لیے وہ مغموم ہیں۔ چند

دنوں میں یہ کیفیت دور ہو جائے گی۔"

اب اس نے پاوری اور رس اسقف سے گفتگو کی، بچوں سے پیار کی باتیں کیں۔ ایسے میٹھے الفاظ استعمال کیے اور ایسی شفقت کا اظہار کیا کہ بچوں کے ننھے دل مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ بچوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گئی۔ بڑے بچے آپس میں بات کرتے رہے، چھوٹے بچوں کو اس نے کہانیاں سنائیں، اور جب ان کے سونے کا وقت آیا، تو ان کے بوسے لے کر، انہیں سونے کے لیے جانے دیا۔ پھر خود اپنے سونے کے کمرے میں تنہا واپس گئی۔

وہ اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کرنے لگی، چونکہ بچے اس وقت اس کے پاس موجود نہ تھے، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے فانی جسم کی اسی طرح حفاظت کرے گی جس طرح دنیا میں اس نے اپنی نسوانیت کی حفاظت کی تھی۔ اس نے اپنے لباس کی جیب میں اس چھوٹے پستول کو بھر کر رکھ لیا، جسے اس نے چند دنوں قبل خریدا تھا۔

کئی گھنٹے گزرے۔ گھڑیاں گھنٹے بجاتی رہیں۔ مکانوں میں شور و غوغا بالکل کم ہو گیا۔ صرف گاڑیاں سڑک پر چل رہی تھیں ان کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز دیواروں سے گزر کر بہت دھیمی اور دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ اب وہ اس سے نہیں ڈرتی تھی بلکہ خاتمہ خوشی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے شوہر کو ستانے کا ایسا طریقہ نکالا تھا، جسے وہ ہر گھڑی، زندگی بھر محسوس کرتا رہے گا۔

صبح کی روشنی پردوں کے حاشیوں سے چھن کر کمرے کے اندر آئی مگر وہ اب تک واپس نہ آیا۔ کانتس گھبرائی اور اسے یہ خیال ہوا کہ وہ نہیں آئے گا۔ دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگا دی اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا شوہر اب کیا کرے گا۔

جب خادمہ چائے لے کر آئی تو اس نے کونتس کو ایک خط دیا جو کونت نے لکھا تھا۔ اس نے اپنی بی بی کو اطلاع دی تھی کہ میں ایک طویل سفر کے لیے جا رہا ہوں اور اپنے قانونی مشیر کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ تمہارے اخراج کے لیے تیار رہے۔

(۳)

پیرس میں "شیطان رابرٹ" نامی ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔ ابھی دوسرا ایکٹ شروع ہونے والا۔ مرد، ٹوپیاں اور نیچی واسکٹ پہنے کھڑے تھے۔ واسکٹ کے اوپر سفید قمیص نظر آتے تھے۔ جن کے بٹن سونے اور جواہر کے تھے مردوں کی نظریں عورتوں کے دھبے کی طرف تھیں۔ عورتیں شام کے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جن میں موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس منور کمرے کی فضا موسیقی اور انسانی آوازوں سے معمور تھی۔ عورتوں کے حسین چہرے اور چمکتے ہوئے شانے نگاہوں کے مرکز توجہ تھے۔

وہ دوست جن کی چھوٹی کرسیاں ایک طرف تھیں گفتگو میں مصروف تھے، اور ان نفاستوں، حقیقی یا مصنوعی

دلکشی، اور شان و شوکت کی مذمت کر رہے تھے جن کا مظاہرہ اس عظیم الشان تھیٹر میں ہو رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے جس کا نام برنارد گراندان تھا، اپنے ساتھی برنارد گراندان سے کہا۔

"کونتس دسکارے کو دیکھو۔ ۔ ۔

"ان دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"میں نہیں جانتا۔ کسی زمانے میں مسکارے بہترین شوہر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ اس شہر کے زندہ دل لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جب تک وہ ایک اچھا شوہر تھا، بہت تند مزاج اور شکی تھا۔ جیسے وہ بیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا، بہت بے پروا ہو گیا ہے پھر بھی ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ مسکارے کسی پریشانی، غم یا الجھن کا شکار ہو رہا ہے۔ اگر اس کی بیوی بوڑھی نہیں ہوئی تو وہ قبل از وقت بوڑھا ہو رہا ہے۔"

تھوڑی دیر تک یہ دونوں دوست ان خانگی جھگڑوں کے متعلق فلسفیانہ بحث کرتے رہے جو تفاوتِ فطرت یا طبیعی اختلاف کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔

روشے ڈی سالان نے — جو ابھی تک مادام مسکارے پر نظریں جمائے تھا — کہا:

"یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کے سات بچے ہیں۔"

"ہاں — گیارہ برس کے عرصے میں اس کے سات بچے پیدا ہوئے۔ جس کے بعد تیس برس کے سن میں اس نے اس سلسلے کا خاتمہ کر دیا۔ تاکہ اس کے حسن کی نمائش کا دور شروع ہو۔ یہ دور ابھی ختم ہونے والا نہیں معلوم ہوتا۔"

"غریب عورتیں!"

"تمہیں ان پر رحم کیوں آتا ہے؟"

"کیوں؟..... میرے دوست! ذرا غور تو کرو۔ ایک عورت کا گیارہ برس تک بار بار حاملہ ہونا، بغیر اس کے شکار ہو گئے جو شیخ عورت کو محض انڈا دینے والی مشین بنا دیا ہے۔"

"اس کا چارہ ہی کیا ہے؟ یہ فطرت کا تقاضا ہے۔"

"یہ صحیح ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ فطرت ہماری دشمن ہے۔ ہمیں زندگی بسر فطرت کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اس کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ ہمیں پھر جانور بنا دے۔ دنیا میں نفاست، حسن، اخلاق، علی تخلیق جو کچھ بھی ہے، اس کی تخلیق خدا نے نہیں کی۔ بلکہ انسان نے، انسان کے دماغ نے۔ ہم نے دنیا کو حسن، لطافت اور دلکشی عطا کی ہے، ان گیتوں کی بدولت جنہیں ہم اس کے متعلق گاتے ہیں، شعرا کے کلام کی تشریح، فن کاروں کی تخیل اور ان عاقلانہ باطلیوں کے ذریعے جو خلط ہوا کرتی ہیں، مگر بظاہر قدرت کی معقول توجیہ کرتی ہیں۔ خدا نے صرف بھدی مخلوقات کو پیدا کیا ہے، جن میں ہماری کے ہر افراد میں اور چند سالوں کے حیوانی ارتقا کے بعد ضعیف اور زیادہ بدصورت ہو جاتی ہیں۔ غالباً خدا نے انہیں قابلِ نفرت طریقے سے اپنی نسل کو پھیلانے اور شام کے قتیل الحیات کیڑوں کی طرح مرجھانے کے لیے پیدا کیا ہے، میں نے ابھی کہا تھا۔" قابلِ نفرت طریقے سے اپنی نسل کو پھیلانے کے لیے میں پھر اس جملے کو دہراتا ہوں ذرا بتاؤ تو سہی کہ تخلیق

انسانی کے گھناؤنے طریقے سے بھی زیادہ شرمناک اور قابل نفرت کوئی دوسری چیز ہے جس سے لطیف احساسات دُور بھاگتے ہیں۔ اور ہمیشہ بھاگتے ہی رہیں گے کل اعضا جو اس کفایت شعار اور کینہ ور خلاق نے بنائے ہیں ان کے دو دو کام ہیں۔ اس نے ایسے اعضا کیوں نہیں بنائے جو آلائشوں سے پاک ہوتے۔ تاکہ ان اعضا سے اس پاک مقصد کی تکمیل ہوتی جو انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ منہ جو مادی غذا کے ذریعے جسم کی نشوونما کرتا ہے، گفتگو اور خیالات کی بھی شناسکر آہے۔ ہمارے جسم کی بقا کا باعث ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ذہانت کو بھی بوید اکرتا ہے۔ قوت شامہ جو پھیپھڑوں میں زندگی بخش ہوا پہنچاتی ہے، دماغ کو پھولوں، خنکیوں، درختوں اور سبزوں کی خوشبوؤں سے بھی معطر کر دیتی ہے۔ کان ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع دیتا ہے، اسی کان کی بدولت ہم نے موسیقی، ایجاد کی، اور اوازوں سے جسمانی انبساط اور ابدی مسرت کی تخلیق کرنا بھی سیکھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کینہ پرور خالق کا مقصد یہ ہے کہ مرد کے لیے ممکن ہی نہ ہو کہ عورت سے اپنے تعلقات کو لطیف بنا سکے۔ پھر بھی مرد نے عشق کی بناؤٹی جو اس حاسد خلاق کا چنداں بُرا جواب نہیں لیکن اس نے عشق کے ساتھ ایسی شاعرانہ خود بینی وابستہ کر دی ہے کہ عورت اکثر بھول جاتی ہے کہ اُسے مجبوراً کیسے کیسے تعلقات قائم کرنے پڑتے ہیں لیکن ویسے لوگ جو اپنا کوئی نصب العین مقرر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اخلاقی جرائم اور مذہب عیاشی ایجاد کرتے ہیں، جو خدا کو دھوکا دینے اور حسن کی بے باکانہ پرستش کرنے کا دوسرا طریقہ ہے

انسان کے بچے تو اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح جانوروں کے فرق یہ ہے کہ انسان کے فعل کو قانون جائز قرار دیتا ہے۔

"اس عورت کو دیکھو! کس قدر روح فرسا خیال ہے کہ یہ گوہر بے بہا یہ حسین عورت جو صرف اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ اس کے حسن کی پرستش کی جائے، اپنی زندگی کے گیارہ سال کونت دی سکارے کے جاں نشینوں کو پیدا کرنے میں گزار چکی ہے!"

برنارد گرانڈاں نے ہنستے ہوئے کہا:

"تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر بہت کم لوگ تمہارا مطلب سمجھ سکیں گے۔"

سالانس خوش ہو گیا۔

"تم جانتے ہو کہ خدا کی تخلیق کے متعلق میرا کیا تصور ہے؟" اس نے کہا "ایک عظیم انسان تخلیق آدمیت ہم نہیں جانتے جو فضائیں گردوں دنیائیں اس طرح پیدا کر دیتا ہے جیسے مچھلی سمندر میں انڈے دیتی ہے۔ تخلیق اس کا "خدائی فعل" ہے۔ لیکن وہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے بے خبر رہتا ہے۔ اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے پھیلائے ہوئے جراثیم کن مختلف طریقوں سے ارتباط ہوتا ہے۔ انسانی تخیل ایک اتفاقی حادثہ ہے جو بالکل خلاف توقع ہے۔ ممکن ہے کہ زمین

کے ساتھ فنا ہو جائے اور پھر اسی شکل میں، یا کسی دوسرے عنوان سے یا کسی دوسری دنیا میں معرض وجود میں آئے۔ اسی ذہنی حادثے کے باعث ہم اس دنیا میں، جو ہمارے لیے نہیں بنائی گئی ہے، اس قدر بے چین رہتے ہیں۔ نئی شورشوں کا خمیر مقدم کرنے، ان کو رہنے کی جگہ دینے، اور ان کی نشو و نما میں مدد دینے کے لیے ہم تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ، جو حقیقتہً شائستہ ہیں، قدرت کے ارادوں کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رہتے ہیں۔"

گراندان غور سے اس کے تقریر سنتا رہا۔ وہ اس کی تخیل کی حیرت انگیز پرواز سے واقف تھا۔ اس نے اپنے دوست سے پوچھا:

"گویا تمہارا خیال ہے کہ خدا نے محض اتفاقاً انسانی تخیل کی تخلیق کی؟"

"بے شک! انسانی تخیل ہمارے دماغوں کے اعصابی مرکزوں کا اتفاقی عمل ہے، نامعلوم کیمیائی تغیرات سے مشابہ، یا شمل بجلی کے، جو گرد و غیر متوقع اتفاقات سے پیدا ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسانی تخیل ان تمام مظاہر سے مشابہ ہے جو جاندار مادے کی پراسرار خمیر سے ہویدا ہوتے ہیں۔

"میرے دوست! انسانی تخیل کو ایک حساس خالق نے پیدا کیا ہے اگر اس کی تخلیق کا مقصد وہی ہے جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں، اگر یہ جانوروں کے تخیل، اور جذبۂ صبر و رضا سے بالکل جداگانہ، عابر، متجسس، اور پریشان ہے، تو یہ دنیا، جو ہمارے لیے بنائی گئی تھی، ایسی نہ ہوتی، لومڑی کی تنگ قیام گاہ، سلاد کے کھیت، اور چڑیے خانہ باغ کی طرح ہوتی، یہ کیسی دنیا ہے جہاں تمہاری تنگ نظر قدرت نے ہمیں رہنے کی جگہ دی ہے کہ ہم غاروں میں یا درختوں کے نیچے رہیں، اور معقول جانوروں کے گوشت، یا کچی ترکاریوں کو جو دھوپ اور پانی سے نشو و نما پاتی ہیں، اپنی غذا بنائیں؟

"اگر ہم تھوڑی دیر کریں غور کریں، تو ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ دنیا ہم لوگوں کے لیے نہیں بنائی گئی۔ ہمارا تخیل جس کی پیدائش اور پرورش، دماغی اعصاب کے کسی اجنبی صفت سے ہوتی ہے، بالکل بے بس، کم نگاہ، اور الجھا ہوا ہے، اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ اسی کی بدولت ہم دنیا میں بلاؤں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

"اس دنیا پر غور کرو، جو خدا نے اپنی مخلوقات کے رہنے کے لیے بنائی ہے۔ کیا یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ خاص کر جانوروں کے لیے بنائی گئی ہے؟ انہیں کے لیے یہاں درخت لگائے گئے اور جنگل آباد کیے گئے ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مگر جانوروں کے لیے سب کچھ ہے، درخت، سبزہ زار، دریا، سیر و تفریح کے مقامات اور کھانے پینے کی چیزیں! اس لیے مجھ جیسے عربیں لوگ یہاں ہرگز خوش نہیں رہ سکتے۔ صرف ایسے لوگ خوش و خرم رہ سکتے ہیں جو حیوانوں سے مشابہ ہوتے اور انہیں کی طرح قانع اور مطمئن رہتے ہیں۔ مگر آدمیوں کا کیا مصرف ہوتا ہے؟ شعرا، بے صبر، عالم خواب میں رہنے والے، متفکر اور بے قرار لوگ، ..... بدنصیب ہستیاں!"

"ہم چقندر، کرم کلے، پیاز، گاجر اور مولیاں کھاتے ہیں کیوں کہ ہم مجبور کر دیے گئے ہیں کہ ان چیزوں کے عادی بنیں، اور ہمیں ان سے رغبت ہو جائے۔ اسی لیے کوئی دوسری چیز پیدا ہوتی ہی نہیں۔ لیکن یہ چیزیں تو صرف بیلوں اور بکریوں کی غذا کے لائق ہیں۔ جس طرح گھاس اور لونگ کے پودے، گھوڑوں اور گائیوں کی غذا ہیں جب میں کھیت میں اناج کے خوشے دیکھتا ہوں، تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اناج کے خوشے بٹیروں اور دوسری چڑیوں کی چونچوں کے لیے زمین سے پھوٹ کر نکلتے ہیں، میرے منہ کے لیے نہیں۔ اسی طرح جب میں روٹی چباتا ہوں تو چڑیوں کی حق تلفی کرتا ہوں۔ جب مرغ کا گوشت کھاتا ہوں، تو بیلوں اور لومڑیوں کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کرتا ہوں۔ کیا کبوتر اور اس جنس کی دوسری چڑیاں باز کی قدرتی خوراک نہیں؟ گائے اور بھیڑیے کے گوشت بڑے بڑے گوشت خوار درندوں کی غذا نہیں؟ لیکن ہمارے نصیب ایسے کہاں کہ ہم ساگ کے ساتھ گوشت پکا کر کھائیں!

"جانوروں کو دن کاٹنے کے سوا اور کیا کرنا ہے؟ ان کے رہنے کی جگہ مقرر، اون کی غذا کا سامان مہیا ہے۔ ان کا کام صرف گھاس کھانا، شکار کرنا اور کسی غیر ارادی احساس سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کو کھا جانا ہے۔ خدا نے دنیا میں امن و امان قائم کرنے کا خیال نہیں کیا، بلکہ اس کے مدنظر صرف اپنی مخلوق کی موت تھی، اس کے تصور میں ایسی مخلوق تھی، جس کے افراد ایک دوسرے کو برباد کرنے اور نوچ کھانے پر تلے ہوئے ہوں۔

"جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے ہمیں محنت، کوشش، صبر، ایجاد، تخیل، ذاتی جوہر اور خداداد صفات سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ ہم اس پتھریلی زمین کو رہنے کے قابل بنا سکیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ہم اس دنیا نوسی فریتے سے زندگی بسر کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے؟ قدرت کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ہم اس تکلیف دہ ماحول میں زندہ رہ سکیں، جو ہماری شان کے لائق ہی نہیں۔

"ہم جس قدر مہذب، ذہین اور شائستہ ہوتے جاتے ہیں، اسی قدر ہمیں اس حیوانی جذبے پر قابو پانا پڑتا ہے جو ہماری فطرت کا جزو ہے۔"

"غور کرو کہ ہم نے کس طرح تمدن کی بنا ڈالی جس کی بدولت ہمارے پاس موزے سے لے کر ٹیلیفون تک ہر قسم کی چیزیں موجود ہیں۔ یہ چیزیں جنھیں تم ہر روز دیکھا کرتے ہو، ہمارے لیے بہر صورت کارآمد ہیں۔"

"اپنی تسخیر سے جنگ کرنے کے لیے ہم نے ہر قسم کا سامان مہیا کر لیا ہے۔ مکانات، لطیف مٹھائیاں، کیک، شربت، شراب، کپڑے، زیور، بستر، چٹائیاں، گاڑیاں اور مشینیں۔ ان کے علاوہ ہمارے قبضے میں سائنس، آرٹ، انشاپردازی اور شاعری کے ذخیرے ہیں۔ ہمیں نے آرٹ، شاعری، موسیقی اور مصوری کی تخلیق کی ہے۔ ہر وہ چیز جو تخیل کی پیداوار ہے، ہماری ہی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی ان گونا گوں لطافتوں کے باعث ہیں

اپنی زندگی جسے خدا نے محض افزائش نسل کے لیے مخصوص کیا تھا زیادہ حسین زیادہ اہم کم بے مزہ اور کم تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔"

"اس تھیٹر کو دیکھو۔ یہاں ایک ایسی دنیا ہے جس سے خود تقدیر بھی واقف نہیں۔ جس کی حقیقت صرف ہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ہم جیسے غیر قانع اور بے قرار حیوانوں کی بنائی ہوئی، مضطرب اور حساس دنیا!"

"پھر ماہ و سال کی مسکارے ہی کے وجود پر غور کرو۔ خدا نے اس کو غاروں میں جانوروں کے چمڑے لپیٹ کر آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ کیا اسی زندگی اس کے لیے موزوں نہ ہوتی؟ لیکن ہیں معلوم کہ اس کے ظالم شوہر نے یکایک اسے چھوڑ کر اداری عورتوں سے اختلاط کیوں بڑھا دیا، حالانکہ اس کے سات بچے بھی ہو چکے تھے؟"

گراندان نے جواب دیا:

"میرے دوست! غالباً اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس نے محسوس کیا ہوگا کہ اپنی بی بی سے میل جول رکھنا ننگا سودا ہے۔ خانگی اقتصادیات کی بنا پر اس نے بھی وہی نظریے قائم کیے ہوں گے جو تم نے اپنے فلسفے کی بدولت قائم کیے ہیں۔"

آخری ایکٹ کے لیے تین بار گھنٹی بجی، دونوں دوست ٹوپیاں اتار کر ایشج کی طرف پھرے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

(۴)

تماشے کے بعد کونت اور کونتس مسکارے اپنی گاڑی میں بیٹھے گھر واپس جا رہے تھے۔ یکایک شوہر نے بی بی کو مخاطب کیا:

"گیبرئیل!"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمہیں اس کا احساس ہیں کہ اس الجھن کی مدت بہت طویل ہو گئی؟"

"یعنی؟"

"وہ ناقابل برداشت الجھن جس میں تم نے مجھے گزشتہ چھ سالوں سے مبتلا کر رکھا ہے؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"بتا دو کہ وہ بچہ کون سا ہے؟"

"نہیں بتا سکتی!"

"تم نہیں جانتیں کہ جب میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں' یا مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے' تو اس شک سے میرے دل میں کیسی کیسی اٹھتی ہے! خدارا! مجھے بتا دو کہ وہ کون بچہ ہے؟ میں تم سے کھاتا ہوں کہ تمہارا قصور معاف کر دوں گا۔ اور اس بچے کے ساتھ بھی اپنے بچوں کی طرح سلوک کروں گا۔"

"مجھے یہ بتانے کا حق حاصل ہی نہیں۔"

"تم نہیں محسوس کر سکتیں کہ اب مجھے زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے؟ یہ سوال جو میں اپنے سے کرتا رہتا ہوں' یہ پریشان کن خیال جو مجھے ستانے لگتا ہے' جب میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں! میں پاگل ہو جاؤں گا!"

بی بی نے پوچھا:

"تم واقعی بہت پریشان ہو؟"

"بہت زیادہ پریشان ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا مجھے گراں معلوم ہوتا ہے۔ یہ احساس مجھے بار بار ستاتا ہے کہ ان بچوں میں ایک بچہ ایسا ہے جسے میں نہیں پہچانتا' اور جس کی وجہ سے میں دوسرے بچوں سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔"

بی بی نے دوبارہ پوچھا:

تم واقعی بہت پریشان ہو؟

اس نے غموم اور دھیمی آواز میں جواب دیا:

"میں نے تم سے بارہا کہہ دیا کہ یہ الجھن بالکل ناقابل برداشت ہے' اگر مجھے اپنے بچوں سے محبت نہ ہوتی تو کیا میں اس گھر میں رہتا بھی؟ تمہارے اور ان بچوں کے نزدیک رہنا گوارا بھی کرتا؟ تم نے میرے ساتھ بڑا شرمناک سلوک کیا۔ میرے دل میں اگر کوئی جذبہ ہے تو صرف اپنے بچوں کی محبت کا۔ تم تو اس حقیقت سے بھی طرف واقف ہو۔ میرے دل میں ان کی ایسی ہی محبت ہے جیسی صرف پرانے زمانے کے لوگوں کو ہو سکتی تھی۔ تمہارے لیے میں ایسا شوہر ہوں' جس کا نصب العین قدیم طرز کی خانگی زندگی ہے۔ کیونکہ میں ذی حس آدمی ہوں' فطرت کی پیروی کرنے والا' اگلے زمانے کا انسان ——— ہاں' میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے مجھے بدگمان بنا دیا' کیونکہ تم بالکل جداگانہ روش کی عورت ہو۔ میں وہ باتیں کبھی نہ بھولوں گا جو تم نے مجھ سے کہی تھیں اسی دن سے مجھے تمہارے افعال کی پروا نہ رہی۔ میں نے صرف اس لیے تمہیں قتل نہ کیا کہ پھر یہ معلوم کرنے کا آخری ذریعہ بھی باقی نہ رہتا کہ ہمارے .... بلکہ ..... تمہارے بچوں میں کون بچہ میرا نہیں ہے۔ میں نے اس قدر صبر کیا اور اتنی الجھن برداشت کی' جس کا احساس تمہیں نہ ہو سکے گا۔ سب سے بڑے لڑکے کے سوا میں کسی بچے سے محبت کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ میں انہیں بھی بھر کر دیکھ نہیں سکتا' انہیں پکار نہیں سکتا'

ان کو پیار نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو یہ سوچے بغیر گود میں نہیں لے سکتا: "کہیں یہی تو وہ بچہ نہیں؟" پھر برس سے میں تمہارے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آرہا ہوں۔ سچ سچ بتا دو کہ حقیقت کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بُرا سلوک نہ کروں گا۔"

اگرچہ گاڑی میں اندھیرا تھا" مگر وہ یہ محسوس کر سکا کہ گیبریل اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید اب وہ بولے گی۔ اس نے پھر کہا:

"میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اصل واقعہ بیان کر دو۔"

گیبریل نے آہستہ سے کہا:

"شاید میرا جرم اس سے بھی زیادہ سنگین ہے جتنا تم اُسے سمجھ رہے ہو۔ مگر میں بار بار حاملہ ہونا نہیں چاہتی تھی تم سے الگ رہنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے خدائے برتر کی حضور میں جھوٹی قسم کھائی۔ اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر جھوٹ بولی، کیونکہ میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی۔"

اس نے بی بی کے بازو کو اسی طرح، زور سے دبایا، جس طرح اس نے اس دن دبایا تھا، جب یہ دونوں سیر کے لیے بوا کی طرف گئے تھے۔

پھر اس نے ہکلا کر کہا:

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"حرف بہ حرف سچ کہہ رہی ہوں۔"

اس نے دہشت زدہ ہو کر کہا:

"اب تو میں نئے شکوک کا شکار ہو جاؤں گا جن سے کبھی نجات نہ ملے گی۔ میں کس طرح سمجھوں کہ تم جھوٹ کب بولی تھیں، اُس دن یا آج؟ تمہاری بات کا اب کیونکر یقین کروں؟ ایسے اقرار کے بعد میں کسی عورت پر کس طرح بھروسا کر سکتا ہوں؟ میں تو اب کچھ سوچ ہی نہ سکوں گا۔ میں بہت خوش ہوتا اگر تم مجھ سے کہتیں: "وہ بچہ ژاک ہے" یا "وہ بچہ ژاں ہے۔"

اب گاڑی مکان کے صحن میں داخل ہوئی۔ جب گاڑی سیڑھیوں کے سامنے رُکی تو کونت پہلے اُترا اور حسب معمول اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے بی بی کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔

"کیا میں تم سے تھوڑی دیر تک بات کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا:

بی بی نے جواب دیا:

"بہ شوق تمام۔"

وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں گئے۔ نوکر جو کمرے میں لیمپ جلانے آیا انہیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔
جب انہیں تنہائی نصیب ہوئی تو گونت نے پھر گفتگو کا سلسلہ جاری کیا:
آخر میں حقیقت سے کیوں کر واقف ہو سکوں گا؟ میں نے ہزار بار تمہاری منت کی مگر تم خاموش رہیں اور کسی طرح بھی ہونے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ آج تم یکایک کہتی ہو کہ میں جھوٹ بولتی تھی۔ چھ برس تک تم مجھے اس قسم کی عیب بات کا یقین دلاتے رہیں! ہیں — جھوٹ تو تم آج بول رہی ہو — اس کی وجہ میں کیا بتاؤں؟ غالباً مجھ پر ترس کھا کر؟
بی بی نے ایسے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا جس سے سچائی ٹپک رہی تھی۔
"لیکن اگر میں جھوٹ نہ بولتی تو گزشتہ چھ برس میں کم سے کم چار بچے پیدا ہو گئے ہوتے۔"
اس نے چلا کر کہا:
"ماں بھی کہیں ایسی باتیں کرتی ہے؟"
بی بی نے کہا:
"میں اپنے کو ایسے بچوں کی ماں کیوں کر تصور کروں جو اب تک پیدا ہی نہیں ہوئے؟ میرے لیے وہی بچے کافی ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں۔ میں انہیں دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔ اس مہذب زمانے کی عورتیں صرف دنیا کی آبادی بڑھانے کے لیے وقف نہیں۔"
وہ کھڑی ہو گئی مگر گونت نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے:
"صرف ایک بات تباہ دو گیسو بیل۔ مجھ سے اصل واقعہ بیان کر دو گی؟"
"میں تو کہہ چکی ہوں کہ میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی۔"
وہ بھی بھر کے بی بی کا منہ دیکھتا رہا۔ وہ کس قدر حسین معلوم ہو رہی تھی! اس کی بھوری آنکھیں آسمان کی طرح شفاف تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں پر ایک مرصع زرنگار تاج کہکشاں کی طرح چمک رہا تھا۔ گونت نے دفعتہً محسوس کیا کہ یہ ہستی جو میرے سامنے ہے 'صرف ایک عورت ہی نہیں' جس کا کام محض افزائش نسل ہے' وہ ان تمام عیب و ہوس خواہشوں کا پراسرار حاصل ہے جو صدیوں سے ہماری فطرت ہی میں داخل ہو گئی ہیں' اور جو اپنی منزل مقصود سے ہٹ کر ایک دلفریب اور غیر مرئی چمنستان حسن کی طرف جا رہی ہیں۔ ہماری بعض خواہشیں ہیں جو شکوار خواب دکھاتی ہیں۔ ان خواہشوں اور تمناؤں میں شہرت' خود بینی' جمالیاتی احساس' غرض وہ تمام لطافتیں جو قدرت نے عورت کو عطا کی ہیں' موجود ہیں۔ گوشت اور پوست کا یہ مجسمہ جسے ہم عورت کہتے ہیں' ہماری مادی خواہشوں اور لطیف جذبات کو یکساں برانگیختہ کرتا ہے۔
اس کا شوہر اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ اس انکشاف حقیقت سے وہ گشتہ حیرت ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے

بد گمانی پر غور کر رہا تھا' مگر اس وقت کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

آخر اس نے کہا:

"مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم اس وقت سچ بول رہی ہو: مگر اس کے پہلے مجھے یقین تھا کہ تم ہمیشہ جھوٹ بولتی تھیں۔"

کونتس نے شوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور

"خیر تو پھر ہماری دوستی قائم ہے؟"

اس نے بی بی کا ہاتھ چوما اور کہا:

"مجھے اب تم سے کچھ بھی رنجش نہیں۔ گیبریئل! تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا"

وہ کمرے سے باہر نکلا مگر اس کی نظریں بی بی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گیبریئل اب تک کس قدر حسین ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اب ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا ہے' ایسا جذبہ جو اس کے اگلے جذبۂ محبت سے زیادہ شدید ہے۔

دہات کی جھونپڑی

مصنفہ:- چیخوف۔ مترجمہ:- عبدالحفیظ ثمر

ایک نوجوان اپنی کم سن بی بی کے ساتھ ایک چھوٹے سے دہاتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ شوہر کا بازو بی بی کی کمر میں حمائل اور بی بی کا سر شوہر کے کاندھے پر جھکا ہوا تھا۔ دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

چاند متحرک بادلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی خوشی پر ہنس رہا ہے اور اپنے تخلیق دہ اور لاحاصل چکر کی نامناسبت پر۔ ہوا ساکن اور تاریک اور شاہ دانے کی خوشبو سے گراں بار تھی۔ ریلوے لائن کے اس پار کہیں دور پر ایک کوئل کوک رہی تھی۔

بی بی نے آہستہ سے کہا "ساشا! کیسا سہانا منظر ہے۔ یہ تو خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھنا یہ جھاڑی کس قدر خوشنما اور دل فریب ہے۔ اور یہ تار کے کھمبے اور خاموش کھیت کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت سامنے کے منظر میں خاص مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ انسانیت اور تمدن یہاں سے قریب ہی ہیں۔ جب دوش ہوا پر گاڑی کی گھنگھناہٹ کی آواز آتی ہے تو کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

"بے شک، دریا! مگر تمہارے ہاتھ گرم کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ دریا! کہو آج شب کے کھانے کے لیے کیا ہے؟"

"مرغ کا گوشت اور سلاد ہے۔ مرغ اتنا بڑا ہے کہ دو آدمیوں کے لیے کافی ہے اور پھر کرین اور سارڈین بھی ہیں جو شہر سے آئی ہیں۔"

چاند نے بادلوں کی آڑ میں منہ چھپا لیا۔ انسانی مسرت کے مشاہدے سے اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور اس مجرد زندگی کی یاد تازہ ہو گئی جو وہ چاندنیوں اور وادیوں سے پرے گذشتہ لاکھوں برس کرتا رہا تھا۔

"ٹرین آ رہی ہے" دریا نے کہا۔

تین تشفیں منحصر کچھ فاصلے پر نظر آئیں۔ اسٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر آیا۔ لیمپ کی روشنی لان پر ادھر ادھر چلنے لگی۔

ساشا نے جاہی لیتے ہوئے کہا "ٹرین یہاں پہنچ جائے تو ہم گھر واپس چلیں۔ دریا! ہم دونوں کس مزے سے وقت گذار رہے ہیں۔ زندگی میں اتنا لطف!..... یقین کرنا مشکل ہے۔"

دو سیاہ فام بلا رنگین ہوئی پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ انیس ڈبوں کی دھندلی روشنی میں کھڑکیوں سے مسافروں کے شانوں، ٹوپیوں اور تو اب آلود چہروں کی جھلک دکھائی دی

ایک ڈبے کے اندر سے یہ آواز آئی "دیکھو! دیکھو! دریا اور ساشا ہیں لینے کے لیے آئے ہیں! دریا..... دریا..... ادھر دیکھو!"

دو چھوٹی لڑکیاں جھپٹتی کودتی ٹرین سے باہر نکلیں۔ اور دریا کے گلے سے لپٹ گئیں۔ ان کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اور ایک لمبا۔ دبلا پتلا مرد باہر نکلے۔ مرد کے بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ان کے پیچھے دو اسکول کے لڑکے تھیلے لیے ہوئے آئے لڑکوں کے بعد استانی اور استانی کے بعد لڑکیاں کی رادی۔

"ہم آگئے، ہم آگئے۔ پیارے بچے" مونچھ والے مرد نے ساشا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہنا شروع کیا "تم تو ہم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوگے ہاں دیوے سے کہتا ہوں کہ تم اپنے بوڑھے چچا کو بُرا بھلا کہہ رہے ہوگے کہ اب تک آئے نہیں۔ کہو کیا۔ کوستیا۔ نا نا۔ فیفا..... بچو۔ اپنے چچائی ساشا کو سلام کرو ہم لوگوں کی پوری جماعت یہاں پہنچ گئی۔ اٹھ تین یا چار دن کے لیے..... غالباً ہماری تعداد زیادہ ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں تکلیف ہو"

ساشا اور دریا اپنے چچا اور اس کے خاندان کو دیکھ کر دم خود ہو گئے۔ چچا نے ان دونوں کو پیار کیا اور ان سے باتیں کرنے لگا گر ساشا محو حیرت ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جھونپڑی میں اتنے لوگ کس طرح رہیں گے۔ اسے اور دریا کو اپنے کمرے خالی کر دینے پڑیں گے۔ مکیہ اور بستر بھی مہمانوں کو دینا پڑے گا۔ سین، سارڈین اور مرغ آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے۔ چچا کی لڑکیاں باغیچے کے تمام پھول توڑ لیں گی۔ روشنائی گرا دیں گی اور جھونپڑی میں ہنگامہ برپا کر دیں گی۔ چچی بار بار اپنی بیماری کا حال سناتی رہیں گی اور فخریہ بیان کریں گی کہ بیرن فون فنک سیرا باپ تھا.....

ساشا نے نفرت کی نگاہوں سے اپنی بی بی کو دیکھا اور اس کے کان میں کہا:

"یہ سب تم سے ملنے آئے ہیں!..... لعنت ہو ان پر!"

"نہیں۔ یہ سب تم سے ملنے آئے ہیں" دریا نے غصے سے لال پیلی ہو کر کہا۔ "یہ سب تمہارے رشتہ دار ہیں۔ مجھ سے کیا واسطہ؟"

پھر وہ اپنے مہمانوں سے مسکرا کر بولی "خوش آمدید"

چاند پھر نکل آیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ گویا وہ خوش تھا کہ اس کے کوئی رشتہ دار نہیں۔ اپنے غضب آلود اور رنجیدہ چہرے کو چھپانے کے لیے ساشا نے مہمانوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے اپنی آواز میں گرمجوشی پیدا کرنے کی کوشش کی اور کہا:

"خوش آمدید۔ آپ نے میری جھونپڑی کو سرفراز کیا"

لہ ایک قسم کی چڑیا۔

تمثیل

بدگمانی

مصنفہ:- مولیئر مترجمہ:- آرزو جلیلی

افرادِ تمثیل

لے باربوئیے، آنٹریلیک کا شوہر
ڈاکٹر،
آنٹریلیک،
والیر، آنٹریلیک کا عاشق
گورژیبو، آنٹریلیک کا باپ
ویلیر بکن،
لاوالے،
کاتو، آنٹریلیک کی خادمہ

پہلا منظر — باربوئیے

باربوئیے ہر شخص کو یہ ماننا پڑے گا کہ میں نہایت بدنصیب انسان ہوں! میری بی بی مجھے مارڈالنا چاہتی ہے مجھے آرام پہنچانے اور میری خواہش کے مطابق کام کرنے کے بجائے وہ مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ان جگہوں پر مرتبہ اُسے ڈانٹوں۔ گھر پہنچنے کے بعد، وہ دھوئیں کھاتی پھرتی اور خدا معلوم کس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ اُف! غریب باربوئیے! تم کس درجہ تابلِ رحم ہو! لیکن اسے سزا دی جانی چاہیے ذہن کر کہ تو نے اُسے قتل کر دیا؟..... اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد تم پھانسی پر لٹکا دیے جاؤ گے۔ اگر تم اس کو جہنم بھیج دو؟..... وہاں سے کبھی آنے کی تدبیر کرے گی۔ لیکن آخر تم کر ہی کیا سکتے ہو؟ ڈاکٹر! دیکھو آرہا ہے۔ ذہن کر کہ اپنی پریشانیوں کے متعلق اس سے مشورہ کرو۔

دوسرا منظر — ڈاکٹر اور باربوئیے

باربوئیے میں تمہیں بلانے جارہا تھا۔ مجھے ایک ضروری بات کے بارے میں تم سے رائے لینی ہے۔

ڈاکٹر میرے دوست! تم نہایت بے تمیز اور غیر مہذب معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں ٹوپی اتار کر سلام کرنا چاہیے تھا، اور مجسّم دانکسار کے ساتھ یہ کہنا چاہیے تھا کہ زندہ تا الحکما میتہ۔ زمان جناب ڈاکٹر صاحب! نظام آداب عوض کرتا ہو تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟

باربوئیے ڈاکٹر! میں تم سے آدم ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ میں آپے سے باہر تھا، اور میں نے سوچا ہی نہیں کہ کیا کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم باہت[1] ہو

---

[1] مولیئر نے یہاں Homme de bien کا شوخانہ Homme de rien سے کس طرح بڑا ہے اس عبارت کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے Honest کے معنی "باہت" استعمال کیا کہ "باہت" کے دو معنی ہوتے ہیں ایک "شریف" دوسرا "بے حیا"۔ باہت کا ترجمہ نہیں۔ مترجم

آدمی ہو۔

ڈاکٹر تم جانتے ہو کہ "بہت آدمی" آیا کہاں سے؟

باربویے مجھے اس سے کیا بحث کہ وہ دیلیٹن[1] سے آیا یا آوبرویلیرے سے۔

ڈاکٹر نہیں جانتے تو مجھ سے سنو! بہت آدمی ماشاءاللہ سے آیا ہے۔ ماشاءاللہ کے آخری رکن سے بے اور الف لینے سے "با" ہوا۔ ہے "میم اور تے ملا کر لفظ "بہت" بنا۔ دو نوں کو ملا دینے سے "بہت" ہوا اور پھر "آدمی" جوڑ دینے سے "بہت آدمی" ہو گیا۔ لیکن میں تم سے کہہ رہا تھا کہ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟

باربویے میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ لیکن ذرا یہ تو سنو کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ.....

ڈاکٹر پہلے تم یہ سنو کہ میں صرف ایک ڈاکٹر نہیں ہوں، بلکہ میں ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، اور دس ڈاکٹر ہوں۔ اول تو یہ کہ ایک کل اعداد میں پہلا عدد اور سبھوں کی جڑ ہے۔ اس لیے میں ڈاکٹروں میں اول ڈاکٹر ہوں، سب ڈاکٹروں سے زیادہ قابل۔ دوسرے کامل علم حاصل کرنے کے لیے دو صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ احساس اور سمجھ۔ میں سلیم احساس اور سلیم سمجھ ہوں۔ گویا میں دو ڈاکٹر ہوں۔

باربویے میں مانتا ہوں۔ جو میں کہنا چاہتا.....

ڈاکٹر تیسرے واسطہ کا تو ہے کہ "تین" اول طاق

---

[1] دیلیٹن شہروں کے نام۔

ہے۔ میں خود کامل ہوں، اور جو کام کرتا ہوں، وہ بھی کامل ہوتا ہے۔

باربویے بہت اچھا ڈاکٹر.....

ڈاکٹر چوتھے فلسفے کے چار حصے ہیں: منطق، اخلاقیات، طبیعات اور مابعد الطبیعات۔ میں چاروں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ گویا میں چار ڈاکٹر ہوں۔

باربویے بس کرو۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ اب میری سنو۔

ڈاکٹر پانچویں کلیات خمسہ ہیں جنہیں جانے بغیر صحیح نتائج اخذ کرنا غیر ممکن ہے۔ جنس، نوع، فصل، خاصہ اور عرض، میں ان پانچوں سے کام لیتا اور ان کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں۔ گویا میں پانچ ڈاکٹر ہوں

باربویے مجھے صبر سے کام لینا پڑے گا۔

ڈاکٹر چھٹے۔ چھٹا عدد "کامل" کا عدد ہے۔ میں اپنی آمدنی کے لیے مسلسل کام کرتا رہتا ہوں۔ گویا میں چھ ڈاکٹر ہوں۔

باربویے اچھا، اچھا، جب تک جی چاہے بولے جاؤ۔

ڈاکٹر ساتویں۔ ساتواں عدد خوشی کا عدد ہے۔ مجھے ان باتوں کو عمل علم ہے جن سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اپنے گاہکوں کی بدولت میں برابر خوش رہا کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے اپنے بارے میں یہ کہنا پڑتا ہے "میں سات ڈاکٹر ہوں"۔ آٹھویں۔ آٹھواں عدد اضافت کا عدد ہے۔ کیونکہ اس میں برابر کمایا جاتا ہے۔ عقل اور اضافت کی بدولت، جن سے میں اپنے کل کاموں کو [illegible]

میں آٹھ ڈاکٹر ہوں۔ نویں: قتیل کی نو دیویاں ہیں اور میں ان سبھوں کی آنکھ کا تارا ہوں۔ دسویں! بغیر کل اعداد کو دہرائے کوئی شخص دسویں عدد تک نہیں پہنچ سکتا اور یہ عدد کل اعداد پر حاوی ہے۔ اسی طرح جب میں تمہیں ملا تو گویا تم نے ڈاکٹروں کے ڈاکٹر کو پالیا اور میری ذات دنیا کے کل ڈاکٹروں کا مجموعہ ہے۔ یعنی ان معقول، صحیح، واضح اور دل نشیں دلائل سے تم سمجھ سکتے ہو گے میں ایک، دو، تین چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس ڈاکٹر ہوں۔

باربوئیے یہ کیا بک رہا ہے؟ میں نے سمجھا تھا کہ یہ ہوشیار آدمی ہے۔ اور مجھے معقول مشورہ دے گا۔ لیکن یہ تو ایک خارجہ از علم ہوتا ہے جو مجھ سے بات کرنے کے بہانے پہیلیاں بجھا رہا ہے۔ ایک، دو، تین چار! ——— ہا! ہا! ——— ہا! ہا! چلو تمہیں میری بات سننا پڑے گی اور یاد رکھو کہ میں تمہارا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے میری تشفی کر دی تو میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ اگر تم چاہو گے تو روپے بھی دونگا۔

ڈاکٹر اوہو روپے؟

باربوئیے ہاں روپے! اور اس کے علاوہ بھی تم جو کچھ مانگو۔

ڈاکٹر (تیزی سے۔ اپنے کان کو پیچے کی طرف کھینچ کر) تم کہتے ہو کہ میں روپے کے لیے سب کچھ کروں گا؟ تم مجھے روپے کا لالچی کہتے ہو؟ سنو میرے دوست! اگر تم مجھے سونے کی ایک تیلی دو اور یہ تیلی ایک بیش قیمت کمس میں ہو، یہ کمس ایک قیمتی صندوقچے میں ہو اور یہ صندوقچہ ایک صندوق میں، یہ صندوق ایک عجائب خانے میں، یہ عجائب خانہ ایک عالی شان عمارت میں، یہ عمارت ایک شاندار محل میں، یہ محل ایک حیرت انگیز قلعے میں، یہ قلعہ ایک مشہور شہر میں، یہ شہر ایک زرخیز جزیرے میں، یہ جزیرہ ایک ہرے بھرے صوبے میں، یہ صوبہ ایک ترقی یافتہ مملکت میں، اور یہ مملکت ساری دنیا میں ہو، اور اگر تم مجھے یہ دنیا دے دو جس میں یہ ترقی یافتہ مملکت ہو، جس مملکت میں یہ ہرا بھرا صوبہ ہو، جس صوبے میں یہ زرخیز جزیرہ ہو، جس جزیرے میں یہ مشہور شہر ہو، جس شہر میں یہ حیرت انگیز قلعہ ہو، جس قلعے میں یہ شاندار محل ہو، جس محل میں یہ عالی شان عمارت ہو، جس عمارت میں یہ عجائب خانہ ہو، جس عجائب خانے میں یہ عجیب و غریب صندوق ہو، جس صندوق میں یہ قیمتی صندوقچہ ہو، جس صندوقچے میں کمس ہو اور جس کمس میں سونے کی تیلی ہو، میں اتنی بھی پرواہ نہ کروں گا (انگلیاں چٹکاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

باربوئیے ۔ مجھے بھول ہوئی۔ اسے ڈاکٹر کے لباس میں دیکھ کر میں نے اسے روپے کا لالچی دنیا فریب سمجھا۔ لیکن چونکہ اسے روپے کی ضرورت نہیں اس کو خوش کرنا بہت آسان ہے۔ میں اس کے پیچھے دوڑوں گا۔

(دوڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر — آنٹرلیک۔ والیر۔ کاتو

آنٹرلیک — میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آئیں تو بڑا احسان ہو، میرا شوہر ایسا بدصورت، بے تمیز، اور شرابی ہے کہ اس کے ساتھ رہنا میرے لیے بہت کٹھن ہے میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ ایسے احمق کے ساتھ رہنے سے کسی کو کیا خوشی نصیب ہو سکتی ہے؟

والیر — آپ نے میری بڑی عزت کی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا دل بہلانے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ آپ ازراہ مہربانی یہ کہتی ہیں کہ میری صحبت آپ کو ناگوار نہیں، میں آپ کی دل جوئی کر کے ثابت کر دوں گا کہ مجھے آپ کا خیال معلوم کر کے کتنی خوشی ہوئی ہے۔

کاتو — جلدی سے کچھ اور بات شروع کرو وہ پڑوسی آ رہا ہے۔

چوتھا منظر — بارہوئیے۔ والیر۔ آنٹرلیک اور کاتو

والیر — بیگم صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو بری خبر سنانے آیا ہوں۔ لیکن آخر آپ کسی نہ کسی سے تو ضرور سنتیں اور چونکہ آپ کے بھائی ہمارے....

آنٹرلیک — اس سے زیادہ کچھ نہ کہیے جناب! میں آپ کی خادمہ ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے لیے اس قدر زحمت گوارا کی۔

(والیر چلا جاتا ہے)

بارہوئیے — ہوں، ہوں! اب اس کی کیا ضرورت ہے کہ میں اپنی بی بی کی بے وفائی کی سند عدالت سے حاصل کروں؟ اچھا! اچھا! فاحشہ عورت! میری ہدایت کے باوجود تو غیر مرد سے التفات کرتی ہے، اور میری آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتی ہے۔

آنٹرلیک — اتنی سی بات کے لیے مجھے ملامت کرنے لگے؟ یہ شریف انسان تو مجھے اپنے بھائی کی موت کی خبر دینے آیا تھا۔ اگر تمہیں مجھ سے جھگڑنے کا بہانہ مل گیا؟

کاتو — میں نے تو اسے دیکھتے ہی سوچا تھا کہ آپ کو یہیں نصیب نہ ہوگا۔

بارہوئیے — تم دونوں عورتیں ایک دوسرے کو بناتی ہو۔ کاتو۔ تم میری بی بی کو بہکاتی ہو جب سے تم اس کی خادمہ بنی ہو، اس میں پہلے کی سی آدمی خوبیاں بھی باقی نہ رہیں۔

کاتو — خوب! آپ مجھ سے اچھا سلوک کرتے ہیں!

آنٹرلیک — اس شرابی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ تم دیکھتی نہیں کہ وہ نشے میں اتنا چور ہے کہ اس کے حواس بجا نہیں۔

پانچواں منظر:۔

گورژیبو۔ ولیمرکین۔ آنٹرلیک۔ کاتو۔ بارہوئیے

گورژیبو — دیکھو، میرا کم بخت داماد پھر میری بیٹی کو گالیاں دے رہا ہے۔

ولیمرکین — ہمیں دریافت کرنا چاہیے کہ معاملہ کیا ہے۔

گورژیبو — تم ہمیشہ لڑتے ہی رہو گے! مگر پھر بھی میں کہتا

نہ رہو گے ؟

باربوئے یہ بہت مجھے شرابی کہتی ہے آنٹرپلیک سے بھی چاہتا ہے کہ تمہارے لوگوں کے سامنے تمہیں سخت سزا دوں۔

گورژیو شیطان کی مار ہو..... اگر یہ صحیح ہے جو وہ کہتا ہے۔

آنٹرپلیک ابتدا تو ہمیشہ وہی کرتا ہے.....

کاتو اس گھڑی کو بُرا ہو جب تم نے اس منحوس کو اپنا شوہر بنایا تھا۔

چھٹا منظر :-

(گورژیو۔ ولیمر کین۔ آنٹرپلیک۔ کاتو۔ باربوئے۔ ڈاکٹر)

ڈاکٹر۔ اس کا مطلب کیا ہے ! کیسی گڑبڑ کیسا جھگڑا ! کیسا ہنگامہ ! کیسا شور و غوغا ! (دہائی) دنگا فساد ! تمہیں ہوا کیا ہے لوگو ؟ آخر ہوا کیا ہے ؟ کیا آپس میں صلح کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں ؟ اچھا میں اس جھگڑے کو طے کروں گا۔

گورژیو میرے داماد اور میری بیٹی میں کچھ جھگڑا ہوا ہے

ڈاکٹر کیسا جھگڑا ؟ اچھا مجھے اس جھگڑے کی وجہ بتاؤ۔

گورژیو جناب !.....

ڈاکٹر بالکل مختصر الفاظ میں.....

گورژیو ہاں ہاں لیکن اپنی ٹوپی تو پہن لیجیے۔

ڈاکٹر ٹوپی ؟ یہ تو ہونٹ ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہونٹ کہاں سے نکلا ہے ؟

گورژیو نہیں

ڈاکٹر یہ بوتم ایسٹ سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں "یہ اچھا ہے" "کوئی چیز جو اچھی ہے" کیوں کہ یہ انسان کو سردی اور کھانسی سے بچاتا ہے۔

گورژیو بہت خوب ! میں نہیں جانتا تھا۔

ڈاکٹر اچھا اب جلد جھگڑے کی وجہ بیان کرو۔

گورژیو واقعہ یہ ہے کہ

ڈاکٹر مجھے امید ہے کہ تم خواہ مخواہ دیر نہ کرو گے۔ مجھے ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ پھر بھی اگر میں تمہارے گھر میں امن قائم کر سکوں تو میں ایک منٹ ٹھہر جانے کے لیے تیار ہوں۔

گورژیو۔ میں بہت جلد اپنا بیان ختم کر دوں گا۔

ڈاکٹر تو جلدی کرو۔

گورژیو میں ایک منٹ میں سب کچھ کہہ دوں گا۔

ڈاکٹر مسٹر گورژیو۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ چند الفاظ میں سب کچھ کہہ لینا بڑا کمال ہے۔ زیادہ بولنے والے کی بات کوئی نہیں سنتا۔ کیونکہ سننے والوں کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ "مختصر کلام از بہر صفات اولی ست" "ایماندار آدمی کی بہترین صفت خاموش رہنا ہے۔

گورژیو تو پھر آپ کو جاننا چاہیے کہ.....

ڈاکٹر سقراط اپنے شاگردوں کو تین کاموں کی ہدایت کرتا تھا۔ اپنے کام ہوشیاری سے کرنا۔ سنجیدگی سے کھانا اور چند الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر دینا

گورژیو اب شروع کرو۔

گورژیو میں تو چاہتا ہی ہوں۔

ڈاکٹر محض چند الفاظ میں۔ بغیر کسی تمہید کے بغیر لمبی تقریر کیے ہوئے۔ بس ایک ہی فقرے میں سب کچھ بیان کر دو۔ جلدی، جلدی، مہسیو گورژیو جلدی کرو۔

گورژیو مجھے ہونے بھی تو دیجیے.....

ڈاکٹر تم بہت ہوتے ہو مہسیو گورژیو۔ اب کوئی دوسرا آدمی جھگڑے کی وجہ بتا دے

ولیسبرکین آپ کو جاننا چاہیے جناب کہ.....

ڈاکٹر تم بالکل جاہل، ان پڑھ اور تہذیب سے ناواقف ہو جس کو فصیح زبان میں گدھا کہتے ہیں۔ تم بغیر کسی تمہید کے بولنا شروع کر دیتے ہو! کوئی دوسرا شخص مجھے بتائے کہ کیا ہوا تھا۔ (آشر لیک سے مخاطب ہو کر) کیا تم اس ہنگامے کی وجہ بتاؤ گی؟

آشر لیک۔ تم اس موٹے موذی کو دیکھ رہے ہو، یہ شراب کے پیپے جیسا شخص جو میرا شوہر ہے۔

ڈاکٹر مجھ جیسے ڈاکٹر کی موجودگی میں اپنے شوہر کا نام تمیز کے ساتھ لو۔

آشر لیک اچھا! تو جناب کا یہ خیال ہے؟ میں آپ کی یا آپ کے خیالات کی بالکل پروا نہیں کرتی۔ جب جی چاہے میں خود ڈاکٹر بن جاتی ہوں۔

ڈاکٹر جب بھی چاہے تم ڈاکٹر بن جاتی ہو، ابھی ڈاکٹر ہی ہے۔ میرے خیال میں تم ہر بات اپنی خواہش کے مطابق..... مگر جھگڑے کا سبب تو بتاؤ۔

باربوئیے جناب، حضور عالی.....

ڈاکٹر تمہید تو ابھی ہے۔ "جناب عالی! یہ فقرہ کانوں کو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے! بڑا شاندار فقرہ ہے! "جناب عالی!"

باربوئیے اپنی وصیت کے مطابق.....

ڈاکٹر بالکل ٹھیک..... "اپنی وصیت کے مطابق!" وصیت میں کسی خواہش کا اظہار ہوگا۔ خواہش کے لیے اس کی تعمیل کا ذریعہ اور ذریعے کے لیے کسی شے کا ہونا ضروری ہے۔ بڑا جپت فقرہ ہے! "اپنی وصیت کے مطابق!"

باربوئیے۔ میں غصے میں بہوت ہو رہا ہوں۔

ڈاکٹر اس لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کر دو۔ "بھوت!" یہ نہایت غیر فصیح لفظ ہے۔

باربوئیے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب خدا کے واسطے میری بات تو سنیے۔

ڈاکٹر اگر اس وقت قیصر زندہ ہوتا تو کہتا! "اسے پی ڈالو"

باربوئیے۔ اگر میری بات نہ سنو گے تو تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ بھلا بکنے سے تمہارا مطلب کیا ہے؟

(باربوئیے، آشر لیک، گورژیو کا تو، اور ولیسبرکین جھگڑے کی وجہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر نہیں سمجھاتا ہے کہ کل مل کر رہنا اچھا ہے۔ سب کے سب بہ یک وقت بولنے لگتے ہیں اور ٹراٹوف کا شور مچاتے ہیں۔ اس عرصے میں باربوئیے، ڈاکٹر

کے پاؤں رسی سے باندھ کر اس کو زمین پر پٹخ کے مل گرا دیتا ہے' اور گھسیٹنا شروع کرتا ہے۔ ہنگلر بولتا ہی رہتا ہے' اور اپنے ہاتھ کو انگلیوں پر اس طرح گنتا ہے' گویا اسے اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ زمین پر گرا ہوا ہے)

گورژیبو بیٹی اب گھر واپس جاؤ اور اپنے شوہر کے ساتھ امن و امان سے رہو۔

ویلیبرگن غلام اب رخصت چاہتا ہے۔

(ویلیبرگن' گورژیبو اور آنٹرلیک جاتے ہیں)

ساتواں منظر — والیر اور لاوائے

والیر میں تمہارا بے حد ممنون ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ایک گھنٹے میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں تم نے مجھے بلایا ہے۔

لاوائے اتنی دیر تک انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ پندرہ منٹ میں ناچ ختم ہو جائے گا اور تم اپنی محبوبہ سے ملاقات نہ کر سکو گے۔

والیر اچھا تو چلو۔

آٹھواں منظر — آنٹرلیک (تنہا)

میرا شوہر گھر پر موجود نہیں۔ میں ایک پڑوسی کے یہاں ناچ دیکھنے جاؤں گی۔ شوہر کے آنے سے پہلے ہی واپس آجاؤں گی' کیونکہ وہ کہیں شراب پی رہا ہوگا' اور اسے خبر بھی نہ ہوگی کہ میں گھر سے باہر گئی ہوں۔ کم بخت مجھے ہمیشہ اپنے کتے کی طرح گھر پر تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ (آنٹرلیک جاتی ہے)

نواں منظر — بے بار بوئیے

مجھے یقین تھا کہ میں اس احمق ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کروں گا۔ اس جاہل گدھے پر شیطان کی مار ہو! میں نے اس کی ساری قابلیت کا خاتمہ کر دیا۔ اب ذرا گھر چل کر دیکھوں کہ میری خوش سلیقہ بی بی نے کھانے کے لیے کیا پکایا ہے۔ (چلا جاتا ہے)

دسواں منظر — آنٹرلیک

ہائے رے تنہست! میں بہت دیر کے بعد پہنچی۔ دعوت ختم ہو چکی تھی۔ میں اس وقت پہنچی جب لوگ واپس جا رہے تھے۔ مگر اس کی پرواہی کیا ہے؟ کبھی نہ کبھی پھر موقع ملے گا۔ میں اس طرح گھر پہنچوں گی گویا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ خدا خیر کرے! دروازہ بند ہے' کاتو! کاتو!

گیارہواں منظر

(اے بار بوئیے (دریچے کے سامنے) آنٹرلیک

بار بوئیے "کاتو! کاتو!" کاتو کو ہوا کیا ہے؟ اور تم ایسے موسم میں رات کے وقت کہاں سے آرہی ہو؟

آنٹرلیک میں کہاں سے آرہی ہوں؟ دروازہ کھولو تو بتا دوں۔

بار بوئیے یہ تو ہو چکا! جہاں گئی تھیں وہیں جا کر سو رہو۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ رات کے پچھلے پہر تنہا مارے پھرنا! اُف! میرا سر چکرا رہا ہے۔

آنٹرلیک صرف اس لیے مجھے گالیاں دیتے ہو کہ میں تنہا ہوں؟ آخر میں کروں کیا؟

بار بوئیے گھر پر رہو' کھانا تیار کراؤ' گھر کے کاروبار دیکھو' اور بچوں کی پرورش کرو۔ گر فضول باتیں

کرنے کا فائدہ کیا؟ اچھا اب رخصت! جہنم میں جاؤ اور مجھے چین سے رہنے دو۔

آنٹریلیک تو کیا دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئیے نہیں۔ تمہیں اندر نہ آنے دوں گا۔

آنٹریلیک میرے پیارے شوہر! دروازہ کھول دو میرے عزیز از جان شوہر!

باربوئیے اف! گھڑیال! موذی سانپ! تم مجھے دھوکا دینے کے لیے کتنی پیار کی باتیں کرتی ہے!۔

آنٹریلیک کھولو دروازہ کھولو!

باربوئیے الوداع! جاؤ جہنم میں۔

آنٹریلیک دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئیے نہیں!

آنٹریلیک تمہیں اپنی بی بی پر ذرا بھی رحم نہیں آتا؟ وہ تو تم پر دل و جان سے فدا ہے۔

باربوئیے نہیں میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم نے مجھے سخت دھوکا دیا ہے انتقام کا خبث مجھے شیطان مجسم بنا دیتا ہے یعنی یوں سمجھو کہ میں اپنی صد پر اڑا ہوا ہوں۔

آنٹریلیک میں کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیادہ غصہ دلایا تو میں کوئی ایسا کام کر بیٹھوں گی کہ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔

باربوئیے کیا کر بیٹھو گی، میری نعش؟

آنٹریلیک میں اعلان کرتی ہوں، کہ اگر تم نے دروازہ نہ کھولا، تو میں یہیں پر اپنا خون کر ڈالوں گی۔ میرے والدین ضرور ہم دونوں کو دیکھنے آئیں گے، اور مجھے مردہ پائیں گے۔ پھر تمہیں پھانسی دیدی جائے گی۔

باربوئیے ہا! ہا! ہا! نابکار عورت! میرا کیا بگڑے گا؟ تم اتنی بے وقوف نہیں کہ ایسا کرو گی۔

آنٹریلیک تمہیں یقین نہیں آتا۔ دیکھو میرے پاس ایک چھری ہے۔ اگر تم نے دروازہ نہ کھولا، تو میں ٹھیک دل کے سامنے چھری بھونک لوں گی

باربوئیے ذرا ہوشیاری سے۔ چھری بہت تیز ہے

آنٹریلیک دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئیے میں تم سے بیسیوں دفعہ کہہ چکا کہ دروازہ ہرگز نہ کھولوں گا۔ خود کشی کرو، مرجاؤ، جہنم میں جاؤ۔ مجھے کچھ بھی پروا نہیں۔

آنٹریلیک (بہ ظاہر چھری بھونک لینا چاہتی ہے) اچھا تو الوداع ..... آہ! میں مرگئی۔

باربوئیے وہ ایسی بے وقوف تو نہیں کہ سچ مچ چھری بھونک لے؟ میں روشنی لے کر نیچے جاؤں گا اور اسے دیکھوں گا۔

آنٹریلیک (اپنے آپ سے) میں تم سے ضرور بدلا لوں گی مجھے ڈھونڈتے رہو۔ اگر اس عرصے میں میں مکان کے اندر پہنچ گئی، تو پھر میری باری آئے گی۔

(وہ باربوئیے کی نظر بچا کر مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

باربوئیے۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے وقوف نہیں۔ وہ مر کر بھی یا کوئے کے گھوڑے کی طرح دوڑتی ہے

مہ "ولیمن اور آرمن" کے مترجم افسانے میں ایک لڑکی کے گھوڑے کو ذکر ہے جو بہت تیز دوڑ سکتا تھا۔ اس کی تیز رفتار مغرب ضرب المثل ہوگئی ہے مترجم

دوڑتی ہے۔ میں تو ڈر گیا تھا۔ اس نے اچھا کیا کہ بھاگ گئی۔ کیونکہ مگر میں آپا تا تو جوتوں سے خبر لیتا اب بھجے سور سنا چاہیئے۔ اچھا! ہوا سے دروازہ بند ہو گیا کا تو! کا تو! دروازہ کھولو۔

آنٹر لیک (دریچے کے سامنے) "کا تو" کا تو! کا تو کو ہوا کیا ہے؟ اور تم اس طرح نشے میں چور اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟ ابھی میرے والدین یہاں پہنچیں گے اور تمہاری حالت سے واقف ہو جائیں گے۔ فوراً کپڑے پہنے نالائق انسان تم دن رات شراب خانے میں پڑے رہتے ہو اور اپنی بی بی کو گھر پر چھوڑ دیتے ہو کر بچوں کے ساتھ دن بھر تمہارا انتظار کرے۔

باربوئیے دروازہ جلدی کھول شیطان کی خالہ! ورنہ تیرا سر پھوڑ دوں گا۔

بارہواں منظر

(گورژیو، ولیبرکین، آنٹر لیک، لے باربوئیے)

گورژیو کیوں؟ کیا ہے؟ اب تک لڑ رہے ہو؟

ولیبرکین تم کبھی مل جل کر نہ رہو گے؟

آنٹر لیک ذرا دیکھو تو سہی۔ وہ شراب پی کر آیا ہے اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔

گورژیو وہ سچ کہہ رہی ہے۔ رات کو نہیں دریک گھر سے باہر نہ رہنا چاہیئے۔ بتیں لازم ہے کہ سویرے گھر واپس آکر اپنی بی بی کے ساتھ پر امن زندگی بسر کرو

باربوئیے اگر میں نے گھر سے باہر قدم رکھا ہو تو میرا ستیاناس ہو سامنے والے کوٹھے پر لوگ ہیں ان سے پوچھ لیجئے۔ وہ تو خود ابھی گھر واپس آئی ہے۔ اف! بے گناہوں پر ہمیشہ ظلم ہوا کرتا ہے۔

گورژیو اب غصہ تھوک دو اور آپس میں میل کر لو۔ تم اپنی بی بی سے معافی مانگو۔

باربوئیے میں اس سے معافی مانگوں! اس کو شیطان لے بھاگ تو بہتر ہوتا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہا ہوں ہائے اللہ اب کیا کروں؟

گورژیو بیٹی اب اپنے شوہر کا بوسہ لو اور رنجش کی باتیں بھول جاؤ۔

تیرہواں منظر:- ڈاکٹر (رات کا لباس پہنے ایک دریچے کے سامنے)

ڈاکٹر پھر وہی سنگامہ، شور و غوغا، چھاؤ، دھماؤ، ہوائی طوفان بے تمیزی؟ ایک لحظہ بھی چین نصیب نہیں۔

ولیبرکین کہیئے ڈاکٹر صاحب۔ اب یہاں میں اتفاق ہو گیا۔

ڈاکٹر کیا اتفاق کے متعلق ارسطو کی کتاب کا ایک باب پڑھ کر تمہیں سناؤں؟ اس نے ثابت کیا ہے کہ کائنات کے مختلف حصے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ہی قائم ہیں۔

ولیبرکین یہ باب بہت طویل ہے کیا؟

ڈاکٹر بہت طویل تو نہیں ہے۔ کل ۱۰، ۱۱ صفحات کا مضمون ہے۔

ولیبرکین شکریہ! اب یہیں جانا چاہیئے۔ خدا حافظ!

گورژیو ہاں اب اس وقت رہنے دیجیے۔

ڈاکٹر آپ ارسطو کا مضمون سننا چاہتے ہیں؟

گورژیو نہیں۔

ڈاکٹر جب آپ کی یہی مرضی ہے تو الوداع۔

ولیبرکین چلو اب گھر چل کر کھانا کھائیں۔

(پردہ)

مقالات

(۱) میر تقی میر از ق ع د (۲) حاتم کا سال وفات از ق ع د

میر تقی میر

از ق ع د

میر صاحب کب لکھنؤ گئے، اس سوال کا جواب تذکرہ نگاروں نے مختلف طور پر دیا ہے، میرزا علی لطف اور ہاروں صدی کے اواخر میں لکھنؤ میں مقیم تھے اور جن کی آصف الدولہ کے دربار میں رسائی تھی، لکھتے ہیں کہ میر صاحب میرزا سودا کی موت کے بعد لکھنؤ پہنچے، آزاد کا بیان ہے کہ ۱۱۹۰ھ میں دہلی جانا ہوا، ذکر میر کے فاضل مرتب نے میرزا علی لطف کے قول کو آزاد کے بیان پر ترجیح دی ہے، تذکروں کی ورق گردانی سے بہت ممکن ہے کہ مزید اختلاف کا پتا چلے، لیکن چونکہ ہم اس سوال کا جواب خود میر صاحب کی زبان سے دینا چاہتے ہیں تذکروں کے اختلافات کو دکھانے کی چنداں ضرورت نہیں،

ذکر میر میں میر صاحب نے لکھنؤ جانے کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے مگر میر صاحب کی عادت ہے کہ بات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو اس کا سال و تاریخ درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ لکھنؤ جانے کا سن بھی انہوں نے نہیں بتایا، لیکن ذکر میر میں میر صاحب نے صرف اپنے ذاتی حالات ہی نہیں بیان کیے ہیں بلکہ اپنے زمانے کے تاریخی واقعات بھی لکھے ہیں اور دہلی سے روانگی کے قبل و بعد کے واقعات جو اس کتاب میں موجود ہیں ان کا زمانۂ وقوع عہد شاہ عالم کے مؤرخین سے معلوم ہو سکتا ہے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد میر صاحب کے دہلی چھوڑنے اور لکھنؤ جانے کا زمانہ بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

میر صاحب (ذکر میر ص ۱۳۰) امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خان بہادر کے متعلق لکھتے ہیں:- "باستعمال منہیات و تماشائے زنان چنان پرداخت کہ قوت از بدن زائل شد آخر بہ مرض سل گرفتار شد، الحق کوشش بسیار در علاج او بکار بردند اما فائدہ مترتب نہ شد، چوں مایوس شدند بہ حسرت می گفت کہ من ہیچ ندی خواہم جز ایں قدر کہ زندہ بمانم، در بیماری او زمانہ رنگ دیگر گرفت"

اپنے لکھنؤ جانے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:- "فقیر کہ خانہ نشین بود خواست کہ از شہر بدر رود از جہت بے اسبابی حرکت متعذر بود، برائے نگہ داشتن عزت من در خاطر نواب .. آصف الدولہ .. گذاشت کہ میر پیش من بیاید" (ذکر میر ص ۱۳۰ و ۱۳۹) لکھنؤ پہنچ جانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:- "بعد از آمدن من ایں طرف آں جا کہ نجف خاں بر بستر افتادہ بود فوت کرد"۔ (ذکر میر ص ۱۴۰)

اقتباسات بالا سے دو باتیں قطعی طور پر معلوم ہو گئیں، ایک یہ کہ ابھی میر صاحب دہلی ہی میں تھے کہ نجف خان زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور معاملات حکومت میں ابتری پیدا ہو چلی تھی، دوسرے یہ کہ ان کا انتقال میر صاحب کے لکھنؤ پہنچ جانے کے بعد ہوا، اب ہمیں تاریخ کی مدد سے یہ معلوم کرنا ہے کہ نجف خان کی بیماری نے خطرناک صورت کب اختیار کی اور ان کی موت کب واقع ہوئی، میر صاحب کے

دہلی چھوڑنے کا زمانہ خود بخود معلوم ہو جائیگا۔

شالاں اور خیر الدین محمد الہ آبادی کی کتابوں سے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں :-

" ۱۶ر محرم، روز سہ شنبہ کو بادشاہ، سیر باغ مقبرہ صفدر جنگ کے لیے تشریف لے گئے، امیر الامرا باوجود اس کے کہ انہیں خفیف تپ تھی، ہمراہ رکاب تھے، بادشاہ نے کہا بھی کہ احتیاط لازم ہے، گھر جا کر آرام کر، لیکن اس پر بھی تین دن حاضر خدمت رہے، جب طبیعت پر ماندگی کا بہت اثر ہوا، رخصت ہوئے "[۵]

" از دوم[۵] ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ از حویلی قمر الدین خان در حویلی صفدر جنگ آورد، لیکن مرض روز بروز تزاید بود، شالاں اور خیر الدین محمد دونوں متفق ہیں کہ نجف خان نے ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ کو انتقال کیا، ۱۶ محرم تک نجف خان کا بادشاہی کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے میر صاحب نے غالباً اس کے کچھ ہفتے بعد دہلی چھوڑی اور ۲۲ ربیع الثانی سے قبل لکھنؤ پہنچ گئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لکھنؤ میں میر و سودا کی یکجائی کی جو روایتیں ہیں وہ محض مصنوعی ہیں۔

میر صاحب کے سال وفات کا عام طور پر علم ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس دن کس مہینے کس تاریخ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس اطلاع کے لیے ہم میر احمد نشتر داماد سید انشا کے ممنون ہیں، ان کے حیات فارسی میں ایک صفحے سے زیادہ کی عبارت ہے جس کے ہر فقرے سے میر کا سال وفات نکلتا ہے، ایک فقرہ جسکی داد انہیں فیتسی سے ملی تھی یہ ہے "سنہ یک ہزار و دو صد و بیست و پنج ہجری"۔ آخر کے دو فقروں سے سن کے علاوہ مہینا، دن، تاریخ سب معلوم ہوتے ہیں، "فقرۂ اول بلجہ فارسی صاف دل آیا ۱۲۲۵، یوم الجمعہ دلست و یکم از مہ شعبان ۱۲۲۵، فقرۂ ثانی بزبان پاکیزہ بیان ہند، ۱۲۲۵ جمعہ کا اچھا روز اور اکیسویں ماہ شعبان کی ۱۲۲۵،

---

[۱] دستہ گلشن ہند طبع دوم ص ۲۰۲ و ص ۲۰۹، ۲۱۰

[۲] آب حیات طبع نہم ص ۲۰۵ آزاد نے میر کے حالات کے لیے گلزار ابراہیم سے مدد لی ہے، لیکن علی ابراہیم یوں لکھتے ہیں، "ہنگام تحریر کہ ۱۱۹۶ھ است تشنیدہ شد کہ در جہان آباد... اقامت دارند" گلزار ابراہیم خلی۔

[۳] مقدمۂ ذکر میر ص ۱۰، فاضل مرتب نے ۱۱۹۶ھ کے لیے گلشن ہند کے ساتھ گلزار ابراہیم کا بھی حوالہ دیا ہے، لیکن گلزار میں میر کے لکھنؤ جانے کے متعلق ایک لفظ نہیں۔

[۴] اصل عبارت فارسی ہے۔

[۵] عبرت نامہ جلد دوم خلی کتابیں سب کتب خانۂ خدا بخش خان مرحوم کی ہیں۔

سال وفات حاتم

از ق۔ ع۔

شاہ حاتم کے سال وفات کے متعلق حسب ذیل اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں:

(۱) آب حیات آزاد طبع نہم ص ۱۱۹ "۹۶ برس کی عمر پاکر ماہ رمضان ۱۲۰۰ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔۔ مگر مصحفی نے تذکرۂ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے اور ۹۵ برس کی عمر پائی"

(۲) تذکرۂ ہندی مصحفی ص ۸۱ "عمر شریف بہ صد رسیدہ بود و سال بہت کہ در شاہ جہان آباد وبعیت حیات سپرد"

(۳) عقد ثریا مصحفی ص ۲۳ و ۲۴ "بقولش تاریخ تولدش صرف ظہور باشد ... ہشتاد و سہ سال عمر دادہ۔۔ در یک ہزار و یک صد و ہفت در ماہ رمضان رحلت کردہ۔ (قطعۂ تاریخ وفات کے آخری دو شعر یہ ہیں):

سال تاریخ از خرد جستم بہ ناگہ ایں مصرعہ بر گوشم خورد بہ کہ بگو مصحفی چو پرسیدت بہ آہ صد حیف شاہ حاتم مرد

(۴) تاریخ شعرائے اردو مولفہ فیلن و کریم الدین ص ۱۳۳ "۔۔ در میان ۱۲۰۰ھ و ۱۲۰۱ھ دہلی میں فوت ہوا"

(۵) تذکرۂ بیجگر قلمی دفتر ہند لندن فارسی عبارت کا ترجمہ "سو سال کے قریب عمر پائی، ۱۲۱۰ھ میں مرے رنگین نے تاریخ کہی: ؎

نہیں کہنے میں کچھ آتا ہے افسوس — جہاں سے اُٹھ گیا اُستاد حاتم — مرے تن میں رہیگی جان جب تک
نہیں ہونے کا دل سے دور یہ غم — گیا دنیائے فانی سے یکایک — جسے استاد کہتا تھا اک عالم
تمامی ہند میں اس سال یارو — ہوا مرنے کا اس کے سخت ماتم — لحد پر اس کی سب شاگرد مل کر
ہوے جب فکر میں تاریخ کی ہم — کہا ہاتف نے رنگیں رنجہ کی — میاں حاتم سے تھی بنیاد محکم

میں نے "آہ حاتم برفت از دنیا" سے تاریخ نکالی، لیکن لالہ کنور سنگھ فارغ بریلوی کے دیوان میں جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ایک قطعہ ملا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کی وفات ۱۱۹۶ھ میں ہوئی:

فارغ چو پے جستجوئے تاریخ بہ گشتم بہ تلاش و فکر ہمدم بہ بانالۂ آہ ہاتف از غیب بہ گفتا زجہاں برفت حاتم

۱۱۹۶ھ: آزاد نے محض سہو سے ۱۱۹۶ لکھ دیا ہے مصحفی کے تذکرۂ فارسی عقد ثریا کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں دونوں میں ۱۱۹۷ھ ہے، اور قطعۂ تاریخ کے مصرع آخر سے بھی یہی نکلتا ہے۔

۱۲۰۰ھ: کریم الدین نے سال وفات ۱۷۹۱ء لکھا ہے جو ۱۲۰۶ھ کے مطابق پڑتا ہے۔ ۱۲۰۰ھ کی سنہ چونکہ کہیں اور نہیں ملتی، خیال ہوتا ہے کہ آزاد نے اسے تذکرۂ کریم ہی سے لیا ہے، لیکن حساب کرنے میں ایک سال کی غلطی ہوگئی۔ آزاد نے کریم کا حوالہ نہیں دیا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں آزاد نے بکثرت ایسا کیا ہے۔

۱۷۹۱ء مطابق ۱۲۰۶ھ؛ تذکرۂ کریم بڑی حد تک دتاسی کی تاریخ (۱۸۰۱ء) ماخوذ ہے اور یہیں یقین ہے کہ کریم نے حاتم کا سال وفات اسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ دتاسی کا ماخذ تذکرۂ ہندی مصحفی ہے، جس میں لکھا ہے "سہ سال بہت کہ ... دولت حیات سپرد" اور دتاسی کی شرح دتاسی بھی تذکرۂ ہندی کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پورا تذکرہ ایک ہی سال (۱۲۰۹ھ) میں لکھا گیا ہے، حالانکہ اس تذکرے کا آغاز ۱۲۰۰ھ میں ہوا[۵۱] اور سال تکمیل ۱۲۰۹ھ ہے۔[۵۲] مصحفی نے حاتم کا حال ۱۲۰۰ھ میں لکھا، اس حساب سے سال وفات ۱۱۹۷ھ ٹھہرتا ہے اور عقد ثریا اور تذکرۂ ہندی کے بیانات کا ظاہری اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

۱۲۱۰ھ: رنگین کے قطعۂ تاریخ کی بہت آخر سے سال تاریخ نکالنے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہاتف کا پورا قول "سخنہ" کی بیان حاتم سے بھی بنیاد محکم "بغیر نقطہ و تخریجہ مادۂ تاریخ قرار دیا جائے، اس صورت میں ۲۴۰۰ سے زائد نکلتا ہے اور یہ صریحاً غلط ہے؛ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف لفظ "سخنہ" کے اعداد لیے جائیں اور اس کی بنیاد یعنی "کا" کا عدد اس سے خارج کر دیا جائے، اس صورت میں ۱۲۱۰ برآمد ہوتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ صرف مصرع آخر کے اعداد شمار کیے جائیں۔ اس سے بھی ۱۲۱۰ ہی نکلتا ہے۔ دیوان رنگین مدت ہوئی ہماری نظر سے گزرا تھا، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعہ دیوان میں ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس عدد تک صحیح نقل ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جگر سے اس کے نقل کرنے میں غلطی ضرور ہوئی ہے اور اس بنا پر ہم ۱۲۱۰ھ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

۱۱۹۷ھ: اس کی تین سندیں ہیں: عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور قطعۂ تاریخ مصحفی ۱۱۹۰ھ میں لکھے گئے ہیں، ۱۱۹۷ھ میں دہلی ہی میں موجود تھے، حاتم سے ان کے تعلقات خصوصیت مندانہ تھے، مصحفی کا سال وفات میں غلطی کرنا بالکل خلاف قیاس ہے۔ فارغ بھی حاتم کے شاگرد تھے، اور اس معاملے میں ان کی شہادت بھی کافی وزن رکھتی ہے۔ رہا رنگین کا قطعۂ تاریخ، اگر وہ صحیح بھی نقل ہوا ہو تو مصحفی اور فارغ کی شہادتوں پر رنگین کی شہادت کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اور جب تک رنگین کی تصدیق اور ذرائع سے نہ ہو، ۱۱۹۷ھ ہی کو حاتم کا صحیح سال وفات سمجھنا چاہیے۔

---

۵۱ مصحفی نے لکھا ہے کہ بشتاد و سہ سال عمر دارد (جو ۷۳ سال عمر پائی) سے مختلف ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقد ثریا کی سال کی عمر میں لکھا گیا ہے، مصحفی نے حاتم کا حال ان کی وفات کے قبل تحریر کیا تھا۔ تذکرے کی تکمیل سے پہلے ہی حاتم مر گئے تو مصحفی نے ان کی موت کا حال بڑھا دیا، لیکن اوپر جو کچھ لکھ چکے تھے اسے بدلے عالم رہنے دیا۔

۵۲ جو کچھ لکھا ہے اپنی یاد سے لکھا ہے، اس وقت تاریخ اور سب کی طرف رجوع مشکل ہے۔

۵۳ تذکرۂ ہندی تذکرۂ فارسی کی تکمیل کے بعد شروع ہوا، تذکرہ ہندی ص ۳، تذکرہ فارسی کا سال تکمیل (۱۱۹۹ھ ہی) اس کے بعد بھی اضافے ہوئے ہیں) اس لیے تذکرۂ ہندی کا سال آغاز ۱۲۰۰ھ ہونا چاہیے۔ اس امر کا قطعی ثبوت کہ ۱۲۰۰ھ میں اس تذکرے کی ابتدا ہو چکی تھی یہ ہے کہ مصحفی در ذکر متعلق بحرکی وفات ۱۱۹۹ھ میں کہتے ہیں "یک سال بہت کہ در ہمبولیشن شفایا فتہ ص ۹۳ ۔

صوبہ بہار

ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد

ماخوذ از مراۃ الاحوال مصنفہ آقا بہبہانی
از جناب یوسف الدین احمد بلخی، پاٹن

۸ ذی قعدہ سنہ مذکور (یعنی ۱۲۱۵ھ) میں ہم لوگ عظیم آباد پہنچے، چند دوستوں نے استقبال کیا۔ میرزا غلام حسین خاں کے بھائی امیر علی خاں کی شناسائی ہوئی۔ اجاجا و لال (راؤ لی خاص نواب آصف الدولہ) کی بیٹی سے ہوئی تھی اس تقریب میں ان کے ہمشیرزادے بھی یہاں آئے ہوئے تھے، ان کی خواہش سے میں یہاں ٹھہر گیا۔ یہ صوبۂ بہار کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کا نام پٹنہ ہے ... عظیم الشان نے اپنے نام پر ایک شہر بسانا چاہا تھا، اخراج کا اندازہ ایک کروڑ سے زیادہ ہوا، بادشاہ نے عظیم الشان کے نام پر عظیم آباد نام رکھا، یہ شہر آباد ہوا تو اصل بہار ویران ہو کر محض ایک دیہات ہو گیا۔ عظیم آباد اب تک پٹنہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر فقیر پرور اور بہت پر لطف ہے، یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اور ہر قسم کے کپڑوں اور کھانے کی چیزوں کی اس قدر افراط ہے کہ لوگ یہاں سے باہر لے جاتے ہیں۔ بنگالے بلکہ ہندوستان میں اس جامعیت کے شہر کم ہیں۔ اسے جنت الہند اگر کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کا طول ڈیڑھ فرسنگ کے قریب ہے اور عرض نصف فرسنگ کے قریب واقع ہے جس کی لطافت دہلی شیریں مشہور ہے۔ یہاں بڑی بڑی عمارتیں اور پرشکوہ بازار بہ کثرت ہیں۔ دریا کے کنارے مسجد اور مدرسے کی عالی شان عمارت ہے جسے زمانۂ سابق میں نواب سیف خاں بہادر نے جو قدیم شاہی حکام سے تھے بنوایا تھا۔ اس کے غربی کنارے پر چند مکانات بھی تھے عمارات ابھی تک مضبوط و مستحکم ہیں اگرچہ کچھ کچھ خرابی کے آثار مرمت نہ ہونے کی وجہ سے نظر آنے لگے ہیں، تاریخ بنائے قاعدۂ جمل اس آیت سے نکلتی ہے "ان الساجدات فلله جوامع الله" [۵۳]

آج کل سراج الدولہ شہید کی لاولد ختری میں سے بعض نامسیاہ مُتمال نے اراضی وقف کے ایک حصے پر قبضہ کر کے مکان بنا لیا ہے، اور سوسنیں کو اتنی قدرت نہیں کہ مخالفت کر سکیں۔ المختصر ہیں چند روز اس شہر میں رہا، یہاں کے اعزہ اور اعیان، مقدسین و مومنین ملاقات کے لیے آتے رہے اور مسائل شرعی کی تحقیق کرتے ہیں نے عظیم آباد کو اس معاملے

---

[۵۳] یہ سن ایک نسخے میں ہے، دوسرے میں نہیں، لیکن دونوں نسخوں میں اس سے قبل جو ٹکڑا ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں عظیم آباد آئے۔ [۵۴] اصل عبارت فارسی "سب الواہش اولاد ہمشیرہ جناب مرزا غلام حسین خاں سابق الذکر کہ بہ تقریب دولت مالی شان امیر علی خاں، برادر خود، با صبیہ راؤ لی خاص نواب آصف الدولہ بہادر مشہور بہ اجاجا و لال بہ ایالہ و نقہ بودند، منزل کردم"۔ [۵۵] شنبہ ۸ لکھتا ہے۔

میں بنگالے کے کل شہروں علی الخصوص دارالشرب مرشد آباد سے ممتاز پایا۔ خانہ ان تو لباش کے کچھ افراد بھی اس شہر میں آسودگی کے ساتھ سکونت پزیر ہیں۔ ازاں جملہ عالی جاہ ... عمدۂ امرائے عظام، نواب .. مقرب السلطانی مبارز الملک امیر الدولہ خان خانان عباس قلی خاں بہادر، نصرت جنگ، دام اقبالہٗ خلف ... نواب .. میر الملک، میر الدولہ رضا قلی خاں بہادر، نادر جنگ خراسانی، کہ زندہ فیل احمد جام کی اولاد سے ہیں۔ جیسا کہ میں نے سُنا ہے ان کے آباء اجداد سلاطین صفویہ کے امرا میں تھے، اور نواب میر الدولہ مرحوم خود شاہ طہماسپ کے دربار میں کسی عہدے پر تھے۔ طہماسپ کے زوال کے بعد کچھ دنوں حق نمک کا خیال کر کے گوشہ نشین رہے۔ نادر شاہ کو جب ان کی عقل اور ذہانت کی خبر ہوئی اس نے انھیں بلا کر اپنے امیروں کی جماعت میں داخل کیا، اور کچھ عرصے کے بعد سفیر بنا کر محمد شاہ کے پاس بھیجا۔ اُس وقت سے ہندوستان میں بھی سلاطین بابریہ کے یہاں معزز و محترم رہے۔ شاہ عالم ان کی بڑی عزت و حرمت کرتے تھے۔ میر الدولہ اس کے دربار کے مشہور امیروں میں تھے اور آخر تک اسی کے وکیل مطلق تھے۔ نواب (یعنی عباس قلی خاں)، وشن ضمیر، بلند ہمت، عالی مرتبت، نیک خصلت، باوقار، دیندار، نجبتہ کردار، صاحب ذوق سلیم و طبع مستقیم ہیں۔ علوم درسیہ سے بھی ناواقف نہیں اور ان کی تحصیل کے بہت شائق ہیں۔ مجھ سے محبت فرماتے ہیں، وہ برادری کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے، ملاقات کو برابر آتے اور اپنی پُرلطف صحبت سے میرے دل حزیں کو مسرور کرتے تھے۔ ان کی اولاد بھی صاحب کمال، نجات کی طالب اور ابنائے جنس سے ممتاز ہے۔

..... عالی جناب ... سید کاظم علی خاں بہادر خلف ارشد ... غفراں مآب نواب فخر الدولہ سید تقی علی خاں بہادر ظفر جنگ خلف مرحوم بخشی الممالک نصیر الدولہ سید ہدایت علی خان بہادر اسد جنگ ابن سید علیم اللہ ابن سید فیض اللہ طباطبائی ان کی عالی خانوادگی مشہور ہے اور بیان کی محتاج نہیں وہ ایک عالی مرتبہ بزرگ اور خوش گفتار سید ہیں ان کے مزاج میں انکسار، تواضع، اور بے نفسی بہت ہے، اور انھیں علما و اہل کمال کی صحبت کا شوق حد سے زیادہ ہے۔ آداب دوستی و محبت کے برتنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی بہت آرام اور عافیت سے گزرتی ہے۔ اور مجھ سے بے حد محبت ہے۔ اکثر اوقات اپنے رشتہ داروں اور متوسلین کے ساتھ ملاقات کو آتے اور میری طبیعت کو مسرور فرماتے ان کی والدہ ماجدہ نواب اسمٰعیل قلی خاں بہادر کی بیٹی ہیں جو مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کے بھائی حاجی احمد کی منجھلی بیٹی منجھلی خانم کے بطن سے ہیں۔

نژاد از دو کس دارد ایں نیک پے ✤ ز بہرام گور و ز کاؤس کے

ان کے چچا مرحوم مغفور سید غلام حسین خاں مصنف سیر المتاخرین۔ اور مرزا غلام حسین خلف حاجی اسمٰعیل مرحوم بن آقا علاء الدین محمد (جن کا ذکر ملا محمد صالح ماثر نوائی کے حالات میں ہو چکا ہے) ان کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ ان کے اجداد میں میر فیض اللہ قدس سرہ نہایت مقدس اور صالح تھے۔ اور مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے

اس شہر میں میر محمد مومن خلف میر محمد یوسف بہبہانی سادات طباطبائی سے ہیں اور مدت دراز گزری کہ دارالامان ایران سے آکر اس ملک میں مقیم ہیں۔ اب سے پہلے کچھ سامان معاش تھا مگر اب مفلس ہو گئے ہیں اور افلاس اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی کئی اولادیں ہیں۔

اسی شہر میں عالی حضرت ..... آقا سید زین العابدین کل کلاب خلف حاجی محمد ناصر قزوینی ہیں۔ جو ایک خوش خلق مہذب اور خوش صحبت جوان ہیں۔ مجھ سے انھیں بہت انس تھا اور حاجتمندوں کی خدمت میں وہ کبھی کمی نہ کرتے حقیقت میں ان کا وجود دینی کاموں کی انجام دہی میں بہت مغتنم ہے جن دوستوں سے فیض آباد سے واپسی پر ملاقات ہوئی ان کا نام اس کے بعد لکھا جائیگا۔

مختصر یہ کہ چند روز کے بعد فیض آباد کی جانب روانہ ہوا۔ داناپور میں جو عظیم آباد سے تقریباً تین فرسنگ ہے آدھی رات کو میں اور میرے تمام ہمسفر سوئے ہوئے تھے کہ راہزنوں کی ایک جماعت کشتی پر چڑھ آئی۔ ہوشیار ہونے کے بعد ہم لوگوں نے مقابلہ کیا مگر ان کی جماعت زیادہ تھی ہم لوگ مقابلہ نہ کر سکے وہ لوگ کشتی پر آگئے اور کئی آدمی ننگی تلواریں لیے میرے اور میرے ناظر آقا محمد حسن خزانی کے سر پر کھڑے ہو گئے۔ ہم لوگوں کو قتل کا خوف ہوا ہزنوں نے تمام سامان لوٹ لیا اور بدن کے کپڑوں اور کتابوں کے سوا کوئی چیز نہ چھوڑی۔ اس کے علاوہ آقا محمد کا شراب مانگتے تھے۔ مگر کتابوں کو دیکھ کر آپس میں بولے کہ یہ سب شراب ہی ہیں۔ کتابوں کی برکت سے اس خطرے سے نجات ملی۔ ان لوگوں نے کشتی کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید روپے کی قسم کوئی چیز چھپی ہوئی ہو۔ اور آقا محمد حسن کے سوا تمام ملازموں کو ننگا کر دیا۔ صبح ہونے کو تقریباً آدھ گھنٹا باقی تھا کہ ان لوگوں نے اپنی راہ لی۔ صبح کو عازم عظیم آباد ہوا، دوستوں میں سب سے پہلے منشی رام چند نامی ایک ہندو کو اطلاع ہوئی انھیں بہت افسوس اور صدمہ ہوا۔ میرے چند روزہ قیام کے دوران میں یہ صاحب مجھ سے اخلاق ناصری پڑھتے تھے اور اپنی جماعت میں نہایت ہوشیار اور نیک سیرت تھے۔ ان کے بعد دوسرے دوست بھی پہنچے۔ میں نے سید کاظم علی خاں بہادر موصوف کے مکان میں جو دریا کے کنارے واقع ہے قیام کیا۔ خدا کے فضل اور دوستوں کی مدد سے تمام سامان پہلے سے بہتر مہیا ہو گیا۔

عالم ادب

(۱) **مرقد غالب**، خواجہ حسن نظامی صاحب اپریل کے ہمایوں میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غالب کا مزار درگاہ حضرت نظام الدین کے قریب لب سڑک (کذا) واقع ہے، مزار کے پاس یعنی جنوب میں اکبر کوکا... مرزا عزیز... کا مقبرہ ہے.... مزار کے غرب میں قبر ہے نواب بیگم صاحبہ حکیم احمد اصل خاں مرحوم کے مکان کی دیوار ہے، اور شرق میں نواب لوہارو کے خاندان کی کچھ قبریں ہیں۔ پھر ایک دیوار ہے، پھر تین سو گز کا ایک قطعہ زمین ہے جس کو حکیم محمد وصاحب نے غالب ہال بنانے کے لیے خریدا ہے۔ اور شمال میں ایک دیوار ہے، اور اس کے باہر شکستہ قبرستان ہے، جس کے وارث اب موجود نہیں۔ غالب سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ شمالی دیوار کو بنا کر شکستہ قبرستان درست کر دیا جائے، اور شمال کی طرف سڑک کے پاس ایک شاندار دروازہ بنا دیا جائے، اور جتنی زمین مرحوم بیگم صاحبہ.. نے مزار کے غرب میں عطا فرمائی تھی اس کو شامل کر کے غالب کا مزار اتنا اونچا بنا دیا جائے جو سڑک سے نظر آنے لگے، اور شرق میں غالب ہال بنا دیا جائے تاکہ آئندہ جیسے اور مشاہیر مزار کے قریب ہی ہو سکیں۔ غالب کا مزار نواب صاحب لوہارو کے قبرستان میں ہے، اس لیے قبرستان کے وارث غالب کا مزار بنانے میں مزاحمت کرتے ہیں۔ لہٰذا تجویز کی گئی ہے کہ.. صرف غالب کی قبر کو بنا دیا جائے لوہارو والوں کو اگر اپنے بزرگوں کی قبروں کا خیال ہوگا تو خود بنوا لیں گے...

(۲) **مرقد ذوق**، خواجہ صاحب کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذوق کی قبر حکیم عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی نے بنوا کر چار دیواری درست کرا دی ہے۔ اور ایک تختی لوح لگا دی ہے۔

(۳) **ابوبکر محمد شیث فاروقی** صاحب۔ ناظم دینیات کو مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک قلمی کتاب **ہشت کشت** دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت ۱۰۰ صفحات تقطیع ۹ × ۵ پ ہے ہر صفحہ پر بارہ یا تیرہ سطریں ہیں تیمور شاہ حقیقت نے امیر خسرو کی ہشت بہشت کا نثر فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ولیم ہیل مارٹن صاحب کی فرمائش سے غلام احمد نے کلکتے میں اردو ترجمہ اور نشر میں کیا ہو کتاب کا سال تالیف ۱۲۱۰ھ فصل ہے باغ و بہار سے سابق لکھی ہے۔ فاروقی صاحب اس کو طبع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (رسالہ نامہ سہیل)

(۴) **سید نذیر حسن** کرمی صاحب پروفیسر فارسی کالج خالی بیاض ہیں (جس میں انھوں نے **ہمایوں بادشاہ کا دیوان** جو ہندوستان کا ہے۔ یہ دیوان عرصے سے مفقود تھا۔ حافظ شمس الدین صاحب پروفیسر چیف کالج اس دیوان کے متعلق ایک مضمون معیار کے لیے لکھ رہے ہیں۔

(۵) **ایشیاٹک سوسائٹی** کلکتہ میں مدینے سے ایک قدیم کتاب آئی ہے جو ۲۰۰ قبل کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا **نام خریدۃ القصر** ہے اور اس میں عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور سقلیہ کے شعرا کے کلام کا

انتخاب دیا ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف بارھویں صدی عیسوی ہے، اور مصنف عماد الدین کاتب اصفہانی۔ عماد الدین ۱۱۲۵ء میں بہ مقام اصفہان پیدا ہوا، اور بغداد میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سلطان نور الدین اور سلطان صلاح الدین اس کے سرپرستوں میں تھے۔ ۱۲۰۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

(۶) ڈاکٹر ابو العلم محمد نظام الدین نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کے صدر کی حیثیت سے جو خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھا تھا، اس کا اردو ترجمہ رہبر دکن میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس کے عنوانات درج ہیں، جس سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ اس خطبے میں کون کون سے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ آخر میں ہم بعض حصے جو ہمارے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں، نقل کریں گے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی اشاعت و وسعت، مشرقی قریبہ اور مشرقی ممالک میں عربی اور فارسی کی تحصیل، زبان عربی کا جدید مرکز مصر، مشرقی ممالک میں فارسی زبان کا مرتبہ، فارسی زبان کا ارتقا، افغانستان اور زبان فارسی، ہندوستان میں علمی تحقیقات کی نوعیت و مقصد، قدیم مسالک، فرائض محقق، چند تحقیقی تصانیف، ہندوستان کے ممتاز علمی ادارے، صوبۂ پنجاب کی ادبی و علمی خدمات سر محمد اقبال، ادارہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، دیگر جامعات، شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ، دار المصنفین اعظم گڑھ، حیدرآباد جدید کی علمی فضا، علوم اسلامی کی ترویج، معجم المصنفین، مدرسہ نظامیہ، اسلامک کلچر، دیگر علمی و ادبی خدمات مجلس مخطوطات فارسیہ، فرہنگ نظام، اردو لغت، محکمۂ آثار قدیمۂ سرکار عالی، (اسکے بعد جامعۂ عثمانیہ اور اردو کا ذکر ہے)" مغربی خیالات کے" تاثر اور مصریوں کی قوت اخذ کی صلاحیت نے مصر میں ایک ادبی احیا... کی صورت اختیار کی ہے۔ اور عربی میں شعر کا ایک جدید دور۔ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ جیسے مصلحین اعظم، سعد زاغلول سے نجات دہندہ مصر، احمد زکی پاشا جیسے عربی ادیب، جرجی زیدان جیسے ادیب و فسانہ نگار و جریدہ نویس، احمد امین، علی عبد الرزاق، طہ حسین جیسے علم بردار ان حریت، رشید رضا منفلوطی، خلیل مطران، فریدہ وجدی، اور امین ریحانی جیسے ادیب اور رشید المیان علم کی سرپرستی میں شروع ہوا، نظم بھی ترقی سے کچھ محروم نہیں رہی۔ شوقی اور حافظ ابراہیم کے دبستان نظم مغربی اثر کے مقابلہ میں اپنے مورچے پر قائم ہیں،

ادبیات عالیہ کی اشاعت، جدید ادبیات کی ترویج مصری اخباری دنیا کی سرگرمی ملاً تمام عربی دنیا پر قبضہ جمائے ہے لیکن اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض اعتبارات سے کمیت کو کیفیت پر ترجیح دی جاتی رہی ہے یورپی ممالک میں جس قسم کی اعلیٰ پایہ علمی تحقیقات ہوتی ہیں وہ شاذ و نادر ہی جدید عربی میں نظر آتی ہیں۔ اور حیثیت سے قاہرہ کی چہل پہل کسی دوسرے مشرقی و مغربی تمدنی، مرکز سے کم نہیں۔ اخبار، رسالے، تناول یونی تصویریں (ٹائپ از اشتہارات، ڈرامے، تقاریر، سبھی جلسے، فنی مراسلت، خانگی کاروبار سبکے سب عربی زبان میں انجام پاتے ہیں۔ اسی شیخ و مشق و بیروت بھی عربی زبان کے دو بڑے مرکز ہیں عربی زبان کی نشو و نما میں کافی حصہ لے رہے ہیں۔ فرانسیسی اثر کے بعد عربی زبان مشرقی زبانوں میں سے اہم ہیں الا قوامی رتبہ حاصل کر لیا ہے"

فرایض محقق قدیم و جدید مسلک کے حسن و قبح سے قطع نظر اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تحقیق و تدقیق فی نفسہ صحیح تفحص و تجسس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت کا انکشاف صرف اسی طرح ممکن ہے محقق کا فرض عین ہے کہ وہ اپنے ذاتی خیالات و میلانات سے علیحدہ ہو کر صرف اسی مواد پر انحصار کرے جو اس کے پیش نظر ہو اور قیاسات سے کام نہ لے۔ اسے اپنی تحقیقات کو اس مقام سے شروع کرنا ہے جس نقطے پر اس کے پیش رو نے انتہا کی تھی۔ اس کے ہاں اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ سب سے پہلے موضوع زیر بحث کے متعلق جس قدر مواد موجود ہو اس پر اسے عبور حاصل کرنا لازمی ہے، پھر واقعات کا تجزیہ کر کے ایک مستحکم بنیاد پر اپنے نظریے کو قائم کرنا اس کا فرض ہے معلومات انسانی میں ایک مستقل اضافہ کرنا مقصود ہے، ایسا جو اخلاف کی رہنمائی کا موجب ہو، اس کے نظریے مرور زمانہ سے باطل نہ ہو سکیں تجسس و تدقیق کا یہی ایک صحیح طریقہ ہے اور یہی ایک صحیح عالم و محقق کا مسلک ہونا چاہیے۔ حالات حاضرہ کا لحاظ، نسل و رنگ و مذہب کا امتیاز، ذہنی و مادی ترقیوں کا تفوق، یہ وہ چیزیں ہیں جو کبھی کسی محقق کے نظام عمل کا جزو نہیں بن سکتیں۔

فاضل صدر شعبہ نے مختلف اداروں اور بعض افراد کی علمی خدمات کے متعلق جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:

پنجاب یونی ورسٹی (۱) فہرست المعقد ابن عبد ربہ کی عقد الفرید جیسی اہم کتاب کی تشریحی فہرست (۲) اقلید الخزانہ یعنی عبد القادر بغدادی کی خزانۃ الادب جیسی جامع تصنیف کی تشریحی فہرست۔ (۳) تتمہ صوان الحکمۃ بیہقی۔ تتمہ صوان الحکمۃ کے مصحح نسخے کی اشاعت (۴) زبدۃ التواریخ یا اخبار دولت سلجوقیہ کی تصحیح و تہذیب (۵) امیر خسرو کی زندگی اور کارناموں کا تاریخی مطالعہ (۶) امیر قدرت اللہ کا مجموعہ نغز، حسب ذیل کتابیں مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں، یا آئندہ شائع ہونے والی ہیں۔ مجلس مخطوطات فارسی، نادر امیر خسرو، شائع ہو چکا ہے، برہان المآثر زیر طبع

فرہنگ نظام۔ فرہنگ نظام یا فارسی بان کا جدید لغت بھی ایک اور بڑی مہم ہے جس کی تالیف میں آقای سید محمد علی، اعلی الاسلام صاحب پروفیسر فارسی نظام کالج مصروف ہیں اس وقت تک سرکاری مصرف سے اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ حصہ زیر ترتیب ہے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ: اس ادارے نے مستشرقین کو جیسے مشہور مستشرق فی خطا اپنے لیے محفوظ کر لی ہیں۔ تذکرۃ الاولیاء اسلامی علوم کی اہم اور نادر کتابوں کے ذکر میں اس ادارے کی طرف سے چھپ چکا ہے اور ابرناج لطیع الکتاب، دو سالہ لاکھ عمل حال میں مرتب ہو گیا ہے۔ اسی سے زیادہ مستند تصانیف اس ادارے نے اس وقت تک شائع کی ہیں۔

محمود حسن خاں صاحب عربی زبان میں مصنفین سہ سالہ کا تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ اس وقت تک چار جزو شائع ہوئے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ اور اردو کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

اردو کی تمدنی قیمت اگرچہ ذرائع کا اس جامعہ کے تعلیمی لوازم، ساز و سامان، ماحول اور دیگر ذرائع کو دیکھ کر حیران ہو جانا ممکن ہے۔ لیکن کیا پیرونی محتحن طلبہ کی قابلیت اور صلاحیت کے بہترین حکم نہیں ہوں، انھیں غیر جانب دار طریقہ پر

اردو زبان کی اہمیت اور تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ بعض مصنف متحدہ اپنی پوروپین میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خود ان کے طلبہ کو معاشی میں پر اس قدر قدرت حاصل نہیں اور نہ وہ اظہار مافی الضمیر کے لیے ایسے اسلوب بیان کے حامل ہیں جیسا کہ بعض فرزندان جامعہ کو اردو زبان میں اکتساب کی وجہ سے عبور حاصل ہے۔

ذرائع اکتساب جب جامعات کا اصلی مقصد ترویج علم ہے اور طالب علم سے توقع کی جاتی ہے "ہر گوشہ خرمنے" اور ہر زبان سے استفادہ اور ہر ملک میں تحصیل کی غرض سے جادہ پیمائی کرے تو پھر کیوں ایک جامعہ اور دوسری جامعہ میں ذریعہ تعلیم کی بنیاد پر حدود فاصل قائم کیے جائیں۔ ؟ کوئی زبان خواہ انگریزی ہو یا فرانسیسی یا جرمن یا کوئی اور تنہا زبان علم و حکمت کی اجارہ دار نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال کے پیش نظر جدید جامعات میں پروفیسر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مضمون کے ادب پر زبان کی قید و بند سے آزاد ہو کر عبور حاصل کرے اور اپنے مخصوص موضوع پر خیالات کا اظہار ایسے سہل الفہم طریقے سے اور ایسی زبان کے ذریعے کرے جو طلبہ کی ذہنیت سے بالکل قریب ہو اور تشنگان علم کی سیرابی کر سکے۔ جامعہ عثمانیہ میں اسی اعلیٰ اصول کے مطابق ملک کی عام فہم زبان کو ذریعہ علم قرار دیا گیا ہے۔

لسانی معیار یہ بات ہندوستان کے ایک اور دلچسپ لسانی مسئلے کی طرف رہبری کرتی ہے جس کا ہمیں خالص تعلیمی نقطہ نظر کے تحت حل کرنا ضروری ہے۔ کیا کسی زبان کو کسی خاص فرقے یا مذہب یا قوم کے مفاد کے ساتھ وابستہ اور علم کی مقدس دیوی کو غبار آلود کرنا چاہیے ؟ کیا کسی زبان کی پختگی سے اس کی خصوصیات کا اندازہ کرنا چاہیے یا صرف اس کے رسم الخط کے اعتبار سے ؟ کیا کسی زبان کی عمومیت اور مقبولیت پر غور کرنا چاہیے یا اقلیتوں کی مشکلات سے اس کو جانچنا چاہیے ؟ کیا کسی زبان کی سرمایہ داری اور اس کی علوم قدیمہ اور جدیدہ حکمیہ و عقلیہ کو بخوبی اخذ کرنے کی صلاحیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے یا محض جذباتی تعلق کی بنا پر مادی زبان ہونے کی حیثیت سے اس کی نسبت اظہار الفت کرنا چاہیے ؟

اردو کی عمومیت مجھے کامل یقین ہے کہ آپ مجھ سے اس معاملے میں اتفاق کریں گے کہ ہندوستان (بابندستان عظم کی صورت میں ہم سب اپنی مادر وطن کو متشکل ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کریں گے) کا ایک کثیر حصہ اردو بولنے اور سمجھنے پر قادر ہے۔ کیا ہندوستان کے مختلف حصوں میں سوائے اردو کے کوئی اور ہندوستانی زبان اس عمومیت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اگر ہندوستان کا لسانی جائزہ لیں تو یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جائیگی کہ اردو گا یا ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم سب ایک عام زبان کی تشکیل میں یک جہتی کا ثبوت دیں اور زبان کے صوبہ داری میلانات اور اختلافات کو رفع کر کے اردو کو اظہار خیال کا واحد ذریعہ قرار دیں۔

تشکیل جدید حضرات! اردو زبان کی تشکیل جدید اور ہندوستانی زبانوں میں اس کے مرتبے پر تقریر کو ختم کرنے سے قبل آپ کی اجازت سے اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اور مجھے اس بات سے

انتہائی مسرت ہوگی اگر آپ بھی اس موضوع پر کشادہ دلی سے اظہار رائے کریں اور مفید تجاویز پیش فرمائیں۔
اس سلسلے میں آپ یقیناً **منتظم کوشش اور ایک مرکزی ادارے کی ضرورت** محسوس کریں گے جس کا تمام ہندوستان میں یکساں احترام کیا جائے، جو مقامی اور صوبہ وار کی تعصبات و اختلافات سے پاک ہو، جو دنیائے اردو میں اپنے اقتدار علمی کو قائم رکھے اور زبان کی نشو و نما کے اضافے کا موجب ہو۔ اس خصوص میں اترپردیش اردو اکاڈمی، جامعہ عثمانیہ و دارالمصنفین اعظم گڈھ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور دوسرے ادارے جو اردو کی ترقی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں طرح لائق تحسین ہیں۔ مگر مزید ترقی کے لیے ایک تمام ہندوستان ادارہ وفاق کی تشکیل ناگزیر ہے جس کی رہنمائی میں اصلاح زبان، توسیع ادب اور اعلیٰ علمی تحقیقات کا کام صحیح اصول پر انجام پائے۔

اصلاح زبان اصلاح زبان کے لیے اس کی ساخت، عناصر ہیئت و ترکیب اور قواعد کی خامیوں کو دور کیا جائے، ایک متفق علیہ رسم الخط ایجاد کیا جائے، ایک مشترک نام اختیار کیا جائے، ایک ایسا معیاری اصول قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ثقیل اور نامانوس الفاظ خارج کیے جائیں اور لسانی اتحاد کی خاطر مقامی محاوروں کے جزوی اختلافات اور مختلف مسلکوں کے جھگڑے بالکل نظر انداز کیا جائے۔

توسیع ادب توسیع ادب کے لیے ضروری ہے کہ جدید اصول پر زبان سرمایہ دار بنائی جائے، مختلف زبانوں کی معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا جائے اور مختلف علوم و فنون کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی جائے۔ ایک مستند لغت اور ایک انسائیکلوپیڈیا (جامع العلوم) اجتماعی مساعی سے مرتب کیا جائے جدید مفاہیم کے ادا کرنے کے لیے نئے الفاظ وضع کیے جائیں علمی اصطلاحات معین کی جائیں (انجا) ادبی و تعاقبی ادب نیز طباعت و اشاعت کا معیار بلند کیا جائے۔ نثر کی طرز نگارش میں اعلیٰ علمی و فنی اسالیب اختیار کیے جائیں حقیقی شعر و سخن کی نوعیت کا اعتراف کیا جائے اور ادبی جد و جہد میں بلند ہمتی اور اعلیٰ مقاصد پیش نظر ہوں۔

تحقیقات علمی زبان و ادب کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لیے لازمی ہے کہ عالمانہ اصول کے تحت مخصوص موضوعوں پر مبسوط مقالے اور رسالے شائع کیے جائیں محققانہ اصول پر تنقید و تبصرہ کا کام انجام پائے، تاریخی، تحقیقی، و تنقیدی تالیفات مرتب کی جائیں، اور مستند و جامع تصانیف تحریر کی جائیں اور بلند پایہ شکار پیدا کیے جائیں تاکہ ہندوستان حب الوطنی کے حقیقی جذبہ کا ثبوت قومی یکجہتی کی یکتا نظیر اور لسانی عظمت کی لاثانی مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔

روس اور انگریزی ادب انگریزی کے جدید و قدیم ادب سے روسیوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی حال میں شیکسپیر کے ۶ تماشے دکھائے گئے تھے، اور ڈکسن کا پک وک پیپرس بھی تمثیل کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اسی علم کی ایک کونگرس بہ مقام موسکو منعقد ہوئی تھی، جس میں بالشتی مصنفوں کے علاوہ ممالک غیر کے وہ اہل قلم بھی شریک ہوئے تھے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ اس کانگرس میں متعدد مقرروں نے اس پر زور دیا کہ ادب کے شاہکار، پیش

کرنے کے لیے راسخ العقیدہ بولشوی ہونا ضروری نہیں، اور روسی افسانہ نگار اور شاعر بورژوا مصنفوں کے طریق کار کا مطالعہ کرکے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میکسم گورکی، لوناچارسکی، لینن اور کارل راڈک کی تقریروں سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بالشوی حکومت بھی انقلاب کے ابتدائی زمانے کے ادبی مسلک کو ناپسند کرتی ہے۔ بالشویوں کے نقطہ نظر کے تغیر کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا کہ ۱۹۳۴ء میں اولڈس ہکسلے کے پوائنٹ کونٹر پوائنٹ کا ترجمہ روسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا لہجہ بایو سانہ ہے، اور ایک لمحے کے لیے بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ بالشوی عقائد کی تبلیغ میں اس سے مدد مل سکتی ہے۔ دلزکی، روسی انقلاب پسند ہمیشہ تضحیک کیا کیے، لیکن ابھی حال میں اس کی ۶ کتابوں کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ انگریزی اور امریکی مصنفین کی اور کتابیں جو حال میں چھپی ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: دن مور ریوراز گولزوردی، ہیرو کہ موت، (۲) کرنل کی بیٹی، از رچرڈ ایڈنگٹن، سورج بھی طلوع ہوتا ہے، از ارنسٹ ہیمنگوے، ایرو اسمتھ از سنکلیر لیوس، فورٹی سکنڈ پیریلل از جون ڈوس پاسوس، افسانہ نویس کا افسانہ از شروڈ اینڈرسن۔

(۸) ابھی حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے تین سربرآوردہ ایڈیٹر اڈورڈ بکس (ایڈیٹر اٹلانٹک منتھلی پریس) جون ڈیوی (استاد فلسفہ کولمبیا یونیورسٹی) اور چارلس لے بیرڈ نے ۲۵ کتابیں منتخب کیں جو پچاس سال کے اندر شائع ہوئی ہیں اور جن کا اور نئی کتابوں کے مقابلے میں دنیا کے عمل اور خیال پر زیادہ اثر ہوا ہے۔ تینوں کی فہرستوں میں سب سے آگے یہ تین نام ہیں۔ سرمایہ مصنف کامل مارکس لوکنگ بیکورڈ مصنف اڈورڈ بلمی، دی گولڈن بوٹ مصنف سرجیمس فریزر۔ حسب ذیل کتابیں بھی کسی نہ کسی فہرست میں ہیں: میرڈ ٹو اذ (۲) ڈاکٹر میری اسٹوپس، دی متھیمٹکل تھیوری اوف الکٹریسٹی اینڈ میگنیٹزم از سرجیمس جینز، نظریہ اضافیت از آئنسٹائن، بیرک روم بیلڈ از کپلنگ، پلینر پلینر بنٹ اینڈ ان پلینر بنٹ از مرفروشا، تاریخ عالم از ویلز، سیری کشمکش از ہنڈرک وان مغرب از اسپنگلر۔

(۹) عبدالرازق الجزری صاحب اپنے والد بزرگوار مرحوم عبدالراشد الجزری کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں، مرحوم کے مضامین اور متفرق تحریریں جو اخباروں اور رسالوں میں گزشتہ ۴۰ سال میں شائع ہوئی ہیں جمع کی جارہی ہیں اندازہ ہے کہ ان کا مجموعہ ۴ جلدوں میں شائع ہوگا۔

(۱۰) رسالہ ہمایوں کے مشہور مضمون نگار فلک نما کے مضامین کا مجموعہ بہت جلد دفتر ہمایوں سے شائع ہوگا۔

(۱۱) انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ اپریل کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ اس موقع پر ایک دن صرف اردو کے لیے مخصوص تھا، اور اس دن صدر جلسہ عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو تھے، اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے زبان کو ترقی دینے کی تجاویز پیش کیں، جائزہ اردو کی تحریک کا ذکر کیا، اور اردو کے ادیبوں کو زبان کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرکے، ادب کو قوم کی ضروریات اور حالات کے مطابق بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔ اردو اور ہندی

کی تردید کے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا اس کا ایک حصہ یہ ہے۔ "ہنس کے فاضل اڈیٹر اکتوبر کے رسالے میں فرماتے ہیں۔ اگر اہل زبان ستاؤں تو آپ کے سمجھانے کے لیے مترجم کی ضرورت ہوگی:

"اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کرکے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے لاکھ سمجھانے پر بھی اسے **زندہ ملکی زبان** بنانے کا عہد کر چکے ہیں:

خود مہاتما جی کا خط ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے ہنس کے متعلق تحریر فرمایا ہے:۔

"ہنس ہندوستان بھر میں انوکھا پرچہ ہے۔ یہ ہی ہندی اچھا ہندوستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہے تو ایسے مالک کی آرزو ہے۔ پرچہ پرانت کی بھاشا میں جو لکھا جاتا ہے اس کا پرچہ راشٹر بھاشا ہو تو اس کو ملنا چاہیے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ایسا پرچہ دل چاہے اُن کو ہنس دو اپرت ماس آدے، روپے میں ملا کرے گا۔"

اس ہوشیاری کو آپ نے دیکھا۔ اب تک ملک کی زبان "ہندوستانی" تھی اور سب سے زیادہ منظم اور بااقتدار کانگریس نے اُسے علی الاعلان تسلیم کر لیا تھا، لیکن اب ہندی یا ہندوستانی ہو گئی۔ یا ہندوستانی الفاظ ناس دسنیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ حذف ہو جائیں گے بلکہ یہ سمجھیے کہ ہو گئے جیسا کہ ہنس کے اڈیٹروں کی تحریر سے صاف ظاہر ہے۔ اب اس تحریر کا (جسے مہاتما جی ہندوستانی کہتے ہیں) مہاتما جی کے اس خط سے مقابلہ کیجیے جو انھوں نے حکیم اجمل خاں کو اُردو زبان اور اُردو رسم خط میں لکھا تھا اور جس کا عکس بعض رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں میں سے ہم کس زبان کو ہندوستانی کہیں۔ زبان کو سیاسیات کے خارزار میں گھسیٹنے اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنانے کا یہ نتیجہ ہے کہ دو طبقوں میں بجائے اتفاق کے نفاق اور بڑھتا جاتا ہے۔

اب مہاتما جی جس زبان کو ہندی یا ہندوستانی کہتے ہیں اس کا ایک نمونہ تو آپ نے خود ان کے خط میں دیکھ لیا، دوسرا نمونہ ہنس کے فاضل ایڈیٹر منشی پریم چند کی تحریر سے پیش کیا جاتا ہے:

"آپ نے بہت ٹھیک کہا کہ تاکیوں منور نجن کی وستو نہیں اور نہ گا گا کر سُنانے کی چیز ہے۔ وہ تو ہمارے ہردے میں پریرنا توں کو ڈالنے والی، ہمارے اداسی اور گرست من میں آنند سے اسپھورتی کا سنچار کرنے والی، ہم میں کو نئل بھاوناؤں کو جگانے والی (استری بھاؤ ناؤں کی نہیں) وستو ہے۔

اسے مہاتما گاندھی ہی ہندوستانی کہہ سکتے ہیں، ورنہ کسی اور زبان داں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ میں نے آسان جملہ آپ کو سُنایا ہے اگر میں اس رسالے کے کسی مضمون کا کوئی حصہ سناتا تو آپ کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور کہہ اُٹھتے:

گر تو ہندی بدیں نمط خوانی ببری رونق زباں دانی

اور یہ بھی یاد رہے کہ جو جملے میں نے ابھی آپ کو سُنائے ہیں یہ ایک شخص کی تحریر ہے جو اُردو کا بھی ایسا ہی اچھا ادیب ہے جیسے ہندی کا اور جو اُن لوگوں میں سے ہے جو ہندوستانی زبان کے وضع کے حامی ہیں۔ مجھے اس کی زبان پر مطلق اعتراض نہیں

یہ بہت صحیح اور فصیح ہندی ہے لیکن اسے ہندوستانی کہنا لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ ممکن ہے کہ مہاتما گاندھی جو جو توجیہ و تاویل کے فن کے اُستاد کامل ہیں لفظ الحمد، یا آ کے کچھ اور معنی پیدا کرلیں ورنہ بحالت موجودہ "ہندی یا ہندوستانی" کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہوسکتا۔ زبان کا آسان یا مشکل ہونا ایک دوسری بات ہے۔ ہر ایک کا ایک اسلوب بیان یا طرز تحریر ہوتا ہے اور خاص کر ادبی اور سائنٹیفک مضامین میں لامحالہ زبان مشکل ہوجاتی ہے لیکن جو تحریر جس زبان میں ہے اُسے اُسی زبان سے منسوب کرنا مناسب ہے۔ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے غلط فہمیاں پیدا کرنا درست نہیں۔ میں یہ بھی عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے لنگوئسٹ کے قابل اڈیٹروں نے اپنے رسالے کی زبان کو کبھی ہندوستانی نہیں کہا۔ یہ مہاتما گاندھی ہیں جو ہنس کی زبان کو ہندوستانی کہتے ہیں اور ایسی بڑی جسارت ایسا ہی بڑا آدمی کرسکتا ہے۔ اگرچہ ہمیں ہنس کے اڈیٹروں کے اس قول کے تسلیم کرنے میں بہت تامل ہے کہ اب ہندی زبان تمام ہندوستان کی عام زبان ہوگئی ہے۔

(۱۲) لاہور میں ایک انجمن "انجمن اردو پنجاب" کے نام سے قائم ہوئی ہے جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔ (۱) اردو زبان اور رسم الخط کی ترقی اور ترویج، (۲) اردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینا۔ (۳) مستند اور معیاری زبان کو جدید اور مقامی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے وسعت دینا۔ (۴) ایک شعبۂ ادب کا قیام جس میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں اور جس کے ماتحت تصنیف و تالیف اور تراجم اور تحقیق و تدقیق کا کام کیا جائے (۵) اردو کے نشوونما کا جائزہ لیتے رہنا۔ (۶) اخبارات، رسائل سینما، ریڈیو وغیرہ کے ذریعے سے اردو کی نشر و اشاعت۔ (۷) اردو دانوں کی موجودہ دفتری عدالتی اور تعلیمی حیثیت کا تحفظ۔ (۸) پنجاب یونی ورسٹی اور محکمۂ تعلیم میں اردو کے فروغ کی کوشش کرنا۔ (۹) درسی کتابوں کی زبان کا احتساب، انتقاد اور اصلاح۔ (۱۰) مختلف مقامات میں باقاعدہ انجمنوں کا قیام اور الحاق اور جہاں کہیں ایسی انجمنیں موجود ہوں ان کو الحاق کی دعوت دینا۔

انجمن کے سرپرستوں میں سر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، سر عبدالقادر، کے نام نظر آتے ہیں اس کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ہیں، اور معتمد میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۳ مئی کے جلسے میں ۱۲۰۰ روپے بھی جمع ہوئے، میاں بشیر احمد صاحب کا چندہ سب سے زیادہ تھا یعنی ۵۰۰ روپے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی۔

(۱۳) مان پوری صاحب کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ دفتر نیرنگ بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔

اوراق پارینہ

(۱) دیوان دوم معروف، از ق۔ ع۔ د۔
(۲) دریائے لطافت حصۂ منطق الوشتۂ قتیل، از ق ع د
(۳) حیدر آباد کے کتب خانوں میں، اردو کی قلمی مثنویاں (زمعین الدین درد، دائی صاحبہ

(۱) **دیوان دوم معروف**: یہ مسلمات سے ہے کہ معروف کے دو دیوان ہیں۔ دیوان اول طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے سطور ذیل کا مقصد دیوان دوم کا تعارف کرانا ہے۔ اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی ابتدا میں قصیدہ کے ۵ صفحے ہیں جو نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس قصیدہ کا بیشتر حصہ دیوان اول کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ وہ حصہ جو کسی وجہ سے خارج کر دیا گیا تھا، ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"معروف مرحوم کا سرمایۂ اولاد دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بیا جتابی بی سے تھا، اور ایک بیٹا حرم سے تھا.....

معروف مرحوم کی حرم سے جو صاحبزادے تھے ان کا بیان بہ سبب علالت ہم نے ترک کر دیا ہے"

"حافظ غلام رسول ویران مرحوم نابینا تھے، اور ذوق کے اولین و بہترین شاگردوں میں تھے، اور اتنے معمر تھے کہ شاید دو چار سال ذوق مرحوم سے عمر میں کم ہوں گے۔ ان کا مزار بیرون احاطۂ حضرت خواجہ باقی باللہ سمت شمال واقع ہے۔ اور پروفیسر آزاد مرحوم تو غدر سے پہلے جب ذوق مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے بالکل نوعمر تھے۔ شاید پندرہ سولہ سال کا سن ہوگا جو حاضر باشی ویران مرحوم کو حاصل تھی وہ آزاد کو کہاں میسر، یہ ان کی صحبت کے قابل تھے نہ یاران طریقت تھے (کذا) ان کو اپنی طالب علمی سے ہی اتنی فرصت کہاں تھی جو ذوق مرحوم کے جلیس بنتے یہ تو کچھ اپنی نوجوانی کے جوش میں کہتے تھے اس کی اصلاح ذوق مرحوم سے لے آتے تھے۔ بہ مزید احتیاط حافظ ویران صاحب سے بھی جو حضرت قبلہ ام کی خدمت میں اکثر تشریف لایا کرتے تھے، یہی امر دریافت کیا تو انھوں نے صاف کہا کہ کبھی اُستاد مرحوم یعنی ذوق مرحوم سے میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے فرمایا ہو کہ حضرت معروف میرے شاگرد تھے، یا میں ان کا کلام بنایا کرتا تھا۔ بلکہ اثنائے سخن میں جب معروف مرحوم کا ذکر آتا تھا تو فرماتے تھے کہ ان کو ذاتی سخن اعلیٰ درجے کا تھا۔ اکثر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اپنا کلام سناتے تھے اور میرا سنتے تھے، داد سخن کی بزرگانہ نوازش فرماتے تھے۔"

"ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے، آزاد مرحوم کی تحریر و عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف مرحوم فخر الدولہ کے بڑے بھائی تھے، حالاں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت معروف کے زہد و ورع اور متبع شریعت و اہل طریقت و صاحب سنت ہونے نے بہ خوائے آیۂ کریمہ ان اکرمکم عند اللہ اتقیٰ کم، بڑے بھائی کے دل میں چھوٹے بھائی کی وہ وقعت و عظمت قائم کی تھی کہ وہ حفظ مراتب میں بہت ہی غلو کرتے تھے۔ غالباً جس سے اجنبی دیکھنے والے یہ سمجھتے ہوں کہ معروف بڑے ہیں اور فخر الدولہ چھوٹے۔ مگر ایک واقع نگار کی ایسی

ادائے تحریر پر ضرور انجان لوگوں کو خلاف واقعہ علم ہوتا ہے، اور جاننے والے مولف کی بے علمی یا سہو و خطا کا گمان کرتے ہیں۔ اب ہم کسی قدر اس جملے کی تشریح کرتے ہیں جو آزاد مرحوم نے مبہم طور پر لکھا ہے۔ یہ ساری سخاوتیں اسی سعادت مند بھالی کی بہ دولت تھیں جو دن بھر سر انجام مہام میں جان کھپاتا تھا، اتوں سوچ میں گھلتا تھا اور خاندان کے نام کو زندہ کرتا تھا، اور ان سے فقط دعا کی التجا کرتا تھا، جزء مذکور (۱۰ بالا صفحہ ۲۱۰ دو پنجم ذکر ذوق میں تحریر ہے۔ یہاں سے تشریح جو لکھتا ہوں یہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے۔ معروف مرحوم کی تمام خانہ داری کا خرچ یعنی مایحتاج خانہ، جاڑے گرمی کا کپڑا، زنانہ و مردانہ مکانات سکونت، ان سب باتوں کی کفالت فخر الدولہ مرحوم کی طرف سے ہوتی تھی۔ علاوہ بریں، ایک پالکی، ایک ہوادار، آٹھ کہار، دو گھوڑے خاصے اور دو گھوڑے رشتوں کے لیے (اور چار سوار اردلی کے لیے۔ منشی، داروغہ، خدمتگار، چوبدار، ہرکارہ، فراش، اعلیٰ ادنیٰ کل ملازمین جو ایک سرکار کے لیے لازمی ہیں، یہ سب اسی سعادت مند مگر عمر میں بڑے بھائی کی طرف سے تعینات تھے۔ تین سو روپے ماہوار صرف جیب خرچ کے لیے ملتے تھے جو، وزمرہ کی خیرات و صدقات و میوہ خوری کے لیے مقرر تھے، تاہم ہر سال دو تین ہزار روپیہ اور قرض بھی ادا کیا جاتا تھا، جو حضرت معروف کا دست سخی اپنے اوپر بار کر لیتا تھا۔ حضرت معروف کی تصنیف سے دو دیوان کامل اور ایک تسبیح زمرد راقم کے پاس تھے، لیکن کوئی بزرگوار دیوان اول اور تسبیح زمرد اڑا لے گئے، صرف یہ دیوان دوم میرے پاس رہ گیا ہے فقط راقم میر زا سید الدین احمد خاں عرف احمد سعید طالب عفی عنہ، روز دوشنبہ ۲۷ محرم الحرام ۱۳۳۳ ہجری اقدس مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء

تمہید کے بعد چند اوراق سادہ چھوڑ دیے گئے ہیں۔ دیوان کے پہلے صفحے میں ۱۰ شعر ہیں، ۱۰ سطر، ۱۰ سطروں کا ہے، لیکن چونکہ مقطع عموماً دو سطروں میں لکھا گیا ہے، اشعار کی تعداد فی صفحہ ۱۰ سے کم ہے۔ غزلیں ۱۱۳ اور اق میں ہیں۔ اشعار کی تعداد ۳۵۵ ہے۔ شعروں کی بگہ خالی ہے، دو شعروں کے صرف ابتدائی الفاظ لکھے ہوئے ہیں، اور ۶ کے صرف ایک ایک مصرعے ہیں۔ دیوان کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے: ؎

منہ اپنا کہاں اُس کے جھنوں کے بیاں کا ٭ بندے کی زباں ایک دو خالق دو جہاں کا

معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کی تصحیح اور مقابلہ دوسرے نسخوں سے بھی کیا گیا ہے، چنانچہ ذیل کی عبارتیں پنسل سے لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ "یہ غزل بشیر مرحوم کے دیوان میں نہیں ہے" "یہاں تک تمام کلام وہی ہے جو میرے دیوان میں موجود ہے" "یہ شعر زیادہ ہے" "سرخی رام کے ہاں کے دیوان میں یہ غزل نہیں ہے" "نہیں کا لفظ کاٹ دیا گیا ہے۔ ایک جگہ صحیح و درستی سے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں "یہ شعر مصحح اور دیوان میں نہیں ہیں" کہیں کہیں پنسل ہی سے تصحیح بھی کی گئی ہے اور نسخوں کے اختلاف بھی دکھائے گئے ہیں۔

سامنے تم آجاتے ہو جب دھیان بھارا کرتے ہیں، اس غزل کے صرف ۴ شعر دیوان میں ہیں، بعد کا ورق اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

نشے میں جب وہ کہتا ہے کہ مجھ کو نیند آتی ہے ✤ تو پھر اس کو اُٹھا کر میں چھرکٹ پر لٹاتا ہوں

یہاں پر سے ۱۰ ورق کسی نے پھاڑ لیے ہیں۔ نشان موجود ہے۔ غزلیات کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے،

خارجی سن کے جلے جی میں نہ کیوں لے معروف ✤ جب کہ تو منقبتِ حیدرِ کرّار پڑھے،

ورق ۱۱۳ کے خاتمے پر کاتب نے یہ عبارت لکھی ہے "تمام شد دیوان معروف بہ خطابے، بطلا بندہ لال جی پرشاد کا بیچ ملازم ریاست نواب صاحبان کرنال تحریر یافت۔ ۲۰ جون ۱۸۵۵ء۔ اس کے بعد ۲ ورقوں میں متفرق کلام حسب تفصیل ذیل ہے:

غزل تمام ۳ شعر، مصرع اول "اگر وہ خاک پا ہم دیکھ پاتے اپنی آنکھوں سے"

رباعیاں ۱۰، رباعی اول: کوئی پابند زلف عنبر بو ہے ✤ اور کوئی اسیر حلقۂ گیسو ہے"

جو ٹے انھیں دل لگے بلا یں ڈھیر ہو ✤ ان سادہ رخوں کی یہ تو سادہ خو ہے"

آخری رباعی۔ یہ دو اہل رباعی نہیں، لیکن دیوان میں اس کا شمار رباعیوں میں کیا گیا ہے:

"پاس غیر اتنا ہے اس کو کچھ کہا جاتا نہیں ✤ خواب میں بھی دور ہی رہتا ہے پاس آتا نہیں

"واقعی وہ ایک ہی ظالم ہے لیکن دوستو ✤ کیا کروں ایسا حسیں میں دوسرا پاتا نہیں۔

متفرق اشعار ۱۸، ان میں ۳ ایک نا تمام غزل کے ہیں۔

دل کے سوزِ غم سے جب اپنے کو کا جل سا کرے ✤ تب کوئی ہاں یار کی آنکھوں میں اپنی جا کرے

ہماری آنکھ سے جس نے خدا کو دیکھا ہے ✤ قسم خدا کی کہ اُس نے خدا کو دیکھا ہے

یہ نہیں خواہش کہ ہو یا ستائے حسن میں ✤ جس کے ہم محکوم ہیں وہ ہو ہمارے حکم میں

بات کیا سامنے اس کے کرے انسان دست ✤ دیکھ کر اس کو تو رہتے نہیں انسان درست

شعر آخر: جب تک کہ یہاں یار کی یا رب خبر آئے ✤ ہوئے نہ خبر بے خبری اس قدر آئے

خاتمہ: تمام شد دیوان بلاغت عنوان نواب الٰہی بخش خاں صاحب تخلص بہ معروف، کہین پور مرزا عارف جان، برادر زادہ نواب شرف الدولہ قاسم جان، امراے بیجاپور خانی، باشندہ دہلی، شاگرد رشید جناب حضرت شاہ نصیر الدین دہلوی چشتی، صابری، المتخلص بہ نصیر، قدس سرہ البصیر۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر محمد اسماعیل خاں ریبع دہلوی کی طرف سے آزاد پر چند اعتراض ہیں مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء

(۲۲ ورق)

دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر اور ناسخ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ جرأت کے رنگ کی بھی غزلیں ہیں لیکن کم۔ درد کی طرز میں بھی غزلیں ہیں لیکن اتنی نہیں کہ آزاد کے اس قول کی تصدیق کے لیے کافی ہوں کہ آخر میں درد کی طرز میں آگئے تھے۔ محاورہ بندی کا بھی انہیں خاص شوق ہے خیال تھا کہ ایسے اشعار یا مصرعے جن میں محاورے بندھے ہوں جمع کر لیے جائیں لیکن اس نیت سے چند صفحات سے زیادہ پڑھنے کا کبھی موقع نہ مل سکا۔ بعض مصرعے اور اشعار ملاحظہ ہوں،

آتش دل پہ مرے کوئی چھڑکا کرتا + تو سن فکر کو گلہ رونے کو پڑا کرتا + ضبط وہ غیرے در پہ کاہے کو لاکرتا + اگر کبھی اس سب شیریں سے یہ بوتا رد کش تو میں شہد کو پانی سے بھی پتلا کرتا (ہوتے سے لے فلک نہ امیر کلاں گرا اٹھتا نہیں ہے پھر کبھی اتنی جہاں گرا + مرہی گئے تھے پھر کی شب لیک بچ گئے کیا جانے کب کا آگیا آڑے بیاد یا + سن لیجو چینی نے میں یہ آج گل پڑا + سب راز ہو گیا وا آنکھیں جو ڈبڈبائیں تو وہ بھی پیش آیا تھا جو کہ جی میں ڈوب کا۔

دو تین غزلیں ملاحظہ ہوں:۔

کیا کیجیے اگر دل سے غم اس کا نہیں جاتا
گھر آئے کو تو گھر سے نکالا نہیں جاتا

پاس اب ترے بیمار کے بیٹھا نہیں جاتا
دیکھا ہے یہ حال اس کا کہ دیکھا نہیں جاتا

ہم اور نہ کہتے اسے احوال دل اپنا
باعث ہی کچھ ایسا ہے کہ بولا نہیں جاتا

مت ڈھونڈ اسے جو گم ہے تری یاد میں یں
عنقا سے بھی کھوج اس کا تو پایا نہیں جاتا

ہم جان سے جاتے ہیں اگر اس کو عزیزو
لے آؤ تو کہہ اس میں تمہارا نہیں جاتا

ایسا نہ ہو وہ قبر پہ ساتھ اور کو لائے
یہ دل سے پس از مرگ بھی دھڑکا نہیں جاتا

یہ حال ہے اب تو دل پر درد کا اپنے
بیدرد سے بھی ہاتھ لگایا نہیں جاتا

کیونکر ثمر نخل تمنا کو نہ ترسیں
واں ہے کہ جہاں ہاتھ ہمارا نہیں جاتا

گو خوب رخ اب خواب دکھائی نہیں دیتے
پر دیکھنے کا ہم سے یہ لپکا نہیں جاتا

قاصد جو مرا جاتے ہی لے آئے ہے پیغام
کیا جانے کہ جاتا بھی ہے واں یا نہیں جاتا

جاتے تو ہیں واں یار بہت میری طرف سے
لائے جو اسے یاں کوئی ایسا نہیں جاتا

ہے حق کی طلب تجھ کو تو جویا ہو کہ معروف
پیاسے کو کبھی ڈھونڈنے دریا نہیں جاتا

رتبہ دیکھو اپنی نیست کا کہ اس محفل میں ہے
قرب دیکھو اپنے کینے کا کہ اس کے دل میں ہے

ہم جان سے دل نہیں اپنا راز تا وقت قتل
ہے یہی دھڑکا کہ رعشہ پنجۂ قاتل میں ہے

خالق ارض و سما جس میں سما یا دیکھا
بل بے وسعت کتنی وسعت اس دل بے حوصلہ میں ہے

وصل گرچہ بسی سے ممکن نہیں لیکن کوئی
ہم سے پوچھے جو مزہ اس سعی لاحاصل میں ہے

تو اگر مجنوں ہے تو ہم نے خبر کر دی تجھے — دل سے سن رہ بے خبر لیلیٰ یہی محمل میں ہے
ہفت خواں کی منزلیں ہیں جس کے آگے ایک گام — ہر قدم پر نیم جاں یہ عشق کی منزل میں ہے
عشق سے کرتا ہے کیوں اتنی ملامت تو مجھے — اے صحابہ عشق تو انساں کے آب و گل میں ہے
اس کے سایے کو اٹھائے جا رہیں سے اے فلک — مرد کہ در کار گر چشم مہ کامل میں ہے
جوں گہر کس سے مجھے چشم گشادہ کا رہو — دخل کب ناخن کو سر رشتہ مشکل میں ہے
دیں مجھے وقت شہادت بھر کے حوریں لاکھ جام — لیک میری روح آب خنجر قاتل میں ہے
جو تپ غم سے کہ میری نبض میں ہے اضطراب — یہ تپش معروف کا ہو گر کل بسمل میں ہے

معروف نے اس دیوان کی بعض زمینوں میں سہ غزلے بھی لکھے ہیں، دو غزلوں کے مقطعے ملاحظہ ہوں۔

تیسری بھی غزل ایک اور مری سن معروفؔ — ہوں نئی طرح سے اظہار تمنا کرتا
سنائے تیسری بھی اب غزل معروف پھر ایسی — کہ منہ تھک جائے تحسیں کرتے کرتے نکتہ سنجاں کا

ایک مطلع حضرت علی کی شان میں ہے۔ اس شعر سے بہت ملتا جلتا ہے جو آزاد نے خضر کی طرف منسوب کیا ہے

ہوں تو سنی ہے علی سے دوستی جانی مجھے — خواہ ایرانی کہو اور خواہ تورانی مجھے

اعظم الدولہ سرور اور حسام الدین حیدر خاں نامی کی طرف دو شعروں میں اشارے ہیں،

لکھ غزل اک اور بھی معروف سرور کے لیے — آج اس پر نکتہ فہمی نکتہ دانی ختم ہے
حسام الدین حیدر خاں سے امید وفا ست رکھ — بہ رنگ گل دو ہفتہ دوستی معروف فانی ہے

بعض اشعار جن سے معروف کے ذوق سخن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہے پسند اپنی وہی شعر کہ جس میں معروف — طرز میر کی انداز ہو جرات کا سا
ہے پسند خاطر معروف گر شعر مثال — دیکھیے دیوان منگا کر صائب تبریز کا
سن کے معروف غزل کو ترے اکثر نہیں — وہن مصحفی و میر سے نکلے آواز
معروف یوں تو سب شعرا خوب ہیں ولے — بھاتی ہے مجھ کو درد کی یا میر کی زباں
شعر لکھ معروف اب آ کے قلم کو تھام کر — یہ غزل ہے واسطے مانگے کے بھوانی مجھے

دریائے لطافت حصہ منطق نوشتہ قتیل

یہ صفحہ ۳۰۴ صفحے پر شروع ہو کر ۳۰۴ ص پر ختم ہو جاتا ہے، زبان اس کی فارسی ہی ہے، لیکن بغیر کسی وجہ کے اردو لکھنی شروع کر دیتے ہیں، جیسا کہ شاعوں سے ظاہر ہو گا۔ علمی حیثیت سے اس رسالے کی کوئی وقعت نہیں، لیکن اصطلاحات علمیہ کو ضبط بندی الفاظ میں ترجمہ کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اس باب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"بندہ سراپا گنا ہگار یعنی تمثیل روسیاہ گوید کہ چوں افصح فصحائے روزگار و اُردو ور واج دہندۂ نقد بلاغت در ہر زبان و کو تکلم بلیغ عالی مرتبت شاعر لیق والا منزلت" برازندہ آلائی متعالی مضامین جدیدہ از دریائے طبع نقاد و فرزندہ مجالس اصحاب معنی شیع راقت دہن وقاد" یعنی میر انشاء اللہ خاں صاحب تخلص بہ انشا کہ کمال تش اکثر تشبہاً مستغنی از بیان عمر زیدہ ہست" بحسب پایۂ بندگان جناب وزارت مآب ..... صرف و نحو را زبان اردو تمام کرد نظر بلطف قدیم ..... خواست کہ ایں بے تشخص را نیز چند کس صاحب تشخص مانند و از بانع عنایت حضور پر نور بہرہ وافی روزی ایں کمینہ غلام وافی گردد ..... نبا بریں راقم کثیر الاثم نخست زباں را بنطق چناں وا می نماید کہ از بعضے و ا نمایا نہا ند آشنا زبان اردو چنیں بسماعت رسیدہ کہ جاننا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں جاننا اور جاننے والا اور جانا گیا تینوں ایک ہوں اور اس کا نام عربی میں علم حضوری اور میں نے آپ گیان نام رکھا ہے اس واسطے کہ جب جاننا اور جاننے والا اور جانا گیا تینوں ایک ہوئے تب آپ کو آپ ہی جاننے گا جس طرح سے کہ خدا اپنی ذات کا آپ جاننے والا ہے اور اس کی ذات جانی گئی ہے اس صورت میں جاننے والا اور جانا گیا دونوں ایک ہوئے کس جہت سے کہ ذات شخص کی وہی شخص ہے جس وقت دو شخص ہو جاننے والا اور ذات ٹھہری جانی گئی تو ثابت ہوا کہ دونوں ایک ہیں۔ اب آئیے اس بات پر کہ جاننا کیوں کر ایک ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ جاننے والے اور جاننے گئے میں تفاوت ہو گا وہیں جاننا ان دونوں کے سوا تیسری چیز ہو گا" اور جہاں یہ دونوں ایک کہے جائیں گے وہاں وہی جانا گیا جاننا بھی ہے۔ اس صورت سے کہ فلانے کو بڑا علم ہے اور فلانے کی بڑی معلومات ہے۔ دونوں ایک معنی رکھتے ہیں اور ایک مقام میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اس بیان سے یہ بات کھلی کہ جب جاننا اور جاننے گئے میں کچھ فرق نہ رہا اور جانا گیا اور جاننے دونوں ایک ٹھہرا اور بیچ اس کا یہ ہوا کہ جاننے والا اور جاننا اور جانا گیا تینوں باہم ایک ہیں دلیل اس پر یہ ہے کہ جو دو چیزیں آپس میں سب وجہ سے باہم نہ ہوں گی۔ تو ان دو میں سے ایک کی نظیر بھی دوسرے کی ہو ہو نظیر ہو گی ..... آگے یہ کہتا ہوں کہ آدمی کو بھی جو اپنی ذات کا علم ہے وہ بھی حضوری ہے اور یہ علم کچھ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتا خود بخود اپنی روح کا علم انسان کو ہوتا ہے جو بیں بدن کے ساتھ علاقہ ہوا دو ہیں یہ علم انسان کو حاصل ہوا مگر وہ علم جو حق تعالیٰ کو اپنی ذات کا ہے حضوری کہلاتا ہے اور وہ عالم حصوری جو ہیں اپنی ذات کا ہے حضوری حادث کہلاتا ہے و نیز باید دانست کہ بعضے بران رفتہ اند کہ خدائے تعالیٰ را سوائے علم ذات خود علم اشیاء موجودہ کہ آنہا را اعیان ثابتہ گویند ہم حضوری باشد ..... "ص ۳۰۹ تا ۳۱۳

"ازیں جا شروع کنیم قضایائے شرطیہ را اور وہ دو قسم ہے متصلہ اور منفصلہ اول متصلہ کو سنیے کچھ چھپا نہیں کہ ایک شرطیہ دو جملوں سے بنا ہے دلیل اس پر یہ ہے کہ جس وقت حرف شرط اور علامت جزا اور ڈالے ایک شرطیے کے دو ٹکڑے باقی رہ جائیں گے مثال جو آفتاب نکلے تو دن ہو موجود ہو جو کہ حرف شرط و تو علامت جزا ست و در باید کرد باقی ماند در جملہ آفتاب کا نکلنا اور دن کا موجود ہونا و ایں ہر دو جملیہ است لیکن ایں ہر دو مصدر ماضی باید ساخت

یعنی آفتاب نکلا ہے اور دن موجود ہوا ہے وایں قضیہ متصلہ از متصلہ از ومیہ نامند قسم دیگر از متصلہ اتفاقیہ است یعنی بسبیل اتفاق ایک دوسرے کی شرط پڑے ..... " ص ۳۵۱ تا ۳۵۲

ذیل میں مصطلحات اور ان کے تراجم کی مکمل فہرست دی جاتی ہے۔ بہت سی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے ترجمے طرف انہوں نے توجہ ہی نہیں کی۔

علم حضوری - آپ گیان	موضوع - ٹھکانا	انشا	تھوڑی بات		
علم حصولی - پردھیان	عوارض ولوازم - لچھن	تقیدی	پھنسا ہوا		
تصور	دھیان	معرف	پتا	غیر تقیدی	چھٹا ہوا
تصدیق	جوں کا توں	حجت	بت کماؤ	مفہوم	سمجھ ہوا
محسوس	دہری اونچ نیچ	دلالت - بات بنانا، زد سمجھانا، پانا، جانا	کلی	سینورن	
موضوع	بول	دفع	ٹھہرانا	جزئی	اچھوتی
محمول	بھرپور	مطابقت	ٹھیک ٹھیک	مصداق	سچل
رابطہ	جوڑ	تضمن	کھسر	سادی	دہی
اذعان	مان لینا	التزام	اوپر کا لگاؤ	تباین	دو اور دو
قضیہ	بات	دفع	ٹھہراؤ	عموم	اکھری اونچ نیچ
نسبت	ملاپ	طبع	آپ سے آپ	عین	اصل
موجبہ	پورا جوڑ	عقل	سوچ	نقیض	اکہرا انیل
سالبہ	پورا توڑ	نفلی	بولتی ہوئی	ضد	دہرا انیل
بدیہی	پرگٹ	غیر نفلی	چپ چپاتی	خاصہ	اپنا اپنا کام
نظری	گپت	دال	رہبر	ماشی	چلتا جانور
تسلسل	الجھاسوت	معنی	مراد کا گھر	معرف	بتانے والا
دور	ایر پھیر	مفرد	ٹھیکل	معرف	جانا بوجھا
عالم	بنگھٹا	مرکب	ملا جلا	حد	اصل اصل
حادث	نیا	تام	پورا		باہر باہر
قدیم	پرانا	ناقص	ادھورا	رسم	بگاؤ

صغریٰ	پہلی بات	کبریٰ دوسری بات	نتیجہ = درنیدی سوائے ۔ اردو پھل
استقرا	جانچنا	تمثیل پھیلاؤ	و در اُردو حاصل

بعض قلیل الاستعمال الفاظ و تراکیب

کھنٹھا	بھنا گنبد	گلی خال (قسم کبوتر)	
غٹ غوں غٹ غوں (آواز کبوتر)	پندرہ چوک تین بیسی	داری (قسم انار)	
تکھنی مشک	کنوے (جمع کنواں)	مزہ دو یار دو اری جاؤں نام مردان زن سیرت	

کلام گوپی ناتھ کاتھ ساکن شاملی بابد خود کہ ذوقی رام نام داشت و بہ چوکی رام مشہور بود: "بابو جی میں یہ کھاجے ہم لکھ کا لڈو کہیں ہیں اسے کھا لوگ کی کہیں ہیں' ناں جانے ہوروں کے کھانڈ بھی آوے ہے گا نہیں بھلا بابو جی ہم لوگ تو سب لکھ کا لڈو کہیں ہیں' معلوم نہیں کہ ہم لوگ بانے اس کا نانو کچھ اور بھی کہیں ہیں' کہ یوئی کہیں ہیں ص ۳۱۸

کلام مولوی عتیق اللہ پوربی بابکے از شاگردان رشید خود ش: یہ جو ملا صدرا میر باقر کبیر علم معقول ہاں شاگرد رشید آ و کچھ بوجھے' انہیں پڑت کر معقول کیری کتب کہ سے پڑھی رہیں' ص ۳۱۹

حکایت متعلق خاں عالم بقا اللہ خاں: روزے عزیزے بہ در او تاق امیرے وارد شد' ما دیانے بر سر شخصے ایستادہ دید' پرسید کہ' ایں ما دیان از کیست' جواب داد کہ' جس کا میں نوکر ہوں' سایل باز سوال کرد' تو ملازم کیستی' گفت' جس کی یہ گھوڑی ہے' و بعضے گویند کہ ایں نقل نوکر ما دیاں نواب خان عالم بقا اللہ خاں مرحوم است' چنانچہ از ہماں روز نواب مذکور بہ گھوڑی والا مشہور شد..... ظاہر ہست کہ سبب مشتہر شدن او بہ ایں لقب بخل و دنائت او باشد کہ نوکران باوصف حق نمک دم صبح بے آشنا کردن معدہ بیک دو لقمہ نام او را نمی برند' دیگراں در چہ تمار اند" ص ۳۱۷۔

حیدرآباد کے کتبخانوں میں اردو کی بعض قلمی مثنویاں

از محمد معین الدین دردائی صاحب

حیدرآباد کے کتب خانوں میں ابھی تک بہت سی قلمی کتابیں ایسی موجود ہیں جن کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے۔ آج کی صحبت میں بعض مثنویوں کا ذکر کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کے متعلق پہلی بار لکھا جا رہا ہے:

(۱) **مثنوی ریاض الحسنین**[1] اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ اور اگرچہ اس نسخے کے کاتب نے اپنا نام نہیں دیا ہے لیکن اس کے مطالعے سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس مثنوی کا مصنف غلام علی عشرت ایک غیر معروف شاعر ہے۔ بعض جگہ مصنف نے خود اپنے تخلص کا اظہار کیا ہے:

یا ابن علی روح الثقلین — آرام دل فاطمہ یعنی کہ حسین
اب عشرت غمگیں کی تمنا ہے یہی — روضے پر پڑھوں ریاض الحسنین

کر عشرت زیادہ نہ طول کلام — بہ آل نبی و محمد سلام
لکھا عشرت نے جب حال شہیداں — تو رضواں نے بہ صد خیر سعادت
قلم نرگس کی بے برصفحۂ گل — لکھی تاریخ استیان شہادت (۱۲۲۳ھ)

اس مثنوی میں آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے واقعات درج ہیں اور پھر شہادت کے مفصل حالات مذہبی رنگ میں بیان کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ خود مصنف کے ایک شعر سے ظاہر ہے:

---

[1] اس مثنوی کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس قابل ہے کہ اسے گمنامی کے پردے سے نکال کر دنیائے ادب میں متعین کیا جائے۔ دردائی۔

کہ از ذکر آدم علیہ السلام — دراں یا فتم تا بخیر الانام

اپنے والد کے انتقال کے بعد یزید نے تخت خلافت پر متمکن ہو کر جو ایک خط عبدالملک کو حضرت امام حسین و ابن عمر و ابن ابوبکر و ابن زبیر علیہم السلام سے بیعت لینے کے لیے لکھا تھا اس کا ذکر اس مثنوی میں اس طرح کیا گیا ہے ؎

یزید لعیں ہو کے قائم مقام — ہوا سرگروہ لعینان شام
وفات پدر سے ہوئیں دل میں شاد — ہوا کار فرما جو وہ نامراد
رفیقوں کا سن قصہ گو تہ کلام — دیئے کو نامے لکھے نام نام
تھا عبدالملک ابن مروان واں — لکھا اس کو خط شقاوت نشان
بہ ابن علی و بہ ابن عمر — بہ ابن ابوبکر و ابن زبیر — یہ کہدے کہ اس میں تمہاری ہے خیر
کہ چاروں ہم آکے بیعت کریں — ارادہ اطاعت کا دل پر دھریں
نہ مانیں تو چاروں جواں ہم دگر — تو پھر کاٹ کر بھیج چاروں کا سر

اس مثنوی کا سال کتابت ۱۲۲۴ھ ہے جیسا کہ ختم کتابت کے اس جملے سے ظاہر ہے:

"تحریر فی التاریخ دوم در شہر رمضان المبارک سنہ ۱۲۲۴ھ"

(۲) مثنوی چندبدن اس کا مصنف باجینی واقف دکن کا ایک غیر معروف شاعر ہے اس کے حالات کے لیے میں نے متعدد تذکرے دیکھے لیکن کسی میں کچھ نہ ملا اپنے کلام سے یہ ایک ذی علم اور صاحب دیانت شاعر معلوم ہوتا ہے تعجب ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اس کے حالات قلمبند کرنے میں غفلت سے کام لیا۔ اپنی مثنوی میں واقف نے ایک جگہ خود اپنے دکنی ہونے کا ذکر کیا ہے:

کہ بندہ تو سراپا پر خطا ہے — خطا کا بخشنا عین خطا ہے
اگرچہ میں بھی تو اہل دکن ہوں — نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں
مے ہندی سے اپنے حسب مقدور — بیان کرتا ہوں سنیے اس کا مذکور

مصنف نے کئی جگہ خود اپنے تخلص کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً

ارے واقف کیا اپنی ہے جو عرض — تو ہے گو نعت کا کہنا تجھے فرض
سخن میرا جہاں میں کر تو مشہور — سدا رکھ عارفوں کے پاس منظور
یہی واقف کی ہر دم التجا ہے — تری درگاہ میں یہ دسا ہے
وہ مصنف ہو کہیں گے سب بجا ہے — اے واقف مرحبا ہے مرحبا ہے

۱۱ جسینی واقف کی مثنوی چندر بدن در اصل تقیی کی مثنوی چندر بدن و مہیار کا (جو دکنی زبان میں ہے) صاف اردو (ہندی) میں ترجمہ ہے جیسا کہ خود واقف کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

تقیی نے مگر دکنی زباں میں — لکھا ہے قصۂ ایک ان کے بیاں میں
لکھا ہے فارسی کوئی رسالہ — یہ سب قصے کا ہے اس میں حوالہ
تخلص فارسی والے کا تھا عشق — سراپا عشق کا قصہ لکھا عشق
لکھ ہندی میں گر تو اس کو سارا — تو دنیا میں رہے گا آشکارا — خیال اس بات کا جب دل میں آیا — قلم تب ہاتھ لے میں نے اٹھایا

واقف کے ان اشعار سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چندر بدن و مہیار کے قصے کو تقیی سے پہلے کسی شاعر نے فارسی زبان میں لکھا تھا اور تقیی کی مثنوی چندر بدن و مہیار اسی سے ماخوذ ہے۔

واقف کی مثنوی چندر بدن کا صرف ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ اور اب تک اس کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ اس مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۲۰ھ ہے۔ مصنف کے ان اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

پس از شکر خدا تاریخ کا فکر — مجھے لازم ہے کرنا اب بیاں فکر
سن ہجری سے دیکھا میں نے فی الحال — تھا بارہ سو پہ ستائیسواں سال
نہیں تاریخ کوئی اس سے فائق — وہ پہنچے وصل کو معشوق عاشق

کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے اس کا کاتب ایک ہندو پورن سنگھ نامی ہے۔ خاتمۂ کتاب میں خود کاتب نے اپنے نام کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس سے کاتب کے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

"زادہ دار پورن سنگھ پسر نرائن دھن سنگھ نبیرہ ہزاری محکم سنگھ کارپرداز سرکار نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر (آئندہ) ستھ پورہ حالا سکونت در مکان مہاراج موصوف بندہ اقامت دار و دیرینہ غرض از کسے ندارد سوائے ذات عالی صفات ایما مہاراج دھرم بھوت دھرا تار راجہ چندر اہل بہادر"

کاتب کرتے وقت کاتب نے چند اشعار اپنی طرف سے بھی لکھ دیے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ کاتب بھی اردو کا شاعر تھا۔ اس کے صرف دو اشعار اس وقت یاد ہیں جو درج ذیل ہیں:

الٰہی بخش دے اس فدوی کے گنہ کو — تو طاقت دے مرے تا زیست دست و پا کو
میرے فرزند جہاجن رائے کو تو شاد رکھ — مرے مہاراج ندیا دھر ہی کو تو آباد رکھ (کذا)

اس کی تاریخ کتابت ۱۲ صفر المظفر ۱۲۲۵ھ ہے۔ خود کاتب کے الفاظ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

"تاریخ شانزدہم ماہ صفر المظفر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء بار فرمایش مہاراج بیاد ھر جو پسر گنیش رائے در محلہ سینی علم تیاری کتاب چندر بدن مہیار نمودہ شد"

اس مثنوی میں سب سے پہلے حمد ہے پھر مناجات نعت منقبت حضرت علیؓ منقبت بندہ نواز گیسو دراز۔ اس کے بعد خود مصنف نے اپنے نام اور وطن وغیرہ کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ ان سب کے بعد قصے کا آغاز ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

حمد:۔

کرم سے اپنے لے ساقی وحدت — پلا مجھ کو تو صہبائے محبت
کیا تو عشق کو پیدا ازل سے — نہیں کچھ عشق ہیگا آج کل سے
دیا یوسف کو ایسی حسن و خوبی — زلیخا چاہ غم میں جس کے ڈوبی
سنا شیریں کی تو شیریں زبانی — کیا فرہاد کے سر تیشہ رانی
دکھا چند رہن کا ماہ رخسار — کیا مہیار کو دیوانہ اک بار
کیا تو ہیر پر رانجھا کو قرباں — کیا عذرا کو وامق کا پریشاں
حقیقی اور مجازی عشق باہم — وہ دونوں ایک ہی معنی میں توام
تو خود معشوق خود عاشق خود معشق — تو خود شائق تو خود مشتاق و خود مشق

آغاز داستان:۔

ارے ساقی کہاں ہے آفتابی — لگا منہ سے مرے کی صراحی
سنو یہ داستان عشق بازو — سنو لے درد و غم کے جاں گدازو
زمن ایں داستان عشق بشنو — شنو از حرف کمنہ معنی نو
کوئی ہے ہند میں ایک شہر اعیں — جسے آنکھوں سے دیکھے دل کو ہو چین
وہاں رہتا تھا کوئی ایک تاجر — وہ تھا مال و منال اپنے سے فاخر

(۳) مثنوی مرأۃ الحشر: اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں میری نظر سے گزرا ہے۔ یہ ایک مذہبی مثنوی ہے جس کا مصنف سید محمد فراقی ہے۔ مصنف نے خود اپنے تخلص اور نام کا ایک جگہ ذکر کیا ہے۔

فراقی تخلص ہے میرا مدام — وے اصل سید محمد ہے نام

سبب تصنیف پر ایک جگہ فراقی نے خود ہی روشنی ڈالی ہے۔ تفرقی اور غواصی کی شہرت کا سبب ان کی تصانیف کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

جو دیکھا ہوں ایسے تماشے ابار — مرا بھی ہوا شوق بے اختیار
پڑا آخرت نامہ میری نظر — دیکھا دل رگ میں تن کے بتر

.....

اسی سے مرے دل میں گذرا یہ بات — کروں نظم میں لسکوں دیکھنی میں سب

اس مثنوی کے کاتب نے نہ اپنا نام لکھا ہے اور نہ سال کتابت ہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ البتہ سال تصنیف کے

متعلق خود مصنف نے ایک جگہ دو اشعار لکھے ہیں جس سے اس مثنوی کے سال تصنیف کا پتا چلتا ہے وہ دو اشعار یہ ہیں:

کیا قصد تاریخ جب بونا — یو اجمال تفصیل کر کھولنا
توج دل[1] کیا اس ذرا انتخاب — یو دیکھو جو ہے بارکت کتاب[2]

نمونہ کلام درج ذیل ہے:

خدا وند بیچوں نرنکھار توں — ہمارے جیون کا ہے ادھار توں
ہماری مراد وں کا توہار ہے — ہرامید کا توں پکا پار ہے
تہے مغفرت کے ہیں امید وار — گو بل وقت کا تو بچہ ہنا ہے یار (کذا)
الٰہی مجھے ذوق طاعت کا دے — نیٹ شوق اپنی عبادت کا دے
مجے زندگی ہی تلک برقرار — تری بندگی میچہ رک استوار
ترا یاد کا رات دن دھیان ٹے — تجھے پوجنے کا مجھے گیان دے
عبادت کا قوت مجے کر عطا — رک اپنی محبت مرے پر سدا

(۴) گلشن عشق نصرتی - اس مثنوی میں شہزادہ منوہر اور مدمالت کی داستان عشق ہے۔ اس کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ایک کتب خانہ آصفیہ میں جس کا کاتب غلام احمد ہے اور دوسرا صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ذاتی کتب خانے میں۔ کتب خانہ آصفیہ والے نسخے کا سال کتابت ۱۱۹۴ھ ہے۔ اس کے شروع کے چند اوراق غائب ہیں اور کتابت بھی کچھ اچھی نہیں برخلاف اس کے نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے پاس جو اس کا نسخہ ہے اس کی کتابت بہت پاکیزہ اور صاف ہے۔

(۵) علی نامہ نصرتی - حیدرآباد میں اس کا صرف ایک نسخہ دفتر دیوانی (خانگی نہیں) کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس نسخے کا کاتب محی الدین بن سید عبدالرسول نبیرہ مخدوم اشرف جنگ ہے۔ کاتب کی تحریر کے مطابق اس نسخے کا سال کتابت ۱۱۰۷ھ ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے جس میں بقول مؤلف "یورپ میں دکنی مخطوطات" یہ شعر موجود ہے

لکھا شہ کا میں جس جو یو کراوں — ہزار یک برس تہ تے چھ برس

اس شعر سے علی نامہ کا سال تصنیف ۱۰۰۶ء اکلتا ہے۔ بطور نمونہ دو اشعار درج ذیل ہیں:

حمد اوّل ہے خدا کا جس نے روز اوّل — دیا ہے بہت مرداں کوں جو توفیق سوہل
رکھا اس نامہ نامی کا علی نامہ تاوں — تا جنم جگ یو زمانی کی گلی جوئے ہیکل

[1] "اس ذرا" کا مفہوم واضح نہیں ہوتا (معیار) [2] اس مصرعے سے ۱۱۳۳ نکلتا ہے (معیار)

استفسارات

(۱) مصنف مغل اور اردو نے گلزار ابراہیم مصنفہ علی ابراہیم خاں کے حوالے سے حسب ذیل باتیں لکھی ہیں۔
گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، اور اس کے تین قلمی نسخے بھی میرے نظر سے گزرے ہیں، لیکن یہ باتیں نہ مطبوعہ نسخے میں ملتی ہیں نہ قلمی نسخوں میں۔ کیا کسی صاحب کو کوئی قلمی نسخہ ایسا معلوم ہے جو مصنف مغل اور اردو کا ماخذ رہا ہو اور اس میں حوالہ ہائے ذیل ملتے ہوں؟

(ا) ص ۹۳ مغل اور اردو "نواب شجاع الدولہ اور بکسر کی لڑائی تک اردو کا وہ مکتب ادھر میں کھلا رہا" اردو کے مکتب سے مراد وہ ادبی انجمن ہے جو امیر خاں انجام نے۔ یہ قول مصنف مغل اور اردو دہلی میں قائم کی تھی، اور جس کا دفتر ان کے مقتول ہونے کے بعد صفدر جنگ کے قبضے میں آیا تھا۔

(ب) ص ۸۵ "فدوی"۔ مسلمان ہونے پر محمد حسن ہو گئے"۔ احمد شاہ کی تعریف میں انھوں نے ایک قصیدہ عرضی کے گزرانا ... حضور نے ہزار روپے نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی"۔

(ج) ص ۱۱۵۔ ۱۱۶ "صاحب عالم نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا جو ان کی وفات کے سبب پورا نہ ہو سکا۔ وہ ناقل ہیں کہ واران ہیسٹنگز۔ بنارس آئے تو صاحب عالم نے اپنے شعروں کی بیاض بہ طور تحفہ انھیں ذی جوان کے ساتھ ولایت گئی الخ"۔ صاحب عالم سے مراد جہانداد شاہ ہیں اور وہ سے علی ابراہیم خاں۔

(د) ص ۱۱۲ "شاہ صاحب نے ۱۸۰۳ء میں رحلت کی"۔ شاہ صاحب سے شاہ ولی اللہ صاحب مراد ہیں۔

(ہ) ص ۱۳۱ مراد شاہ۔ ایک مشہور پنجابی اردو گو۔ جب یورپ کے سفر سے لوٹ کر دلی آئے ہیں تو بادشاہ انھیں انعام واکرام دیتا ہے"۔ مراد شاہ وہی ہیں جن کا ذکر پنجاب اور اردو میں ہے اور بادشاہ اکبر ثانی ہیں جو ۱۸۰۶ء میں تخت پر بیٹھے ہیں۔ مصنف گلزار کا انتقال ۱۸۱۳ء میں ہوا ہے، اور کتاب کی تکمیل اپنی زندگی ہی میں کر چکے تھے، اکبر ثانی کے زمانے کا واقعہ گلزار میں کیوں کر درج ہو سکا، سخت حیرت ہے

(۲) میر امامی ہروی میر حسن کے اجداد سے تھے۔ حسن نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ عالم، فاضل، خطاط اور شاعر تھے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ وہ عہد شاہ جہانی میں ہندوستان آئے اور شاہ جہاں کے منصبداروں میں تھے۔ اگر ایسا ہو تو عہد شاہ جہاں کی کسی نہ کسی کتاب میں شاعر، خطاط، عالم یا منصبدار کی حیثیت سے ان کا ذکر ہونا چاہیے۔ مجھے باوجود تلاش کسی کتاب میں تذکرہ میر حسن کے سوا میر امامی ہروی کا حال نہیں ملا، میں نے ایک صاحب سے جن کا یہ دعوی تھا کہ میر امامی عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے، دریافت بھی کیا کہ اس دعوے کی کون سی سند ہے، لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اگر کسی صاحب کو میر امامی کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ میں نہایت ممنون ہوں گا۔

قاضی عبدالودود

محکمہ (۱) دیوان معروف و دیوان جوکسن وغیرہ از ق ع ع د (۲) مخمس مصحفی وغیرہ، از ڈاکٹر شادانی و ق ع ع د (۳) گوتی، از ڈاکٹر شادانی و اعجاز فسنوی (۴) معیار کی زبان، از ڈاکٹر شادانی۔

دیوان معروف

ص ۱۵ ۔ شعر خاصے سن و لے معروف + یہ تو بیٹھیں تھا جس پر سیرا = بیٹھن، دوپٹہ جس میں گوٹا کناری یا قیمتی کپڑے رکھ کر لپیٹتے ہیں۔

ص ۱۶ ۔ مکو جب کہ تیرے تبسم کا آپڑا + گلشن میں جھٹ غنچہ گل کھل کھلا پڑا = غنچہ کا دل ؟

ص ۲۰ ۔ یوسف اوکاں ملاحت حسن کے بانٹے ہوئے + دیکھتا تجھ کو تو پھر تیری سی صورت مانگتا = ؟

ص ۲۹ ۔ گرچہ واحد میں ہوں دو پر دونوں کی ایک + دیکھنے میں دو ہیں آنکھیں ہے نظر دونوں کی ایک، واحد بیچوں ل (دو)۔

ص ۸۵ ۔ مجھ کے کیجو تمک اس دل کو چاک شل ایاز + بجائے دانہ ہم اس میں شہ (ر) کھتے ہیں = انار

ص ۸۷ ۔ قسم دیکر فضا کی آدمی سے میں نے جو پوچھا کہ سچ بتلا وہ مجھ کو تجھ میں بھی یاد کرتے ہیں = کہا اس نے کسی کے دل کی کیا معلوم ہے لیکن + تمہارا ذکر ہمسا ہے تو اکثر آہ کرتے ہیں، بھرتے۔ نظمہ بند اشعار میں علی الخصوص جب ان کی تعداد بہت کم ہو قافیے مختلف ہونے چاہییں۔

ص ۹۱ ۔ تحقیق ہی پڑجائے ہے کل جن کو تو پھرو + معذور رہیں نظارۂ دیدار سے آنکھیں = ہے، گل۔

ص ۹۲ ۔ روزی پہنچی ہے دستک ہم پہ اس کی عشق نے + دم بدم کرتا ہے خوں دل طلب غم ان دنوں،

روزی پہنچے ہے دستک ہم پہ اس کے عشق کی ؟

ص ۹۲ ۔ شاخ نرگس کے قلم سے اس کی یاد بیشم میں + برگ گل پر میں لکھا کرتا ہوں صاحب ان دنوں۔ صاحب قافیہ طاقت، حلاوت،

ص ۹۶ ۔ منع مت کر مجھ کو ہمدم، روز تو سستی دکھا + بھید یہ ہے، از عشق اس میں عیاں ہوتا نہیں، ؟

ص ۹۸ ۔ تم کو پاس غیر ہے کب پاس جا دو گے ہمیں + دور ہی بیٹھی کے گو ہم کو اٹھا دو گے ہمیں۔ دور بھی بیٹھیے گو ہم تو۔

ص ۹۹ ۔ کیوں نہ تاب رخ سے ہوئے مہر وش خط کی بہار + یعنی رہتا ہے تر اکثر جو انشا دھوپ میں، وجوانسا یہ ایک رخت ہے جو دھوپ ہی میں شاداب رہتا ہے۔ مصحفی اپنی مثنوی گلبن لکھتے ہیں: سادہ سبزے سے رشت دھوپ ہے، سبزہ سودا ک جوانسا ہے۔

ص ۱۰۳ ۔ خنجر عشق بری جاں تیز دستی ہے + عبث پڑھائی ہے یوں حاجت کمان نہیں = مرحبا تیز دستی

ص ۱۰۰ ے اگر اُڑ، ہو نشہ پی کر کہیں لائے نہ فعل ✤ تو ابھی تم سا تھ اپنے لے پلا کر دیکھو تو ۔ فیل
ص ۱۰۸ ے ایسا نہیں ہوا غم غفور کار گر ✤ جس سے جگر میں کاسۂ چینی کی ہو نہ ہو ۔ نکے ، سو
ص ۱۰۹ ے مست ہے کہنے کے جانے کا رنج لے زاہد ✤ نہیں جو ہوئے پیدا تم اس سے راہ کرو ۔ ؟
ص ۱۱۱ ے برگ گل توڑے ہے اور دعوی عشق لے بلبل ✤ دیکھ تو بھولی ہوئی آنکھوں سے مقدار کو تو ۔ بھولی
ص ۱۱۲ ے گرچہ سب باتوں سے ثابت ہوئے لیکن معرف ✤ دیکھ لیتے ہیں کن آنکھوں سے طرحدار کو تو ۔ تائب انکھیوں
ص ۱۲۰ ے دل میں یوں یاد ہے اک پردہ نشیں کی ہم ✤ جیسے ذاکر ہو پڑا ذکر خفی کا کوئی ۔ بڑا
ص ۱۲۴ ے جو سوز غم کی لکھوں اپنے داستان ساری ✤ تو بیچ شانہ میں جل جائیں انگلیاں ساری ۔ مذکرہ باطن میں اس طرح ہے
تو بیچ شانہ نہیں جل کے الخ ۔ میں کی جگہ ہو بھی ہو سکتا ہے ایعنی اس طرح تو بیچ شانہ ہو جل جائیں الخ
ص ۱۲۴ ے لگا ہے اُس بت سفاک سے دل اپنا جدا ✤ کہ جس سے مانگتی ہے خلق الاماں ساری ۔ خدا ، یا ، خود آ ؟
ص ۱۲۷ ے زلفوں ہی میں پھنسنا ہے بلا سے یہی سہی ۔ پھنسائے
ص ۱۴۰ ے مشہ اب تیرے تو پی کے اہل بزم کو دیکھ ✤ جو قصد قتل ہے تیغ نگہ کو آب تو دے ۔ تیز ، سی
ص ۱۴۰ ے تو بلا شوخ طبع ہے اے رحم ✤ غم زدوں کو ہنسا یا تو نے ۔ زخم
ص ۱۴۵ ے کیونکر ایسے ملاقات کی تدبیر بنے ✤ جیسے بوخوئی کے مانی سے نہ تصویر بنے ۔ جس کی کی
ص ۱۴۹ ے جب سے پہچانا الف تب سے وہ قامت یاد ہے ✤ راستی ہو کر رہتی بھی قیامت یاد ہے ۔ اپنی
ص ۱۶۲ ے کیا کرے اس میں تمنا کوئی خواص آہنگ ✤ دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ ۔ شنا کا کوئی خواص
ص ۱۶۵ ے کیا اے عزیز وقت تھے تم عدم سے ✤ اس گلشن جہاں کو جائے قضا سمجھ کر ۔ تم یہاں ، فضا
ص ۱۶۹ ے یوں تپ غم میں جوانی گئی ہیات شتاب ، بیہمات ۔
ص ۱۶۹ ے کتبۂ چشم مقنی کو لو یا دام نہ بھیج ۔ کشتۂ تو ۔
ص ۱۶۹ ے دیکھ کر محفل میں سب کو عارض جانانہ شمع ✤ کرکے داشعلہ کی بال و پر ہوئے پروانہ شمع ۔ شب کی بھی
ص ۱۷۱ ے طفل اشک گر گاں چشم تر نکالے ہے ✤ یہ چور اب تیلیوں کی تاج میں ہاں سر نکالے ہے ۔ جو طفل ، تیلیوں
ص ۱۸۱ ے جو رات بام پر اپنے وہ رشک ماہ چڑھے ✤ چمار ، ہم کس کے پھر نگاہ چڑھے ۔ مہ چمار ، ہم
ص ۱۹۹ ے کسی فقیر نے جو شش ہیں تم پہ سارے لوگ ✤ تو ہنس کے بولے کہ اک رشہ لگ پیارے لوگ ۔ اکثر
کوئی صاحب اس شعر کا مطلب بیان فرمائیں ۔
ے عکس منہ پانی میں دیکھے ہے تو وہ یاد شیخ ✤ منہ کو دھوتا ہے کہ صورت مری گوہی ہو جائے ۔
گلشن بیخار میں ایک مطلع اور ہے جو مطبوعہ دیوان معروف میں نہیں ۔

ے مے کے پینے سے تو ہر چند بنا ہی توبہ + پر رمضاں سے وہ خجل ہوں کہ الٰہی توبہ ،

دیوان جو شش کے متعلق لکھا گیا تھا کہ اس میں غزلوں کے کل اشعار کی تعداد ۳۷۵ اور ۳۷۷ اشعار ایسے ہیں جنھیں کاتب نے لکھ کر خط زد کر دیا ہو ان اشعار میں ۲ ایسے ہیں جو کہ رد ہونے کی بنا پر کاٹ دیے گئے ہیں، اس لیے در اصل ایسے اشعار کی تعداد ۵۵ ہے ۔ ۷ شعروں کی ایک غزل ایسی بھی ہے جو قلم زد نہیں لیکن حاشیے پر اس کے متعلق لفظ خارج لکھا ہوا ہے ۔ مطلع یہ ہے :

ے محبت ابھری ہو گئی ہوا ہوائے ہوا + ہمارے خانۂ دل میں نہیں ہے جائے ہوا ،

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کاتب عیار نے محمد قلی خاں مشتاق کا نام غلطی سے محمد علی خاں مشتاق لکھ دیا ہے ۔

مارچ کی اشاعت میں دریائے لطافت مطبوعہ مرشد آباد کے سرورق کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا سال طبع ۱۲۶۶ھ ہے، لیکن تمہید کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے اُس کا آخری مصرع یہ ہے " گفتا این ہست دریائے لطافت " (مارچ کی اشاعت میں این است کی جگہ این ست چھپ گیا ہے ۔ اس غلطی کی اپریل کے پرچے میں تصحیح کر دی گئی ہے) ۔ اس سے ۱۲۶۷ نکلتا ہے ۔ جناب خیال فرماتے ہیں کہ این ست ہی صحیح ہے ۔ الف کا اضافہ کاتب نسخۂ مرشد آباد کی غلطی ہے ۔ اس صورت میں مصرع آخر سے بھی ۱۲۶۶ ہی نکلیگا ۔ اور اختلاف دور ہو جائیگا ۔

دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ سال تکمیل ہے ۔ کتاب کا آغاز شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۱ نسخۂ مطبوعہ ۱۹۱۰ء " شاہ عالم بادشاہ غازی ۔ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ " شاہ عالم کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے تذکرۂ ہیجگر کا حال فہرست بلمارت میں صفحہ ۳۰ پر درج ہے نہ کہ ص ۳۴ پر جیسا کہ کاتب کی غلطی سے درج ہو گیا ہے ۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تذکرۂ باطن کا نام اشپرنگر نے گلشن بے خزاں لکھا ہے، یہ صحیح نہیں ۔ اس کا ایک نام گلستان بے خزاں ہے اور دوسرا نغمۂ عندلیب ۔

مخمس مصحفی وغیرہ

از ڈاکٹر عندلیب شادانی ، قاضی عبد الودود

(۱) مخمس مصحفی " مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ یہ بات بے حساب " آپ کا خیال ہے کہ موجودہ صورت میں صحیح غلط ہے، میرے نزدیک اس میں کوئی غلطی نہیں ۔ " بے حساب بات ہے " کے معنی ہیں لغو بات، نامعقول بات، فارسی میں بھی ایک محاورہ ہے " حرف حسابی زدن " یعنی معقول بات کہنا ۔ عجب نہیں کہ اردو میں یہ محاورہ فارسی سے آیا ہو ۔ اب آیئے مطلب کی طرف ۔ پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ " کسی نے جھوٹ یا سچ شہزادے کے کان میں پھونک دیا کہ مصحفی نے آپ کی ہجو کہی ہے، اس اوہام سے اپنی بریت کے لیے مصحفی نے اپنا مشہور قصیدہ رائیہ ... لکھا " مطلب شعر کا یہ ہے کہ اے بادشاہ تو

یہ انصاف کرتا کہ حقیقت حال دنیا پر روشن ہو جائے اور سب کہیں کہ یہ بات کہ مصحفی نے سلیمان شکوہ کی بحر کو محض لغو ہے' اس لیے مصحفی تو کسی کی بحر نہیں کیا کرتا وہ تو مدح گو ہے'۔

دوسری چیز اس میں قابل لحاظ 'نہ' کا املا ہے' میرے نزدیک 'نا' لکھنا چاہیے۔ امروہے کے لوگ آج بھی ناہی بولتے ہیں' نہ صرف امروہے میں بلکہ پورے ضلع مراد آباد میں (امروہہ مراد آباد کا سب ڈویژن ہے۔) عوام الناس 'ناہی' ہی بولتے ہیں۔ ہائے مختفی شورٹ دو دل کے اظہار کے لیے لکھی جاتی ہے اور لونگ دو دل کے لیے الف ضروری ہے۔ جو لوگ نا بولتے ہیں وہ کھینچ ہی کر بولتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مصرعے میں وزن کا لحاظ کرتے ہوئے بھی ناہی چاہیے۔

(۲) غزل آصف الدولہ۔ "پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں" اس کی جگہ "پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں' ہونا چاہیے' ورنہ مصرع بے معنی ہو جائیگا۔ شمس النسا بیگم کی غزل میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے۔

(۳) مثنوی میر حسن "عیش کی ہر طرف بجھتی تھی بساط" میر حسن نے ایسا نہیں کہ طرف بہ سکون رائظم کیا ہو۔ غالباً انھوں نے سمت لکھا ہوگا۔ کیا میر حسن کے کلام میں کہیں اور بھی یہ لفظ اس طرح استعمال ہوا ہے؟ اسی مثنوی کے اس مصرعے میں یہ لفظ صحیح تلفظ کے ساتھ نظم ہوا ہے "شعلوں کے ہر طرف' روشن تھے چراغ"۔

"شعر کا بھی غرض طرفہ ہے یہ فن' جب تک غرض کو بہ سکون' انڑ پھیں مصرع سوزوں نہ ہوگا۔ میرے نزدیک حسن نے مصرع اس طرح لکھا ہوگا "شعر کا بھی ہے غرض طرفہ یہ فن"

(۱) تاسب کہیں الواس مصرعے کے متعلق میں نے صرف اپنے شبہے کا اظہار کیا تھا کہ صحیح نہیں معلوم ہوتا' کوئی قطعی رائے نہیں دی تھی۔ اس کی صحت میں شبے کی کئی وجہیں تھیں' ایک تو مصرعے کی بندش پست نہیں۔ دوسرے یہ کہ "بے حساب بات" لغو یا نامعقول بات کے معنی میں نہ لغت میں ہے اور نہ کسی شاعر کے کلام میں آیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے خود مصحفی نے بھی کسی دوسری جگہ لفظ بے حساب اس معنی میں استعمال نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ شعر میں نہ کی جگہ نا پڑھنا کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم یہ خوبی ممکن ہے کہ مصحفی نے اسی طرح لکھا ہو۔ رہا لفظ نہ کو نا کھنا' اس کے متعلق گزارش ہے کہ کسی لفظ کو ہائے مختفی سے لکھنا اور اس طرح پڑھنا کہ گویا الف سے لکھا ہوا ہے اردو اور فارسی میں کثرت سے رائج ہے۔ دیوان کے قلمی نسخوں میں بھی اسی طرح درج ہے جیسا کہ معیار میں ہے۔

(۲) پڑے راستہ الخ یہ مصرع دیوان جہاں نسخۂ لندن میں اسی طرح ہے' لیکن جناب سخاوانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ راستہ صبح دم کی جگہ راہ تا صبح دم ہونا چاہیے۔ ابھی حال میں یہ بات بھی میں نے دریافت کی ہے کہ یہ شعر دیوان مصحفی اول یا سوم میں بھی خفیف اختلاف کے ساتھ موجود ہے' اور صرف یہی نہیں ایک اور شعر بھی جو آصف کی غزل میں ہے مصحفی کے دیوان میں پایا جاتا ہے۔ دونوں شعر حسب ذیل ہیں:

تو آئے نہ آئے ولے ہم تو ہر شب ۔۔۔ تری راہ تاصبح دم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے ۔۔۔ بھلا یہ بھی تیری قسم دیکھتے ہیں

'میاں' یا 'یہاں' سے 'دلے' بہتر ہے، اور پڑے راہ پڑی راہ کو ترجیح ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں شعر غلطی سے جاں نے آصف کی طرف منسوب کر دیے ہیں، اور در اصل مصحفی کے ہیں۔

(۳) طرف کو حسن نے دوسری جگہ بھی بسکون راء نظم کیا ہے، مثال یہ ہے:

سب طرف سے ہاتھ اٹھا کے اک دم ۔۔۔ سر بر قدمت نہادہ بودم ۔۔۔ افسوس کہ روزگار نگذاشت

شیخ محمد عابد دل معاصر حسن کا مطلع ملاحظہ ہو:

مُنہ دیکھ اس طرف دو خالم مبادا دیکھتا ہی ہو ۔۔۔ دل اپنی جان کا دشمن تو مت خواہی نہ خواہی ہو

لفظ غرض حسن نے بسکون راء لکھا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ مشکل ہے، لیکن جب طرف بسکون راء استعمال ہو سکتا ہے تو غرض بھی ممکن ہے کہ اسی طرح حسن کی زبان پر ہو

گومتی

(۱) از ڈاکٹر عندلیب شادانی (۲) از اعجاز نسنوی

(۱)

"اور اگرچہ آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر غازہ مل کر الجھ۔ سرمہ اور غازہ دونوں کے لیے فعل مل کر استعمال کیا گیا ہے، حالاں کہ سرمہ لگانا معاوضہ ہے، سرمہ ملنا نہیں۔ لہٰذا انھیں ایک ہی فعل کے تابع ہونا چاہیے تھا۔

(۲)

اس قصے میں ایک بات بالکل سمجھ میں نہ آئی۔ گومتی شہزادے کے محل میں بچے کو لے کر واپس جاتی ہے، اس موقع پر لکھا ہے کہ "اگرچہ گومتی شاہزادے کو بہت عزیز تھی .. لیکن یہ الفاظ اس سے کسی نے نہ کہے" گومتی 'میرا جذب دل تجھے پھر کھینچ لایا ہے' "بچے کی پیدائش کے بعد گومتی نے نہایت صبر کے ساتھ .. شہزادے کی سرد مہری کو برداشت کیا" گومتی اگر شہزادے کو بہت عزیز تھی تو پھر شہزادے کی سرد مہری اسے کیوں برداشت کرنی پڑی؟

[معیار: اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اصل قصہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، اس لیے ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ غلطی مصنف کی ہے یا مترجم کی]

معیار کی زبان

از ڈاکٹر عندلیب شادانی

صحت زبان کا جہاں تک تعلق ہے آپ کو زبردست کامیابی ہوئی ہے۔ عموماً اردو کا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں

زبان کی وہ ڈھائی سو غلطیاں نہ ہوتی ہوں۔ معیار میں زبان کی غلطیاں بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے بھی اکثر نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن معیار چونکہ زبان کے معیار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس لیے ہر وہ چیز جو مجھے کھٹکی آپ کو بتا دوں گا عام اس سے کہ اس کی اہمیت کم ہو یا زیادہ۔

ص ۱۹ "سانپ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے" اتنی زبردست کہ باوجود خواہش اور ارادے کے انسان اس کے زیر اثر آجاتا ہے" باوجود غالباً "ان اپنائٹ ادھ" کا ترجمہ ہے، یہ اس جگہ بالکل غلط ہے۔ برعکس یا خلاف ہونا چاہیے ورنہ مطلب بالکل الٹ ہو جائے گا۔

ص ۲۰ کرایت صحیح نہیں کراہت چاہیے

ص ۲۲ "میں اتنا بزدل نہیں کہ خود اپنے نزدیک خوف زدہ معلوم ہونے سے ڈروں" اس کا کیا مطلب ہے؟

ص ۲۲ "یکایک یہ پراسرار دلکش منظر تیزی اور آہستگی سے اوپر اٹھتا ہوا معلوم ہوا" تیزی اور آہستگی متضاد صفتیں ہیں یہ یک وقت تیزی اور آہستگی سے اٹھتا کس طرح ممکن ہے؟

ص ۲۲ "ایک لمحے کے لیے اسے سکتہ سا ہو گیا" اور آنکھیں بند کیے چہرہ زمین پر رکھے وہ پڑا رہا" وہ آنکھیں سے پہلے آنا چاہیے۔

ص ۲۲ "کیوں خدا کی پناہ الخزیہ کیوں" رائی" کو سحر معلوم ہوتا ہے" مگر اس محل پر جب کہ حیرت و استعجاب کا اظہار مقصود ہے استفہامیہ "کیوں" درست نہیں، اس کی جگہ خوب! اچھا! ماشاء اللہ سبحان اللہ وغیرہ میں سے کوئی کلمہ ہونا چاہیے

ص ۲۲ "دو دو سیڑھیوں کو تڑپتا ہوا وہ پلٹ میں آیا" سیڑھیوں کو تڑپنا کیا معنی؟ ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں طے کرتا ہوا، یا دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اس مفہوم کو ادا کر سکتا ہے (تڑپنا چاندنے کے معنی میں لغت میں موجود ہے۔ معیار)

ص ۲۲ "بوتا" یوپی میں جو سا بولتے ہیں لیکن ہی کہتے ہیں، بلکہ جو سا میں ہی کا مزید علیہ ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ن کا خانہ درست نہیں۔ شاید یوپی کے باہر ہی طرح بولتے ہوں (اعتراض صحیح ہے، ہمارے یہاں بھی اعلان نون کے بغیر ہی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ن کے ساتھ بولتے ہیں۔ معیار)

ص ۲۵ "میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا" ص ۱۳ کوئی رقعہ اٹھا نہیں رکھا ص ۱۳ بہتر ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں" نہیں کی جگہ نہ چاہیے۔

ص ۲۵ "میں اپنے وجود کی سراپا تصویر بن کر رہ گیا" سراپا میں کے بعد آنا چاہیے" بلکہ موجودہ سراپا تصویر کی صفت معلوم ہوتا ہے۔

ص ۲۵ "اجنتہ کی بستی" جن کی جمع اجنہ بالکل غلط ہے، جنوں کی بستی لکھنا چاہیے۔

ص ۲۵ "صدائے درخواست" بر نہ خاست چاہیے یہ کتابت کی غلطی ہے جس کی تصحیح نہ ہو سکی (معیار)

ص ۲۰ "اور میں اس کو بھیج کر وہاں چلا گیا" اگر میں اس خیال سے تم کو خط لکھنا چاہتی" ضمیر جب مفعولی حالت میں ہو تو اس کے ساتھ کا کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ اسے نہیں بولتے ہیں۔ جلیل اور ریاض کے کلام سے ایسے موقع پر کو کے استعمال کی سند دی جا سکتی ہے لیکن یہ کہ اسکو کی جگہ اسے اور تم کو کی جگہ تمہیں بہتر ہو لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کو کو بھی جائز ہے: وصہ شرمیں اللہ کہ تم کو اور پھر اعتمد تمہیں گھر سے جو تم کو (معیار)

اقتباس

خسرو کی ہندی شاعری

خسرو کی ہندی شاعری (ماخوذ از حالات و تصانیف خسرو' مصنفہ ڈاکٹر وحید مرزا ایل۔ ایچ۔ ڈی) زمانۂ حال کے مصنف ان ہندی اشعار کو جو خسرو کے نام سے قدیم تذکروں میں درج ہیں خسرو کی طرف منسوب کرنے میں تامل کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشعار جس زبان میں ہیں وہ کھڑی بولی سے بہت مختلف ہے اور قدیم ہندی کے جو مسلم الثبوت نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے مشابہ نہیں۔

خسرو ہندوستان میں پیدا ہوئے ان کی ماں ہندوستانی نژاد تھیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھی طرح ہندی جانتے تھے، چنانچہ خود فخریہ لکھتے ہیں:

"ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب ۔ شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن" (دیباچۂ غرۃ الکمال)

ان کے فارسی اشعار میں ہندی الفاظ مثل یا محاورہ، دھان، مار مار کنار وغیرہ ملتے ہیں:

"سرآں دو چشم گردم کہ چو ہندوان بہ زنان ۔ ہمہ رابہ ناوک مژگاں بجگر نشانہ کردہ"

یہ صحیح ہے کہ ایسے الفاظ فارسی کلام میں کثرت کے ساتھ نہیں ملتے، لیکن اس کی وجہ جیسا کہ وہ خود دیباچۂ غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں یہ ہو کہ فارسی میں خود بخود ہندی الفاظ داخل کرنا انھیں پسند نہ تھا۔

رہا یہ سوال کہ خسرو نے ہندی میں اشعار کہے یا نہیں۔ اس کا جواب خود خسرو کی زبان سنیے:

"جزوے چند نظم ہندی نیز نثر دو ہستاں کردہ شد، ست ایں جا بہ ذکرے اسندہ کردم" (دیباچۂ دیوان سوم)

خسرو کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں، جن میں ایسے الفاظ ہیں جو ہندی فارسی دونوں میں یا مشترک ہیں۔

آری آری ہمہ ہیاری آئی ۔ ماری ماری برہ (کہ) ماری (آئی)

رباعی ذیل بھی خسرو کی طرف منسوب ہے لیکن کسی قلمی نسخے میں مجھے نہیں ملی:

"دلم بہ تماشائے کنار جوئے ۔ دیدم بہ لب آب دو ہندوئے
گفتم صنما بہائے رفتت چہ بود ۔ فریاد برآورد کہ دور دور موئے"

موجودہ مواد کی مدد سے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ خسرو کا ہندی کلام کس قدر تھا۔ بعض اصحاب کا یہ قول کہ ہندی کلام مقدار میں فارسی اشعار سے زیادہ تھا۔ مبالغے سے خالی نہیں، کیونکہ خود خسرو کے قول (دیباچۂ دیوان سوم) سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ خسرو نے جزوے چند لکھا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مقدار میں

زیادہ نہ تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دیباچہ نگار کی تحریر کے بہت بعد تک خسرو زندہ رہے۔ اور انھوں نے اپنے ہندی کلام میں ضرور اضافہ کیا ہوگا۔ قیاسی کلیہ قبول بھی ہو تو یہ نہیں کہ خسرو بڑھاپے میں ہندی گوئی کی طرف مائل ہوئے اس لیے کہ غرۃ الکمال کی تدوین کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی، اور ہندی گوئی کی اس سے قبل ابتدا ہو چکی تھی۔

بہ قسمتی سے خسرو نے اپنے ہندی اشعار کی قدر نہ کی (اور ان کو جمع کرنے کی کوئی فکر کی۔ خسرو ہندی محض تفنن طبع کے لیے کہتے تھے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میرزا غالب کے زمانے تک فارسی گو شعرا اپنے ہندی کلام کو چٹکلے خاطر میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ میرزا غالب جن کی شہرت کا دارومدار ان کے دیوان اردو پر ہے کہتے ہیں:

"فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ ✤ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است"

یہ یقین ہے کہ خسرو نے ہندی اشعار کا دیوان مرتب نہیں کیا، اور غالباً قدیم العصر اشخاص میں سے بھی کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہی اشعار باقی رہ گئے ہیں جو زبانی نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے چلے آئے ہیں یا بیاضوں میں نقل ہوا کیے ہیں۔ کچھ دوہے، کچھ پہیلیاں، ایک غزل جس کے اشعار میں یہ التزام ہے کہ ایک مصرع فارسی ہے، اور دوسرا ہندی، ایک مخمس جس کا ہر پانچواں مصرع فارسی ہے، چند رباعیاں اور رسالۂ خالق باری یہی چیزیں ہیں جو آج کل خسرو کی طرف منسوب ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ تذکروں میں نقل ہوتا چلا آیا ہے اور قدیم تذکرہ نگار بلا تامل فیض خسرو کی ملک سمجھ لیتے تھے۔ لیکن آج کل یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ اشعار اس زمانے کی زبان میں ہیں۔ خسرو تیرہویں صدی عیسوی میں کیوں کر اس زبان سے آشنا ہو سکتے تھے جو آج کل فوج دہلی میں بولی جاتی ہے، اور کسی قدیم ہندی مصنف نے یہ زبان کیوں نہیں استعمال کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اول تو یہ علم نہیں کہ خسرو کے زمانے کی ہندی کیسی تھی، خسرو کے اشعار کے علاوہ کوئی اور نمونہ موجود نہیں، گو یہ علم ہمیں ضرور ہے کہ خسرو کے زمانے میں ہندی یا ہندوی نام کی ایک بولی دہلی اور نواح دہلی میں رائج تھی، اور یہ اس قدر ترقی یافتہ تھی کہ نظمیں اس میں لکھی جاتی تھیں (نہ سپہر، عشیقہ) یہ یاد رکھنے کی کیا وجہ ہے کہ خسرو کے زمانے کی زبان آج کل کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ زبان جب ایک شکل اختیار کر لیتی ہے تو بہت کم بدلتی ہے، ہندوستان میں اس کی اور بھی کم وجہ ہے کہ اجنبی زبانوں کے اثر سے یہ ملک بہ نسبت دوسرے ممالک کے زیادہ محفوظ رہا ہے، جب ہندوستان کے باشندوں کی یہی حالت ہے، رسم و رواج اور معاشرت اب بھی وہی ہے جو تیرہویں صدی عیسوی میں تھی تو یہ کیوں مان لیا جائے کہ ان کی زبان ان کے ابتدا کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ ان وجوہ سے یہ کہنا قرین عقل نہیں کہ یہ اشعار جعلی ہیں گو یہ بخوبی ممکن ہے کہ لوگوں نے ان میں ردوبدل کر دیا ہو اور کچھ اپنی طرف سے بھی ملا دیا ہو۔ اس کا پتا چلانا کہ خود خسرو نے کیا لکھا تھا اور دوسروں نے کیا کچھ اپنی طرف سے ملا دیا ہے مشکل ہو لیکن یہ تعین کرنا چاہیے کہ وہ اشعار جو سب سے زیادہ مختلف ہوں گو، وہ انھیں خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ایک ایسا سرچشمہ

انسانوں کی شبیہ کھینچتا ہے، اُس کی طرف شبیہیں منسوب کی جا سکتی ہیں۔ لیکن مناظر قدرت کی تصویریں اس کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ ان اشعار کی ذاتی خوبی، اور اسلوب بیان کی جدت کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ضرور کسی بڑے اُستاد کے کہے ہوئے ہیں، اور اس قدیم روایت کو کہ خود خسرو ان کا مصنف ہے مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ چوں کہ ان اشعار کی تعداد کم ہے یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ الحاقاً اشعار زیادہ ہوں،

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خسرو کے اشعار کھڑی بولی میں ہیں اور قدیم ترین نمونے ہندی ادب کے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ہائی ہندی ( ) میں ہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خسرو کی سب بڑی خصوصیت جدت طرازی ہے، وہ قدماء کے نقش قدم پر چلنا پسند نہیں کرتا، بلکہ اپنی راہ خود نکالنا چاہتا ہے۔ ہندی میں اس نے تفنن طبع کے طور پر لکھا، اور اس کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ اس زبان میں کوئی ایسی نظم لکھے جس سے اس کی یاد قائم ہے اور جو پہیلیات کی طرح مستند سمجھی جائے۔ اس لیے اس نے بالکل وہ بول چال کی زبان کو شعر گوئی کے لیے منتخب کیا، اور جب تک مقرض کوئی خاص ثبوت نہ پیش کرے، خسرو کے ہندی اشعار خسروہی کے سمجھے جائیں گے

(مصنف نے خاکسار کی رائے کے متعلق مخالف اور موافق رائیں نقل کر کے یہ لکھا ہے کہ قطعی فیصلہ موجودہ مواد کی مدد سے نہیں کیا جا سکتا، اور کتاب اس پایے کی ہے بھی نہیں کہ اس کے متعلق مناظرے میں وقت صرف کرنا مفید ثابت ہو سکے

معیار)

مُراسلت

"بھارتیا ساہتیا پرشد کی اصل حقیقت"

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے جاننا چاہیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر ہنسیں بھی ہوں گے۔ اس لیے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن" اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں "ہندی ساہتیا سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو پرشوتم داس ٹنڈن تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شان نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے، جو بیان کی گئی اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا، اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیا ساہتیا پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیوں کہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیا سمیلن منعقدہ ٹرود میں سب سے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجا ٹرود نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پرزور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر منشی کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جامع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنھیا لال منشی، ہری ہر شرما اور گردھاشرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹ ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیکر، ہری بھاؤ آپادھیائے اور بابا راگھو داس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیا کے لیے ایک مہاراشٹ کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیا سمیلن کو بھارتیا ساہتیا سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس پرشد کا ادیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں)

اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرانا اور اس نام سے بھارتیا ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مدد گار ہونا
(ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندوستانی' میں ہوگا .....

اس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی 'پہلا کام یہ کیا کہ ایک "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا' اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اسے رشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مؤرخ مسٹر کنھیالال منشی بھی اس کی ایڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیا ساہتیہ پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی میں آپ کو اس کے پہلے جلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۷ء کو تقریباً ۱۰ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیکر نے اپنا ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ ایڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے' زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جزسے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندوستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ آمدین نشنل کانگریس نے اپنے ریزولیشن میں یہ لے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تجویز پیش کی اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنے۔ فرمانے لگے کہ کانگریس کا ریزولیشن بھی میں نے ہی "بنایا تھا" میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اس وقت ہندوستانی کے معنے ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنے بتا دیے ہیں جو ہنس کی تجویز میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زود رنجی ہے۔ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیکر صاحب نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا "تاکہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجایش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم "اردو" لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندوستانی" سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی' یہ تو آپ کی خواہش یا منشا ہے۔ اس سوال کے

جواب میں کہ ہندی کون سی زبان ہے اور ہندوستانی کون سی مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی اودی زبان ہے اور عام لوگ کہتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا اپنے مطبوعہ ایڈیٹر میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں ان فارسی الفاظ کو جو زبان میں رچ گئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

تیسرے پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رہنے دیں یا ہندوستانی کا ہندی ہندوستانی کے کوئی معنی نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا مجھے ہندی سیکھن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو ڈھیلی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ زیر بحث میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیوں کہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لیے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھیے اور میں اس کی تائید کروں گا اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کھیالال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سیکھن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا جو اس وقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف تھی۔ اگر ہندی سیکھن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جس کا انہیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم خاطر منظور کرنی پڑتی۔ گرمہاتما گاندھی بجا رتیا ساہتیا پرشد کو ہندی سیکھن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پائیں حالانکہ بقول منشی پریم چند یہ خیالی صبح ہیں۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سے پہر کو ایک گفتگو بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا کتنا بدلنا چاہیے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات

کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کچھ لال منشی اور دو ایک اور اصحاب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہارتھیوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت ریزولیوشن پیش نہ کر دیں، رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا ریزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا۔ اس لیے اصلاح پسند نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر معترض تھے۔ ایک ایک بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ ان میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیا ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی اور ہندی کے معنی ہندوستانی بنانے میں، پھر "ہندی ہندوستانی" کے جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے ہیلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروک میں داخل ہو گیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لیے ان کے پاس جواب موجود ہے، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی ہندوستانی" گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندوستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انھیں حیرت ہوئی، ہنس کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں"۔ اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیا ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیا ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی اور اس کا پہلا اجلاس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی"۔ کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیا ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا

(قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے۔ تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں۔"

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیا ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے۔ جس میں وہ اور ہندی سیکن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انہیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سیمن کا اجلاس تجویز ہوا تھا۔ تاکہ ہندی سیکن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے سلسلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بدرل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اس گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمایندوں نے یہ کہا (اور غالباً ان کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ ان سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لیے زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے اس خیال کی تائید کاکا کالیکر کے ایڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لیے عام فہم ہوگی ہمارے لیے مشکل ہے۔ ..... وہ ہندی بھی جو دلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ بھی ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ ... کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ دیہات سے آنے والے نمایندوں کے لیے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں۔"

اس دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کیے جائیں جو ہندی بنگالی گجراتی مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو لاکھ ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ کر ایسی ہو گئی ہیں کہ

ایک لفظ ہونے پر بھی ان کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرکبی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری ان مبتدیوں کے لیے کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادب کی ضروریات کے لیے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ میں ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے جن لیے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لیے جائیں اور ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترکہ سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے۔ انہوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے بجائے ہندوستانی قرار دیے ہیں۔ جو درست نہیں۔ اردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیا ساہتیا پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں ضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن ہنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیا پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے اور اس لیے اس سے نہ صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے، تلفظ کی سہولت نے ان کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ شلاگرام کا گانو ہو گیا۔ درش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہار شیخی ہے

یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انہیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ حبیب صاحب نے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنھیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کرانیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے ان میں اردو کا عنصر تقریباً بعد دوم ہے۔ حبیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور "میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انہیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لیے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خاص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ (مسلمان) اور ان کی تمام خدمات جو انہوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں، ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے الہ آباد میں ہندی یونیورسٹی کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا۔ یعنی وہ زبان ہندی ہو گی کیوں کہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہٰذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ فرقہ وارانہ تصفیہ کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر حبیب نے چند امور خاص طور پر جماتا ہی کے غور کے لیے پیش کیے ہیں اور ان سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں وہ امور یہ ہیں:—

۱— ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہو گی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

۲— ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہو گا۔

۳— لفظ کا معیار اس کا رواج ہو گا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

۴— تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کیے ہیں مورد تسلیم کیے جائیں۔

۵— اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے نظری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔

۶— دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کیے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے

کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو' دونوں فطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخل دفتر ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ حبیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو مندرجہ صاحب کے بیان پر اعتراض ہے' ان کا یہ مطلب تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا' سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی ان کے اور ان کے رفقا کے رویے سے پیدا ہو گئی ہے اسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم' مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر سیف محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سراسر غلط بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر جنبہ یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کر لیتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے میں نے ایک آدھ بار نوٹ کر کے یہ ہندو مسلم سوال نہیں، بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے' وہ اردو کے ادیب ہیں' اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لیے اس بحث کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال غلط پٹڑی پر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا۔ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اس وقت بولی جاتی تھی اور اس لیے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے۔ اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے

حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اُردو تو اُردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور بھنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں جو بر سر اجلاس ہوئی تھی ایک بار یہ بھی کہی بار فرمایا کہ اگر یہ ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔ لیکن ان کو نیشن کانگریس کے ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت (change of heart) کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جن اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل کا تو ڈوجوڑ اور دانوپیچ کا باعث ہمارے ملک کی بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو تھک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی۔ لیکن جب انہیں اس کی توقع نہ رہی یا انہوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی میں چھوڑ سکتے تو ہم ہی اُردو میں چھوڑ سکتے ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت ترقی کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

عبدالحق

آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو

۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

سالنامہ سہیل ۱۹۳۶ء علی گڈھ، مرتبہ رشید احمد صدیقی صاحب و آل احمد سرور صاحب۔

اردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ از محمد ابو لیث صدیقی ص ۵، تا ۱۱۵، (۱۰) تمہید میں اردو کی ابتدا کے متعلق چند اقوال نقل کرکے خسرو کے ہندی اشعار لکھے ہیں۔ ایک غزل یہ بھی ہے ؎

خوار شدم زار شدم لٹ گیا + درہم عشق تو کمر ٹوٹ (کذا) ہے۔

مضمون بنگلہ ہے۔ م نے اس مصرع کی قدامت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ "چمن میں آئی ہے کیسی یہ رت مرے من کی کوئی سمجھائے" اس مصرع کے متعلق حضرت شاہ عظیم آبادی مرحوم کا قول ہے کہ خسرو سے سیکڑوں برس قبل کا ہے۔ (۲) سفل اور اوود، اس عنوان کے تحت وہ اشعار نقل کیے ہیں جو خیال مرحوم نے اکبر، نور جہاں اور زیب النسا کی طرف منسوب کیے ہیں۔ یہ بھی جو گھڑی مجھ سے بہ راہ عادت الخ اس رباعی کے متعلق م کی تحقیق ہے کہ اصلی، باعی فارسی میں ہے جو تزک جہانگیری میں موجود ہے۔ مترجم تزک جہانگیری نے فارسی، باعی کا نظم ہی میں ترجمہ کردیا۔ اور اسی طرح غلطی سے اردو کی رباعی اکبر کی طرف منسوب ہوگئی۔ نور جہاں والے اشعار خفیف اختلاف کے ساتھ تذکرہ حسن میں مہین بدایونی کے نام درج ہیں۔ (زیب النسا کی طرف جو تین شعر منسوب ہیں، م انھیں بھی مشکوک سمجھتے ہیں لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس کے ہیں، پہلے دو شعر کے متعلق تو ہم بھی سردست کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن تیسرے کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عظیم بلہوی کا ہے۔ ؎ اگر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے + خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے، معیار (۳) دکن اور اُردو، دوسرا عنوان ہے، ضمناً رسالۂ تصوف و اخلاق مصنفہ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (۷۰۶ھ تا ۸۰۸ھ) کا ذکر بھی، سالنامہ، سالہا دگار، ۱۹۳۶ء کے حوالے سے آگیا ہے۔ (م نے عمر ۱۲۰ سال، سال تصنیف ۷۰۰ھ بتایا ہے، لیکن سال ولادت صریحاً غلط ہے معیار)۔ گلشن عشق مصنفہ نصرتی کا ایک نسخہ نواب حیدر یار جنگ کے کتبخانے میں ہے اور فقیہ رضوان شاہ روح افزا کا مصور نسخہ سنوکال لائبریری گیا میں ہے (اس کے علاوہ بھی مطبوعات فراہم کی ہیں، لیکن وہ دونوں سے ماخوذ ہیں معیار) (۴) تیسرا عنوان اُردو کے قدیم نمونے ہے۔ م چند کوئی کے اشعار کی قدامت کے قائل ہیں۔ انھوں نے (۱) دوسرے پورٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وسیلی (۲) مصنفہ نرپت لال، سال تصنیف ۱۱۵۵ھ شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا۔) میں حسب ذیل عربی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں کلا (کلاہ) گھانی (قبا) جرد (زرد) وجا (واجب) تاجی (تازی) کتنگ (قسمت) وغیرہ۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء برنی میں حسب ذیل ہندی الفاظ ملتے ہیں، ٹھیکہ ہندوان، منڈل، گھٹی، بہی پٹواریان، ڈھولک، پنچ تڑہ، مٹھ، منڈھی غلہ، مالش موہٹ، ریوڑی، تھانہ، موڑا (موڑھا) چودھری، بل بل، بھٹی، تاریخ فیروز شاہی مصنفہ عفیف سراج میں

حسب ذیل الفاظ لات (لات) گھڑیال، درخت سنجل، چونہ، گھڑیال خانہ، نانک اور کبیر کے اشعار نقل کرنے کے بعد ہم نے عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء کے حوالے سے یہ شعر لکھے ہیں جو بہ قول مضمون نگار عالمگیر تاریخ داؤدی میں درج ہیں۔ نوسے اور پرتھا بتیہا پانی پت میں بھارت دیسا، آٹھیں، جب سکدار بابر جیتا براہیم ہارا۔ ہم نے کانپور کے راجے کے اشعار کا ذکر کیا ہے جو محمود کا معاصر تھا، اور اردو کی ابتدا کے متعلق بعض مستشرقین کے اقوال کی تردید کی ہے

(۵) ہم نے سید سلیمان صاحب ندوی کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات، اور نواب صدر یار جنگ کے مضمون مندرجہ مقالات، اردو مرتبہ انجمن ہذا سے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالوں سے یہ لکھ کر کہ اردو کی داغ بیل مسلمانوں کی دکن یعنی فتح سندھ کے زمانے میں پڑی، یہ اعتراض کیا ہے کہ طلوع اسلام سے قبل عرب اور فارس کے ہند سے تعلقات تھے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اردو کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی۔ (اہل عرب و فارس کے ہند سے تجارتی تعلقات اور اردو کی داغ بیل اولین سلطان اور اردو، سندھی اور اردو، پنجابی اور اردو، دکن میں اردو کی داغ بیل ان عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سرسری ہے اور کافی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ معیار) (۶) آخر میں حسب ذیل تذکروں کا م نے ذکر کیا ہے

(الف) تحفۃ الشعرا مصنفہ محمد افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی، آزاد بلگرامی نے "تحفہ اصحاب شعر" سے تاریخ نکالی ہے۔ ۱۱۶۵ھ۔ اس کے دو نسخے ہیں پہلا چھوٹی تقطیع کے ۱۰۱ صفحات کا جس کا سال کتابت نامعلوم ہے، دوسرا ۱۱۰۹ھ کا لکھا ہوا (یہ تذکرہ فارسی گو شعرا کے حالات میں ہے۔ لیکن فارسی گو شعرا کا اردو کلام بھی انتخاب میں آگیا ہے چنستان شعرا کے ساتھ اس کتاب کے دو اجزا جن کا تعلق شعرائے ریختہ گو سے ہے عبدالحق صاحب نے شائع کر دیے ہیں۔ اس تذکرے کے ذکر میں ہم نے ضمناً تین عجیب باتیں لکھی ہیں ایک تو یہ کہ نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۵۶ھ ہے، دوسرے یہ کہ میر حسن کا اپنے تذکرے کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ تیسرے یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میر حسن کا تذکرہ میر کے تذکرے کے بعد سب سے پہلا تذکرہ ہے معیار۔)

(ب) بہار و خزاں مصنفہ میر بہاء الدین عوج اورنگ آبادی صاحب تذکرہ اس کی ترتیب کے وقت ہی ۱۱۷۱ھ میں انتقال فرمایا، اور چھ سے تک پڑا رہا۔ مرحوم کے صاحبزادے نے اس کو ترتیب دیا "چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحے پر ہے کم و بیش ۷۰ شعرا کا حال درج ہے غالباً صرف ایک ہی نسخہ اس وقت موجود ہے۔ (ہم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲ سال تصنیف ہے۔ لیکن اس کی ترتیب کا زمانہ اس کے بھی بعد ہے۔ سید عبدالولی عزلت کا ترجمہ جو ہم نے اس تذکرے سے نقل کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی تصنیف کے وقت عزلت زندہ تھے۔ عزلت کا انتقال بارہویں صدی ہی میں ہو چکا تھا، مضمون نگار نے کتاب کے سال تصنیف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ معیار)

(ج) ریاض حسینی مصنفہ عنایت اللہ فتوت، مصنف نے اس باعی سے تاریخ نکالی۔ دوسری بیت ۵ ۵ ۱۱۷۰ء سے سرد بدل واقف گفت گلرخسار یحیان بہار معنی یہ حاصل نسخے میں ۱۱۷۰ء ہے مگر اس صحیح سے

صرف ۱۱۶۶ نکلتے ہیں، پہلے مصرعے کے بذل کی ب کا تعمیہ ہو کر ۱۱۶۸ ہونا چاہیے۔ (دوسری بیت کا پہلا مصرع معلوم ہوتا ہے کہ صحیح نقل نہیں ہوا۔ ۔ سید در بذل کے کیا معنی؟ معیار) تعداد صفحات ۲۲۱، ہر صفحے میں تقریباً ۱۲ سطریں، کم و بیش ۱۸۲ شاعروں کا حال درج ہے۔ کاتب جس کی فرمایش سے یہ کتاب تصنیف ہوئی خواجہ اکرم۔ غالباً صرف ایک نسخہ وجود میں ہے۔

(۵) طبقات الشعرا مصنفہ قدرت اللہ شہابی (رم کا یہ قول کہ یہ تذکرہ دکن میں تصنیف ہوا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا، اور نہ یہ قول کہ سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اس لیے کہ اس تذکرے کے بہت سے اندراجات اس کے بعد کے ہیں یہ ممکن ہے کہ اس کی ابتدا ۱۱۸۸ھ میں ہوئی ہو۔ معیار)

مضطر خیرآبادی از سید جان نثار حسین اختر جلیگ ابن مضطر صفحہ ۱۳۳ تا ۱۵۴ (مضطر کے متعلق من جملہ اور باتوں کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوائل میں اصلاح اپنی والدہ سے لی، اور امیر مینائی کی شاگردی برائے نام ہے خطابات خاں بہادر، اعتبار الملک اقتدار جنگ ریاست ٹونک سے ملے تھے ان کی نظمیں "منہ دیکھی محبت" "نیکی کا بدلا بدی" اللہ بس باقی ہوس، اور دو لکھی کی پکار" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ مضطر فانی شاعری کا مختصر سا مجموعہ بھی یادگار الہامات کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں مضطر کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی ہے مضطر کے حالات سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ معیار)

(مضمون نگار نے سوز کا یہ مطلع ؎ دعوی کیا تھا گل نے اُس رخ سے رنگ و بو کا لالے غلطی سے مصحفی کے نام سے لکھ دیا ہے۔ معیار)

بہار اور اردو شاعری از عین الدین درد ائی صاحب صفحہ ۲۲۱ تا ۲۸۰ (اب اسے لے کر اس زمانے تک کے شعرا کے حالات اس مضمون میں لیں گے۔ بعض باتیں ضرور اس سے معلوم ہوتی ہیں لیکن اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور بہت بے پروائی سے لکھا گیا ہے۔ مطبوعات جدیدہ کے تحت سہو کے تحت میں اس کے اغلاط ملاحظہ ہوں معیار)

(۱) خانقاہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری از بیاض سید شاہ نجم الدین صاحب نجم "دس چار کچھ اگم آدے + آٹھ پانچ پہل مانگے پاوے + تین گیارہ پہنچے راج + نو سو سترہ کرے اکاج + (کذا)

(۲) حضرت شاہ احسان اللہ چشتی نظامی المتخلص بہ فخری حضرت مخدوم فرید طویلہ بخش کی اولاد میں تھے، اور بہار شریف محلہ چاند پور میں رہتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں کہتے۔ اردو کلام نایاب ہے۔ اس خاندان کے ایک بندگ سے مضمون نگار کو حضرت فخری کی ایک اردو نظم دستیاب ہوئی۔ علمی بیاض میں اس کی شان نزول یوں لکھی ہے۔ حضرت فخری اور حضرت شاہ علیم الدین سجادہ نشیں حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری

سے گہرے تعلقات تھے حضرت شاہ علیم الدین کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی اور یہ ان کے ملال کا باعث تھا۔ حضرت فخری نے آستانہ مخدوم صاحب پر حاضر ہونے کی صلاح دی، اور خود یہ نظم لکھ کر انھیں اپنے ساتھ وہاں لے گئے اور سوز و گداز کے ساتھ اسے پڑھا۔ دعا کی برکت سے حضرت شاہ ولی اللہ عالم وجود میں آئے۔ سال تصنیف ۱۱۸۵ھ۔ اکاون بند ہیں، اول و آخر کے بند درج کیے جاتے ہیں۔ معیار

یا شرف دیں تجھ شرف سے جملہ عالم پر شرف — جملہ عالم پر شرف ہے تجھ شرف سے ہر طرف
غلام کر تا پیا تجھ حاسد ناداں حرف — مشکلیں آسان کر میری پیے شاہ نجف
رات دن ہو دور فخری یا مظفر شاہ دیں — یا مظفر شاہ دیں حاجت روائے سرزمیں
آرزو کو تم سے پوچھوں دل کو ہو میرے یقیں — مشکلیں آساں کرو میری پیے شاہ نجف

(۲) حضرت شاہ امیر الدین بہاری ظلوم دو مخلص، فارسی دیوان مطبوعہ، اردو کا ضخیم دیوان جس میں متعدد مثنویاں بھی ہیں، اب تک بہار شریف میں محفوظ ہے۔ سال ولادت ۱۲۱۷ھ۔

(۳) حضرت سید شاہ امین احمد متخلص بہ ثبات و شوق خلف حضرت وجد۔ ولادت ۱۲۴۹ھ وفات ۱۳۲۱ھ۔ گل بہشتی، گل فردوس، روضۃ النعیم، شجرات طیبات سلسلۃ العلائی، عبرت افزا، شہد و شیر مثنویاں آپ کی تصنیف سے ہیں۔ کل تصانیف دیوان اردو کے سوا مطبوعہ ہیں، فارسی اردو دونوں کہتے تھے (اشعار ۱۱)

(۴) صاحب مضمون نے شاد مرحوم کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے اس میں بہت سے بہاری شعرا کے تخلص آگئے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

خاک کیوں کر نہ ہوئے اب عظیم آباد کے اوپر — ناب باقی بلاغت ہر زباں شورفصاحت ہر

حسب ذیل شعرا کا اس قطعے میں ذکر ہے۔

بیدل، تحقیق، راسخ، سوز دل، عشق، شیفتہ، شیدا، کاہش، کیفی، مفتوں، ذبیح یاس، لتکیں، شرر، احمد، منشا، الفتی، ضمیر، وحشتی، عبرتی، قمر، ضیا، التسلیم، مائل، فیض مہدی، مہدوی، آشفتہ، مجنوں۔

حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے از ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ ڈی، صفحہ ۲۴۸ تا ۲۵۸۔

ادب لطیف۔ لاہور، فروری۔ اردو کی تاریخ اور رحالت (ایک محققانہ مقالہ) از میر محمد عام عباس ایم اے۔ ص ۹ تا ۱۲۔ [اردو کے ہندوؤں کا تعصب دکھایا گیا ہے، مناظرانہ مضمون ہے۔ معیار]

ادب لطیف مارچ "اردو شاعری پر ادب انگریزی کا اثر" ص ۹ تا ۱۵، از ساغر جیدری

بی اے۔ (سرسری سی پر لکھا گیا ہے۔ معیار)

میر انیس و فردوسی۔ ص ۲۸ تا ۳۰، از مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب بی اے ایل ایل بی۔ مرزا صاحب نے انیس کے بہت سے اشعار ایسے دیکھے یا سنے ہیں جو فردوسی کا ہو بہو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں "یا قدرے ادل بدل کے ساتھ" انھوں نے اہل نظر سے سوال کیا ہے کہ کیا یہ صاحب کی زمینی شاعری محض فردوسی سے استفادے کا نتیجہ ہے؟ (معیار)

اردو کی تاریخ و حالت پر ایک متعلمانہ نظر ص ۳۰ تا ۴۲، از عبدالرشید صاحب منشی فاضل (میر محمد عامر عباسی صاحب کے مضمون پر اعتراض ہے۔ معیار)

ادب لطیف۔ اپریل۔ چغتائی صاحب کا ایک استفسار، ص ۴ تا ۶، از محمد اسحاق صاحب

تنویر کراچی۔ مئی۔ منور خاں غافل لکھنوی، از حضرت افسر صدیقی، ص ۹ تا ۱۳۔ (۱) ان کے والد کا نام صلابت خاں، یوسف زئی افغان تھے۔ ان کے بزرگ سپاہی پیشہ تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں "شاعر نہیں کہ فخر کرے شاعری پیشہ، غافل سپاہی ہے اسے کیا شاعری سے کام"

شاعری میں مصحفی کے شاگرد تھے ۵ یا شاعران شیریں غافل مرا چہ کار ہست، بد خوش کردہ ایم طرز ہستا و مصحفی را (۲) غافل گویا کے توفیق تھے اور ان کے فیض صحبت کے خود معترف تھے، ۵ خود اتنی کہاں تھی شاعری میں میری اے غافل میں اس شہرت کو فیض صحبت گویا سمجھتا ہوں" ۳ مصحفی نے ۱۲۳۶ھ میں غافل کی عمر ۳۵ سال بتائی ہے۔ سراپا بخن ۱۲۶۹ھ کی تصنیف ہے، اس میں ان کا ذکر اس طرح ہے کہ گویا اس وقت زندہ تھے۔ شمیم سخن ۱۲۸۸ھ کی تصنیف ہے اس میں ان کا شمار مرحومین میں کیا ہے۔ قیاساً ان کی وفات ۱۲۶۹ اور ۱۲۸۸ھ کے درمیان ہوئی۔ (۴) اولاد میں ایک جھمو خان ملازم منشی نول کشور تھے۔ اس سلسلۂ ملازمت کی وجہ سے طبع نول کشور نے دیوان غافل کو چھاپ دیا۔ جھمو خاں کا ایک لڑکا عبداللہ خاں عفت مقیم کان پور، رحمت بنارسی وبا لکرشن قمر لکھنوی تھا۔ غافل کے ایک اور پوتے امجد علی خاں تخلص واجد کا ذکر تذکرہ کاملہ سستہ سخن میں آیا ہے۔ (۵) تذکرہ روز روشن سے پتا چلتا ہے کہ فارسی بھی کبھی کبھی کہتے تھے۔ (غافل کا حال مصحفی نے تذکرہ ریاض الفصحا میں لکھا ہے، اس تذکرے کا سال آغاز ۱۲۱۲ھ اور سال تکمیل ۱۲۳۶ھ ہے۔ صاحب مضمون کا یہ لکھنا کہ مصحفی نے ۱۲۳۶ھ ہی میں غافل کا حال لکھا ثبوت کا محتاج ہے۔ معیار)

شاعر آگرہ، مارچ مرتبہ جناب اعجاز حسین قریشی **متغزلین اردو**، ص ۱۵ (اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ بزم اکبر آبادی، مرزا عباس بیگ کے بیٹے اور مرزا جعفر علی فیضی لکھنوی کے پوتے ہیں۔ علی حسین قیصر ان کے حقیقی ماموں تھے اور یہ ان کے والد کے ماموں تھے۔ معیار)

ندیم۔ اپریل۔ مصنف **سیر المتاخرین کی آل و اولاد**، از سید مرتضیٰ حسین صاحب نقاد، ص ۴۴ تا ۴۸ (۱) "غلام حسین خاں کے اہل و عیال کا مقبرہ حسین آباد (جیلا) میں موجود ہے، اس کی بہت سی اولادیں تھیں"

ناکتخدا بیٹی، اصلہ بیگم کی وفات غلام حسین خاں کی زندگی میں ہوئی اور اس کی قبر پر جو کتبہ شعر فارسی میں ہے وہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ اس لڑکی کو مذہبی مشاغل کے سوا کسی دوسرے کام سے دلچسپی نہ تھی۔" اپنی حیات میں شاید اس نے اپنا ترکۂ دخترِ مرحوم کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ معیار)

ندیم گیا پتہ۔ "**میر صاحب کی اصلاحیں**" از حکیم سید احمد اللہ صاحب ندوی، ص ۱۰ تا ۱۰، (نکات الشعرا سے ماخوذ ہے۔ معیار) **اردو کے یوروپین شعرا**، از سید رفیق قاسم صاحب، ص ۴۲ تا ۴۶ (۱) شائق، واکر، فلاطون، اسفان، شورہ، جمیت (۲) صاحب، صاحب سنی یہ جورج فانوم، رشکر، اسیر، غفی، ایران کے مختصر حالات ہیں (۲) صاحب مضمون نے ذکا کے متعلق یہ صحیح نہیں لکھا کہ نصیر اس کے آقا تھے۔ اس کے تذکرے کا سال تالیف بھی انھوں نے غلط لکھا ہے۔ معیار) (۳) (اعظم الدولہ سرور، کا سال وفات صاحب مضمون نے ۱۲۲۵ھ لکھا ہے، یہ صحیح نہیں، ۱۲۲۵ کے بہت بعد کی باتیں تذکرۂ سرور میں درج ہیں۔ صحیح سال وفات کے لیے گلشن بیخار ملاحظہ ہو۔ معیار)

ادبی دنیا فروری **کلیات دعا** از آزاد، زوجہیں صاحب، ص ۷۶۰ تا ۷۸۰ (۱) علی بخش، دعا عظیم آباد کے رہنے والے تھے یا کم از کم عظیم آباد سے انھیں گہرا تعلق تھا، ایک فارسی قطعے میں عظیم آباد کی تعریف ہے، جنت المند عظیم آباد است۔ (صاحب مضمون نے دعا کو ہماری شعرا میں شمار کیا ہے لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت ان اشعار سے نہیں ملتا جو انھوں نے نقل کیے ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ غالباً دعا تفضیلیہ فرقے کے شیعہ تھے، تفضیلی در اصل ان سنیوں کو کہتے ہیں جو حضرت علی کو دوسرے خلفا سے افضل سمجھتے ہیں۔ معیار) (۲) کلیات کا قلمی نسخہ کتب خانۂ خدا بخش میں ہے جس میں عربی فارسی اور اردو کی غزلیات اور متفرق کلام کے نمونے ہیں۔ حصہ اردو پر منتخب از دیوان ہندی، لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اردو علیحدہ مرتب ہوا تھا، کتابت ۱۲۴۶ھ میں شروع اور ۱۲۴۸ھ میں تمام ہوئی کاتب کا نام مہدی بخش ہے۔ (۳) دیوان میں خماسے، اربعہ کی تعریف موجود ہے اور انشا کو بھی جا بجا یاد کیا ہے: حضرت انشا تلک بھی ساری بات ہو گیا ہے اب دعا نام سخن، (۴) دیوان میں ۴۴ غزلیں ۹ رباعیاں اور ۹ فردیات اور ۳ مثنویاں ہیں حکایت عشق، مبارک البیان شیر و شکر، اس کلیات میں دیوان ریختی بھی شامل ہے جس میں ۲۱ غزلیں، ۱۱ رباعیاں ۱۹ مختلف اشعار اور ۵ قسمیں ہیں۔ ہجری کی فارسی غزل پر ایک مخمس ہے: ؎

ہوتی ہو آن کے آتو سے تم آپا گستاخ ۔۔۔ دیکھکر تم کو تو کہہ بیٹھے گی انا گستاخ
چھوڑو غفلت یہ سنو اور نہ ہو خفتہ گستاخ (کذا) رفت دوشینہ چو آہم بہ ثریا گستاخ

بہ دعا دست برآور و مسیحا گستاخ

دو مخمس اور ہیں جن میں سے ایک انشا کی غزل پر ہے۔ نسبت کا نمونہ یہ ہے:

تمھارے (دیا سے بھلا کون سی) نسبت ✧ گر پوچھے تو انا میں ہوں ترے قربان
کیا سمجھے گی تو میں تجھے سمجھاتی ہوں رسنے ✧ ان دونوں پر ہے باندھا پہ سمجھ تو نادان

کلیات کے آخر میں ایک واسوخت اور حسن کے اشعار کی تضمین ہے۔ ایک قطعے میں، زبانوں کے اشعار ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے اردو، فارسی، (بیان ہے نگر، لہجہ بنگالیان، زبان سرکارساران، لہجہ انگریزان زبان عربی (صاحب مضمون کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ گجرات نگر سے مراد ضلع ہو جسنگ ناقصہ ہے تو دعائے وہاں کی صحیح زبان نہیں لکھی: دعائے جو زبان لکھی ہے وہ پورب کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جے پور کا بھی نام تھا۔ معیار)
جانور ہو آپ کیا یہ مکار ام جانڑی ہے ✧ چاہوں ہوں تم کو پھاڑ کے پنجاس کام آئی۔ یہ لہجہ ہے گر،

ندیم مارچ تعلیم (۱) (ص ۱۳ تا ۱۹) (۱) خواجہ عشرت لکھنوی (۱) آصف الدولہ جب حکمراں ہوئے شاہ عالم آگرہ آباد میں تھے (اسی زمانے میں میر حسن سوز لکھنؤ آئے (نواب نوازش گردی اختیار کی شاہ عالم شجاع الدولہ کے زمانے میں دہلی جا چکے تھے (سوز کا نام محمد میر تھا (آصف کب سوز کے شاگرد ہوئے اس کو تحقیق علم نہیں معیار) (۲) صاحبقران ثانی سیر المتاخرین ۵ روپے ماہوار پاتے تھے۔ جرات خلف یار خاں کے ملازم تھے (یہ دونوں باتیں کسی تذکرے میں نہیں ملیں معیار) ۳ مصطفیٰ قلی خاں یگانہ چنگیزی کے ہمراہ لکھنؤ گئے (صحیح نام مصطفیٰ خاں ۱۱۶۵ھ سے بھی قبل مر چکے تھے معیار) ۴ میر قمر الدین منت خوش حال رئیس تھے (میرزا خانی نوازش اور میر ضیا ان کے ملازم تھے (منت شاہی پنشن تھے، نوازش اور ضیا ان کے ملازم نہ تھے معیار) ۵ (افسوس اور سبحان سلیمان شکوہ کے ملازم نہ تھے۔ معیار) ۶ (میر کو ملک الشعرا لکھا ہے (یہ صحیح نہیں (یہ غلط ہے کہ میر نے لکھنؤ جانے کے حالات نظم کیے ہیں اور وہاں پہنچتے ہی شریک مشاعرہ ہوئے (یہ بھی صحیح نہیں کہ سودا میر کے لکھنؤ پہنچنے کے بعد دہلی سے نواب الدولہ کے عہد میں فرخ آباد گئے۔ سودا اس سے بہت پہلے ۱۱۷۰ کے لگ بھگ احمد خاں کے زمانے میں فرخ آباد چلے گئے تھے، وہ نیفی آباد شجاع الدولہ کے عہد میں گئے (ذکر آصف کے عہد میں معیار) (۷) شیخ مصطفیٰ سلیمان شکوہ کے یہاں آگئے (اس سے شبہ ہوتا ہے کہ سلیمان کے بلانے سے لکھنؤ گئے تھے (یہ صحیح نہیں ۱۱۹۰ھ میں وہ لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ معیار)

مطبوعات جدیدہ :-

(۱) خطبات گارساں دتاسی از ق۔ ع۔ و
(۲) سالنامۂ سہیل از ؟
(۳) کلیم عجم از ؟

خطبات گارساں دتاسی

مسٹر عبدالرحمٰن مسعود و دیگر اصحاب و مرتبۂ عبدالحق صاحب 'سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو' ص ۲۰+۸۱۴ قیمت مجلد للعہ صدر 'غیر مجلد للعہ 'گارساں دتاسی کا سال ولادت ۱۷۹۴ء ہے اور سال وفات ۱۸۷۸ء - وہ پیرس کے مدرسۂ السنۂ مشرقیہ میں اردو کا استاد تھا ؛ ہندوستان کی کبھی اس نے صورت بھی نہیں دیکھی ، لیکن جہاں تک اردو سے دلچسپی کا تعلق ہے ' وہ مغربی مستشرقین میں جن کی عمریں ہندوستان میں گزری ہیں ' اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے ۔ راقم کو اس کا ذاتی علم ہے کہ یورپ میں اگر کبھی اردو کے متعلق بحث چھڑتی ہے تو اختلافی امور کے فیصلے کے لیے اب تک دتاسی کی تصانیف کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ۔ دتاسی استاد اردو کی حیثیت سے ہر سال کے آخر میں ایک لکچر دیتا تھا ' جس میں وہ اس سال کے ادبی ارتقا پر تبصرہ کرتا تھا ' یعنی اس سال ہندوستانی اور ہندی میں کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں ، کون کون سے نئے اخبار و رسالے جاری ہوئے ، کتنے نئے مطابع قائم ہوئے ، کن کن مصنفین نے ادب میں اضافہ کیا ۔ دتاسی مستشرقین یورپ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا کرتا ' اور کبھی کبھی ہندوستان کی سیاست اور معاشرت پر بھی نظر ڈالا کرتا تھا ۔ ان لکچروں کی ابتدا دسمبر ۱۸۵۰ء سے ہوئی ' اور یہ سلسلہ ۱۸۶۹ء تک جاری رہا ۔ اس درمیان میں صرف ایک سال یہ لکچر نہ ہوا ۔ یہ ۲۰ سال جدید ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں ' اور اس زمانے کی ادبی ' ذہنی ' اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں میں شاید ہی کوئی ہو جسے دتاسی نے ان لکچروں میں نظر انداز کر دیا ہو ۔ یہ لکچر فرانسیسی زبان میں ہیں ۔ اور اب انجمن ترقی اردو نے ان کا ترجمہ کتابی شکل میں شائع کیا ہے ' انجمن کی یہ دولت وہ اردو داں بھی پا سکتے ہیں جو فرانسیسی سے ناآشنا ہیں ۔

فاضل مرتب بجا طور پر ان خطبات کو دتاسی کے اہم ترین ادبی کارناموں میں شمار کرتے ہیں ، ذاتی طور پر ہم انہیں تاریخ ادبیات سے بھی زیادہ اہم سمجھتے ہیں ' اس کی وجہ یہ ہے ، کہ تاریخ کا واحد جن تذکروں سے لیا گیا ہے ' وہ ایک ایک گرکے منظر عام پر آگئے ہیں ' اس کی قدر اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ تذکرے نو مطبوعہ ہیں ' ان کی اشاعت ہو گئی ۔ تو اس کی اہمیت باقی نہ رہے گی لیکن خطبات کا مواد دتاسی نے سرکاری رودادوں ' اپنے زمانے کے اخباروں ' رسالوں ' کتب فروشوں کی فہرستوں اور بہ کثرت ذاتی مشاہدات سے فراہم کیا ہے ، اس ذخیرے کا معتد بہ حصہ اب دستیاب نہیں ہو سکتا ' جو کچھ باقی ہے وہ اس قدر منتشر ہے کہ اس کو از سر نو جمع

کر فاجو سے شیر کو لے نکل رہے ہے، اس کتاب سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں اور بظاہر کوئی صورت اس کی نظر نہیں آتی کہ آئندہ بھی کوئی کتاب اس کی جگہ لے سکے۔

دتاسی نے اسی کتاب میں کہیں لکھا ہے کہ کتاب اگر بحیثیت مجموعی مفید ہو تو اس کے عیوب سے چشم پوشی کرنی چاہیے یعنی ہے کہ انیسویں صدی میں تبصرہ نگاروں کا اس پر عمل ہو لیکن بیسویں صدی میں تو تبصرہ کا صرف ایک رخ دکھا دی شریعت میں گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے' اور ہمارے لیے باوجود اس کے کہ دتاسی کی بڑی عزت اور محبت ہمارے دل میں ہے۔ اس مشورے پر عمل پیرا ہونا ممکن ہے۔

فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں دتاسی کے اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں جابجا غلطیاں پائی جاتی ہیں' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سی ایسی معلومات ظہور میں نہیں آئی تھیں، جو اس وقت ہماری دسترس میں ہیں۔ دوسرے آنجہ وہ غیر ملک کا شخص تھا، اور کبھی ہندوستان آنے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا' اس لیے ہمارے ادب اور ہمارے معاملات کے سمجھنے میں کہیں کہیں غلطی کا سرزد ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں"۔ ہماری رائے میں اس کے اغلاط کی توجیہ کے لیے صرف اسی قدر کہنا کافی نہیں' کچھ غلطیاں صحیح ہے کہ ان وجہوں سے سرزد ہوئیں جو فاضل مرتب نے بیان کی ہیں لیکن ہمارا سب سے بڑا اعتراض دتاسی پر یہ ہے کہ اس نے "اس مواد سے جو اس کے سامنے تھا اچھی طرح کام نہیں لیا' اور اس کی مدد سے بھی کتاب اس نے لکھی ہے، اس سے بہت بہتر کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ اس کی تصانیف کے مطالعے سے جن خاص عیوب کا ہمیں پتا چلتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اُردو فارسی سے عالمانہ واقفیت نہیں رکھتا' اور مشرقی مصنفین کی مخصوص طرز ادا کو اُسے کافی علم نہیں' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عبارت کا مطلب سمجھتا ہے' اور خواہ مخواہ غلطیاں کر جاتا ہے۔

(۲) شعرائے اُردو کے حالات لکھنے کے لیے بھی تذکروں کا مطالعہ کافی نہیں، ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی ضروری ہے دتاسی نے ایک تو یہ کہ فارسی گو شعرائے تذکروں کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کی' حالانکہ بہت سے ریختہ گو شعرا کا حال فارسی گو شعرا کی حیثیت سے فارسی کے تذکروں میں ملتا ہے' دوسرے یہ کہ وہ اس ملک کی تاریخ و جغرافیہ سے مطلقاً ناواقف ہے۔ ایک تخلص یا ایک نام کے اگر دو شاعر ہوں، تو وہ ان کے درمیان مشکل ہی سے کوئی فرق کریں: ہو' اور ایک دوسرے سے یگانہ کوس کے فاصلے پر کیوں نہ ہوں' وہ معمولاً انہیں ایک کر دیتا ہے۔

(۳) اس کا حافظہ کمزور ہے' اس کی کتابیں متناقض بیانات سے بھری ہوئی ہیں' اور بہ کثرت حوالے غلط ہیں

(۴) دتاسی وقت نظر سے بالکل محروم ہے' اس کی نادانہ بلائیں عجیب و غریب ہوتی ہیں' اور مختلف فیہ مسائل میں مختلف شہادتوں پر نظر کرکے معقول نتیجے پر پہنچنے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۵) کتابوں کی بے پروائی سے پڑھتا ہے کہ آخر کو کئی وقت زبان و بیان کی رو جو بھی مطلب نکلتا ہے۔

دہلوی کے ان نقائص کا ثبوت اس کی تصانیف علی الخصوص تاریخ ادبیات میں بکثرت ملتا ہے۔ دہلوی کا پایۂ تحقیق کس قدر بلند ہے۔ اس کا اندازہ ناظرین کو بھی ذیل کی مثالوں سے ہو جائے گا۔ مثالیں صرف خطبات سے لی گئی ہیں۔ اور بعض اغلاط جن کی فاضل مرتب اور ان کے لائق شاگرد نے تصحیح کر دی ہے، نقل نہ کر دیے گئے ہیں۔

(۱) ص ۸۴ دہلوی مصنف مجمع الانتخاب کا نام مفتر محمد کمال لکھتا ہے۔ اس کو اتنی واقفیت نہیں کہ لفظ مفتر نام کا جزو نہیں بلکہ محض از راہ انکسار بڑھا دیا گیا ہے۔

(۲) ص ۵۰ "گرویزی ذات کا شیخ ہے"۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور صوفی تھے اور ان کی سیادت میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا، دہلوی نے کہیں ان کے متعلق یہ پڑھا ہوگا کہ شیخ وقت یا شیخ طریقت تھے "اور" انہیں سید سے شیخ بنا دیا۔

(۳) ص ۹۰ شیفتہ کے متعلق دہلوی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں اپنا ذکر بڑے الگ رکے ساتھ کرتے ہیں، واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے جس کو بھی چاہے گلشن بے خار کا دیباچہ دیکھ کر اپنا اطمینان کر لے۔

(۴) ص ۱۰۰ صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ مغرالله خاں نے اس پر ایک مثنوی قول حسین لکھنؤ میں لکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی تذکرہ نگار مومن خاں کا نام لکھ کر دوبارہ جوان کا ذکر آیا تو خاں مغرٰی الیہ لکھا۔ مغرٰی الیہ "مغرالله بن گیا"، اور ایک ایسی مثنوی جس کے متعلق دہلوی کا علم ہونا چاہیے تھا کہ مومن کی تصنیف ہے وہ ایک خیالی شاعر کی طرف منسوب کر دی گئی۔ ایک تذکرہ میں جو دہلوی کی نظر سے گزر چکے ہیں اس مثنوی کا ذکر ہے اور ہر جگہ مومن ہی ان کے مصنف بتائے گئے ہیں۔

(۵) ص ۱۰۲ "ایک اور عورت شاعرہ جو باوجود ہندو نام کے خاتمہ مسلمان ہو چکی ہے"۔ یہ حسام الدولہ کے حرم میں تھی "موالات قاسم" شیخ محمد چاند صاحب نے یہ صحیح اعتراض کیا ہے کہ چپا کا ذکر تذکرۂ قاسم میں نہیں، لیکن دہلوی کی اس غلطی کی وجہ انہوں نے نہیں بتائی "تذکرۂ قاسم (جلد ص ۱۷۸) سے ایک اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے، اس غلطی کی وجہ خود سمجھ میں آجائے گی "سمجھنا تخلص شعلے ستارہ پیشہ خدستان حسام الدولہ کہ ناماش از صفحۂ خاطر محک شدہ" سمجھنا کو چپا پڑھنا کوئی بڑی غلطی نہیں لیکن دہلوی کا تخلص اور نام میں فرق کرنا تھا، اور لفظ شخص کے بعد اسے کوئی حق نہ تھا کہ سمجھنا کو عورت سمجھے تذکرۂ قاسم دہلوی کے حافظوں میں ہے اور یہاں کی نظر سے گزر چکا ہے، اس لیے اس غلطی کا ذمہ دار دہلوی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

(۶) ص ۱۰۲ "میر نے اپنا تذکرہ مخلص کی وفات سے ایک برس قبل لکھا" مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ میں ہوئی ۱۰ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تذکرے بسال تصنیف ۱۱۶۳ھ ہے دوسری جگہ سال تصنیف ۱۱۶۵ھ بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیان صحیح نہیں ہو سکتے۔

(۷) ص ۷۷ "تذکرۂ شورش مخمور کی وفات کے دس برس بعد یعنی ۱۱۶۸ + ۱۰ = ۱۱۷۸ میں لکھا گیا" ص ۷۹ تذکرۂ شورش ۱۱۹۲ میں لکھا گیا۔ ان دونوں بیانوں میں تضاد ہے

(۸) ص ۸۱ جہاں تک ہمیں علم ہے سب سے پہلا سب سے پرانا میر کا تذکرہ ہے۔ ص ۹۰ پر اس کے خلاف لکھا ہے۔

(۹) ص ۸۹ مصنف نے شاہنامۂ عالم کے عہد تک کے حالات نظم کیے ہیں "تذکرۂ ہندی میں معنی لکھتے ہیں کہ ایک دوبرہ"

نسب نامۂ شاہ عالم بگ لکھا گیا۔

(۱۰) ص ۱۰۸ مصحفی کو یہ واقعہ کہ اکرام بخش نے ان کے تذکرے سے سرقہ کر کے وہ مراۃ تذکرہ لکھا حقیقت سے معلوم ہوا۔ تذکرہ ہندی میں ہے کہ خود حقیقت بھی اس سرقے میں شریک تھے۔ حقیقت سے اس واقعے کا معلوم ہونا وتاسی نے غلط فہمی سے لکھا ہے۔

(۱۱) ص ۱۴۱ مجرد زاکت مخلص کا نام وتاسی نے رام جی پڑھا ہے اور اس کو ہندو قرار دیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔

(۱۲) ص ۱۲۱ جان صاحب رنجنی کو کوئی عورت سمجھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جان مخلص کی ایک عورت کا ذکر کرنا ملتا ہے میں موجود ہے؟ دوسرے یہ کہ جان صاحب کو کریم الدین صاحب تذکرہ کا استاد قرار دیا ہے۔ کریم الدین نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے اس کا شبہ بھی ہو اور نہ کریم الدین شعر کہتا تھا۔ رنجنی سے بھلا ایک عورت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔!

(۱۳) ص ۱۴۰ وتاسی نے لکھا ہے کہ حیدر شاہ نے مخلص لکھے ہیں اور اس میں دلی سے ترقی کی ہے۔ وتاسی نے کسی کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن حیدر شاہ کا حال صرف گلزار ابراہیم میں ہے، اور وتاسی نے وہیں سے لیا ہے۔ گلزار میں خلیل نے یہ لکھا ہے کہ حیدر نے دیوان ولی کی کسی غزل کو مخمس کیا تھا۔ یہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

(۱۴) ص ۱۴۲ مرزا علی لطف صاحب تذکرہ کا باپ ہجری تخلص اردو میں شعر کہتا تھا۔ لطف نے ہجری کی ذرہی گوئی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ریختہ گوئی کا ذکر سوا وتاسی کے کسی نے نہیں کیا۔

(۱۵) ص ۱۴۲ وتاسی لکھتا ہے کہ قاسم نے ۱۰۹ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ حوالہ کریم الدین، کریم الدین نے صرف یہ لکھا ہے کہ بڑی عمر پا کر انتقال کیا۔

(۱۶) ص ۱۴۲ مصحفی کا سال وفات کریم کے حوالے سے ۱۲۱۴ لکھا ہے، حالانکہ کریم نے ۱۲۲۰ھ لکھا ہے، یہ خان کاکب کی غلطی ہے۔

(۱۸) ص ۱۴۲ مصحفی کے متعلق لکھا ہے کہ دیوان زادہ حاتم کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کے ہم عصر تھے، حاتم نے دیباچہ میں مصحفی کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

(۱۸) ص ۱۴۸ محمد جان ساقی تخلص کے متعلق لکھا ہے "ساقی مصور یا ساقی" اس سے تشبیہ ہوتا ہے کہ ساقی نام تھا اور ساقی حرف حالانکہ ساقی زبان کا نام تھا "تخلص" اور ساقی تخلص تھا، جیسا کہ تذکرہ قاسم اور تذکرہ نرود کے حوالے سے واضح ہو گیا۔

(۱۹) ص ۱۴۹ گلستان سخن، اس نام کے تین تذکرے ہیں، جوش، جتلا اور حاجر کے لکھے ہوئے۔ جتلا کے تذکرے کا نام گلشن سخن ہے، اور جوش نے غالباً اس نام کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا، بلکہ جہاں تک ہمیں علم ہے، جوش کسی تذکرہ نگار کا تخلص نہیں۔

(۲۰) ص ۱۴۹۔ خاص طور پر قابل ذکر شاہوں میں سودا، میر اور حسن کے بعد، درد اور یقین وغیرہ کے ساتھ بعد دہلوی، امین بنارسی، اور عاشق فارسی پوری سے گم نام شاہوں کا نام لکھا ہے۔

(۲۱) ص ۱۴۹ ہمارے ہم عصر شاہوں میں ذوق و آتش و نسیم اور نظیر کے دیوان زیادہ قابل لحاظ ہیں" اگر کسی صاحب کو تخلص کے کسی ممتاز شاعر کا حال معلوم ہو تو وہ ہم سے زیادہ توضیح فرمائیں۔

(۲۲) ص ۹۲ گلشن بے خار سب تذکروں سے زیادہ صحیح ہے، یہ سچ ہے کہ شیفتہ شعر فہم اور نکتہ رس تھے لیکن یہ بالکل غلط کہ انہوں نے واقعات کے لحاظ سے تذکرے کو صحیح بنانے کی کوئی خاص کوشش کی تھی۔ صحت کے لحاظ سے دوسرے تذکروں پر اسے ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲۳) ص ۹۳ بالخ کا انتقال ۱۲۵۹ میں ہوا، ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۲۵۹ کے بعد ہوئی

(۲۴) ص ۱۴۵ دتاسی کے نزدیک داسوخت سوز سے مختلف نہیں، اور داسوخت کا مصدر ہونا ظرد دری ہے

(۲۵) نامی الدین حیدر فاری لغت ہفت قلزم کے مولف تھے ص ۱۹۸

(۲۶) ص ۲۲۲ دتاسی نے غدر ۱۸۵۷ کے زمانے میں یہ تنا ظاہر کی ہے کہ مرزا دارا بہت دار اخلص خلف اکبر حضرت قتیل مرحوم سے محظوظ ہیں، حالانکہ یہ غریب غدر سے بہت قبل مر چکا تھا، مرزو سرے ولی عہد بھی غدر سے قبل انتقال کر چکے تھے، لیکن دتاسی کو اس کی بھی خبر نہ تھی

(۲۷) ص ۲۴۲ - ۲۴۳ دتاسی مشتی عظیم آبادی صاحب تذکرہ اور الٰہی بخش عشقی لکھنوی شاگرد رشک کو ایک سمجھتا ہے۔ عشقی کا تذکرہ اس نے نہیں دیکھا، لیکن اشپرنگر نے جو کچھ عشقی کے متعلق لکھا ہے اس کی نظر سے گزرا ہے، اور عشقی کے زمانے کے متعلق وہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ خود اپنی تاریخ ادبیات میں عشقی کا نام اس نے رحمت اللہ لکھا ہے، جو غلط ظاہر ہوا ہے۔ لیکن الٰہی بخش سے مختلف ہے۔ دتاسی کو یہ علم ہے کہ تذکرہ عشقی میں آزردہ والے ہوئے ہیں وہ ۱۲۱۵ کے ہیں (یہ اشپرنگر کا قول ہے جو صحیح نہیں) اور ۱۲۱۵ میں الٰہی بخش عشقی کا کیا ذکر ہے ان کی استاذ الاستاذ تاسخ بھی مستقر عام پر نہیں آئے تھے۔ خود رشک کی پیدائش ۱۲۱۵ یا اس کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ یہ تمام باتیں دتاسی کو معلوم ہیں یا معلوم ہونی چاہییں لیکن وہ بے تامل الٰہی بخش عشقی اور وجہ الدین عشقی کو ایک بنا دیتا ہے۔

(۲۸) محسن صاحب تذکرہ دتاسی کی رائے میں اعلیٰ درجے کے شاعروں میں ہیں، اور ان کا تذکرہ اردو کے اور تذکروں کی طرح بے مزہ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ محسن کا شمار کسی نے اعلیٰ درجے کے شاعروں میں نہیں کیا، اور نہ اس کا کلام اسے اس کا مستحق ٹھہراتا ہے، اور اس کا تذکرہ اردو کے کل تذکروں سے بدرجہا زیادہ خشک اور بے مزہ ہے۔

خاص مرتب اور ان کے لائق شاگرد شیخ محمد چاند صاحب مصنف کی غلطیوں کی کہیں کہیں حواشی میں تصحیح کی ہے جس سے ان کی وسعت نظر کا پتا چلتا ہے، لیکن بعض مقامات پر ان صاحبوں سے خود غلطی ہو گئی ہے جس کی طرف ہم ان کی توجہ منعطف کرانے کی جرأت کرتے ہیں۔

(۱) عبد الحق صاحب کا خیال ہے کہ علی ابراہیم کا ایک تخلص خلیل اور دوسرا اہل تھا، دتاسی لکھتا ہے کہ ایک تخلص خلیل اور دوسرا حال تھا۔ دتاسی کا قول صحیح ہے، تذکرہ علمی میں حال تخلص دیا ہے اور علی کسی تذکرے میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر فاضل مرتب کے پاس اس کی کوئی سند ہو تو ہمیں آگاہ فرمائیں، تاکہ ہم اپنی رائے کو بدلنے کا موقع لے۔ (حاشیہ ص ۱۸۰)

(۲) شیخ چاند صاحب کہتے ہیں کہ خاکسار نے اپنے تذکرے کا نام معشوق چہل سالہ تو رکھا تھا، یہ نام کسی تذکرے کا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ

کا جواب دیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ تذکرہ اپنے معشوق کے نام معنون کیا تھا۔ پرانے زمانے میں کسی شخص کے نام پر کتاب لکھنے کا وہی مطلب ہوا کرتا تھا، جو آج کل کسی کے نام سے کتاب معنون کرنے سے نکلتا ہے۔ حاشیہ ص ۱۰۶۔

(۳) شیخ چاند صاحب کا خیال ہے کہ امام الدین سرچو کی رسالہ "الاشاہی تھا" یہ صحیح نہیں' اس کا باب اس عہدے پر مامور تھا۔ امام الدین کا حال گلزار ابراہیم میں دیکھیے حاشیہ ص ۱۰۰

(۴) شیخ محمد چاند صاحب لکھتے ہیں کہ طبقات کا قید ہونا کسی تذکرے میں نہیں پایا جاتا۔ یہ قول صحیح نہیں، عشقی نے اس کا حال لکھا ہے' اور تعجب نہیں کہ اشپرنگر نے بھی اس سے نقل کیا ہو۔ کیا "طبقات" سے بھی قید ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے' گو بعض مقامات مشکوک ہیں۔ صرف خطی سوا ایک کے نظر نہیں آئی۔ ص ۱۲۹ شاہزادی خالہ "تخلص انہوں نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے عماد الملک کے محل میں اسی نام سے پکاری جاتی تھیں" دنیا کی "خالہ بیگم کو شاہزادی خالہ بنادیا' اور خلعی سے اسے تخلص سمجھ لیا' حالانکہ تخلص نہیں' مترجم کا سہو یہ ہے کہ انہوں نے فرانسیسی لفظ نیو یو کا ترجمہ بھانجے کی جگہ بھتیجے کیا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق بھتیجے اور بھانجے دونوں پر ہو سکتا ہے، لیکن عماد الملک اگر بھتیجا ہوتا تو یہ شاہ خالہ بیگم کے لقب سے نہ پکاری جاتی۔ مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے۔ طاعت کی غلطیاں زیادہ نہیں لیکن ان کی تصحیح کے لیے غلط نامہ ہوتا تو بہتر تھا۔

سالنامہ سہیل علی گڑھ ۱۹۳۶ء

مرتبہ رشید احمد صدیقی صاحب' ص ۳۲+۴۴۸' تصاویر سرورق علاوہ' تقطیع.....
قیمت تین روپیہ (۳/-)۔

رشید احمد صدیقی صاحب اردو کے مقبول انشا پردازوں میں ہیں' اور سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں قسم کے مضامین اچھے لکھتے ہیں۔ ہم نے معیار کی کمی اشاعت میں یہ شکایت کی تھی کہ ان کے ایک مضمون میں سنجیدگی اور ظرافت کو جمع کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی' یہ شکایت ایک خاص مضمون کے متعلق تھی' یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے کل مضامین کے متعلق ہماری یہ رائے ہے۔ صدیقی صاحب چند سال قبل سہیل نامی ایک سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردو معلی کی طرف سے نکالا کرتے تھے۔ اس کی اشاعت بعض وجوہ سے موقوف ہوئی' یہ رسالہ انہوں نے پھر جاری کیا ہے۔ لیکن اب اس کی زیارت سال بھر میں ہم بار کی جگہ صرف ایک بار ہوا کرے گی' علی گڑھ سے علمی اور تعلیمی مرکز میں ایک ایسے رسالے کی جو وہاں کے نوجوانوں کو ادب اردو کی خدمت کی طرف مائل کرے' شدید ضرورت ہے' ہم سہیل کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایسے اسباب پیدا ہوں کہ صدیقی صاحب اسے جلد جلد شائع کر سکیں۔ سہیل کے سرورق پر علی اور ادبی سالنامہ لکھا ہوا ہے' لیکن سوا دو کے کل مضامین ادبی تعلق رکھتے ہیں۔ ادب میں تخلیقی تحقیقی اور تنقیدی مضامین مناسب تعداد میں ہیں۔ سجاد علی انصاری مرحوم کی نامکمل "روزہ" قابل دید ہے، اسے پڑھ کر ہمیں اپنی غفلت پر افسوس ہوا کہ اس سے قبل ان کی کسی تحریر کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر افسوس ہمیں ان کی جوان مرگی کا ہوا۔ اگر مرحوم نے عمر پائی ہوتی تو اردو کے تخلیقی ادب کی کمر ایک بڑی حد تک درست ہو جاتی۔ صدیقی صاحب نے اس تمثیل کی اشاعت سے اردو پر بڑا احسان

کیا ہے، اور اگر اپنے رسالے میں وہ اس کے سوا کچھ اور نہ بھی شائع کرتے، جب بھی ٹریڈنے والوں کو یہ سودا مہنگا نہ پڑتا۔ ایک دوسری تمثیل "دیوانے" کسی طالب علم کی لکھی ہوئی ہے، لیکن ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو، اگر ایسا ہے تو یہ خود ان کا قصور ہے، انہیں قبیلہ اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ مصنف کی مدد کے بغیر ہو لے ہم قائم کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس میں تخیل کی بڑی بے اعتدالیاں ہیں، اور قواعد فن سے بے ضرورت انحراف کیا گیا ہے۔ افسانوں میں سلطان حیدر صاحب جوش کا افسانہ قابل ذکر ہے، اور نظموں میں کوئی بھی قابل ذکر نہیں۔ "ناقدانہ مضامین" میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون اچھا ہے، اور تبصروں کا معیار عام رسائل کی سطح سے بلند رہتا ہے۔ ادبیے متعلق بوقتی مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مضمون کو چھوڑ کر کسی کا پایہ بلند نہیں۔ دو مضمون مرتب کے شاگردوں کے ہیں، ایک صاحب نے اُردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ کے عنوان سے چودہ پندرہ سو برس کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے، ایسا ایک ایسا وسیع اور مشکل موضوع ہے کہ کبھی بھی اس پر آسانی سے نہیں لکھ سکتے، چہ جائیکہ مبتدی۔ اس کے لیے جس وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی ضرورت ہے، اس کے واسطے ایک عمر چاہیے، دوسرے صاحب نے "ہمارا اور اُردو شاعری" کے موضوع پر لکھا ہے اور اس مضمون میں بھی آٹھ نو برس کی ادبی تاریخ زیر بحث آگئی ہے۔ ان دونوں مضمون نگاروں کو اُردو سے پُرشوق ہے، وہ دوسرے نوجوانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ مضمون لکھنا بھی محنت سے ہے، لیکن انہوں نے اتنا بھاری بوجھ اُٹھایا ہے کہ ان کے کمزور کاندھے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ دونوں کسی ایک مصنف یا کسی خاص دور کے متعلق اچھے نوٹس کو سامنے رکھ کر لکھیں، تو بہت زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ذیل میں ہم مفصلاً ہمارا اور اُردو شاعری کے اغلاط کا ذکر کرتے ہیں۔ اعتراض مقصود نہیں اور نہ ہم طالب علموں کے مضامین کو کالجین فن کے معیار سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ فرض فرد ہے کہ صدیقی صاحب کو مرتب میل اور استاذ اُردو کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، اور آئندہ سہیل غلط معلومات کی اشاعت کا ذریعہ نہ بنے۔

(۱) "ناصر الدین اور اس کے بیٹے معز الدین کیقباد کی جنگ کے حالات کو فارسی میں حضرت خسرو نے بہت پہلے ایک بہاری شاعر نے ..... اُردو میں نظم بند کیا تھا۔ خسرو کی قرآن السعدین ہر جگہ مشہور ہے، لیکن غریب بہاری شاعر کا بھی ایک شعر یاد رہے۔

'من کی اوجڑی ٹھگری کو تب کرنی باداں ناصر دین کو جب ملیں ہو بیدی کیداں'

یہ بیان سخت تعجب خیز ہے، ایک تو یہ کہ ایک ہی نظم فارسی اور اُردو دونوں میں کیسے نظم بند ہوئی؟ دوسرے یہ کہ خسرو کیقباد کے دربار کی شاعر تھے، "قرآن السعدین" باپ بیٹے کی مصالحت کے تھوڑے ہی دن بعد خسرو نے کیقباد کے حکم سے لکھی تھی۔ کسی شاعر کا خواہ وہ بہاری ہو یا غیر بہاری، اُردو گو ہو یا فارسی گو، اس موضوع پر خسرو سے بہت پہلے نظم لکھنا قطعی ناممکن ہے۔ شعر بالا کے زمانۂ تصنیف سے قطع نظر بھی کی جائے، تو اس کا کیا ثبوت کہ یہ شعر کسی بہاری شاعر کا ہے۔ صاحب مضمون کو یہ فرد بتانا تھا کہ یہ شعر انہوں نے کہاں

ہے یا اور ان کو بیان مصنف اور زمانہ تصنیف کے متعلق کہاں سے ماخوذ ہے

(۲) ذیل کے دو شعر علی الترتیب حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری اور ان کے مرید مولانا مظفر بلخی کی طرف منسوب کیے ہیں لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

"شرفا گور ڈراون نس اندھیاری رات — واں نہ پوچھے کون تمہاری جات
جی لگن میں ہے کہ آئی ہیں سہاگی بتیاں — جن کے کارن تجھ بہتوں نے بنائی بتیاں"

(۳) ملا علیم تحقیق کے اشعار ذیل بغیر کسی حوالے کے نقل کیے ہیں اور زمانی حیثیت سے انہیں بیدل سے بھی مقدم قرار دیا ہے۔ تحقیق کا سال ولادت ۱۰۵۰ھ لگ بھگ ہے اور سال وفات ۱۱۶۲ھ (تذکرہ خوشگو) اس حساب سے بیدل کی ولادت کے تقریباً ۲۰ برس بعد تحقیق پیدا ہوئے اور بیدل کی کافات کو کم از کم ۱۰ برس بعد سے ہیں تحقیق کے زمانے میں ریختہ گوئی عام ہو چکی تھی، اور بغیر کسی معتبر سند کے ہم ان اشعار کو تحقیق کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ نوالے دھن کی سند (مضمون نگار نے) اشعار کے لیے تو نہیں لیکن حالات کے لیے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے) ناکافی ہوگی۔

"سرجن ترے مکھڑے میں سورج کی کرن دھاہے — دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں مری چندھراہے
"جیکھڑا باندھو دل ہوں کاجا (کذا) — سلونا ساورے ایہ مرکوں آجا

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی عظیم آبادی تذکرہ نگار نے ریختہ گوئی کی حیثیت سے تحقیق کا ذکر نہیں کیا

(۴) شکی اور جمالی دو نے شاگرد تھے۔ یہ لوگ عمر کے لحاظ سے بہت بعد کے ہیں، شکی کو عشقی نے اپنا شاگرد لکھا ہے مضمون نگار کو اس قسم کی حکایتوں کو اس قدر آسانی سے قبول نہیں کرنا چاہیے۔

(۵) میر تقی میر نے میر جعفر عظیم آبادی سے فارسی ضرور پڑھی، لیکن مضمون نگار نے میر کی شاگردی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ میر فن سخن میں میر جعفر کے شاگرد تھے، حالانکہ یہ واقعے کے خلاف ہے" (ذکر میر ملا حظہ ہو)

(۶) مضمون نگار کے خیال میں طالب آملی بیدل کا ہم عصر تھا، لیکن طالب کا انتقال ۱۰۳۷ھ میں ہوا، بیدل کی ولادت سے کم و بیش ۱۰ سال قبل ہو چکا تھا (سرو آزاد)

(۷) مضمون نگار کی رائے میں "ہمارے اسکول کی اردو شاعری میں بیدل کا اسکول یقیناً سب سے پہلا کہا جا سکتا ہے"۔ سجاد اور فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثر پزیر ہے" جس شاعری کی تصنیف سے اُردو کو صرف دو شعر دستیاب ہوئے ہوں اُسے کسی اسکول کا بانی قرار دینا حیرت انگیز ہے، ہم تحمل کر سکتے ہیں کہ قدما کی تصانیف سے کوئی ثبوت اس امر کا نہیں دیا جا سکتا۔ کہ بیدل نے اُردو میں بہت سے اشعار کہے تھے اور وہ ضائع ہو گئے۔ اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ دو شعر جو میر اور قائم نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں، دہلی میں نہیں بلکہ عظیم آباد میں لکھے گئے، فغاں کا ذکر ہماری شعرا کے سامنے کرنے کی کوئی وجہ نہیں، ان کے فارسی اور اُردو کلام پر بیدل کا بالکل اثر نہیں پڑا۔ اس قسم کے بے بنیاد دعووں سے

ابن یمین کو احتراز لازم ہے۔

۸۔ مضمون نگار کی رائے میں "بیدل دراصل کے علاوہ ایک اسکول بلگرامی سادات کا ہے" اس اسکول میں فورشیدا امی، صفیر، بلگرامی، آروی وغیرہ داخل ہیں، لفظ اسکول سے معلوم صاحب مضمون کی کیا مراد ہے۔ صفیر بلگرامی اور ان کے تلامذہ کے متعلق تو یہ مسلمات سے ہے کہ وہ طرز ناسخ کے پیرو ہیں۔

۹۔ بیدل کے مقیم آبادی ہونے کی تائید میں آزاد کے علاوہ کسی قدیم تذکرہ نگار کا قول نہیں پیش کیا جا سکتا۔ بیدل کا ہماری ہونا ہرگز قدماء کے مسلمات سے نہیں ہے۔ نصیر آبادی نے ان کا وطن لاہور، قاسم نے بخارا، خوشگو اور عشقی نے اکبرآباد بتایا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی تذکرہ نگار نے خوشگو سے زیادہ مفصل بیدل کے حالات نہیں لکھے۔ اور جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے اسے سیکڑوں اربیدل کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا تھا، رہے عشقی، ایک تو وہ خود عظیم آبادی کے ہیں، دوسرے یہ کہ بیدل ان کے استاذ الاساتذہ تھے، خوشگو اور عشقی کی شہادت اس معاملے میں آزاد کی شہادت سے مرجح ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بیدل کا وطن عظیم آباد تھا ایسی شہادت پیش کرنی چاہیے، جس سے خوشگو اور عشقی کی تردید ہو سکے اور بارہویں صدی کے اکثر تذکروں کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ایسی شہادت موجود نہیں۔ ہم نے اس مسئلے کی تحقیق کے لیے کلیات بیدل کا بھی مطالعہ کیا۔ اس سے یہ تو ثابت ہوا کہ غزلیت اور آغاز شباب تک ہماری رہے لیکن یہ پتا نہ چلا کہ کس جگہ پیدا ہوئے۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ مرزا عبدالخالق پدر بیدل کی وفات کے بعد میرزا قتلغ رحم بیدل جو ایک ملازمت پیشہ شخص تھے بیدل کو ہمارے لے آئے ہوں۔ میرزا بیدل کی طرف جو شعر صفیر بلگرامی نے منسوب کیا ہے، وہ در اصل میر سوز کا ہے اور انہیں کے نام نکات الشعراء اور مخزن نکات میں درج ہے۔ شروح ذیل مضمون نگار نے سید نجیب اشرف صاحب کے ایک مضمون سے نقل کیا ہے۔ اس کے متعلق ان کی یہ رائے صحیح ہے کہ بیدل کی تصنیف نہیں۔ مضمون نگار نے شکایت کی ہے کہ سید نجیب اشرف صاحب نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، یہ کمی ہم پوری کیے دیتے ہیں ان کا ماخذ نوائے وطن ہے اور شعر یہ ہے:-

سر اوپر کوئی نہیں تب دھن آپن کہیں — پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بیس

شعر ضمناً:- شہر جس سے ازبس کہ وہ خوب ہوا — اپنے چہرے سے جگڑا ہے کہ کیوں خوب ہوا

۱۰۔ جوشش کے تذکرے کا ذکر حسن کے سوا کسی نے نہیں کیا، خود حسن کو بھی اپنے بیان پر اعتماد نہیں۔ اگر انہوں نے تذکرہ لکھا ہوتا تو عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش، خلیل، عشقی میں سے کوئی نہ کوئی اس کا ذکر ضرور کرتا۔ مضمون نگار کا یہ قول دیکھ کر بھی تعجب ہوا، کہ "جوشش کے ہر شعر میں جدت پائی جاتی ہے" ایسی مبالغہ آمیزی سے احتراز چاہیے۔ دل کو جوشش کا چچا زاد بھائی بتایا ہے، یہ فاش غلطی ہے۔ جسوت رائے ماگر کا بیٹا ہونا بھی صحیح نہیں۔ مضمون نگار کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ دل ہندی کے جید عالم تھے اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے؟ جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ الخ۔ یہ شعر دل کا نہیں جوشش کا ہے۔

۱۱۔ صحیح نہیں کہ مظہر علی جذب کا حال تذکرہ حسن کے سوا کہیں اور نہیں ملتا، تذکرہ عشقی میں ان کا ذکر موجود ہے اور صافی تخلص

کے تحت تو تذکرہ نویسی کے شاعروں کے متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ہے۔

(۱۲) احقر عظیم آبادی نے "دہلوی تھے۔ ممکن ہے کہ عظیم آباد بھی آئے ہوں، لیکن دہلی چھوڑنے کے بعد ان کا قیام زیادہ تر مرشد آباد میں رہا۔ (گلزار ابراہیم و تذکرہ مشتی)

(۱۳) مضمون نگار کو اصرار ہے کہ حسرت کا نام ہیبت قلی نہیں، ہیبت قلی تھا، یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ کل قدیم تذکروں میں ان کا نام ہیبت قلی خاں درج ہے۔ یہ صرف غلط نقل کیا ہے۔ "ادھر ہمارا دھر ایک شیشۂ دل ہے" ہمارے کی جگہ پہاڑ ہونا چاہیے۔ یہ غلطی اور لوگوں سے بھی ہوئی ہے "یہ غزل میں کیا پھریرے ہے" شکی شکی، یہ رباعی دیوان میں بھی درج ہے، غالباً حسرت کی نہیں۔

(۱۴) شورش کا سال وفات مضمون نگار نے ۱۱۹۰ بتایا ہے اور ۱۱۹۵ کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ اپنے ماخذوں میں انہوں نے گلزار ابراہیم (اس کا نام وہ گلزار ابراہیمی سمجھے ہیں) کا نام بھی لکھا ہے، حیرت کی بات ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد بھی شیفتہ کے قول کو وہ مرجح جانتے ہیں

ز مانہ گرچہ بہت برخلاف ہے شورش ہوا کرے ہیں ہے یار اپنے کام سے کام

گلشن بیخار سے مقطع بالا نقل کرنے کے بعد مضمون نگار نے اسی زمین کے دو اور شعر شوالہند کے حوالے سے لکھے ہیں:

کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام قسم خدا کی ہے ساقی کو مجھ کو نام سے کام"

ہماری صبح رخ یار شام زلف نگار نہ مہرہ ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام کے کام"

مضمون نگار ان دو شعروں کو رباعی سمجھتے ہیں۔ تعجب ہے کہ صدیقی صاحب نے اس غلطی کی تصحیح نہیں کی وہ سہیل کے مرتب ہی نہیں مضمون نگار کے استاد بھی ہیں۔ ان کی ذمہ داری دہری ہے۔

(۱۵) عشق کا بھی عظیم آباد کی شعرا میں شمار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

فدوی کو بھی عظیم آبادی شعرا میں نہیں گننا چاہیے، یہ بھی غلط ہے کہ وہ احمد شاہ کے وقائع نگار تھے، ان کا وطن تو جونپور ہے پھر یہ بھی ہے۔ ۱۹۰ تک ان کے قیام کی کوئی جگہ متعین نہ تھی، کبھی فیض آباد کبھی مرشد آباد اور کبھی عظیم آباد میں رہتے تھے۔ (تذکرہ حسن و تذکرہ قائم)

(۱۶) راسخ کے متعلق مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ سودا اور میر کے شاگرد تھے۔ میر نے بھی رائے اصلاح لی، نوائے وطن میں جو حکایت راسخ کے لکھنؤ جانے کی میر نے سنائی اور اپنا دیوان رائے اصلاح پیش کرنے کی لکھی ہے، اسے مضمون نگار تسلیم کرتے ہیں، انہوں نے دو قیمتہ مطلع اشعار راسخ کے نقل کیے ہیں، اور ان سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاگرد در اصل فدوی کے تھے، میر سے محض اصلاح لی تھی۔

"شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار راسخ ہوں ایک میں بھی وے کس شمار میں

"جو ہوں عالم بالا میں برسوں تربیت راسخ اویسیہ ارادت ہے جناب میر سے مجھ کو

سال وفات اور شاگردی سودا و میاں کے متعلق مضمون نگار کی رائے صحیح ہے' باقی کل بیانات محل نظر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ راسخ فیضِ آباد کے رہنے والے تھے' ابتدا میں انہوں نے نذدی سے اصلاح لی' اور ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں نذدی کی شاگردی کا اقرار ہے، لیکن یہ اشعار ان کی ہدایت کے مطابق بعد میں دیوان سے خارج کر دیئے گئے' چنانچہ مطبوعہ دیوان میں جو قدیم قلمی نسخے کی نقل ہے' ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا۔ کسی روایت سے تو اس کی تائید نہیں ہوتی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ مشق کی پختگی کے بعد نذدی سے منحرف ہو گئے ہوں گے، ورنہ ایک آدھ شعر تو دیوان میں ایسا رہنے دیتے جس سے ان کی ارادت مندی کا پتا چلتا۔ رہی میر کی شاگردی' اس کے متعلق تو ایک وطن والی حکایت تو محض سنی سنائی بات ہے' جس کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ شاد مرحوم کو کوئی خاص واقفیت راسخ کے حالات سے رہی ہو، اگر واقعی انہیں راسخ کے حالات کی کچھ تحقیق ہوتی تو مشق کو جو راسخ کے استاذ الاستاذ تھے' ان کا شاگرد نہ سمجھتے، اس حکایت کو رد کرنے کے یہ معنی نہیں کہ راسخ میر کے شاگرد تھے، اس کی نہایت معتبر شہادت ہمارے پاس موجود ہے' مصحفی عظیم آبادی معاصر راسخ لکھتے ہیں:

"در ہمادی حال مشق اشعار بہ استصلاح مرزا نذدی می نمود' چنانچہ از راکر مایہ فرصحتے فی الجملہ استعدادے بہم رسانیدہ کہ شاعرے پایہ سخن گردید' طریقہ پیروی کلام میر مرعی نہاد بہت ساخت' آخر بہاں رسوخ کہ کمون خاطر داشت بہ بارہا بی درصحبت میر صاحب... فائز شد و حلقہ' انقیاد شاگردی بگوش جاں انداخت

اس اقتباس سے اویسیہ ارادت کی حقیقت بھی کھل گئی اور میر کی شاگردی بھی مسلم ہو گئی۔ میرے ارادت غائبانہ راسخ کو میر سے تھی، لیکن حضرت اویس قرنی کے خلاف جو عمر بھر محروم زیارت رہے' راسخ لکھنؤ گئے' اور ان کی مدتوں کی آرزو پوری ہوئی۔ رہا یہ سوال کہ میر سے کس حد تک مستفید ہوئے' اس کا جواب موجودہ مواد کی رو سے نہیں دیا جا سکتا۔ راسخ کا سال ولادت عام طور پر ۱۱۶۲ھ سمجھا جاتا ہے' لیکن کسی نے اس کی تائید کرنے والے وطن سے قدیم تر سند نہیں پیش کی۔ ہماری رائے میں قدیم روایات کی عدم موجودگی میں سال ولادت کا تعین ناممکن ہے۔ رہا ۱۱۶۲ھ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ عبرتی نے جو بقول بعض شاد مرحوم کے استاد تھے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ راسخ نے ۶۰ برس کی عمر پائی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے' ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ۱۱۸۰ھ زیادہ قرین قیاس ہے۔ ہم اپنے دلائل اس موقع پر پیش کرنا نہیں چاہتے۔ سال وفات کا صحیح ہونا بھی کسی قدیم روایت سے ثابت نہیں۔

(۱۸) امین الدین امین کے متعلق یہ لکھنا کہ ۱۲۵۰ھ میں یہ عالم ضعیفی زندہ تھے' صحیح معلوم ہوتا ہے' کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کے زمان حیات و ممات کے متعلق منشی کالا سری رام کے بیان کو مرزا علی لطف کے بیان پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امین کا انتقال ۱۲۰۰ھ سے بھی قبل ہو چکا تھا، جیسا کہ ایک قدیم بیاض سے ثابت ہوتا ہے' جو ہمارے پاس موجود ہے۔

(۱۹) غلام مرتضیٰ جنوں کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہر تذکرے سے ان کا عظیم آبادی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ گلشن اور ابراہیم اور تذکرۂ مصحفی دونوں میں اس طرح ہے "جنوں الہ آبادی' اسمش شیخ غلام مرتضیٰ ابن شاہ تجر رہبر امی" پھر بھی کوئی کہے کہ کوئی

دیر سے پہنچا لہٰذا یہ شعر مضمون نگار نے غلام مرتضیٰ جوں کے نام لکھا ہے، عشقی نے سے جوں اکبرآبادی کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۲۰) خواجہ امام بخش امامی کا عظیم آبادی ہونا مشکوک ہے، عشقی نے انہیں دہلوی لکھا ہے، بالفرض اگر عظیم آبادی ہوں بھی تو ان کے باکمال شاعر ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ یہ رائے یا تو مضمون نگار نے امامی کا کلام دیکھ کر خود قائم کی ہے، یا کسی تذکرے سے نقل کی ہے ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ سوا اس شعر کے جو انہوں نے نقل کیا ہے، امامی کا کلام انہیں کہاں ملا، اور کس تذکرہ نگار کی رائے انہوں نے نقل کی ہے۔

(۲۱) حضور کا نام غلام محمد نہیں غلام یحییٰ تھا، عشقی نے انہیں حزیں کا شاگرد بتایا ہے، اور یہ روایت گلزار ابراہیم جلیل تجلیۃ معاش ہی کہ "عظیم آباد کا مشہور رئیس ہونا اور بچپن ہی سے شوق کہنا صاحب مضمون نے کہاں سے لکھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

کلیم عجم مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی ص ۲۰۰ + ۴۰ تقطیع ۱۷×۲۷ قیمت مجلد ۷ پتا:۔ دار الاشاعت قمر الادب، آگرہ۔

جناب سیماب کا اپنے متعلق یہ دعویٰ کہ:۔

یوں نے اس خوابیدہ عالم کو جگایا ہے کا گرمی محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

ممکن ہے تعلی پر مبنی سمجھا جائے، لیکن اس عہد کے متاز غزل گو شعرا کی فہرست سے ان کا نام خارج نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم عجم ان کے دیوان غزلیات کا نام ہے۔ غزلیات کے ساتھ ۴۰ خطبے بھی شامل ہیں، جو مصنف نے مختلف مقامات صدر مجلس مشاعرہ کی حیثیت سے پڑھے۔ ۴۰ صفحوں میں ۲۰ خطبے ان خطبوں نے لے لیے ہیں، ۵ صفحوں میں مصنف نے اپنے حالات زندگی لکھے ہیں، اور باقی ماندہ صفحات میں غزلیں تضمینیں وغیرہ ہیں۔ کلیم عجم میں جناب سیماب صرف شاعری کی حیثیت سے جلوہ گر نہیں، بلکہ مؤرخ ادب اردو اور نثار کی حیثیت سے بھی دنیائے سخن کے سامنے آئے ہیں۔ ہم ان تینوں حیثیتوں پر الگ الگ نظر ڈالیں گے۔

جناب سیماب کے یہ خطبات چودہ پندرہ برس کی مدت میں لکھے گئے ہیں انہیں ان پر نظر ثانی کرنے کا کوئی موقع ملا ہے، اور کتابی شکل میں ان کے چھپ کر آنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ جناب سیماب کی رائے میں یہ خطبے وقتی ضرورت کے لیے نہیں لکھے گئے، بلکہ ادب میں مستقل درجہ رکھتے ہیں، ہم نے انہیں استفادے کی نیت سے پڑھا، لیکن ہمیں بہت سے ایسے بیانات ملے جنہیں پڑھ کر ہم حیران رہ گئے، یا تو جناب سیماب واقعی اس صدی کے متعلم ہیں یا یہ حیثیت محض ان کا مروجہ صنعت کے برابر ہے سرسری مطالعے میں جو باتیں ہماری نظر میں کھٹکیں۔ ہم ذیل میں انہیں درج کرتے ہیں۔ مشکوک کا اظہار ظاہر ہے کہ ہم نے اپنی موجودہ معلومات کی بنا پر کیا ہے، اگر جناب سیماب اپنے دعووں کی تائید میں ایسے ثبوت پیش کیے جو ہمیں مطمئن کر سکیں تو ہمیں اپنی رائے بدلنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

(۱) "مشی چند رجان برہمن اکبرآبادی تھے"۔ ہمیشہ ہمار کے مصنف کا بیان ہے کہ برہمن کا وطن لاہور تھا۔

(۲) "نواب لطف اللہ خان صادق وغیرہ شعرا نے دہلی کے مطبع سخن کو چمکایا"۔ نواب لطف اللہ کا لقب "خان صادق" تھا۔

عارف ان کا تخلص نہ تھا۔ اگر کسی کتاب میں شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر ہو تو اس کا نام بتایا جائے۔

(۳) عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر آگرے ہی کی خاک سے اُٹھے" کیا مصنف کے نزدیک ان دونوں شاعروں کا زمانہ پیدائش عالمگیر ثانی کا عہد حکومت ہے؟ یا ان کی مراد یہ ہے کہ عالمگیر ثانی کے عہد میں آگرے سے دہلی گئے؟ دونوں صورتوں میں انہیں ثبوت پیش کرنا چاہیے' ہمارا موجودہ علم یہ ہے کہ یہ دونوں عہد عالمگیر ثانی کے بہت پہلے سے دہلی میں تھے اور آرزو نے بہت تھوڑا زمانہ عالمگیر ثانی کا پایا۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ آرزو کبھی عہد تفتہ پر فائز رہے' اور نہ وہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔

(۴) آبرو کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور وہ عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں" ممکن ہے کہ آبرو آگرے لگے ہوں لیکن کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں' عمر کا زیادہ حصہ وہاں بسر کرنا تو بڑی بات ہے' ایک دن بھی وہاں گزارنے کا اگر ثبوت عنایت ہو تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ میکار کے ایک مضمون میں خوشگو کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آبرو کا سال وفات ۱۱۴۶ھ ہے' یہ زمانہ محمد شاہ کا تھا' محمد شاہ ۱۱۶۱ھ میں مرے ہیں' ان کے بعد احمد شاہ کا زمانہ ہے' عالمگیر ثانی کا عہد حکومت احمد شاہ کے بعد آتا ہے' اب رہا ان کے زمانے کے شاعر کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ جناب سیماب کا قول صحیح ہو سکتا ہے' لیکن ہم کی صرف دو صورتیں ہیں' یا تو وہ خوشگو کے قول کو غلط ٹھہرائیں' یا ہمور کے خلاف یہ ثابت کریں کہ ۱۱۴۶ھ میں عالمگیر ثانی ہندستان کا بادشاہ تھا۔

(۵) میر باقر علی تخلص ایک گمنام شاعر ہیں' کم تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد تھا لیکن ممکن ہے کہ وہ دہلی ہی میں پیدا ہوئے ہوں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس سند سے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ "عہد محمد شاہی مخلص نے نقل وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیے"۔

(۶) "پیارام اردو میں کمتر شعر کہتے تھے"۔ میر کا قول ہے کہ اردو میں صاحب دیوان تھے۔

(۷) "میر تقی میر میر عبداللہ کے فرزند اور بمشیر زادہ ... آگرہ کے" آگرے میں پیدا ہوئے' یہیں تعلیم و تربیت پائی' یہیں شعر کہنا سیکھا' اور پھر باپ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے ..... دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا اور وہاں سے آپ لکھنؤ چلے گئے" ذکر میر سے ثابت ہے کہ میر کے والد کا نام محمد علی اور لقب محمد متقی تھا' آرزو کی بہن کے سوتیلے بھائی' ابتدائی تعلیم مزدو آگرے میں پائی' لیکن اس کے علاوہ سب کچھ دہلی میں سیکھا' شعر کہنے کا شوق نہیں سعادت امروہوی نے دلایا۔ دہلی میں ان کا قیام کم از کم چالیس سال رہا۔ اکبر آباد میں بارہ تیرہ اور لکھنؤ میں اٹھائیس برس۔ دہلی کے قیام کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں قیام زیادہ نہ رہا" عجیب بات ہے۔

(۸) عارف اکبر آبادی ... اپنے دوست امیر تقی کی سفارش بروئے کار نہ لا سکے اور ترک وطن کر کے دہلی چلے گئے" عارف سے میر کے تعلقات دوستانہ ضرور تھے' لیکن کسی تذکرے میں یہ نہیں لکھا کہ ان دونوں میں آگرے ہی کی ملاقات تھی اور عارف کے ترک

وضع کا سبب یہ کا اگر چھوڑا تھا۔

(۹) "سودا کے شاگرد شیخ شاہ نصیر" ہمیں تو یہ علم ہے کہ نصیر مائل کے شاگرد تھے" اور مائل بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق تمام (شاگرد سودا) کے تلامذہ میں تھے۔ تمام نے خزن نکات میں مائل کو قدرت کا شاگرد لکھا ہے۔

(۱۰) "ابراہیم علی خاں ذوق دہلوی" ذوق کا نام محمد ابراہیم تھا کسی تذکرے میں ابراہیم علی خاں نہیں۔

(۱۱) "حق جو اور شرر کے مصنف آبرو کے متعلق بھی لکھتے ہیں (ص ۱۴-۱۵) کہ یہ آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان چڑھے، یہیں تعلیم پائی" حالانکہ دوسری جگہ (ص ۱۳) خود لکھ چکے ہیں کہ آبرو کا مولد گوالیار تھا۔ ان دو متضاد بیانوں میں کسے قبول کیا جائے؟

(۱۲) "میر و غالب" جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک حقیر اکبرآبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے، انہیں چین نہ آتا" میر نے اپنے ہزاروں غزلیں کہی ہیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ہزاروں بار آگرے جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔

(۱۳) "یورپ کے متعلق بھی یہی حیثیت ہو چکی ہے کہ وہاں سے پہلا شاعر چاسر تھا" چاسر یورپ کی انگلستان کا بھی پہلا شاعر نہیں۔ اگر جناب سیماب اس دعوی کو ثابت کرکے تو اہل ممالک یورپ کی ادبی تاریخ از سر نو لکھنی پڑے گی۔

(۱۴) "عروض خلیل بن احمد اور ابوالحسن اخفش عروضی کی ایجاد ہے۔ جو بحریں اہل عرب نے ایجاد کیں ان کا اتباع فارسی شعراء بھی کیا، لیکن یوسف بیخاپوری اور زرتشت (کذا) وزیر نوشیرواں نے ان میں بعض تصرفات کیے اور بعض عربی بحریں ترک کردیں" عجیب بیان ہے۔ مدرسے کے لڑکے بھی اس کی تردید کرسکتے ہیں۔

(۱۵) "صعلۃ اور اخفش کے ادبی کارنامے" کیا صعلۃ جناب سیماب کے نزدیک کسی شاعر یا ادیب کا نام ہے؟ عربی داں سے ایسی غلطی سرزد ہونا باعث حیرت انگیز ہے۔ ص ۳۰

(۱۶) "انشاء اردو شعر کی تقطیع کے لیے بعض اردو ارکان وضع کیے۔ مثلاً مفاعیلن کے لیے پری خانم..." وغیرہ۔ "خوش وقتی کے لیے نوابی دربار میں عروض انشائی کچھ عرصے تک جاری رہی" یہ بات انشا کی نہیں قتیل کی ہے اور سعادت علی خاں کے دربار میں مقبول ہوئی یا نامقبول، اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں، مصنف نے اپنے قیاس کو روایت کی حیثیت سے پیش کردیا ہے۔

(۱۷) حضرت سیماب تیسری کو بڑے فارسی گو شاعروں میں گنا ہے، حالانکہ اس تخلص کا کوئی بڑا شاعر نہیں گزرا۔

(۱۸) "شاہ مبارک آبرو کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے۔ صحیح نہیں۔

(۱۹) "آبرو کا سال ولادت ۱۰۸۳ھ لکھا ہے" یہ بھی صحیح نہیں۔ (تذکرہ گلشن)

(۲۰) "مظہر کا سال وفات ۱۱۹۴ھ لکھا ہے" ۱۱۹۵ھ صحیح ہے۔ (گلبات صنت)

(۲۱) "حاتم کا سال وفات ۱۱۹۹ھ نہیں" ۱۱۹۷ھ ہے (عقد ثریا)

(۲۲) تاثیر کا سال وفات ۱۲۱۰ لکھا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں جس کا سال تکمیل ۱۲۰۹ھ ہے ان کی وفات کا ذکر نہ کیا ہوتا۔

(۲۳) تاباں کا سال وفات ۱۲۱۱ لکھا ہے۔ نکات الشعرا کا سال تکمیل ۱۱۷۵ ہے اور اس کی تکمیل کے قبل ہی تاباں کا انتقال ہو چکا تھا، نکات الشعرا جناب سیماب کے ماخذوں میں ہے، اس کتاب کے مطالعے کے بعد تاباں کا سال وفات کیوں کر انہوں نے ۱۲۱۱ھ قرار دیا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔

(۲۴) میر سوز اور میر حسن کے سنین ولادت ۱۱۳۳ اور ۱۱۴۰ لکھے ہیں، یہ بھی صحیح نہیں۔

(۲۵) جرأت کا سال وفات ۱۲۲۵ نہیں ۱۲۲۴ھ ہے

(۲۶) مصحفی اور رنگین کے سنین ولادت غلط دیے ہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ کل خطبات کا مطالعہ کر کے ان مقامات کا جو محل نظر ہیں، ذکر کریں، لیکن ایسے مقامات اس کثرت سے نکل رہے ہیں، کہ اگر ہم اپنے ارادے پر قائم رہتے تو تبصرہ بہت طویل ہو جاتا، اس لیے صفحہ ۶ پر ہم اپنے مطالعے کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت سیماب واقع کے شاگرد آگرے کے رہنے والے ایک دبستان شاعری کے بانی، اور جیسا کہ ان کے خود نوشت حالات سے معلوم ہوتا ہے، مولوی فارسی کے فارغ التحصیل عالم ہیں، توقع تھی کہ ان کی نظمیں اور غزلیاں ہوں یا نہ ہوں، زبان ضرور صحیح و فصیح ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس میں عرف استعمال کی کمزوری اور خیالات کی بے ربطی ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ غلط اور اجنبی انداز، تراکیب اور محاورات کی بھرمار ہے مشتے نمونہ از خروارے، ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں کہ ناظرین کو ہمارے قول کی صحت کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) ص ۲ "صدارت کا اعزاز جناب چکبست کے لیے مقدر تھا، لیکن"۔ مجلس انتظامیہ نے بار صدارت میرے کاندھوں پر رکھ دیا، اگر صدارت چکبست کے لیے مقدر ہوئی تو حضرت سیماب صدر نہ بنتے

(۲) ص ۳ "شاعری صرف تفریح خاطر کا ایک ذریعہ مسرور سمجھی گئی" ذریعہ کیونکر مسرور ہو سکتا ہے، سمجھ میں نہ آیا۔

(۳) ص ۴ علائق جمع بالجمع قاعدۂ عربی کے خلاف ہے، اردو میں بھی ثقات اجزا ذکر کرتے ہیں۔

(۴) ص ۴ "وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے قومی شاعر تھے جن کے نغمات شاعری کو خدا کے سخن نے ایک نئی قوت بخشی"۔ یہاں پر خدا کے لیے خدا کے سخن، تقطعی بے محل ہے۔ (۵) ص ۴ اثر کی جمع اثرات صحیح نہیں۔

(۶) ص ۵ "جب ہندوستان کو عروج حاصل تھا" تو شاعری کا عروج بھی نقطۂ کمال کی آخری حد پر نظر آرہا تھا۔ نقطے کی آخری حد کیا ہوتی ہے؟ کیا جناب سیماب کے نزدیک نقطے کی تعریف جو اقلیدس نے کی ہے صحیح نہیں؟

(۷) ص ۵ "اب ہندوستان زوال کے نقطۂ انتہائی پر پہنچا ہے"۔ تو روایات شاعری بھی اسی نسبت سے انحطاط پذیر ہیں۔ جس وقت

ہندوستان کا ستارہ چمکے گا' اس وقت شاعری کا آفتاب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ درباری کرنا نکلے گا۔

(۸) ص ۶ "اگر وہ (یعنی کانگریس) ڈھونڈے تو ہندوستان میں اسے آج بھی والیک اور نرقی مل سکتے ہیں' اگر وہ آواز دے تو آج بھی گنگا اور جمنا کے کنارے سے بیسیوں ویاپو اور بارن اس کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں" ایک جگہ قوتِ شاعری کے انتہائی زوال کا نمونہ' اور دوسری جگہ یہ دعویٰ کہ ہندوستان میں آج بھی والیک اور بارن کے سے شہر موجود ہیں۔

(۹) ص ۹ جلسۂ رضا۔ جلسے کی صفت رضا مکروہ نہیں (۱۰) ص ۱۲ شرادگاہ مولد کے معنی میں صحیح نہیں۔

(۱۱) ص ۱۵ "میں نے جو کچھ کہا ہے اسے کمیتی نقطۂ نظر سے کہا ہوں" نقطۂ نظر کا یہ استعمال محلِ نظر ہے۔

(۱۲) ص ۱۶ "مرزا غالب آج بھی ہندوستان کے ادبی معیار کا آخری نقطۂ نگاہ ہیں" یہاں نقطۂ نگاہ کا استعمال صحیح نہیں۔

(۱۳) ص ۱۸ "ہم اپنا محاذ شاعری واقعات و حادثات عالم کے دوش بدوش قائم کریں"۔ محاذ شاعری کا کیا مطلب ہے؟

(۱۴) ص ۱۸ "جب کوئی سانحہ شریک وقت ہو" یہ الفاظ جناب سیماب کے خیال کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔

(۱۵) ص ۲۰ "دلی کے کلام میں... قدامت الفاظ باقی رہی' تاہم اس کے متن یا فنہ تکلم سے بعض اشعار ایسے بھی نکل گئے جو آج کے جدید تر غزل ان میں کسی مزید تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی" ایک تو تکلم کی صفت 'متن یافتہ' عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ لفظ مزید بالکل بیکار ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ بعض بھی تغیر ہو چکا ہے' حالانکہ مصنف کا یہ مدعا نہیں

(۱۶) ص ۲۱ "عام غیر دلچسپی" ص ۲۲ خیالات پیدائی عجیب تر کہیں ہیں۔ (۱۷) "صوفیائی"... جذبہ "صوفیائی" نہ عربی ہے نہ فارسی نہ اردو۔

(۱۸) ص ۲۵ "کیا ہندوستان کا سواد... شرکا نہیں" سولو کیوں کر شرکار ہو سکتا ہے' سمجھ میں نہ آیا۔

(۱۹) ص ۲۷ "اولی خصوصیات" لفظ اولی اگر صحیح بھی ہو تو کانوں کو بہت برا معلوم ہوتا۔

(۲۰) ص ۳۲ "تبدیلی فضا" صحیح نہیں

(۲۱) ص ۴۰ سوانح کی جمع اسبع موانحات غلط ہے۔ (۲۲) محاورے کی جگہ تعاوفصحا کی زبان پر نہیں ص ۴۰۔

(۲۳) ص ۴۹ "پیغام کی جمع پیغامات غلط ہے۔ (۲۴) ص ۵۲ چھکڑہ نویسی غلط العام کے تحت نہیں آ سکتا۔

(۲۵) ص ۵۰ "وہ انتشار جو امتداد ایام سے ارنگ کہن میں پیدا ہو چکا ہے۔ منتظم و مرتب ہو جائے" انتشار بدل بہ تنظیم و ترتیب ہو سکتا ہے لیکن منتظم و مرتب نہیں ہو سکتا۔

(۲۶) ص ۵۱ تشہیر لسانی 'تشہیر' شہرت دادن رسوائی کے راپنہاں کہ کے رابر خر سوار کردہ بشہر گرداندن"

(۲۷) حضرت سیماب کی زبان پر لفظ 'قلم کار' نویسندہ کے معنی میں ہے' اس کی سند عنایت ہو۔

(۲۸) 'مشاہدہ پڑھنا فصحا کی زبان نہیں' الجلس پڑھنا صحیح ہے لیکن محاورے میں قیاس کو دخل نہیں'

حضرت سیماب کی نثر کے بعد ان کی نظم و سلام دیکھئے یہ بیڑا ہے ایک خلستان کی طرح آباد ہے' جہاں سبزہ بھی ہے' آب رواں بھی ہے' اور سایہ دار درخت بھی ہیں' لیکن نظم کا بعد وہم آشنا کے لیے اظہار کرتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار

ہماری انجمن مرکزی انجمن ترقی اردو حیدر آباد کی شاخ ہے۔ ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم صوبہ بہار میں اپنی شاخیں قائم کریں۔ ناگپور میں حال ہی میں بھارتیا ساہتیا پرشد کا جلسہ ہوا تھا جس میں گاندھی جی نے اپنی عجیب و غریب ہیئت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے متعلق عبدالحق صاحب کا ایک مضمون معیار میں چھپا ہے۔ ناظرین اس مضمون کو غور سے پڑھیں۔

اب ہمیں اردو کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ اور ہندوستان کے ہر شہر بلکہ ہر قصبے میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کرکے اس کے مقاصد کی تکمیل کرنی چاہیے۔ صوبہ بہار میں جو شاخیں قائم ہوں، وہ ہمارے پاس منظوری کی درخواست بھیجیں۔ عدالتوں میں اردو رسم خط کو رائج کرنے کے لیے ہماری انجمن عنقریب ایک عملی تجویز پیش کرے گی۔ امید ہے کہ ہمدردان اردو ہماری معاونت کریں گے۔

"معتمد"

دیوان جوشش! دیوان جوشش!

عنقریب شائع ہو جائیگا

جوشش عظیم آبادکا نامور شاعر ہے۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے، جسے ہم نے بڑی کوشش سے حاصل کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا ایک ناقدانہ نسخہ مرتب کرایا ہے، جس میں جوشش کے حالات کے علاوہ، اس کے بھائی محمد عابد دل کے حالات بھی ہوں گے۔ دیوان کی چھپائی شروع کرادی گئی ہے۔ فہرست خریداری میں بہت جلد اپنا نام درج کرایئے جن حضرات کی درخواستیں ۱۵ جولائی تک آجائیں گی ان سے قیمت ۲۵ فی صدی کم لی جائے گی۔ رعایتی قیمت کے لیے آخری تاریخ ۳۰ اپریل مقرر کی گئی تھی، مگر شائقین کلام جوشش کے اصرار سے ۱۵ جولائی تک درخواستیں بھیجنے کا موقع دیا گیا ہے۔ قیمت ۶ کے قریب ہوگی۔

منتظم معیار، بانکی پور (پٹنہ)

مطبوعات شاد بک ڈپو

مثنوی مادرِ ہند:- اس وقت تک جتنی مثنویاں تصنیف ہوئی ہیں ان میں سے کسی کا تعلق موجودہ سیاست سے نہیں ہے یہی ایک مثنوی ہے جو ایسے اہم موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اور وہ بھی شاد عظیم آبادی مرحوم جیسے شاعر کے قلم سے۔ مزید براں مولانا سیماب اکبر آبادی اور حضرت رشید صدیقی جیسے ادیبوں کے مقدمے بھی شامل ہیں ص ۹۹ قیمت صرف ۱۲ر

فکر بلیغ:- مصنف شاد عظیم آبادی۔ اس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھیے اور نکات شاعری سے واقف ہو جایئے۔ شعر و سخن کا مذاق رکھنے والے حضرات ضرور منگوائیں۔ سائز ۲۰×۲۶ ص ۱۶۰ قیمت عہ

ظہور رحمت:- یہ چھوٹی سی کتاب ڈیڑھ سو سے زائد کا مجموعہ ہے جس میں حسب ذیل مضامین ہیں (۱) بیان ولادت (۲) معراج (۳) شبیہ مبارک (۴) آپ کے آنے کی ضرورت (۵) حالات براق (۶) طلب نبی معرفت (۷) آپ کا مرتبہ (۸) آپ کا اخلاق۔

داستان عجم:- ادیب الملک نواب امیر حسین خیال عظیم آبادی مصنف "منزل اور اردو" کی زندگی کا آخری کارنامہ جس میں شاہنامہ فردوسی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر رشید الحمد صدیقی کا تعارف اور حضرت عباس شوستری کے مقدمے بھی ہیں۔ ص ۱۱۰۔ اس عدیم المثال تصنیف کی قیمت صرف (عہ) ایک روپیہ ہے۔

شاد بک ڈپو چوگھڑا، پٹنہ سیٹی

معذرت

برقی مشین پریس کی مشین ٹوٹ جانے کی وجہ سے مئی کے پرچے کی اشاعت میں بہت دیر ہوئی اور ہمیں مجبوراً برقی پریس سبزی باغ میں رسالہ چھپوانا پڑا۔ امید ہے کہ جون کا پرچہ جون ہی میں شائع ہو جائے گا۔ اب سے معیار ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا کیوں کہ اس طرح ہمیں رسائل کے خلاصے اور ادبی خبریں مرتب کرنے میں آسانی ہوگی۔

"منتظم معیار"

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

مرتب
قاضی عبدالودود

بانکی پور (پٹنہ)

معاون
آرزو جلیلی

جلد ۱ شمارہ ۴ | فہرست | جون ۱۹۳۶ء

شمار		صفحہ
۱	مروجات ۔ از ق ع و	۲۵۰
۲	تعارف	۲۵۰
۳	آثار ادبیہ ۔ مثنوی در وصف تصرف ابراہیم حسین	۲۵۱
۴	صوبۂ بہار ۔ ۔ از شیخ علی حزیں	۲۵۴
۵	مراسلت صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے از سید حسن عسکری بنام ابراہیم پروفیسر پٹنہ کالج	۲۵۵
۶	۱۹۳۵ء کے ادبی مضامین	۲۵۸

شمار		صفحہ
۷	محکمہ سال کائنات بصف خاں سال آغاز تذکرۂ مصحفی و تصحیح دیوان موصوف از ق ع و	۲۶۲
۸	ہماری زبان ۔ از سید رضا علی سہسوانی و ق ع و	۲۶۴
۹	عالم ادب	۲۶۶
۱۰	مطبوعات جدیدہ و سالنامۂ شاہکار سالنامۂ مساوات الفاظ نہرو چیف دو دیہ و حیرت از بتدی	۲۷۰

تصحیح: (ہوی، ہوے، لکھیے، دیکھیے، چاہیے میں ہمزہ نہیں اگر ہو تو کاتب کی غلطی ہی ۱۳۵ ہندوں، ہندوؤں۔ ۱۴۱ ہوی نہیں ہوئی ۱۴۲ بچا۔ بجا ۱۴۳ اللہ۔ للہ ۱۴۴ حاظر ہے ہاں = حاضر ہے یاں ۱۴۵ الدواء الدوا۔ ۱۴۶ نرز۔ ریز ۱۴۷ اور، اور ۱۴۸ مجھ کو، مجھے ۱۴۹ نشان گمان = سان گمان ۱۵۰ رو رہی ہے ۱۵۱ اسے ۱۵۲ کے ۱۵۳ جاں۔ جا ۱۵۴ دیکریں۔ دیر ۱۵۵ جسے = جیسے ۱۵۶ طبعیات۔ طبیعیات ۱۵۷ اونہوں، انھوں ۱۵۸ تبزایہ۔ تزایہ واشتداد ۱۵۹ ل آیا۔ ل آرا ۱۶۰ اللہ۔ للہ ۱۶۱ ۱۰۳۰، ۱۰۳۷ کرتے تھے۔ کرتا تھا ۱۶۲ اسی = اس ۱۶۳ اور۔ انھیں ۱۶۴ زمانے زمانہ تھے ۱۶۵ مقابلے۔ مقابلہ ۱۶۶ قبدریہ = عبدریہ ۱۶۷ بان = زبان ۱۶۸ طریقہ = طریقے ۱۶۹ ذریعہ = ذریعے ۱۷۰ جذبہ = جذبے ۱۷۱ سنم = بیم ۱۷۲ صاحت = صاحت ۱۷۳ املا اعلان، املا ۱۷۴ زبان = زبان سے ۱۷۵ قدرنہ = نہ قدر ۱۷۶ جز = جزو ۱۷۷ کرانیوں۔ کرانیوں ۱۷۸ موجہ = موجہ ۱۷۹ فقیہ = قصہ ۱۸۰ حسینی = حسنی ۱۸۱ یہ = یہ ۱۸۲ جان = جان بیگ ۱۸۳ جمالی = جمال ۱۸۴ واقعی، قطعی ۱۸۵ کر بھی، کر ۱۸۶ مقامات = مقامات میں۔

شمار کی ہر کھا میں ہندوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ ہندھ کے بعد نویں دسویں اور گیارھویں ہندھیں، پانچویں، چھٹے اور ساتویں ہندھ گیارھویں بارھویں ہندھیں۔

محمد علیم الدین پرنٹر و پبلشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر شائع کیا۔ انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ سے شائع کیا

معروضات

اردو کو اس کے مخالفین کے حملوں سے بچانے، اسے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے حامیان اردو کا منظم ہونا، ضروری ہے۔ تنظیم کس اصول پر مبنی ہو اس کے متعلق ہم اپنی رائے درج ذیل کرتے ہیں:-

(۱) انجمن ترقی اردو کو مرکزی انجمن قرار دینا چاہیے۔ جو انجمنیں اردو کی خدمت کے لیے اس وقت قائم ہیں ان میں سب سے زیادہ خدمات اسی کی ہیں۔ اور یہ سب سے پرانی بھی ہے۔ کسی نئی انجمن کی بنیاد ڈالنے کی قطعی ضرورت نہیں،

(۲) ہر صوبے میں اس کی شاخ ہونی چاہیے۔ اس وقت جو انجمنیں قائم ہیں ان کا مرکزی انجمن سے الحاق لازمی ہے۔ ہم نے بڑی مسرت کے ساتھ ہمایوں میں یہ خبر دیکھی کہ لاہور میں بشیر احمد صاحب سرگرم حامی اردو کی کوششوں سے ایک انجمن اردو پنجاب کے نام سے قائم ہوئی ہے۔ اس کے مقاصد سے ہمیں بالکل اتفاق ہے اور ہم اس کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ اس انجمن کو، انجمن ترقی اردو سے کسی قسم کا تعلق نہیں، نا ممکن ہے کہ بشیر احمد صاحب جو اس انجمن کے روح رواں ہیں مرکزی انجمن سے وابستہ ہونے کے فوائد سے آگاہ نہ ہوں۔ یہی قیاس میں نہیں آتا کہ انہوں نے اپنی انجمن کو بالارادہ انجمن ترقی اردو سے بے تعلق رکھنا چاہا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محض بے پروائی سے ایسا ہوا ہے اور کارکنان انجمن بہت جلد تواصل پیدا کر کے انجمن ترقی اردو سے اس انجمن کو ملحق کریں گے۔

(۳) صوبے کی انجمنیں شہروں اور قصبوں میں اپنی شاخیں قائم کریں۔

(۴) انجمن ترقی اردو کو جلد از جلد کسی مرکزی مقام پر منتخب اشخاص کی ایک کانفرنس منعقد کرنی چاہیے جو ہمارے اور باتوں کے علاوہ ذیل پر غور کرے:- ۱۔ کیا اردو کا نام ہندوستانی رکھنا چاہیے؟ ۲۔ اردو ہندی دو زبانیں ہیں یا ایک؟ اگر دو ہیں تو شمالی ہند میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو گی یا ہندی؟ عدالتوں اور سرکاری دفتروں کی زبان کون سی ہو گی؟ ۳۔ حامیان ہندی کی یہ کوشش کہ ہندی انگریزی کی جگہ لے، اس کے متعلق حامیان اردو کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے۔ ۴۔ ایسے صوبوں میں جہاں کی مادری زبان اردو نہیں، اردو کی کیا حیثیت ہونی چاہیے؟ ۵۔ کیا اردو میں فارسی عربی کے الفاظ بہت زیادہ اور سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بہت کم ہیں؟ ۶۔ کیا اردو کے رسم خط کو آسان بنانے کی ضرورت ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟

تعارف

حسن کی مثنوی کلیات میں بہت غلط لکھی ہوئی ہے، قیاسی تصحیح میں جو حد جناب خیال سے ملی، اس کے ہم نہایت ممنون ہیں۔ قدم جواہر، جواہر علی خان خواجہ سرا ناظر ہو بیگم کی ملک تھا۔ حزیں کی رہائی ایک قدیم بیاض سے ماخوذ ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔ بیچ رائی، رام رائی حزیں کے بھائی تھے۔

آثارِ ادبیہ

مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر

حمد و ثنائے خالقِ دنیا و دیں
دیا اس کا نوس قسزح سے جواب
کرے کون ایجاد یہ بے ستوں

ثنائے صانعِ دیوانِ عرشِ بریں
بنا جب یہ والا نِ عالی مکاں
یہاں تیشۂ عقل ہے سرنگوں

شنا پہلے اس خالقِ پاک کو
رکھے مہر و مہ اس میں دو تابداں
بجا ہے جو حیران بنائے فہم

دیا جس نے رتبہ کفِ خاک کو
زر افشاں انجم کا ابرک لگا
کہ اس دستکاری کو کب پائے فہم

اُسی خاک سے خلق عالم کیا
سفیدی سے دی مہر و مہ کی جلا
مگر فہم میں بھی آتا ہے یاں

ہوا کر کے دم اُس میں آدم کیا
ہوا جب یہ ایوان کرسی نشیں
کہ احمدؐ کی خاطر بنا یہ مکاں

پھر آدم کی خاطر بنایا جہاں
قرینوں سے تب سب میں بانٹی زمیں
در نعت حضرت سید المرسلین

عدم اور ہستی دو رویہ مکاں
رکھی وسعتِ صحن لا انتہا
بیا ساقیا مے بدستی کنیم

رکھی شرق سے غرب تک اک بنا
ازل اور ابد بیچ میں کر بپا
محمدؐ بگویم و مستی کنیم

سراسر مثالِ خطِ استوا
عجب طور کھینچا سن لے ذی عقول
محمدؐ ہے وہ صاحبِ دوسرا

بنا اس پہ پھر گنبدِ آسماں
..... اس کا سب عرض و طول
نہیں دوسرا کوئی ایسا ہوا

احاطے میں اس کے دیا سب جہاں
کیا مخملِ اطلسی اس میں فرش
خدا و محمدؐ اس کا ہے لاک ہے

عناصر کی چوکور اینٹیں لگا
لگا دامنِ خاک سے تا بہ عرش
سمجھ بات گر تجھ میں ادراک ہے

زمانے کا ایوان بر پا کیا
شب و روز آدنی ہیں اک فرشِ راہ
ہے لازم مکاں کو کہیں چاہیے

کیے برج پھر اس میں بارہ عیاں
برنگِ گلیم سفید و سیاہ
کہ انگشتری پر نگیں چاہیے

لگا پیشِ رو ابر کا آسماں
ہے سجدے کے لائق وہ جائے پاک
مدینہ ہے وہ علم کا جانِ پاک

شفق سے اس ایواں کو رنگیں کیا
میں صنعت گری پر ہوں اس کی ہلاک
خدا اس کے در پر کرے ہم کو خاک

طلائے شعاعی سے زرّیں کیا
اسی نے دیا عقل کو یاں علاج
در فضیلت شیخ رزم گیر یا بہ مصداق

کیے بر سرِ بام دستف و جدار
کہ پایا عمارت نے جس سے رواج
انا مدینۃ العلم و علی بابہا

خیالات عالم سے نقش و نگار
یہ کرنی اسی کی ہے اور کس کا کام
در اُس کا ہے وہ جو علی ولی

کیا کہکشاں کا جو طاق انتخاب
یہاں موم ہے کارِ سنگ و رخام
وہ ہے شیرِ حق اور وصی نبی

رسائی ہے اس گھر میں اسکے سبب
یہ جز حب حیدرؑ کوئی پہنچے کب
وہ ہے شہ نشین مقام بنی
کہ جس سے ہوئی تل کے بارہ دری
وہ ہے قبۂ نور دار السلام
درود اس گھرانے پہ ہو صبح و شام
تصدق ہوں میں ہر سر اہل بیت
میں دل سے ہوں خاک در اہل بیت
اسی در کا ہوں میں ازل سے فقیر
ہے ایماں مرا قول سعدی پہ سیر
خدایا بہ حق بنی فاطمہ
کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ
اگر دولتم رد کنی در قبول
من و دست و دامان آل رسول

ساقی نامہ

بلا ساقی بھر کہ وہ جام شراب
نمک سے ملاحت کے ہو جس میں آب
کہ مستی مری شرع کے ساتھ ہے
مرا دین و ایماں ترے ہاتھ ہے
تو لیں جب محمدؐ کی خاطر حسن
کیا حق نے ظاہر زمین و زمن
بناجب یہ قصر زمرد سرشت
بنائے مکاں اس میں رشک بہشت
فضا صاف یہ قصر جواہر نگار
لگے اس کو آباد پروردگار
نمونہ بہشت بریں کا ہے یہ
محل و مکاں مومنیں کا ہے یہ
کہوں کس زباں سے میں اسکی ثنا
جو دیکھے سو جانے کہ اصل علیٰ
شرف مرتبہ مکان زور دارۂ عالی شان
مجھے اس کا نقشہ ہے کرنا رقم
سر سے اٹھاؤں ستون قلم
وہ دروازۂ قصر عالی مکاں
رہے جس کے سایے میں سارا جہاں
اگر آئے کیسا ہی واں مضمحل
جہاں اس کو دیکھے تو کھل جائے دل
دو دل سے از بس وہ ہم رانہ ہے
اسی سے درِ عیش یاں باز ہے
ہر اک اس کا حلقہ ہے چشم بتاں
ہر اک زلف ہے کاکل مہوشاں
مرا فرازیوں کا رسالہ ہے وہ
بلندی کے عالم سے بالا ہے وہ
بلند اس سے کوئی نہ ہوگا مکاں
زمین اس کی ہے ہمسر آسماں
چڑھے جو کوئی اس کے بالائے بام
کٹورا سا نیچے ہو بنگلہ تمام
عجب طرح کا دلکشا ہے وہ خوش فضا
کہ آتی ہے جنت کی اس میں ہوا
ادا ک عقلی اس میں دیکھی میں اور
جو دیکھا سے کھول کر چشم و نور
جہاں تک کہ عقدے ہیں سر کار کے
وہ رہتے ہیں حجروں میں اسکے بھرے
یہ وسعت کہ دل کی یہ وسعت تو ہو
کسی جا میں ایسی فراغت نہ ہو
یہ وہ جا ہے کان زر و زمین بخش
کہ ہر در ہے اس کا در ثمین بخش
رہے چشم بد دور اس سے سدا
کہ ہے شیلیان علیؑ کی وہ جا

ساقی نامہ

ذکر کے دینے میں ساقی قصور
کہ ہے قصر کی مدح اس کے ضرور
پلا مجھ کو صہبائے الفت کا جام
کہ ہے دل میں ساقی کوثر کا نام
عجب قصر دیکھا میں وہ پرشکوہ
کہ مشکل ہے اس کی مانند کوہ
مرتع، بسلط، مصفیٰ تمام
نگیں کی طرح خوش نما وہ مقام
ہوا اس کی شرح بیان نشاط
فضا اس کی طرح زمان نشاط
فلک سے زمیں اس کی ہمداستاں
کف خاک در جبہہ را استاں
صفا نے کی رشک صفائے گہر
چمک برق ابرک سے براق تر
کدورت سے چونا، ہاں کا بری
کہے تو چنبیلی کی جیسے کلی

ہے افشاں ابر کے اس پر ملا
سراپر ہے موتی کا چونا لگا
ہے سرخی کی جا سرخیِ لعل واں
ہو شرمندہ جس سے لبِ گلرخاں
نظر کو نہ ہو وقت نظارہ تاب
بھر آئے ہے سورج کی آنکھوں میں آب
وہ ایواں پُر از طاق و محرابِ طاق
کہ ابرو خمِ دل ربائی میں طاق
پر از طاق واں کا جو ایوان ہے
نظر میں ہلالی کا دیوان ہے
دو کرسی بلند اور وہ شہ نشیں
منقش گل و بوٹے اس کے پہ گھائے ہیں
وہ پردوں کی سرخی کہ لالہ جو داغ
وہ سبزی چمنوں کی کہ ہو سبزہ باغ
ادھر دیکھیے یا اُدھر دیکھیے
مرتع کا عالم جدھر دیکھیے
ہے بارہ دری ایک واں شرق رو
منور ہے جوں عارضِ نیک خو
کرے صبح اس آستاں کو سلام
تفاوت سے خورشید اللہ کرے
دو سرخ اس کے آگے لگا سائباں
شفق جوں فلک پر ہو جلوہ کناں
بلندی میں وہ سائباں جوں سحاب
ہے تو اس قرمز اس کی رنگیں طناب
وہ استادے دونوں یمین و یسار
کہ جیسے دو بازوئے دستِ نگار
ہے اک حوض اس سائباں کے تلے
کہ پانی ہے اس میں کہ یا گھلے
لبالب ہے پُر آئینہ وار
بھرے عکسِ عمارت سے اس میں بہار
خوشا چاہ وہ جس سے ہو اس میں آب
ہر جا چو چشمہ یہ دریا کا تاب
ہے بنگلا بھی چو بیں وہاں ایک سو
کسی کا ہے گویا دلِ نیک خو
وہ بنگلا کہ تھے بنگلے کا دل
کنول کی طرح جس سے دل جائے کھل
ہے اک دست چپ اور بارہ دری
کہ در ہے ہر اک اس کا چشم پری
دو رویہ وہ ایواں ہے فرخندہ فال
ادھر کو جنوب اور ادھر کو شمال
لگے واں ستونوں میں آئینے سب
وہ والان گویا ہے شہرِ حلب
درخشندہ یا ہم مہ و کہکشاں
فراموشہ عکس اس میں گرگ و سگاں
ان آئینوں میں ہے سماں جلوہ گر
ادھر کا ادھر اور ادھر کا ادھر
ہر اک اس کے جلوے سے دیوانہ ہے
وہ آئینہ گویا پری خانہ ہے
وہاں عکس جس کا نمودار ہے
وہ حیرت سے بس نقشِ دیوار ہے
ہے اس آئینے سے دلِ شمع داغ
کہ بے عکسِ شمعوں کا وہ چشم و چراغ
مقابل بہم آئینے دو طرف
قرانِ دو اختر یہ ہیئت الشرف
ستون سرو آئینہ آب چکن
نظر اس کے قمری و بلبل سخن
مثالِ ستوں جو کہ ہیں راست باز
انھوں کے قدم پر ہے چشمِ نیاز
کرے جب کہ فوارہ گردن بلند
اور آئینے میں عکس اس کا ہو بند
ہے اس وقت نقدِ تماشا بہ کف
کہ ساتھ اس بزرگی کے در نجف
وہ نقطہ یہ آئینہ ہے یاں کہ بس
ستوں کے الف کو کیا اس نے وس

درمدح باغ

ادھر باغ اس کے زیرِ قدم
ادھر وہ عمارات رشکِ ارم
کہوں باغ پا یں کا کیا میں بیاں
خدا جیسے ہو زیرِ پائے بتاں
وہ ایواں کا روشن ہو یاں سا مجال
کہ ہے کوکبِ قطب اس رو کا خال
ہوا ہو جسے باغ و گلزار کی
ہے اینٹ ہوا اس کی دیوار کی
گھٹا نت بستی ہے رحمت کی واں
نہیں نام کو گرد و کلفت کی واں

عجائب دہاں حسن ہے جاں فزا ہوا میں[۱] رطوبت ہے والی اس قدر یہ ستھرائی اور یہ صفائی کہیں
دم عیسوی ہے جہاں کی ہوا کہ ہے دھوپ میں چاندنی کا اثر کسی حسن کی ہم نے دیکھی نہیں
گل تری کا ہے اس جا ظہور نہیں بات کچھ میری یاں بے خلل ہے حسن مصفّے[۲] بدن طور کا
آگے ہیں[۳] گل عیش و عشرت سرور یہ ہے صاف اس میں تو کیا ہے خلل سدا وقت رہتا یہ ہیں[۴] نور کا

منور ہے ازبس کہ دیوار و در برابر ہے اس جا[۵] پہ شام و سحر
ہے پتھر پھسلنا بھی واں ایک صاف نظر گر نہ ٹھہرے تو رکھیو معاف

---

[۱] قلمی نسخہ ق، ق میں لگا اور بنا دونوں میں ہے۔ ق رنگیں بجائے زریں ہے۔ ق و نداردہ ہے۔ ق کی جگہ کا ہے۔ ق کی جگہ کو سہ ق طرح کی جگہ شور۔ دوسرا مصرع جناب خیال کی رائے میں اس طرح ہو سکتا ہے بسمع کیا اس کا سب عوض و طول ہے۔ ق ادنی کی جگہ دونوں ہو سکتا ہے۔ یہ مصرع ہر گز ناموزوں اور غلط ہے۔ ہے۔ ق کر دوں بجائے کرے۔ ہے۔ ق میں فہم اور ہم دونوں ہے۔ ہے۔ یہ بھی ق میں نہیں قیاسی اضافہ ہے۔ ق میں ہے۔ ق میں مل کے کی جگہ لگ ہے۔ ق اگر آئے کیا ہے۔ ق اس مقبل سے ق میں اک نداردہ ہے۔ ق میں اس کے نداردہ ہے۔ ق قال بجائے ہر ہے۔ ق عہد بجائے عود ہے۔ ق آستاں بجائے راستاں ہے۔ ق ق برق بجائے براق ہے۔ ق سرفی کی جگہ ہر فی سر ہے۔ ق رگ بجائے لب ہے۔ ق کل بجائے گل ہے۔ ق میں اسی طرح ہے۔ ق سما بجائے سماں لکھا ہے۔ ق میں اسی طرح ہے۔ ق میں اسی طرح ہے ہے۔ ق ؟ ہے۔ ق، حال بجائے خال ہے۔ ق بت بجائے نت ہے۔ ق ہر گز لکھا ہے۔ جناب خیال کی رائے میں یوں ہو گا ہے۔ ق میں گل عشرت و عیش و سرور ہے۔ ق ہوائے رطوبت بجائے ہوا میں رطوبت ہے۔ ق ہیں بجائے یہ ہیں، ہے۔ ق میں بجائے اس ہے۔ ق صفا ہی بجائے صفائی۔

صوبہ بہا رباعی شیخ علی حزیں

پیوستہ غزالان ختن را مست بار وحشی نگہان شوخ دو را مست بار
در شہر تخلصے زمن خواستہ آرام تخلص است آرامت باد

یہ رباعی ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کی ایک قلمی بیاض میں فی جو عہد عالمگیر ثانی کی لکھی ہوئی ہے اس کے متعلق یہ عبارت بھی درج ہے رباعی کہ حزیں در عنایت فرمودن تخلص بہ میر زائن برادر راجا رام زمان عمدہ دار عظیم آباد ارشاد فرمودہ بودند۔

مراسلت

صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے

جناب مدیر معیار

تسلیم

رسالہ معیار سے علمی اور ادبی خدمات کی جو توقع ہے، اُس کی بنا پر سطور ذیل کے ذریعے سے ناظرین کی توجہ صوبہ بہار کے چند علمی خزانوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بہار کو کتب خانہ مشرقی پٹنہ پر بجا ناز ہے، لیکن اس نادر کتب خانے کے علاوہ بھی بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بیش بہا مخطوطات گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ علمی ذخیرے بے توجہی کے باعث کیڑوں کی نذر ہوتے جا رہے ہیں۔

جب انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ س کمیشن کا اجلاس ۱۹۱۷ء میں پٹنے میں منعقد ہوا تو مجھے قدیم کتب تواریخ کی جستجو میں صوبے کے مختلف مقامات کی سیر کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں راے سلطان بہادر کے تباہ حال کتب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا، جو دیوان محلہ پٹنہ سیٹی میں ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر سوبی مل چند، سرکار صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج، پروفیسر کالی کنکر دت، اور راقم الحروف نے تین دن کی محنت کے بعد کئی قدیم مخطوطات، اس علمی ذخیرے سے منتخب کیے۔ لیکن ہمیں اجازت نہ ملی کہ انھیں تاریخی نمایش میں پیش کریں۔ محلہ ہرمندر، پٹنہ سیٹی میں ایک ہندو بھائی کے پاس قلمی کتابوں کا ذخیرہ ملا، جسے انھوں نے بہ وقت تمام ہمیں دیکھنے دیا۔ اگر ان علمی ذخیروں کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ بہت جلد ضائع ہو جائیں گے۔ پٹنہ کے علاوہ، گیا اور آرہ کے اضلاع میں بھی چند نادر الوجود نسخے موجود ہیں۔ گیا میں منّو لال صاحب کا ذاتی کتب خانہ نادر روزگار مخطوطات سے مالا مال ہے۔

مذکورۃ العدر تاریخی نمایش کی مجمل فہرست، جسے مطبع حکومت ہند کلکتہ نے ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تھا، اس کے مطالعے سے صوبے کی علمی دولت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس فہرست میں ۹۴ء سے ۱۶۹۸ء تک کی جو کتابیں، دھلیاں اور مخطوطات ہیں، وہ دیوان ناصر علی مرحوم کے وقفی کتب خانے سے حاصل کیے گئے تھے یہ کتب خانہ، کبھی اضلع سارن میں بہ حالت تباہ موجود ہے۔ اس مردم خیز بستی کو شہنشاہ عالمگیر نے ایک سیتہ کو "بہ تصدق فرق مبارک" بہ طور معافی معاش عطا فرمایا تھا۔ دیوان سید ناصر علی انھیں سیتہ کی اولاد سے تھے۔ اور شاہ عالم ثانی کے ہم عصر تھے جیسا ان کی مہر اور عالی شان عمارتوں کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔ موصوف نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی جس میں اٹھارہ ہزار سالانہ کا وقف بھی شامل ہے۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں جو فارسی میں ہے، سب سے محبوب چیز جسے وقف کیا ہے وہ کتب خانہ ہے جس میں شاہی کتب خانوں کے چند مخطوطات ابھی تک موجود ہیں۔ دیوان موصوف نے وصیت نامے میں اپنے اخلاف سے بار بار تاکید

کی ہے کہ کتب خانے کے تحفظ اور اس کی بقا کا سامان کریں۔ افسوس یہ ہے کہ گو موصوف کی اولاد میں نرسٹ کلاس، ایم ایس سی، انگلستان کے تعلیم یافتہ گریجوٹ، ڈپٹی مجسٹریٹ، اور سابق ایم ایل سی بھی ہیں لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے بزرگ کے وصیت نامے کی سب سے اہم ہدایت پر عمل کریں۔

دیوان ناصر علی کے کتب خانے سے چند کتابیں بہ طور نمونہ از خروارے، تاریخی نمایش میں لائی گئی تھیں۔ تاریخی نمایش کی فہرست کے مطالعے سے ان کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب نے چند ضروری باتیں نظر انداز کر دی ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں حقیقت سے بھی دور پڑ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر فہرست مذکورہ کے صفحات ۴۷، ۴۸، ملاحظہ ہوں:

(۱) مخطوطہ نمبر ۶۴۴، دیوان ہمایوں کے لیے صرف دو الفاظ "منقش" اور "خوش خط" کافی سمجھے گئے۔ حالانکہ بہ قول سر ٹامک، ہیرسٹر پٹنہ اس دیوان میں جو نقاشی ہے، وہ سولھویں صدی عیسوی کے کتیچر آرٹ کا نمونہ ہے۔ سر ٹامک مغل آرٹ کے ماہر ہیں اور ان کے پاس مغل ارت کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ تاریخی نمایش کی فہرست سے دیوان ہمایوں کی اہمیت نہیں ظاہر ہوتی۔ دیوان ہمایوں کا یہ واحد نسخہ ہے جو دیوان ناصر علی کے کتب خانے میں ہے۔ کتب خانہ مشرقی کے دیوان کا مصنف ہمایوں اسفرائینی ہے، اور دیوان موصوف کے کتب خانۂ قطبی کے دیوان کا مصنف کامران کا بھائی اور ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہ کا باپ ہمایوں ہے۔

(۲) مخطوطہ نمبر ۶۴۲، "دکشا" کے متعلق شکر ہے کہ فہرست میں چند سطریں لکھ دی گئیں ہیں، "مصنف بھیم سین کایستھ، سال تصنیف ۱۱۲۰ھ = ۱۷۰۸ء، عہد اورنگ زیب میں دکن کے حالات کے لیے یہ کتاب بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت کمیاب" ہندوستان میں دکشا کا شاید یہی ایک نسخہ ہے۔ ناچیز اس کتاب پر ایک مقالہ حوالہ قلم کرنے کا ارادہ کرتا ہے، جو رسالہ معیار کی کسی اشاعت میں شائع ہوگا۔

(۳) مخطوطہ نمبر ۶۴۷، منتخب الوزرا یہ بھی ایک نادر الوجود نسخہ ہے۔ جس پر متعدد حرریں ہیں، اور پانچ مقامات پر "عرض دیدہ شد" مع تاریخ لکھا ہوا ہے۔ کتب خانۂ مشرقی کا نسخہ "آثار الوزرا" اس سے مختلف ہے۔ منتخب الوزرا کا مصنف قاضی احمد الابرقوہی حسینی ہے۔ سال کتابت ۱۰۰۰ھ ہے۔ مصنف نے جا بجا اپنے ماخذوں کے حوالے دیے ہیں، اور دوسری جلد لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

(۴) مخطوطہ نمبر ۶۶۰، ماثر الاقبال۔ "تاریخ اسلام تا عہد امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ" اور اق ۳۱۰، سطریں ۱۷ فی صفحہ خوشخط نستعلیق دو مہریں ہیں ایک دیوان ناصر علی کی اور دوسری سیر معصوم خاں کی۔ کتابت دہ چہار شنبہ شہر رجب المرجب ۱۰۹۲ھ۔ قدرے کرم خوردہ۔ دوسرا صفحہ کرم خوردہ ہے۔ مصنف کے نام کا پتا نہیں چلتا۔ آغاز کتاب "ذکر احوال سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم" سے ہوتا ہے۔ کتب خانۂ مشرقی اور ریٹن و زیم میں اس کا کوئی نسخہ نہیں۔

(۵) مخطوطہ نمبر ۶۵۲، بیان واقع۔ اس کی اہمیت سے ایلیٹ کی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد، صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۶، ملاحظہ ہو۔

(۶) مراۃ الاسرار، ایک مشہور کتاب ہے، جس کا ایک نسخہ کتب خانہ مشرقی میں بھی ہے۔ لیکن گجرات کا نسخہ قدیم ترین معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بیشتر صفحات کے حاشیے پر جو تحریریں موجود ہیں ان کے متعلق کتاب میں یہ عبارت درج ہے: "نسخۂ مسطورہ در نظر مبارک حضرت ظل شیخ عبدالرحمن حسینی رسیدہ بہت واکثر بہ دستخط خاص ....." اس کے بعد کاغذ پھٹا ہوا ہے۔ شیخ عبدالرحمن مذکور اس کتاب کے مصنف ہیں۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) ہے۔

میں انجمن ترقی اردو، صوبہ بہار سے گزارش کرتا ہوں کہ صوبہ بہار میں جتنے خانگی کتب خانے ہیں، ان کے مخطوطات کی فہرست بنانے کی کوشش کرے۔ دیوان ناصر علی کا کتب خانہ خصوصاً قابل توجہ ہے۔ یہ کام بے شک بہت مشکل ہے، لیکن اگر کتب خانوں کے مالک انجمن کی معاونت کریں تو فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ میں آگے بیان کر چکا ہوں کہ صوبہ بہار میں مختلف مقامات پر نادر الوجود مخطوطات موجود ہیں، جن کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر جلد توجہ نہ کی گئی تو یہ بیش بہا مخطوطات ضائع ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کے پاس مخطوطات کے ذخیرے ہیں، ان سے میری یہ استدعا ہے کہ ان علمی خزائن کو برباد نہ ہونے دیں، لوگوں کو اجازت دیں کہ ان کتابوں کو دیکھ سکیں اور اگر ضرورت ہو تو بعض کتابیں انجمن ترقی اردو صوبہ بہار، یا کتب خانہ مشرقی کو عطا کر دیں، تاکہ یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچیں، اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابوں کو کیڑوں کی نذر کر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر انجمن ترقی اردو تمام مخطوطات کی فہرست شائع کر دے تو یہ بڑی کارآمد چیز ہوگی۔

شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج
سید حسن عسکری

(علمی کتابوں کو ذاتی ملک نہیں سمجھنا چاہیے، یہ مال امانت ہے جو ہمارے پیش رو چھوڑ گئے ہیں۔ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اسے ضائع نہیں کر سکتے۔ اپنے جانشینوں کے لیے اسے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ کتابوں کو گھر میں محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کتب خانہ آصفیہ یا انجمن ترقی اردو کے حوالے کی جائیں۔ علمی کتابوں کی فہرست بھی ضرور مرتب ہونی چاہیے، لیکن اس کے لیے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ اگر بلا معاوضہ اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں، تو انجمن ترقی اردو فہرست کو چھپوا دینے کا ذمہ لیتی ہے۔ معیار)

۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

سالنامۂ شاہکار لاہور:- اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق بعض غلط فہمیاں' از ڈاکٹر سید محی الدین قادری ص ۳۱ تا ۳۴ (۱) گریرسن کی کتاب کو دقیانوسی تبا کر مضمون نگار نے ہم نے اس کی اصولی غلطیاں گنائی ہیں' اور ناظرین کو ارسطو ٹرنر کے مقدمہ معلومات نیالی' ڈاکٹر بیمی کی تاریخ ادب اردو' پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے مقدمہ آغاز و ارتقائے بنگالی' اور پروفیسر ویسر اور پروفیسر جیوس بلوک کی تصانیف کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔ معیار)

(۲) "اردو مغربی ہندی یا برج بھاشا سے نہیں نکلی"۔ اردو اس وسیع زبان سے مشتق ہے جو جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عبد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو ہارہویں صدی عیسوی میں پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ لیکن اس بیان سے یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگا و جمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔

جدید اردو شاعری کی خصوصیات۔ از احمد حسین صاحب ایم اے۔ ص ۴۳ تا ۵۰۔

دیوان افسوس۔ از سید مسعود حسن صاحب جنوری ایم۔ اے ص ۱۲۰ تا ۱۳۲ (۱) دیوان افسوس کا انتخاب ۱۹۰۳ء میں نواب عماد الملک نے چھپوایا تھا۔ دیوان کے خطی نسخے بہت کم ہیں (دو نسخے لندن میں اور دو گلکتے میں موجود ہیں' ہندوستان میں اور نسخے بھی ہیں۔ معیار) دیوان زیر نظر کے آخری صفحوں پر شاہان اودھ کے کتبخانے کی تین مہریں لگی ہیں۔

خوش است مہر کتب خانۂ سلیمان جاہ — بہ ہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ (نصیر الدین حیدر)
ثانی مہر شد چوں شد مزین بر کتاب — خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب
خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب — ثابت و پر نور باد اچوں فروغ آفتاب

تاریخ کتابت کہیں درج نہیں (۲) عدد اشعار غزل تقریباً ہم ہزار' بایں ہمہ ۵۵ قصیدے غزل ۳۰ ترجیع بند ۳ بند' مخمس ۳ بند' قطعہ ۹ اشعار قصیدہ ۴۰ اشعار (۳) نے افسوس کی زبان اور ان کے عہد کے اہل سخن کی ہے اور منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں' مضمون نا تمام ہے' دیوان کا نیشنل کلام پر حاوی نہیں معلوم ہوتا۔ معیار)

جامعہ دہلی ص ۱۱۲ تا ۱۲۹۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب' اساتذۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ (مضمون نا تمام ہے۔ معیار)

۴ "ہندوستانی ڈراما" ص ۲۷۴ تا ۲۷۹، از پروفیسر محمد مجیب صاحب (۱) "یہ ضروری ہے کہ ڈراما کو، جو شکل دیں وہ جانی پہچانی ہو، ہندوستانی ڈراما میں صرف ہندوستانی زندگی پیش کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم یورپ یا کسی نیالی دنیا کا نقشہ اُتارنا چاہیں گے، تو وہ بہت پھیکا ہوگا اور شائد اسے ٹھیک دیکھنے کے لیے ہمیں سر کے بل کھڑا ہونا پڑے۔ اپنی زندگی کی تصویر دکھاتے وقت ہمیں ہر طرح سے مناسبت کا خیال رکھنا چاہیے۔ مکان، رہنا سہنا، لباس ہر چیز کو ایسا ہونا چاہیے کہ ذرا لکھنے والے کا مطلب، قصے کا رنگ اور قصے کے اشخاص... کی کیفیت اس سے جھلکتی ہو۔ (۲) آجکل ہم نے چند "ٹائپ" آدمیوں کی چند قسمیں بنائی ہیں اور ڈرامے میں دکھایا جاتا انہیں کا حق سمجھتے ہیں... وہ خوبصورت رنڈی جسے کوئی بدمعاش پکڑ لے جاتا ہے، وہ شریف ڈاکو جو اسے چھڑاتا ہے، وہ لڑکی جو باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ بیچارہ جو اس کارروائی میں اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی چند قسمیں ہیں، مسخرہ، افیونی، مڑی سودائی، خادم باپ، جوتا اور جھاڑو چلانے والی بی بی اور اس کے حسب حال جوتا کھانے والا شوہر۔ اب ان میں ایک نئی قسم دیس سیوک کی شامل کردی گئی ہے..... اس تقسیم کو چھوڑ کر ہمیں بیچ بیچ کے ہندوستانیوں اور گھڑے ہوئے کرکٹروں کے بجائے جیتے جاگتے آدمیوں کی تصویر اتارنی چاہیے۔ ڈراما لکھنے والے کو اس کا حق نہیں کہ وہ کیرکٹر کو خاص مطلب کے لیے بنائے، کیونکہ وہ خدا کی طرح نئے نئے آدمی نہیں پیدا کرسکتا اور ایسے کیرکٹر کٹھ پتلی کے کھلونے یا گرامو فون کے ریکارڈ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ڈراما کھلونوں کی دکان یا اسکول کا کلاس روم بن کر رہ جائیگا، اصل زندگی کی اس میں بو باس نہ ہوگی"۔

نظام الملک کے آباؤ اجداد (بسلسلہ گذشتہ ۲۳۵ تا ۲۵۲) (اصل مضمون انگریزی میں لکھا گیا تھا، جامعہ میں ترجمہ شائع ہوا ہے۔ معیار)

ہمایوں

۴ "غالب کا حلیہ" از خواجہ حسن نظامی صاحب ص ۶۹ تا ۷۷

"ذوق و غالب" از بشیر احمد صاحب بی اے آکسن ص ۴۸۰ تا ۴۸۰ (ذوق و غالب کے کلام کا مختلف زبانوں میں صاحب مضمون پر جو اثر ہوا۔ اس کا ذکر ہے) آخر میں ان دونوں کے مزاروں کی موجودہ حالت کا بیان ہے۔ معیار) (۱) غالب کی قبر پر یہ اشعار کندہ ہیں:۔

"یا حیّ یا قیوم"

رشکِ عرفی، فخرِ طالب مرد — اسد اللہ خان غالب مرد
گل میں نم، اندوہ میں بیخاطر محزوں — تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی جرأت — ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے یہ خاک"
۱۲۸۵ھ

(۲) ذوق کی قبر پر یہ عبارت مرقوم ہے:۔

۸۰۶ | مرقعہ | خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوقی۔

نقطۂ تاریخ قدیم:- شب چار شنبہ یا ماہ صفر — بحکم خداوند جاں داد ذوقی
نظر دے اردو بہ ناخن زعم — خراشید دفتر استاد ذوقی

نقطۂ تاریخ جدید:- کیا اس کو مہد رو نے آشکارا — یہ شہر نمونہ سے آئین عدالت
سن حال تعمیر مرقد پہ سائل — لحد ذوقی استاد کی آپ کہہ دیں

ملی "عشق و محبت کا مشرقی تصور" اردو غزلوں کا تمدنی پس منظر ص ۷۷ تا ۳۰۳ از حمید صاحب ایم اے۔

ادبی دنیا

مارچ غالب کی شخصیت اور اردو ادب میں اس کا رتبہ ص ۸۲۹ تا ۸۳۱ از جناب پروفیسر دتاتریہ کیفی۔ (۱) "غالب اول درجے کا روادار اور وضعدار اور سچا دوستدار تھا۔ ہرگوپال تفتہ، جو ہرسنگھ جوہر، منشی ہماری لال مشتاق اور پنڈت شنکر ناتھ کے ساتھ جو تعلق غالب کا تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے پرانے زمانے میں گرو چیلے۔۔ کا ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں۔۔ رائے ہمارو مارٹر پیارے لال۔۔ دلی سے بدل کر الور جانے لگے۔ شہر کی طرف سے ان کو الوداعی ایڈریس دیا گیا، دلی کے معزز انگریزوں اور ہندوستانی شرفا کے اس ایڈریس پر دستخط ہوئے، میرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ لفظ اپنے قلم سے لکھے "فقیر اسد اللہ خان غالب کہتا ہے کہ جو ہا پیارے لال کی مفارقت کا غم واندوہ ہوا ہے وہ میرا ہی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں"۔۔ میرزا کا خلوص اور تعلق مذہب و ملت سے نہیں بلکہ انسان اور انسان کی ذاتی خوبیوں سے تھا۔" (۲) "غالب جس جوہر کی وجہ سے مانا جاتا ہے وہ اس کی تخیلی صناعی ہے۔۔ غالب پہلا شخص تھا جس نے اردو میں یہ بات پیدا کی، وہ سہل ممتنع کا استاد مانا جاتا ہے۔" (۳) غالب کا فلسفۂ شاعری اخلاقی اور عالمگیر تھا جن چیزوں کو وہ اچھا اور افضل جانتا تھا، وہ جہاں کہیں بھی ملتیں اور جس مذہب کے انسان میں بھی پائی جاتیں، غالب کی مدح کرتی تھیں"۔

اپریل "اردو کا پہلا گلدستہ" جسے ایک خاتون نے جاری کیا" ص ۹ تا ۱۱ از جناب تلمیذ کاظمی (۱) اس گلدستہ کا نام گلدستہ نازنیں تھا، اس کی مالکہ بلقیس جہاں بیگم نازنیں تھیں اور وہی اسکی مرتب بھی تھیں مقام اشاعت دہلی تھا، اس کے دفتر جناب نواب علی خاں بازکے پاس ہے۔ ان میں سے چھٹا نمبر ۵ جون ۱۸۵۴ء کا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلا نمبر ۵ جنوری ۱۸۵۴ء کو نکلا ہوگا۔ سائز کے ۳۲ سطری مسطر پر ۳۲ صفحے ہوا کرتے تھے اور طرحی غزلوں کے علاوہ غیر طرحی غزلیں بھی درج کیجاتی تھیں، ہر گلدستہ کے آخر میں وہ قصیدے بھی جو معاصرین نے کہے تھے شائع ہوا کرتے تھے (مصنف نگار شوکی ہندی میر غلام حسین گزٹ لکھنؤ، جام جمشید مراد آباد، اخبار اعصمی حیدر آباد دکن کے تبصرے نقل کیے ہیں اور ہر نمبر کا ہر نمبر رفقہ مفید ہند، منشور محمدی فرخ آباد، پیام عاشق کے تبصروں کا ذکر کیا ہے۔ معیار) (۲) یہ گلدستہ اخباروں اور گلدستوں اور کتابوں پر خود بھی رائے زنی کیا کرتا تھا، چنانچہ ۵ نمبر ۱۸۵۴ء کے گلدستے میں تلمذ جناب بیگم، افسانۂ ایام، گلدستہ افسون، فوائد السالکین، اخبار نظام المشائخ

دسیغر گورنمنٹ لاہور وغیرہ پر تبصرے کیے گئے ہیں (انھوں کا تبصرہ اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ معیار) اس رسالے کی الی اعانت کرنے والوں میں بابو نکمی رام اور بھیا زیند رسنگھ بھی تھے۔ پہلے کا عطیہ پانچ سو اور دوسرے کا دو سو چندہ سالانہ شائد ایک روپیا تھا۔ لکھائی چھپائی بری نہ تھی۔ لیکن کاغذ بہت گھٹیا استعمال ہوتا تھا (م) اس گلدستے میں اسیر، ایرزاغ ریاض، مضطر، جلال، کمال وغیرہ کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں (مضمون نگار کا خیال ہے کہ میرزا داغ کی دہ مشہور غزل 'عرصۂ محشر میں اللہ کرے مجھ کو' اور 'جلوے مرے نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں' اسی کے لیے لکھی گئی تھیں کیونکہ یہ غزلیں گلدستے میں موجود ہیں۔ معیار) (۵) ایک غزل دانیال گارڈنر صاحب لشکر خلف اکبر مسٹر سلیمان شکوہ جو گرگر وصاحب (؟) خدا رئیس کاس گنج ضلع ایٹہ کی بھی ہے نہ معلوم یہ دانیال اور سلیمان شکوہ گارڈنر کون صاحب تھے؟" آخری پرچہ جو ہمارے پیش نظر ہے ۱۳ پج ۱۸۵۲ء کا ہے۔ یہ علم نہیں کہ کبتک جاری رہا (کرنیل گارن (یہ گارڈنر کی خرابی ہے) کا ذکر کمال الدین حیدر مورخ اودھ نے کیا ہے' ان کی پوتی سلیمان شکوہ برادر معتمی اکبر ثانی کے بیٹے سے منسوب تھی، نصیر الدین حیدر شاہ لکھنؤ سلیمان شکوہ کے داماد تھے، جب داماد کی بدسلوکیوں کی وجہ سے انہیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو سلیمان شکوہ کا کاس گنج جاکر متیم ہوئے تھے' اسی خاندان کے کسی فرد نے اپنا نام خاندانی تعلقات کی بنا پر سلیمان شکوہ رکھا ہوگا۔ معیار) (۶) بلقیس جہاں بیگم کا ایک قصیدہ جو ہمارا جہ پدمانند سنگھ والی میلی وکھڑک پور ضلع بھاگل پور کی مدح میں ہے اور کئی غزلیں گلدستے میں موجود ہیں۔

نمونۂ کلام:- کیوں غم اٹھائیں خواہش آغوش یار کا ہم بیکسوں کو خوب ہے کونا مزار کا
بچھے ہو جس کو حضرت موسیٰ چراغ طور اک ذرہ تھا وہ خاک دل بیقرار کا
اٹھی شمشیر جب یحییٰ نظر کی بلائیں میں نے لیں اپنے سر کی

مطلع قصیدہ:- رواں بزم در دولت سے بحر آب گوہر ہے جدھر دیکھو ادھر اک کشتی در دیش لنگر ہے

ندیم مئی، قصۂ رضوان شاہ س ۱۹۱۶ از زین العابدین صاحب (۱) یہ مثنوی قدیم دکنی زبان میں ۱۰۹۳ھ کی تصنیف ہے، مصور قلمی نسخہ کتبخانہ نظام گیا میں موجود ہے، نقادیر تعداد میں ۳۶ مقفل اسکول سے تعلق رکھتی ہیں' اور فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ پر شوق سیر بھی اور کتبخانہ آصفیہ میں بھی اس مثنوی کے قلمی نسخے ہیں۔ نسخہ گیا کے کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں (۲) مصنف کا نام (یا تخلص ؟ معیار) فائض یا بہ قول بعض فائز ہے۔ فائض کو ترجیح ہے' نسخۂ گیا میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ (۳) (مضمون نگار نے مثنوی کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں' اس کے املا اور اس کی زبان سے بحث کی ہے اور قصے کا خلاصہ بھی درج کیا ہے جو اس خلاصے سے زیادہ مفصل ہے جو یورپ میں دکنی مخطوطات کے مصنف نے دیا ہے' اس کتاب میں نسخۂ عجائب خانہ برطانیہ کا حال درج ہے' جس کا سال کتابت ۱۲۰۰ھ ہے' اور مصنف نے فائض کو بالالتزام فائز لکھا ہے' مضمون نگار نے مصنف اردو کے قدیم کے اس قول کی بھی تردید کی ہے کہ فائض نے یہ مثنوی دوستوں کی فرمائش سے لکھی تھی' انھوں نے بعض شعر نقل کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فائض کا مقصد اپنے نام کو زندہ رکھنا تھا نہ کہ دوستوں کو خوش کرنا۔ معیار)

جان عالم از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت' س ۱۹۱۶ء (واجد علی شاہ کے ابتدائی حالات، اس مضمون میں ان کی ادبی زندگی کو بحث نہیں کی گئی۔ معیار)

محکمہ

(۱ تا ۲) تاریخ وفات نجف خان، سال آغاز تذکرہ ہندی مصحفی، تصحیح دیوان معروف، ذکر شاہ

(۱) نجف خان کا سال وفات تاریخ فرخ آباد، مصنفہ ولی اللہ میں ۱۱۹۰ھ درج ہے، ولی اللہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ فرخ آباد ہی میں گزارا ہے، اور گو اس نے نجف خان کا زمانہ پایا ہے، غیر الدین محمد اور مثالاں کے بیان پر اس کے قول کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ آثار الصنادید، مصنفہ سر سید احمد خان سے معلوم ہوتا ہے کہ نجف خان کے مزار کے کتبے پر ایک قطعہ تاریخ کندہ ہے۔ ایں تربت نجف مادہ تاریخ ہے، اس سے بھی ۱۱۹۶ نکلتا ہے۔ کمال الدین حیدر، مصنف سلوک سلاطین اودھ نے اس قطعے کو اپنی کتاب کی جلد اول میں نقل کیا ہے۔ بیت آخر یہ ہے: "زد فلک دمی تو ام عالی بجا کہ او" تاریخ سال رارقم ایں تربت نجف"۔ طبع ۱۸۶۹، مطبع نول کشور لکھنؤ۔

(۲) مصحفی نے تذکرۂ ہندی کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ اس کی ابتدا تذکرۂ فارسی کی تکمیل کے بعد ہوئی۔ چوں ایں فقیر... از تصنیف دیوان فارسی و ہندی و تالیف تذکرۂ فارسی فراغت حاصل کردہ، مہم تالیف تذکرۂ ہندی در پیش آمد"۔ تذکرۂ ہندی صفحہ ۲ س ۳۔

عقد ثریا یعنی تذکرۂ فارسی نے کتابی شکل ۱۱۹۹ھ میں اختیار کی۔ زہے باغ باصفا، سے تاریخ نکلتی ہے (عقد ثریا ص ۲) اس تذکرے میں مصحفی ۱۱۹۹ھ کے بعد بھی اضافے کرتے رہے، چنانچہ منتظر کا حال ۱۲۱۳ھ میں لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سال تالیف تذکرۂ فارسی سے مصحفی کی مراد ۱۱۹۹ھ ہے: کہ ۱۲۱۳ھ، اور اس بنا پر تذکرۂ ہندی کا سال آغاز ۱۱۹۹ھ ہوا اس کے کچھ بعد قرار دینا چاہیے۔

(۳) ۴۲ سیاہ کاری معروف نے سیاہ روؤں — جو ہو سیاہ روؤں اس بشر کا منہ کالا = کار ہے

۹۵ ناز مجھ پر کا گو تماشا نہیں مفہوم خوب — دیدۂ خونبار جب تک ترجمان ہوتا نہیں = ہوتا

۹۷ چشم ترسے ایک پل یاں آستیں اٹھتی نہیں — پھر ادھر کیوں تیری چشم پر نمیں اٹھتی نہیں = شرنمیں

۱۰۱ دیدار اب خدا کا مجھے ہو چکا نصیب — یعنی ہوا ہوں اک نگہ پر نمیں سے میں = ہوا، شرنمیں

۱۰۵ یاد مژگاں گر تپ غم میں دلا کی ہے تو رو — یعنی فیر از آب پاشی کچھ نہیں خاروں کی پھاؤں =

یاد مژگاں گر تپ غم میں دلا کی ہے تو رو

۱۰۸ مستی میں ہم کو تلقلِ مینا خوش آئے ہے — تو اک حیات بادہ گرہ در گلو نہ ہو = لے حباب

۱۱۱ گو زہ عاشق عشق میں ہو کو کن ہو کا حباب — لیک مر تو جائے تشنہ مار کر اتنا تو ہو = ہوں

۱۱۸ اپنے سینے کے گل جو دکھلاؤں — بلبلیں ہوں گلے کے ہار ابھی = گلی، کا؟

۱۲۰ جب سے دیکھی ہے یہ تصویر سی صورت تیری — ہوش کھوئے ہوئے منہ تکتے ہیں دو چار کئی = تیری

۱۲۸ پیرہن میں نمودِ تن سے تری ہلکی اک تہ شباب کی سی ہے = شہاب
۱۳۵ بیٹھ نہ پیچ چاپ یوں ہجر میں معروف تو یا تیرے حق میں اور سوا زہر ہے = ترے حق میں کچھ اور
۱۴۶ کھے ہے دشت میں ہر نقش پائے ناقۂ مجنوں عبث گمان کہ جائے آج لیلیٰ یوں نہیں دوں ہے =
ناقہ لے مجنوں، جانی۔
۱۵۰ کہیں ہیں دل کو شبِ خانہ معروف = سب ۱۵۰ ایسی روتا ہے تو طوفان خطر کیونکر نہ ہو = کا مخطر
۱۵۲ رہتی تھی عاشق سے تجھ کو کس قدر بیگانگی = تجھے گو

۱۵۴ نہ پوچھ مجھ سے غمِ درد صدمہ ہائے فراق = غم و درد
۱۵۵ ایک عالم تجھے کوٹھے پہ کھڑا دیکھے ہے مر گیا شب ترے عارض کی صفا دیکھے ہے
ہم تو ہم ماہ بھی حیران سا دیکھے ہے ہر جبیں روے عرفناک ترا دیکھے ہے
عرق در ہائے خجالت ہوے افتر لاکھوں" = خس کا ایک بند ہے۔ چاروں مصرعوں میں ہے کی جگہ ہے ہے
۱۵۸ تو سب کو قتل کیا اور کبھی کو ترسایا گلے پہ تشنہ کے پھرے تجھے نہ رحم آیا = گلوے تشنہ پہ پھیرے؟
۱۶۰ یہ زندگی کی ہے صورت گر اشتہار کریں کہ پاس آئینہ گر تو سنگسار کریں = گر کو تو
۱۶۵ اس کی کھودے ہے یہ بیخ و بن ہیہر مشک کو جوں کھائے کہن = کی یوں، گمن
۱۶۸ تجھ کو اپنے دل لے غم کی قسم + حلقۂ دام تغافل کی قسم = تغافل اور بے غم کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔
۱۶۹ وحشتِ شوق کے نکیں کی قسم = نکیں ۱۶۸ رشتۂ نازِ رگِ گل کی قسم = تار
۱۸۲ تیغ بردار آپ کا بلا ہی ہے = تیغ دار ۱۸۳ کیا ہی تعریف اب لکھوں پس خیر = بس
۱۸۴ اس طرف بھی کرم کیا کیجے گاہ گاہے خبر لیا کیجے = لیا
۱۸۵ کوئی خواہاں بھی ہو شاید تیرا دور ہی سے دیکھ کے ہوتا ہوا = کوئی جو، ہونا
۱۸۶ واں سے جب آگے بڑھیگا تو پھر = تو تو ۱۸۷ آپ نظر آئیگا ان کا مکاں = آپ
۱۸۸ میں بہت آنے کو چاہا کیا = میں تو ۱۸۸ بھیجے اس کا جواب آپ بھی = اب اس
۱۸۸ جس کی وہ کھیے گا رقم طبعزاد = پن کے ۱۸۸ چھوڑ قلم کو گئی تھک قلم = کو کر
۱۹۱ اے برادر قصہ خوں بیانہ است معنی اندر وے بیان دانہ است = چوں، بسان
۱۹۱ گوش رد اپنے ہے یہ اس طور سے = گوش زد ۱۹۲ پاس نام ننگ دل بے صبر تھا = نام و
۱۹۹ اپنا نفس مدعا کہنے لگا + تھا جو قسمت کا لکھا لکھنے لگا = کہنے
۲۰۳ کیا کہوں مستی عجب ہنگام تھا مرگ کا آیا نوارش نامہ تھا = تم سے

ہماری زبان۔ (۱) از سید، صفا قاسم صاحب (۲) از ق ع د

(۱) نورچشمی: کیا لفظ نورچشمی مخصوص عورت ہی کے لیے ہے یا مرد کو بھی لکھ سکتے ہیں؟ میرزا قتیل کا تو خیال تھا کہ مرد کو بھی لکھ سکتے ہیں کیونکہ حرف ی اس لفظ میں نسبتی ہے یعنی وہ نور جو منسوب ہے آنکھ کی طرف دوسری صورت اس ی کی متکلم ہوسکتی ہے یعنی میری آنکھ کی روشنی، جیسے عزیز سے عزیزی، لیکن میرے اکثر ذی علم احباب کا خیال ہے کہ لفظ نورچشمی میں سوائے تانیث کوئی دوسری ی نہیں ہوسکتی، کیونکہ نورچشم فارسی زبان کا مرکب لفظ ہے اس کے ساتھ یائے متکلم یا یائے نسبت کی ترکیب درست نہیں ہوسکتی۔ مگر میرے خیال میں تو قتیل کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس قسم کی ترکیب غلط ہے تو پھر قبلہ گاہی کا لفظ بجائے عورت کے مرد کو کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے، جو عام طور پر مرد ہی کے لیے مستعمل ہے:

"نورِ دیدہ نورچشمی آفتاب آں صفحۂ رو، ا مہ نو قبلہ گاہی گویہ آں محراب ابرو، ا"

(۲) **نورچشمی** اہل اردو کی بول چال میں داخل نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ بعض اہل اردو، اور چستہ ہندوستانی فارسی داں خطوں میں لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اسے استعمال کرتے ہیں، فارسی الفاظ کے ساتھ عربی کی یائے متکلم کا استعمال قطعی ناجائز ہے۔ اگر نورچشمی میری آنکھ کی روشنی کے معنی میں صحیح ہے تو راحت جانی، سرور دلی بھی جائز ہونا چاہیے۔ رہی یائے نسبتی، اس کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو اس کی کوئی ضرورت نہیں، نورچشم سے وہی مطلب نکلتا ہے جو نورچشمی (بہ حالت اضافۂ یائے نسبتی) سے نکل سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نورچشم میں ترکیب اضافی ہے، ایسی صورت میں یائے نسبتی کا اضافہ قاعدے کے خلاف ہے۔ قتیل نہ اردو میں مستند ہیں نہ فارسی میں۔ مطلع جو نورچشمی اور قبلہ گاہی کے جواز کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، اس میں نورچشمے اور قبلہ گاہ ہے۔ ہماری رائے میں نورچشمی میں یائے تانیث ہے، یہ ہندی ہی ہے، لیکن اردو والوں نے جس طرح صاحبزادہ سے صاحبزادی، شاہزادہ سے شاہزادی بنالیا، ہندوستانی فارسی دانوں نے نورچشم سے نورچشمی بنالیا۔ اس کا استعمال ہمارے نزدیک مناسب نہیں، اور نہ اردو کو اس کی کوئی ضرورت ہے، اگر نورچشمی ہمارے دائرے میں داخل ہوتا تو اور بات تھی۔

ڈاکٹر عبدلیب شاہ انی نے بعض الفاظ و محاورات پر جو معیار کے مضمون نگاروں نے استعمال کیے ہیں اپنے خط میں اعتراض کیے تھے۔ ہم ذیل میں ان کے خط کے اقتباس اپنی رائے کے ساتھ درج کرتے ہیں:

نونہ: "نونہ فارسی لفظ ہے عربی الفاظ کی طرح تنوین کے ساتھ اس کا استعمال ناجائز ہے" اعتراض صحیح ہے۔

کراہیت: "کراہیت صحیح نہیں کراہت صحیح ہے" کراہیت کراہت دونوں عربی لغات میں موجود ہیں۔ کراہیت ہمارے لوگوں کی زبان پر بہ کثرت ہے ممکن ہو صوبجات متحدہ میں لوگ کراہت کو ترجیح دیتے ہوں لیکن کراہیت جب لغت میں ہو تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

ترجمہ "آبر کار ترجمہ بتکر، خوشنگ سے لے کر" ص ۴۵ "ترجمہ" فارسی میں اس معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اردو میں اپنی معلوم ہوتا ہے اردو والوں کے لیے لفظ حال اس سے زیادہ مرتب المفہم (دوماتوں سے "بالوگریفی کل" نہیں کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ہمیں ترجمہ سے بہتر لفظ نہ مل سکا۔ اردو والوں پر شبلی اور مصنف "تذکرہ شعرائے اردو" نے بھی اس مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ قیاس سے اور لوگوں کی تصانیف میں بھی ملیگا۔ لفظ حال اس موقع پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کتاب میں کسی خاص طور پر کسی کا ذکر کیا جائے، اور دو چار باتیں اس کے متعلق لکھ دی جائیں، لیکن لفظ ترجمہ صرف اسی موقع پر استعمال ہوگا، جب مصنف نے کسی کا حال باقاعدہ طور پر لکھا ہو اور وہ کتاب کا لازمی جزو ہو۔ مثلاً "آثار الامراء" میں جن جن لوگوں کے نام بہ طور عنوان موجود ہیں، ہم ان کے حالات کو تراجم کہیں گے۔ لیکن جن لوگوں کے حالات دوسروں کے حالات کے تحت میں مندرج ہیں، ہم انہیں تراجم نہ کہیں گے لفظ حال دونوں صورتوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، تاہم ہمیں اس لفظ کے استعمال پر اصرار نہیں۔

تبادلہ صحیح لفظ مبادلہ یا تبادل، مگر تبادلہ اردو میں لکھا اور بولا جانے لگا ہے، بلکہ مکاتبات میں بھی لوگ اسے استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً "تبادلہ خیالات" کیا آپکے نزدیک اس لفظ کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب اس سے قطع نظر کرنا چاہیے؟ تبادلہ ایک خاص معنی میں المبتدا رد کا لفظ بن چکا ہے، ہم زندگی بھر سے سنتے آئے ہیں کہ فلاں شخص کا دلی سے میرٹھ کو تبادلہ یعنی ٹرانسفر ہو گیا" تبادلہ اردو والوں کی ایجاد ہے۔ عربی لغات و کتاب فارسی لغات میں بھی نہیں ملتا، اس کے استعمال پر ہمیں بھی تامل تھا۔ لیکن جب آزاد و لکھنوی کو نظام اردو کی تمہید میں "تبادلہ خیالات" لکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے جواز کا قائل ہونا پڑا، تاہم اگر کمپنی کے معنی میں مبادلہ استعمال کیا جائے اور ٹرانسفر کے معنی میں تبادلہ (حسب سابق) رہنے دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سوچنا یا سوچنا "راستے میں یہ سوچتا تھا کہ اگر میں اکیلے اٹھ جاؤں"۔ مصدر موجنا ہے نہ کہ سوچنا، اور اگر کبھی تھا تو اب متروک ہے اکیلے کی جگہ اکیلا چاہیے ص ۲۲ اعتراض صحیح ہے

افعال کب اور حرف نفی میں مقبولیت نہیں حاصل ہوئی "ص ۱۹" اخلاقی جرأت کا نتیجہ نہ نظر آتا تھا ص ۲۰" میں نے اس وقت غور نہیں کیا تھا ص ۲۲" اور ہمیں بہت محکمین ہیں نظر آنا چاہیے ص ۳۰" ان مثالوں میں حرف نفی کو پورے فعل کے پہلے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن مرکب افعال میں حرف نفی فعل کے ہر دو اجزا کے درمیان آنا چاہیے مثلاً "مقبولیت حاصل نہیں ہوئی" "نتیجہ نظر نہ آتا" اعتراض صحیح ہے۔

قبلہ گاہی یائے معروف کے ساتھ صحیح آہنگ غالب میں موجود ہے، نظم طباطبائی مرحوم رسالہ اردو کے مطبوعہ جنوری ۱۹۲۱ء میں لکھتے ہیں "یہ محض بندیوں کا تصرف ہے ..... اسی طرح منہ الخواجہ ..... مخدوم الانامی ..... و قبلہ گاہی وغیرہ میں شوخی قلم کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں"

عالم ادب

(۱) **ادارۂ کلیم** دہلی کی طرف سے کتب ذیل جلد شائع ہونے والی ہیں۔ ہمارستان، جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کی نثر، جناب جوش ملیح آبادی کی نظم و نثر، جلد دوں میں، آتش کدۂ مشرق، حکمت، بادہ سرخوش، روح ادب، گل بانگ فطرت، افکار، نقش و نگار۔

(۲) **لطیف الدین احمد صاحب** اکبر آبادی کے مختصر افسانوں اور شاعرانہ نثر کا مجموعہ "نغمات" کے نام سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

(۳) آرزو جلیلی صاحب شیخ غلام علی راسخ کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں۔ وہ حالات کے ساتھ کلیات کا انتخاب بھی شائع کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیا سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ناگپور میں جو خطبہ پڑھا تھا، ہم اس کے ضروری اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

ہندی قومی زبان ہونے کی مدعی ہے، صوبہائے متوسط، گجرات، برار، مہاراشٹر اور بنگالے میں بڑی تعداد ہندی سمجھنے والوں کی ہے، لیکن مردم شماری کی رپورٹ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان صوبوں میں ہندی سمجھنے والوں کی تعداد کیا ہے، شمالی ہند کے مسلمان سب کے سب ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جنوبی ہند میں بھی مسلمان ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں، پنجاب کی زبان پنجابی ہے لیکن وہاں زیادہ تر لوگ اپنی عزیات کے لیے ہندی کو برتتے ہیں، لفظ ہندی کو میں نے وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے، اگرچہ خود ہندی زبان کے حامیوں میں اس سلسلے کے متعلق اختلاف ہے کہ اردو، ہندی، الگ الگ زبانیں ہیں، یا ایک، پنڈت گوبند ولبھ پنت وزیر اعظم یو پی نے جو خطبہ صدارت پڑھا تھا، اس میں اس امر کا ثبوت پیش کیا تھا کہ دونوں الگ الگ زبانیں ہیں۔ بابو راد ھا کرشن جی نے اپنے اسی مضمون میں جو ہندی کیا ہے؟ کے عنوان سے لکھا گیا تھا، فرماتے ہیں کہ ہندی، ہندوستان کے باشندوں کی زبان کا نام ہے، اگر کوئی زبان عام طور پر ہندوستان میں برتی جاتی ہے تو وہ ہندی ہے۔ اردو، ہندی سے بالکل الگ نہیں، لفظ ہندی مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے، زمانۂ سابق میں امیر خسرو، میر تقی، انشا اور ملک محمد جائسی کے سے شعرا نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے، ملک محمد جائسی پدماوت میں لکھتے ہیں:۔

"بولی ٹھاکر کی ہندوی، بھاشا جیتی آہی" "جاہیں مارگ پریم کا سہائے سرا ہیں تاہی"

(میرے زبان اردو معلی بھی لکھا ہے اور انشا کی مدہائے لطافت میں لفظ اردو سینکڑوں جگہ آیا ہے، قدما نے لفظ ہندوی یا ہندی ہر اس زبان کے لیے استعمال کیا ہے جو ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ یہ لفظ اس زبان کے لیے مخصوص نہ تھا جو پرانے زمانے میں موجود دہ اردو اور ہندی کی جگہ مروج تھی۔

۱۲۵۲ھ میں ایک مسلمان شاعر حقیقت نے امیر خسرو کی مثنوی بہشت بہشت کے قصے کو منظوم کیا تھا وہ اپنی زبان کو ہندی کہتا ہے

"طوطی ہند کا میں خوشہ چیں ہندی میں اب لکھوں ہوں اس کے تئیں"۔ ہشت گلزار ص

اس مثنوی میں اشعار ذیل ملتے ہیں۔ بابو راجندر پرشاد انہیں ہندی کہتے ہیں یا نہیں؟

"ہے وہ لب لباب مغز سخن خار ہیں ہے یہ اور وہ گلبن
بس کہ بے حد شمار سے تھے قشقے سرکشان جہاں تھے اس کے زیوں
فیلسوف زمان و دور نشور راست کار و امین و نیک سیر
سینہ باز خوانگاہ تدرو چنگ شاہین کا پناہ تدرو معیار ۲

تو اعد زبان یا لسانیات کے رو سے اردو ہندی ایک ہیں یا نہ ہوں ہم کاروباری نقطۂ نظر سے ان تمام لوگوں کو جو بالعموم اس زبان میں بات چیت کرتے ہیں جسے ہم ہندی کہتے ہیں ہندی بولنے والا قرار دیں گے۔ خواہ ان کی ہندی تو اعد کے لحاظ سے کتنی ہی غلط ہو۔ اور ان کی زبان پر ایسے الفاظ کیوں نہ ہوں جو کسی ہندی لغت میں نہیں ملتے۔ ہندی قومی زبان اسی وقت ہوگی جب ہم ان کو شامل کرلیں۔ اور کتابی ہندی سمجھنے والوں کی تعداد کسی صوبے کی زبان بولنے والوں کی تعداد سے بھی کم ہے۔ ہمارا کہنے جو ہندی بولنے والا صوبہ کہا جاتا ہے۔ یہاں بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بھوجپوری، مگدھی، میتھلی وغیرہ۔ ان بولیوں کے بولنے والے اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوں تو کتابی ہندی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ یہی حال صوبہائے متحدہ اور دوسرے صوبوں کا ہے۔ جب میں ہندی کا تصور قومی زبان کی حیثیت سے کرتا ہوں تو ان تمام لوگوں کو جو ہندی کو پرت سکتے ہیں ہندی بولنے والوں میں شمار کرتا ہوں قومی زبان سے ہماری مراد وہ زبان ہے جو مختلف صوبوں کے درمیان تجارتی ضروریات اور دوسری اغراض کے لیے استعمال ہوتی ہے اور جو سارے ہندوستان کے لوگوں کے لیے مبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

طرح طرح کے اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہندی ان شرطوں کو پورا کرتی ہے۔ تیلگو، تامل، ملیالم اور کنڑی زبانیں ہی صرف ایسی ہیں جن کو ہندی کے ساتھ کوئی سیدھا تاثر نہیں ہے اور جن کے بولنے والے نہ ہندی سمجھ سکتے اور نہ جن کی بولی ہندی بولنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں بھی سنسکرت لفظوں کی کثرت ہونے سے تھوڑی ہی کوشش سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اڑیہ بنگلہ میں جہاں آریائی بھاشائیں بولی جاتی ہیں ہندی کو پرچار آسان ہے اور کن کے علاقوں میں جہاں دراوڑ بھاشائیں رائج ہیں یہ کام بلاشبہ کٹھن ہے۔ قومی زبان ہونے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہندی میں آنی چاہیے۔ اس کے پرچار کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنا چاہیے۔ ہندی کی خامیوں کو دور کر کے اسے مکمل بنانا چاہیے۔ اس لیے ہندی کی تشکیل پر غور کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

زبان کے دو حصے ہیں۔ الفاظ اور صرف و نحو۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک عبارت کس زبان کی ہے اس پر اتنا منحصر نہیں ہے کہ اس جملے کے لفظ کس زبان سے لیے گئے ہیں جتنا ان کا رواج کہاں سے اور کیونکر ہوا ہے۔ جملوں کا فیصد جملے کی ترتیب حروف عطف اور افعال پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹے جملے کو لیجیے۔

"رام نے حکم دیا موڑ لاؤ"

اس چھوٹے جملے میں رام نام ہے۔ حکم عربی لفظ ہے۔ دیا فعل ہے۔ اس میں ہندی عربی اور انگریزی کے لفظ آئے ہیں اگر انگریزی اور عربی کے لفظ ہٹتے ہوئے بھی یہ ہندی ہی کا جملہ ہے، اس لیے اگر ہندی میں ایسے لفظ آجائیں جو کسی دوسری زبان سے لیے گئے ہیں تو وہ ہندی ہی رہے گی۔ جتنی زندہ زبانیں ہیں وہ اپنے لغات کو برابر بڑھاتی جارہی ہیں اور ان کے شاعر اور مصنف دوسری زبان کے نئے نئے لفظوں کا استعمال اپنی تصنیفوں میں کرتے ہیں۔ باہر کی بات جانے دیجیے ہندوستان کی بھی بنگلہ، مرہٹی، گجراتی وغیرہ سبھی زبانوں میں دوسری زبانوں کے لفظوں کا استعمال دھڑلے سے ہو رہا ہے اردو والے بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں اردو کے بڑے شاعر اکبر ہندی لفظوں کو بڑی آسانی سے لے لیا کرتے تھے۔ جیسے :-

"سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں"

"آغوش سے سیدھا رہا تجھ سے یہ کہنے والا"

حالی نے ایک جگہ "اُچھ" اور "جالا پورنا" استعمال کیا ہے، ہندی زبان کی خوبیوں میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہوتے ہوئے بھی، اس نے عربی فارسی ہی کے نہیں بلکہ ترکی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے لفظوں کو بھی اچھوت نہیں سمجھا، انگریا نہیں کیا ہوتا تو کہتے ہی لفظ جو ہمارے گھروں میں بیچ گئے ہیں آج نہ ہوتے اور ان کے ہم معنی لفظ ہمارے پاس شاید اتنے موزوں نہ ہو سکے، اس طرح کے لفظ انسانی زندگی کے سبھی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا، مثلاً :-

سوغات، غالیچہ، بہادر، چھلکا، قلی، قینچی، چاقو، لاش، داروغہ، توپ، چمک وغیرہ ترکی سے۔

الماری، اچار، بوتل، کمرا، آلو، بٹ، گملا، گوبھی، گودام، چابی، مستری، میز، تمباکو، نیلام، تولیا، پرات، بوتام، سنترہ وغیرہ پرتگالی سے۔

حد، باغ، حلوائی، عبیر، اطلس، آتشک، کیہ، حقہ، اسباب، بخار، بحث، بلوہ، غلہ، جیب، دلال وغیرہ عربی سے

چوڑہ، فیل، اخبار، نوکر، بیل، دنگل، ستار، طبیعی، زندہ، دوات، دیہات، لے باق، پکڑ، اچھنبہ، کیل، لال، ہیرا، بابا، پاپی، داماد، تالاب، کنجہ، ملا، نچوڑ وغیرہ فارسی سے۔

ہندی کے پرانے مشہور شاعروں کی شاعری میں بھی بہتیرے لفظ ایسے ملتے ہیں جو بدیشی زبانوں کے ہیں یا بدیشی زبانوں سے متعلق ہیں، مثلاً :-

جایسی :- شیر شاہ دلی سلطان۔

سورداس :- ہاں ہری سب پتی تج کو ایک۔
کو کری لکے باہری میری آتے مان کو لائق

تلسی داس :- گئی بہوری غریب نواز ۔۔ سرل سبل صاحب رگھوراج

بہنی بخشش جا پکن دینھی
بنا باز او نہ جائے بجھانا
جنواے گونے مودت سکل بھوپ سرتاج
کم بھگن کچی فوج بڑاری
لوک جائے بندی خانہ
جو کچھ جھوٹھ سچھی جانا

بیٹھے بجاج امیر اوٹ، چینک، ایک منھ کو بیرے
غنی غریب گرام نرناگر
کوئی کنگورن چڑھی گے کوئی کوئی رند بھیر

بودھا :- ہوئے بیزار تو پے دونی بیزاری کیجیے۔ لگھو جلے دے جو کاموں لگھو تا نو ایے۔
پرکاش :- اپنے رنج بجھنے بھیپ رگھو ناتھ راؤ پاہی گے دہر کے کہوں کا ہوشیے ڈارنا۔
بھوشن :- دوم دنڈی ڈوائے خراسان کھنڈی مارے خاک کھادر لوں جھاسے ایسی ساہو کی بہار ہے :- راجا سورلوج کے لگارن کی ڈاک سن کیتے پادشاہن کی چھاتی درکتی ہے۔
متی رام :- سونکو موٹی ولی دل ولیے کو چوسو بیٹ سوہن سوا کی اُلہتی ہے
کہے متی رام ناہی، دیکھے کو سنگو میں کا ہو کے نہ جھتی ہیے میں اُلہتی ہے
ستر وسال نند کے پرتاپ کی لپٹ سب گرنی غنیم برکھن کو دہتی ہے
پتی پادشاہ کی اچتی اعوان کی، اٹھی رہیا راؤ بھاسنھ کی رہتی ہے
بہاری :- لگھن میٹھی جا کی میٹھی لگی کہی کرب غریب
بسے :- کیتے جگت کے چترچیرے کو
بچے :- بڑی سیل ہوں چیل گھونسوا انس

تمنی، اس اور بنڈی کے قدیم شاعروں کی تصنیفوں میں عربی فارسی کے لفظوں کا ہی نہیں، اُردو میں آج کل کے رائج محاوروں کا بھی استعمال ملتا ہے۔ جیسے :-

"بالم باسی اودھ کا بوجھیے نہ خاکہ"

مطلب :- اودھ بھاسے رہنے والے خاک بھی نہیں سمجھتے۔

"کیو وار بھی پیے انہوں نہ آئے باج" مصب :- لے سواسی میں نے کئی بار کہا تم ابھی تک باز نہیں آئے۔

(۱) سالنامۂ شاہکار از ہندی (۲) سالنامۂ مساوات از ہندی
(۳) ادب لطیف انشا قمر از ہندی (۴) ہدیۂ حیرت از ہندی۔

مطبوعاتِ جدیدہ

سالنامۂ شاہکار لاہور

مرتبہ جناب تاجور، ص ۱۵۶، اجمازی تقطیع، قطار در ۱۲، قیمت ۴ ؎

جناب تاجور نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان کی زبان و قلم ہمیشہ اردو کی خدمت کے لیے وقف رہے ہیں، نوجوانان پنجاب میں ادبی خدمت کا جو ولولہ پایا جاتا ہے اس کے پیدا کرنے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ اردو سے انہیں جو محبت ہے وہ مصلحت اندیشی کی حد سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ادبی دنیا نکال کر انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کے لیے اس شغل سے باز آجاتا، لیکن تاجور قدیم اور مصلحت بینی میں تطہیر کا اختلاف ہے۔ اور وہ اسی شان کا ایک دوسرا پرچہ نکال کر رہے۔ تاریخ کا بھی یہ مرض ہے کہ اپنے کو دہراتی رہتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہی سال میں ۵ ہزار روپے کا خسارہ انہیں برداشت کرنا پڑا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ ان کی جیب کی گرانی کیا ہے، لیکن ان کی ہمت بہت بلند معلوم ہوتی ہے۔ شاہکار مفید اور دلچسپ رسالہ ہے، میری آرزو ہے کہ یہ کامیابی کے ساتھ تو ان زندہ رہے۔

اس کا سالنامہ مارچ اور اپریل کے پرچوں کو ملا کر نکالا گیا ہے۔ تاجور صاحب نے اپنے مشیروں کی رائے نقل کی ہے کہ سالنامۂ شاہکار سالنامہ کا شاہکار ہے۔ جناب تاجور اس رائے سے نہ اتفاق کرتے ہیں نہ اختلاف، وہ صرف اسی قدر کہنے پر قانع ہیں کہ میرا فرض تھا اور جو تھا۔ میں نے دونوں کی ادائیگی میں کسر نہیں کی .... بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا۔ انصاف مجھے بھی اس اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ انہوں نے اپنا فرض بہت اچھی طرح انجام دیا ہے۔ اور سالنامے کو مفید اور دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں کی، یہ سالنامہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اس قابل ہے کہ وہ اصحاب بھی جو شاہکار کے مستقل خریدار نہیں بن سکتے، اسے ضرور اکثر خریدیں۔

بیش بہا افسانوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا فانوسی جوم خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہے، خواجہ صاحب نے غالباً آفسانہ نویسی کے میدان میں ابھی ہی قدم رکھا ہے۔ لیکن ان کا انداز کہنہ مشقوں کا ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ کا افسانہ "سفر زیرو فور ۱۰۰ بہ ضابطہ ملازمت" ان کے خاص رنگ میں لکھا گیا ہے۔ "منظر العجائب اور گیان" بھی قابل ذکر افسانوں میں ہیں۔ حصہ نظم میں حافی، جوشی، اختر، شاکر، رواں، جلیل، آرزو، محروم، فاخر، حسرت، سیماب، کے اشعار ہیں۔ حضرت اختر کی نظم "نظم ہستی" کا یہ مصرع مجھے کھٹکتا ہے: "نہ جانے کون سے عالم میں رو رہا ہوں" کہہ رہا ہوں، یہ رہا ہوں، سہ رہا ہوں، میں قائل نہیں، رو رہا ہوں، محل نظر ہے۔ "تاروں کا گھیت" جناب آغا شاعر کی نظم ہے۔ اس کے کئی مصرعے نظر ثانی سے بقدر بہتر ہو سکتے ہیں "یہ کیسی شب ہے کاجل بن گئی دلہن" یا "آسماں کے چاند سے منہ پر نقاب ہے" کا لباس پہنے شب تار آتا ہے" شب کی ترکیب پرانے زمانے میں جاری رہی ہو، لیکن اب متروک ہے، پرانی کامی بری طرح دیتی ہے، شب تار کافی ہے "تار تاری کیا

کیا ضرورت ہے؟ شائق کی نظم کا یہ مصرع "ناموزوں ہے" ذوق طلب کا آغوش ٹوٹا طلسم شوق" آغوش ٹوٹنے سے مترنم بھی ہے۔

تحقیقی مضامین میں کئی قابل داد ہیں لیکن افسوس ہے کہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کرنے کی جگہ نہیں۔ (بعض کا خلاصہ معیار میں درج کیا گیا ہے۔ معیار)

سالنامہ مساوات

۱۹۳۶ء مرتبہ محمد میزالدین صاحب ص ۴۴ اعلاوہ اشتہارات بقطع میانہ قیمت ۱۲ر

رسالہ مساوات علیگڑھ نے اب اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ اس رسالے کے مقاصد حسب ذیل ہیں "(۱) مسلمان خود ساختہ نسبی بتوں کو توڑ کر صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں (۲) مسلمانوں سے آپس کی فرقہ بندیاں دور ہو جائیں (۳) مسلمانوں میں تحصیل علم کا سچا شوق پیدا ہو جائے (۴) مسلمان اقتصادی و معاشرتی زندگی کا بہترین نمونہ بن جائیں (۵) مسلمان بیکاری کی زندگی کو چھوڑ کر محنت و مشقت کے عادی ہو جائیں"۔ سالنامہ زیر نظر کے مضامین سے مقاصد بالا کے حصول میں مدد مل سکتی ہے۔ بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں:- "خاندان پرستی"۔ "اسلامی مساوات پر ایک نظر"۔ "اچھوتوں کا مسئلہ اور جنت اسلامیہ کا نصب العین"۔ "اسلام اور طلاق"۔ "اسلام کا پیغام اخوت"۔ "صوفی اقبال"۔ حصہ نظم میں غزلوں کی کثرت ہے یہ ممکن ہے کہ کسی مصلحت پر مبنی ہو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزلوں کی اشاعت کس طرح مسلمانوں کی اصلاح میں معاون ہو سکتی ہے۔ ایک مشہور استاد کے چند شعر حافظہ میں ہیں، حیرت ہے کہ بیسویں صدی میں بھی ایسے اشعار لکھنے والے اور ان سے لطف اٹھانے والے موجود ہیں!۔

"جمال زلفوں کا ہے بچھا دل پر　　کیوں نظر بار بار جاتی ہے"

"بزم میں تیرے روئے روشن پر　　جان پروانہ وار جاتی ہے"

ادب لطیف

لاہور، افسانہ نمبر ص ۱۴۲ تقطیع معیار، اقتصادیہ اس کے علاوہ قیمت ۱۲ر

اس رسالے کو لکھتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے، لیکن "مسالے کر کے کوست از بہارش پیدا ست"۔ جنوری میں اس کے کارکنوں نے سالنامہ نکالا تھا، اور چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ افسانہ نمبر شائع کر دیا۔

افسانے تعداد میں ۱۴ ہیں ان میں سے ۲ انگریزی سے ماخوذ ہیں اور ان کے مصنفوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔ تین افسانوں کے متعلق یہ اعتراف تو کیا گیا ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ لیکن مصنفوں کے نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی! تو افسانوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں۔ ان میں کم از کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے، اسلم صاحب نے ایک تمہید اپنی جانب سے بڑھا دی ہے، کل نام بدل دیے ہیں۔ اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حذف کر دی ہیں، لوگ اسے سرقہ کہیں گے لیکن کہنے کی بات یہ ہے کہ کسی کو اسلم صاحب پر اعتراض کرنے کا حق نہیں، کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں، کیا شاہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ ریختے میں فارسی کے مضامین باندھو اور کیا ہمارے

شعرا کا آج تک اس روایت پر عمل نہیں ہے؟ افسانہ نگاروں کے لیے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے؟ کلیۂ نیت کے علاوہ جو طبع زاد افسانے ہیں، ان میں بہ حیثیت مجموعی 'اہن' کا سلام سب سے بہتر ہے۔ اگرچہ اس کا پلاٹ ذرا پامال سا ہے۔ تراجم میں سب سے بہتر 'جواری' ہے جو ہندی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ مجموعی اگرچہ مجموعہ کو دلکش اور برگزیدہ افسانہ نگاروں میں ہے، لیکن اس کے مختلف افسانے چنداں بلند پایہ نہیں۔ مسز کوئن ڈوائل ایک خاص طرز افسانہ نویسی کے بانی ضرور ہیں اور انہیں حیرت انگیز مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے، لیکن ہومر کی سراح رسانی کی بنیاد علمی نہیں۔ اس قسم کی سراح رسانی اگر ہے تو ڈاکٹر تھورن ڈائک میں ہے، جو اسٹنی فریبن کے افسانوں کا ہیرو ہے۔ ڈوائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مترجمین کو اب فریبن وغیرہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ناقدانہ مضامین میں ایک بہت دلچسپ، اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ فیجی سوسی دنیا کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ایسی باتیں کسی رسالے میں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے، لیکن ادب لطیف کے ایڈیٹر صاحب نے مضحکہ کیا کہ اسی پرچے میں ایک کہانی 'دنیا کی قدیم ترین کہانی' کے عنوان سے چھاپ دی، اور ایک دوسرا مضمون شائع کر دیا جس میں 'دنیا کے سب سے پہلے افسانہ نگار' لقمان حکیم بتائے گئے ہیں۔ اڈیٹر صاحب کو اپنے مضمون نگاروں کی دل شکنی اس طرح نہیں کرنی چاہیے۔ رسالے کی ظاہری حالت قابل تعریف ہے۔ لیکن طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ تو نے کے طور پر ایک صفحے کے اغلاط ملاحظہ ہوں۔ ص ۳، "مجھی کی عزت خاکوں کے ہاتھ نہ رک سکی" "روک" "ہرچند" میں نے حوصلہ کرنے کی لیکن دل ہا = ؟ "یقین دہانیوں میں جو اس کی بے چینی کا باعث بنی ہوئی تھیں" "تھیں"۔ "اتنے میں سن سن باہر گھڑی نے کچھ بجا دیا جسے وہ پھر کبھی نہ سکیگا" "سن سکے گا"۔ اس صفحے میں املا کے اغلاط کے علاوہ چار غلطیاں ہیں، اگر وسط فی صفحہ ۲ ہی رکھا جائے تو اغلاط کی تعداد ۲۰ ہو جاتی ہے، رسالے کا سیسہ چھپوانا اگر ممکن نہیں، تو غلط نامہ ہی شامل کر دیا جاتا، پڑھنے میں اتنی الجھن تو نہ ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غلطیاں کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ لیکن ایسے میں آپ کے اب اس کا علاج آسانی ہو جاتا۔

دیدۂ حیرت

ایسے مقامات میں جو اردو کے مرکز سے دور ہیں مشاعروں کے منعقد کرنے سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ نئے لوگوں کو اردو سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور پرانے لوگوں کی گھٹی ہوئی باقی رہتی ہے۔ دیوبند میں ایک گلدستہ ہے جو ڈھاکے سے وقتاً فوقتاً جناب خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب بیرسٹر کی فیاضی کی بدولت شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس میں خاص ڈھاکے کے باشندوں کے کلام کے علاوہ ان شاعروں کا کلام بھی چھپتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے آج کل وہاں مقیم ہیں۔ ذیل میں ہم ایک مشاعرے کی طرحی غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں، کہ ناظرین کو ڈھاکے کی زبان اور وہاں کی طرز گفتار کا اندازہ ہو سکے۔

فکر نہیں مجھ کو وہ پڑا جانے	بیدآر	مگر اپنا ہی مبتلا جانے
کہہ پڑھتے ہیں سب اس بُتِ کا	"	اس میں کیا بھید ہو خدا جانے
راہم کر لگا دی باتوں میں	"	دیکھے ان کو مجھ تک آ جانے
تم سے اظہار شان قدرت ہے	ذبیح	لے جو تم ہو کہیں خدا جانے

انجمن ترقی اُردو صوبۂ بہار کا ادبی رسالہ

معیار

بانکی پور (پٹنہ)

مُرتب
قاضی عبدالودود

معاون
آرزو جلیلی

تصویر:- ڈاکٹر ابوالعلم نظام الدین پی ایچ ڈی احمد شبہ فارسی جامعۂ عثمانیہ

جلد ۱ شمارہ ۲ — جولائی / اگست ۱۹۳۶ء

فہرست

شمار		اسکیچ	شمار		صفحہ
۱	مقدمات	۲۷۵	۱۵	غالب — رنج آہنگ از ق ع د	۳۲۱
۲	تعارف	۲۷۹	۱۶	غالب کے دو لطیفے از ق ع د	۳۲۳
۳	یادِ رفتگاں — میکسم گورکی از آرزو جلیلی	۲۸۱	۱۷	سراپا سخن اور غالب از ق ع د	۳۲۳
۴	عشقِ عیادی	۲۸۰	۱۸	تذکرۂ سرور اور غالب از ق ع د	۳۲۵
۵	افسانے — ایک بوڑھا نوجوان از تماشائی	۲۸۹	۱۹	بہار و نگار — ایک پرانی مجمد و معظم بیاض از آقا بہبہانی (مترجمہ جناب صفت الدین احمد علمی صاحب ایم اے)	۳۲۶
۶	واپسی، از ولیم گرہارڈی (مترجمہ جناب محمد ادیب صاحب ایم اے)	۲۸۳	۲۰	نگار کا پہلا گلدستہ نجمۂ سخن از جناب حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب	۳۲۹
۷	عیاریاں، از د — جیکبس (مترجمہ عطارد)	۲۸۸	۲۱	مقالات — ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات از جناب ڈاکٹر ابوالعلم محمد نظام الدین پی ایچ ڈی (مترجمہ جناب محمد سبحان صاحب ایم اے پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)	۳۲۴
۸	تمثیل — کیتھرین پارکر از نورس پیرنگ (مترجمہ متعلم)	۲۹۰	۲۲	سکندر اور ضاحک از ق ع د	۳۴۳
۹	نظم — انقلاب روزگار از پریم کماری	۳۰۴	۲۳	اندسبھا کی تعلق چند غلط فہمیاں از آرزو جلیلی	۳۵۰
۱۰	آنا مادریہ — شنوی میر حسن در وصف قمر جواہر	۳۰۵	۲۴	۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین	۳۵۷
۱۱	کلام سلیمان در نعت و طالب	۳۱۱	۲۵	محکمہ دیوانی مترجمہ از جناب یاور حسن خان صاحب خیال	۳۶۰
۱۲	ڈوائٹ ایزیہ — دیوان ہمایون از جناب حافظ شمس الدین احمد صاحب ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج	۳۱۳	۲۶	تبصرہ سہیل از ؟	۳۶۱
۱۳	دریاے لطافت حصۂ دوم حسن مصنفہ قتیل از ق ع د	۳۱۹	۲۷	دریاے لطافت از ق ع د	۳۶۱
۱۴	دیوان راغب از ق ع د	۳۱۷	۲۸	ایک پرانی مجمد و معظم بیاض از ق ع د	۰۰
			۲۹	شرف جہاں کا ایک شعر از ق ع د	۰۰

محمد علیم الدین پوسٹر اپیلیشر نے برق پریس پٹنہ میں چھپوا کر فسقہ معیار طابع انجمن اسلامیہ بانکی پور سے شائع کیا۔

شمار		صفحہ
۳۰	ہماری زبان — جزاور حزو کی بحث از جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی	۳۶۲
۳۱	ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں کو کا استعمال از جناب ڈاکٹر عبدالحق والی ایم اے پی ایچ ڈی، استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی و جناب ڈاکٹر عبدالستار	۳۶۶

شمار		صفحہ
	صدیقی و جناب بابو محسن خان صاحب تماخیال	
۳۲	عالم اور ادب —	۳۶۷
۳۳	مکتوب خاجدہ — دیوان بابا، ازق ق ع، و	۳۶۹
۳۴	کلیم عجم از؟	۳۷۵
۳۵	استفسارات — از ہیشی پرشاد صاحب مولوی فاضل صدر شعبۂ فارسی وارد و ہند و یونیورسٹی دتی ع	۳۷۴

معذرت :- معیار کی پہلی جلد مکمل ہوگئی، اس میں ۴۲ صفحوں کی کمی ہے، جو اسی سال پوری کردی جائیگی، ہمیں افسوس ہے کہ معیار ابتدائے اشاعت ہی سے وقت پر شایع نہیں ہو رہا ہے، ہم پوری کوشش کریں گے کہ ستمبر کا پرچہ ستمبر ہی میں نکل جائے اور آیندہ سے رسالہ ہر ماہ وقت مقررہ پر شایع ہوا کرے، ستمبر کا معیار ۱۲۰ صفحات کے بجائے ۱۶۰ صفحات پر شائع ہوگا۔

شملہ کی برکھا :- ہمیں افسوس ہے کہ کاتب کی غلطی سے جس کا علم پرچہ کے تیار ہو جانے کے بعد ہوا، اس نظم کے بندوں کی ترتیب غلط ہوگئی، پانچویں بند "ہر ایک شکل برشکال" لکھنی ہے بند ۱۰ میں کمال کے بعد یہ بند درج ہے "یعنی تو آتش دھواں، یہ حیرت کنندۂ مردماں" لیکن اس کے بند ہائے ذیل ہونے چاہئیں جھٹا بند: "پھیلے ہوئے خورشید کی، اللہ ری جلوہ گری" ساتواں بند: "یہ سحر یا اعجاز ہے، یا اور کوئی راز ہے"۔ آٹھواں بند: "فطرت کی تاروکاریاں، کیا کیا کرے کوئی بیاں" ان بندوں کے بعد نواں بند "نیلا ابھی تھا آسماں" دسواں بند "اوپر برس کر کھل گیا، گیارہواں بند "کچھ طرہ والی بجلیاں" بارہواں بند "چشم تماشا کے لیے"۔

تصحیح ص ۳۰۵ چن گل سے مدت ہیں معمور ہے = ندرت ص ۳۲۲ س ۱۰ اٹھا ذہ = تلامذہ ص ۳۲۵ س ۱۱ کا آخری کی آخری س ۱۱ زمانے کی = زمانے کی تصانیف ص ۳۲۶ س ۱ لے لے کر = لے لے کے ص ۳۲۰ س ۳ یقین = تعیین۔

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کی شاخ ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ جھپلا ضلع چلاوں میں شید رضا تاسم صاحب اور دوسرے اصحاب کی کوششوں سے انجمن کی شاخ قائم ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اور مقامات پر بھی انجمنیں قائم کرکے صوبے کی مرکزی انجمن سے متحد کرلیں گے۔

معروضات

معیار نے اپنی زندگی کے چھ مہینے پورے کر لیے۔ معاصرین نے اس کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ نہایت حوصلہ افزا ہیں اور ہم اُن کے نہایت ممنون ہیں۔ جن معاصرین نے معیار کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کے نقائص کی طرف بھی ہمیں توجہ دلائی ہے۔

ایک معاصر کو شکایت ہے کہ معیار کے اغلاط کتابت کی تصحیح کے لیے غلط نامہ شامل کیا جاتا ہے اور اغلاط کی تعداد بہت زیادہ ہے اس کے متعلق ہماری گزارش یہ ہے کہ ہمیں اس کا افسوس ضرور ہے کہ معیار واقعی صحیح نہیں چھپتا، جتنا ہم چاہتے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ اور رسالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ ہم فخریہ نہیں، لیکن جیسا کہ واقعہ کے طور پر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ تین رسالوں کو چھوڑ کر، معیار سب سے زیادہ صحیح چھپتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دوسرے رسالے غلطیوں کی تصحیح کے لیے غلط نامے نہیں شائع کرتے، اس لیے سرسری نظر سے پڑھنے والوں کو غلطیوں کا علم نہیں ہوتا، اپنی غلطی کا اعتراف اور اعلان اگرچہ جرم ہے، تو ہم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک انگریزی اخبار نے کہا ہے کہ معیار کی زبان پسند نہیں، اس کی دانست میں ثقیل عربی اور فارسی الفاظ معیار میں بہت استعمال ہوتے ہیں، یہ امر قابل غور ہے کہ اردو کے کسی رسالے یا اخبار نے معیار پر یہ اعتراض نہیں کیا۔ بظاہر اس روزنامے کا تبصرہ نگار، اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو اردو کی جگہ ہندوستانی کو رواج دینا چاہتی ہے، اور زبان سے، سوا ان عربی اور فارسی الفاظ کے جو عوام کی زبان پر ہیں، کل عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنا چاہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صحیح و فصیح اردو نظم و نثر، عربی فارسی کا ایک لفظ داخل کیے بغیر لکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ بغیر ان دونوں زبانوں کی مدد کے، اردو میں سنجیدہ علمی اور ادبی مباحث پر ایک سطر لکھنا بھی ناممکن ہے، یہ بات دوسری ہے کہ عربی فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے اجنبی الفاظ استعمال کیے جائیں۔

ایک رسالہ، جس نے معیار کی خوبیوں کی "دل کھول کر" داد دی ہے، یہ سمجھتا ہے کہ بعض تبصروں میں تبصرہ نگاران معیار "حد سے تجاوز کر گئے ہیں"۔ مثال میں دیوان معروف کا تبصرہ پیش کیا گیا ہے جس کے آخری صفحے اغلاط کی تصحیح میں صرف ہو گئے ہیں۔ ہم اس رسالے کے فاضل مرتب کے نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ معروف ایک متداول استاد ہے، جس کے کلام سے سند بھی دی جاتی ہے اور جس کے اشعار اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے بھی ناقابل التفات نہیں، ایسے شاعر کے کلام کی تصحیح بے دیدہ ریزی کے نہیں ہو سکتی، لیکن ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مطبوعہ دیوان موجود ہے، یا جو اس سے استناد کرنا چاہتے ہیں، ہر گز فائدے سے خالی نہیں اور یوں تو کتابوں کی تصحیح کیا، خود تمام کتابوں کے متعلق "اناقول فراش" کا قول ہے کہ کتابوں کے لکھنے سے کرم کلی کی کاشت کرنا زیادہ فائدہ مند ہے، اور ابتال کے نزدیک "ذوق سخن" کار بیکاراں ہے۔

"جو کام کچھ کر رہی ہیں قویں، انہیں مذاق سخن نہیں ہے"

تعارف

میر حسن کی مثنوی جو ابھی شائع ہو رہی ہے' اس کے ابتدائی اشعار جوں کے توں چھاپے گئے ہیں۔ میر حسن نے چھوٹی بڑی دس مثنویاں لکھی ہیں' ان میں چار اب تک غیر مطبوعہ ہیں' معیار کو تین مثنویوں کی اشاعت کا فخر حاصل ہوا ہے۔ لیکن ان کی صحت کا انتظام جیسا چاہیے نہ ہو سکا۔ کلیات کا صرف ایک نسخہ ہمارے پاس تھا اور وہ بھی بہت غلط لکھا ہوا' تصحیح کے لیے ہمیں مجبوراً محض قیاس پر بھروسا کرنا پڑا۔ کلیات میر حسن کے کئی قلمی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں' کیا کوئی صاحب ان مثنویوں کی تصحیح کی طرف توجہ فرمائیں گے؟

طالب' سلیمان اور رقت کے اشعار دیوان ضحنت سے ماخوذ ہیں' ضحنت نے ان اشعار کی تضمین کی تھی' انہوں نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ یہ اشعار کن شاعروں کے ہیں' لیکن مقطعوں میں تخلص موجود ہیں' اور قرائن کہتے ہیں کہ طالب' حافظ طالب رام پوری ہیں' سلیمان شہزادہ سلیمان شکوہ' اور رقت قاسم علی شاگرد جرأت۔

پنج آہنگ کے جس نسخے کا ہم نے تعارف کرایا تھا وہ ہمارے خیال میں پہلا اڈیشن تھا' لیکن مضمون کی کتابت کے بعد ہمیں حبیش پرشاد صاحب سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل کا بھی ایک اڈیشن ہے' یہ اس قدر کمیاب ہے کہ خود حبیش پرشاد صاحب کی نظر سے بھی نہیں گزرا ہے' اگر کسی صاحب کے علم میں اس کا کوئی نسخہ کہیں ہو تو براہ مہربانی ہمیں اطلاع دیں۔

آغا بہبہانی نے عظیم آباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے' اس کی ایک قسط ابھی باقی ہے' انہوں نے فیض آباد' لکھنؤ' امرتسر' کابل وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابل دید ہے۔

حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب کے مضمون کی کتابت ہو چکی تھی کہ انہوں نے اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہا' معیار کی طرف سے جو نوٹ ہے' وہ اسی وجہ سے ص ۳۳۳ کی جگہ ص ۳۳۴ کے آخر میں آگیا ہے' حکیم صاحب نے ان ہماری شعرا کی فہرست بھی بھیجی ہے جن کا کلام انہیں نتیجۂ سخن میں ملا ہے' یہ فہرست تحریر کے معیار میں شایع ہوگی۔

ڈاکٹر ابوالعلم نظام الدین نے اپنا مضمون انگریزی میں لکھا تھا' ہم جناب بیدل کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کر دیا۔

اندر سبھا کے متعلق جو مضمون ہے اس میں نام کے تذکرے کی عبارت نقل کی گئی ہے' اس میں ایک جگہ یا لفافہ آئے ہیں "مثنوی میر انیس" ہماری رائے میں یہ کاتب کی غلطی ہے' "مثنوی میر حسن" ہونا چاہیے۔

"گیتھرین پارکر" اسی نام کی تشکیل کا ترجمہ ہے' "عیاریاں" اور "واپسی" کے انگریزی نام "فرینڈز ان نیڈ" اور "دی مین ہو کیم بیک" ہیں۔

تعلیم عجم کا تبصرہ بہت طویل ہو گیا' اس پر بھی تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔

یادِ رفتگاں

میکسم گورکی

روس کے شہرۂ آفاق افسانہ نویس گورکی نے ۱۰ ارجون ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ اس کی پیدائش شہر نژنی نوگورڈ میں ۲۸ مارچ ۱۸۶۸ء کو ہوئی، اس کا باپ رنگریز تھا۔ گورکی کے بچپن ہی میں اس کے والدین انتقال کرگئے۔ نو سال کے سن میں اس نے ایک جوتے کی دکان میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے باورچی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک جہاز پر کام کیا اور پھر مالی کا کام کرنے لگا۔ جب اس کا سن پندرہ سال کا ہوا، تو شہر قازان کے ایک اسکول میں اس نے نام لکھوایا۔ لیکن مجبوریوں کے باعث اسے اسکول سے علٰحدہ ہوجانا پڑا۔ اب وہ نان بائی کا کام کرنے لگا۔ غرض گورکی نے ہمیشہ اسی قسم کی زندگی بسر کی۔ اسے باورچیوں، مالیوں، بھنگیوں، فقیروں، چوروں اور بدمعاشوں کے حالات پر غور کرنے کا کافی موقع ملا۔ گورکی نے اپنے ناولوں میں اسی قسم کے لوگوں کی زندگی کی معماری کی ہے۔ اس نے اپنے کرداروں کے حالات اس فطری طریقے سے بیان کیے ہیں۔ اس کی تصانیف پڑھنے سے روس کے گندوں بھنگیوں اور گنواروں کی زندگی کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

گورکی نے اس عہد میں جنم لیا جب روس میں ادبی اور سیاسی جدوجہد کا فقدان تھا۔ ترگنیف اور دوستوسکی کے انتقال کے بعد روسی ادب کا میدان سنسان ہوگیا۔ یہ کیفیت جنگ روس وجاپان کے زمانے تک قائم رہی۔ اسی بے حسی کے عہد میں روس نے چیخوف اور گورکی جیسے ادیب پیدا کیے۔ چیخوف اور گورکی کے افسانوں میں بہت نمایاں فرق ہے۔ چیخوف نے متوسط طبقے کے حالات لکھے ہیں۔ اس کے کرداروں میں ہمیں عموماً طلبہ، مدارس کے اساتذہ، تجار، مجسٹریٹ اور حاکم وغیرہ نظر آئیں گے۔ اس نے روس کے عہد بے حسی کا خاکہ کھینچا ہے، اس زمانے میں روسیوں کی یہ حالت تھی کہ انہیں کسی بات کی مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔ ان کی بے حسی عروج پر تھی۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ چیخوف کے افسانوں اور ڈراموں کے کردار اسی قسم کے بے حس لوگ ہیں۔

گورکی کے افسانوں میں کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ کشاکش حیات کے فطری مناظر، سماج کے باغیوں کا حوادث سے سرپھوڑیاں رہنا! گورکی، روسی افسانے میں ایک نئے طرز کا موجد ہے۔ اس نے روسی زندگی کے ایسے پہلو پر توجہ کی جس پر اس کے قبل کے افسانہ نگاروں نے مطلقاً غور نہیں کیا تھا۔

اسی باعث روسی ادب میں گورکی کی بہت زیادہ مخلوقات ہے۔

گورکی کا پہلا افسانہ ماکر چدرا (Makar Chudra) ہے جو ساگر کو کاسہ Kas Kas

میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ شہر طفلس کے ریلوے کے کارخانے میں کام کر رہا تھا۔ گورکی کا اصلی نام الکسی میکسیمو وچ پیشکوو تھا۔ لیکن اس کا پہلا افسانہ "گورکی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس نے اپنے افسانوں کے لیے یہی نام اختیار کر لیا تھا۔ آج تک وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۹۵ء میں اس کا ایک افسانہ "چلکاش" شہر ٹیفرس برگ کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے دو سال کے بعد اس کے مختصر افسانوں کا مجموعہ چھپا۔

گورکی کی ادبی زندگی کو دو دور میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے دور میں ۱۸۹۹ء تک اس نے صرف مختصر افسانے لکھے۔ ۱۹۰۰ء سے اس نے ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ اپنے ناولوں میں اس نے روسی زندگی کے گتھے کھینچے اور معاشرتی مسائل سے بحث کی۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے روس کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ اٹلی کے ایک شہر کیپری میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۳ء میں وہ روس واپس آیا اور پیٹرسبرگ سے ایک رسالہ "لی توپس" نکالا۔ تندرستی خراب ہو جانے کی وجہ سے ۱۹۲۱ء میں اسے جرمنی جانا پڑا۔ اس کے بعد اس نے سارینٹو (اٹلی کا ایک شہر) میں مستقل سکونت اختیار کر لی

اس کے چند مشہور ناولوں کے نام یہ ہیں:- بے خانماں (۱۹۰۷ء)، تین آدمی (۱۹۰۹ء)، ماں (۱۹۰۷ء)، ڈیکاڈنس (۱۹۲۴ء)، متفاطیس (۱۹۲۱ء)۔ اس کے اکثر ناولوں میں تیسری خامیاں ہیں۔ لیکن اس نے روسی زندگی کی کامیاب مصوری کی ہے۔ اور اس کی ادبی عظمت محض ان خامیوں کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی۔ مختصر افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں اس کے ڈرامے بالکل ناکام ہیں۔ اس نے اپنے حالات زندگی کئی جلدوں میں لکھے ہیں اور ایک روزنامچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دونوں اس کی بہترین تصانیف میں ہیں۔

ضمیر احمد عرش گیاوی

ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت رنج ہوا کہ ماہ جولائی میں جناب عرش گیاوی کا انتقال ہو گیا ہمیں مرحوم کے پس ماندوں سے دلی ہمدردی ہے۔ عرش مرحوم پرانی طرز کے خوشگو اور کہنہ مشق شاعروں میں تھے، اور اس عہد لے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ نئی میں بھی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے چند غزلیں شائع کو دکھائی تھیں اس کے بعد تسلیم کے شاگرد ہو گئے ان کی تصانیف سے حیات تسلیم، حیات مومن اور دیوان عرش شائع ہو چکے ہیں بعض کتابیں ابھی ہو تک طبع نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

بے داغ الم دل میں پھپولا نظر آیا — اس نخل میں پھول آنے سے پہلے ثمر آیا
اک پھر نکالی وہیں پیکان ستم نے — کچھ دیر کو بھی دل کا جہاں زخم بھر آیا
جی ہی تو ہے اپنا جسے چاہا اسے چاہا — دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا ادھر آیا
اب رات نہیں صبح کے آثار ہیں ظاہر — بیدار ہو اے عرش کہ وقت سحر آیا

افسانے

(۱) ایک ہونہار نوجوان (از تماشائی) (۲) واپسی (از ولیم گر ہارڈی مترجمہ محمد ادیب صاحب ایم اے۔
(۳) عیاریاں (از ۔ و ۔ جیکبس ۔ مترجمہ عطارد ۔

ایک ہونہار نوجوان

(از تماشائی)

میں جب ۱۹۲۶ء میں کیمبرج پہنچا تو وہاں پہلے ہی سے موجود تھا، اس کا دوسرا سال تھا اور میرا پہلا، کسی نے مجھے اس سے ملا دیا، اور اس نے مجھے ایک دن اپنے کالج پنچ پر بلایا، پنچ میں کچھ تکلف نہ تھا، وہی نفاست آمیز سادگی تھی جو کیمبرج کی زندگی کی جان ہے، میز پر شراب سپید کی ایک بوتل بھی تھی، قریب قریب پوری بوتل اسے خود ہی پینی پڑی، اس کے مہمان (میں شامل راوی) یا تو بالکل پیتے ہی نہ تھے، یا محض برائے نام، پنچ کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ برج کھیلا جائے، جو بالاتفاق منظور ہوئی، میزبان نے یہ کہہ کر کہ میری ان کی بازی نہیں، سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا ساتھی بنا لیا، اس نے کئی بار اپنے ساتھی سے اس بات کی معذرت کی کہ وہ شراب زیادہ پی گیا ہے، اور اچھی طرح نہیں کھیل سکتا، یہ معذرت مجھے اور میرے ساتھی کو قطعی غیر ضروری معلوم ہوئی، کیونکہ ہماری دانست میں اس نے نہ کبھی غلط کوں دی اور نہ کبھی غلط پتا چلا، سات بجے شام کو کھیل موقوف ہوا تو میزبان اور اس کے ساتھی نے ہم دونوں سے سترہ سترہ شلنگ جیتے تھے، ہم دونوں نے جیب سے روپے نکال کر ادا کرنا چاہے، لیکن اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کل پھر کھیلیں گے، تم لوگوں کو انتقام کا موقع دینا چاہیے، آج تمہاری قسمت بڑی خراب تھی، یہ بات طے ہوئی کہ دوسرے دن عزنوی کے یہاں پنچ رہے اور پنچ کے بعد تاش کھیلا جائے، دوسرے دن بھی وارنا اور عزنوی ایک ساتھ ہو گئے، اور قسمت پھر ہمارے خلاف رہی، دونوں دن ملا کر ہم دونوں نے تیس تیس شلنگ ہارے جو ہم نے قرار داد کر دیے۔

اس کے بعد ورلمے برابر ملاقات ہوتی رہی، اس کا انداز مربیانہ تھا، لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ یہ بات ظاہر نہ ہونے پائے، اس نے وہی مضمون لے رکھا تھا جو میں نے لیا تھا، وہ مجھے مشورے دیتا کہ کن کلبوں میں شریک ہوں، کن کلبوں میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں، کن سوسائٹیوں کا ممبر ہوں، لندن جاؤں تو کہاں قیام کروں، کس درزی سے کپڑے سلواؤں، کہاں جوتے بنواؤں، یہ جوان سعادت مند کی طرح اس پیر دانا کی باتیں سن لیا کرتا تھا، حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے سال دو سال کم ہی ہوگا۔

کیمبرج میں مجھے رہتے ہوئے جب کچھ دن ہو گئے اور طلاقتوں کا دائرہ وسیع ہو گیا تو وہ لوگ جو پنچ کو دعوت شناسی کہتے ہیں اور ملک متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے، ایک صاحب مدتوں سے کیمبرج میں مقیم تھے، اس وقت تک کوئی امتحان انہوں نے نہیں پاس کیا تھا، جب انہ سے کوئی بھد رواں بابے میں کچھ کہتا تو وہ پوپ کا مصرع پڑھ دیتے "دی پروپر اسٹڈی فور مین از مین" اور کہتے "آپ کو کیا معلوم کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا کچھ سیکھا ہے، امتحان پاس کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، اصل چیز مردم شناسی ہے۔ وہ ان کی رائے میں پرلے سرے کا خود غرض، کینہ اور اسفوب تھا۔ اور اس سے زیادہ الحاد خطرے سے خالی نہیں۔

"تم نے کبھی اسے ڈسلوا کے ساتھ بھی دیکھا ہے؟" اس کے ساتھ ٹہلتا ہے تو واقعی اس کا قد اونچا دکھائی پڑھ جاتا ہے اور ڈسلوا ہے کہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا، حیران و ہراساں رہتا ہے اگر وہ گالیاں بھی دے تو شرمسار کو کر لیتے کے لیے تیار ہیں۔ اور یہ سب اس لیے کہ وہ کرکٹ بلے باز، آئیگر سے ورما کی ملاقات نہ تھی، ادھر اس کا آئی سی ایس میں کامیاب ہونا تھا، اور ورما کو علم ہوا کہ وہ میرے ہی حوبلے میں جانے والا ہے، اس نے اس سے جس طرح ممکن ہوا ملاقات پیدا کی اور خاطر مدارات سے اس قدر راضی کر لیا کہ اس کا سب سے بڑا دوست ہو گیا ہے، ایک بار کا تمہیں واقعہ سناؤں، آئیگر وہ ایک دن کے لیے لندن گیا، وہاں جا کر بیمار پڑ گیا، اور ہائر دوسرے تیسرے کیمبرج سے اسے لندن دیکھنے جایا کرتا تھا اور جب نہ جاتا، خیریت کے لیے جوابی تار دیتا، مجلس میں سب لوگوں کے سامنے وادیا نے اسے جس بُری طرح ڈانٹا ہے، تم نے بہتیرا خود دیکھا ہوگا۔"

وادیا ایک بار ہی لڑا تھا جو بڑے تھاٹ سے، اکڑا تھا جس واقعے کی طرف شرمانے اشارہ کیا تھا، اس کا شاہد یہی میں بھی تھا، اس کا محل وقوع لانز ہوٹل تھا، جہاں اس زمانے میں انڈین فلیس کے ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے، ابھی باقاعدہ کارروائی نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے، پرزیڈنٹ کی کرسی کے نیچے وادیا، کوسٹیلو، غنوی وغیرہ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ورما اندر آیا، اسے پہلے تپاک سے وہ وادیا سے مخاطب ہوا اور بے تکلفانہ انداز میں "ہو کیسی" کہا، کیسی، وادیا کا پہلا نام تھا جس کی سوا اس کے خاص احباب کے کسی کو خبر نہ تھی، یہ سُننا تھا کہ وادیا نے نہایت غضب ناک ہو کر پوچھا: "سن وِدھ میو آئی گون یوردی رائٹ ٹوکوں می بائی مائی فرسٹ نیم۔" (کب سے میں تمہیں اس بات کا حق دیا ہے کہ تم میرا پہلا نام لے کر مجھے پکارو؟) ورما تو بالکل ہکا بکا ہو گیا، ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا، لیکن کوسٹیلو کو جو وادیا کا سب سے بڑا دوست تھا۔ یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور اس نے وادیا سے کہا: "میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے اجازت کی ضرورت ہے، کہاں سے بغل میں بیٹھنے کے لیے تو پہلے سے اجازت کی ضرورت نہیں؟ آؤ ورما، ادھر بیٹھو" کوسٹیلو وادیا کے بغل میں بیٹھا تھا، اس نے اپنی جگہ خالی کر دی، اور ورما کو زبردستی وہاں پر بٹھایا، اس واقعے کے بہت دن بعد جب میں وادیا سے بے تکلف ہو گیا تو اس کے واقعے کا میں نے ذکر کیا، اس نے کہا کہ "میں آپ بھی جب سے یاد کرتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے" کوسٹیلو کی خفگی بجا تھی، لیکن میرا غصہ بھی بے سبب نہ تھا، تم جانتے ہو کہ ساری دولت میرے والد کی پیدا کی ہوئی ہے، ان کا کیپین اور جوانی بڑی تنگ و دقتی میں کٹی ہے، انہوں نے میری تربیت خاص طور پر کی ہے، وہ بچپن ہی سے میرے کان میں یہ بات ڈالتے رہے ہیں کہ ان لوگوں کی قدر کروں جو بے غرض محبت کرتے ہیں اور غرض والوں کی دوستی پر بھروسا نہ کروں، ان کی یہ نصیحت رہی ہے کہ خوش آمد ہرگز بے ضرر نہیں ہوتی، اور ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی ڈھنے کی چیز ہے؟"

"اس لیے تم پوری پوری اینیمیٹا" (وہ ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق ہے) وہ ایمان دار نہیں ہو سکتا) میں نے ایک فرانسیسی مقولہ اسے یاد دلایا۔

"یہ کس کا قول ہے؟ میرے دل کی بات چھین لی۔"

"مجھے مصنف کا نام یاد نہیں"۔ لیکن کیا تمہارا پہلا نام لے کر پکارنا بڑی خوش اخلاقی کی بات ہے؟

"واقعہ تو سنو۔ یہ تو اونٹ کی پیٹھ پر آخری اسٹرا تھا، ورنہ اسے مجھ سے زیادہ ملاقات نہ تھی، سوا صاحب سلامت کے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک دن بڑے اہتمام سے اس نے مجھے لنچ پر بلایا، مجھے انکار کی کوئی صورت نظر نہ آئی، میں نے قبول کر لیا جس دن اس نے مجھے بلایا تھا، صبح سے بڑی برف باری ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ گھر سے باہر نکلے، لیکن بادل ناخواستہ نکلنا ہی پڑا، میں نے اس کے یہاں پہنچ کر گھنٹی بجائی، البتہ لیڈی کے بجائے خود درمیانے دروازہ کھولا، میرا اوور کوٹ اتار کر کھونٹی پر رکھا، اور کمرے میں لیجا کر سب سے آرام دہ کرسی پر آگ کے سامنے مجھے بٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اور لوگوں کو بھی بلایا ہوگا، لیکن یہ خیال غلط نکلا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھانا لانے کا حکم دیا۔ کھانا آیا، اتنا کھانا اور ایسا کھانا کمبخت میں تو مجھے کبھی کسی نے نہیں کھلایا تھا، اس پر طرہ یہ کہ شیمپین کی بھی ایک بوتل تھی۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "سمپوزیل پیو اول دی لک ان دی ورلڈ"۔ (کچھ لوگ قسمت کے بڑے بھی ہوتے ہیں)

"جی ہاں"۔ دن کا وقت اور شیمپین! میں نے بہت منع کیا کہ نہ کھولو، وہ نا نا، اور مجھے بھی اس کی خاطر سے تھوڑی سی پینی پڑی۔ لیکن تم یقین کرو کہ شیمپین اور لنچ کی اس کی گفتگو کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ تھی، تعجب نہیں کہ اسے سن کر میرا وزن بڑھ گیا ہو، خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن جب گفتگو میں بار بار یہ جملہ آنے لگا کہ "یو آر وری ایٹلی فرینڈ آف می"۔ ممکن ہے کہ شیمپین کا اثر ہو، لیکن میں بھی تو آخر آدمی ہوں۔ اس کی برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا، اور قہوے کی پیالی ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سے رخصت ہو کر چلا آیا، اجازت اس نے بڑی مشکل سے دی تھی، لیکن میری طبیعت کا اندازہ یہ تھا کہ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتا تو اٹھے ہی پھوٹ کر چلا آتا، مجھے چاہیے تھا کہ میں اسے اپنے یہاں بلاتا، لیکن بلانا تو بڑی بات ہے، اس کے سلام کا جواب بھی بڑی رکھائی سے دیا کرتا تھا، اس کے بعد اس کا اس قدر بے تکلف ہونا میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوا، اور مجھ سے وہ حماقت سرزد ہوئی جس پر اب تک شرمندہ ہوں۔"

درما کی حمایت کرتے ہوئے میں نے شرما کو یہ جواب دیا: "آخر تمہارا اعتراض کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ درما کی دستیوں میں فرنچ کا پہلو شامل ہوتا ہے اور ان کی بنیاد اتحاد و وفق پر نہیں، تو کوئی بڑی بات نہیں، آگے چل کر تم ہم سب ہی کریں گے، اور ما اگر سچ پوچھو تو قابل مبارک باد ہے کہ اسے اس کم سنی ہی میں اگر معلوم ہو گیا کہ وہ چڑیوں کا شکار ایک ہی پتھر سے ہو سکتا ہے، دوستی کو اگر اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے تو اس میں کیا مضائقہ کیا ہے؟ یہ انسانوں کی عام کمزوری ہے۔"

شرما کی نصیحت کے باوجود میں درما سے ملتا رہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً مجھ سے روپے بھی قرض لیے اور بروقت سے پہلے ادا کر دیا۔ زیادہ جوں جوں گزرتا گیا مجھے معلوم اس کا احساس ہوتا گیا کہ وہ مایہ دیانت نہیں، لیکن پرلے سرے کا کاہاں اور خوش مزاج ہے، ایک بار تعطیل میں تعلیمی فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ علیم اور میرے ساتھ ایسٹ ورن چلے گا لیکن عین وقت پر اس نے انکار کر دیا، میں سوئٹزرلینڈ جا رہا ہوں آئیگر سے میں نے لاکھ کہا کہ میں تمہارے اور علیم کے ایسٹ ورن جانے کا وعدہ کر چکا ہوں لیکن اس نے ایک نہ سنی، تھوڑی دیر کے بعد اپنے جرم کے استغاث میں دلیل پیش کی "تم جانتے ہو آئیگر پنجاب جا رہا ہے اور مجھے پیرسٹری کرنی ہے، اس کی دوستی میرے لیے بڑی مفید ہو گی

میں جانتا ہوں کہ تمہارا اور حلیم کا مجھ پر زیادہ حق ہے، لیکن کیا کروں مجبور ہوں"۔ یہ فقرہ لگتا، بہتیرا لگتا، وہی لیکن اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ میرا اس کا ساتھ لندن میں بھی رہا، پہلی بار جرمنی میں اس کے ساتھ تھیٹر گیا۔ تو میری ٹکٹ بھی اسی نے خریدی دوسری بار میں اسے اپنے خرچ سے تھیٹر لے گیا، تیسرے موقعہ، اس نے ٹکٹ خریدنے کی آمادگی تو کی، لیکن اس کا ہاتھ جیب کی طرف اتنا آہستہ آہستہ جا رہا تھا، کہ میں اس کی سلوموشن پکچر کا لطف اٹھا رہا تھا، جب تک وہ ٹٹولتا نکالے میں نے ٹکٹ خرید لی تھی، چوتھی بار غلطی سے وہ بٹوا گھر ہی بھول آیا تھا، پانچویں مرتبہ جو اس نے تھیٹر ساتھ چلنے کی تحریک کی تو میں نے کہہ دیا کہ میرے پاس کافی روپے نہیں، اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "تم بہت تکلف کرتے ہو، تمہارے پاس نہیں ہیں تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہیں"۔

ورما کیمبرج سے ڈگری لے گئی، لیکن قانون کے امتحان باقی تھے، اس نے کہا تھا کہ دو برس اور رہوں گا، لیکن اس نے امتحان جلد ختم کر لیے اور ایک برس کے اندر ہی ہندوستان واپس چلا گیا، اس کو پانچ چھ مہینے گزرے تھے کہ ایک دن پٹی کبوری میں شرما سے ملاقات ہوئی، وہ سفر کی دکان سے ہاتھ باہر نکل رہا تھا، اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جو بعد میں معلوم ہوا کہ سیرانو دبرجرک کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ ہے، شرما مجھے پٹی کبوری ہی کے کسی قہوہ خانے میں لے گیا، اور ملازمہ کو قہوہ لانے کا حکم دینے کے بعد یوں گویا ہوا:-

"تمہیں ورما کا آخری کارنامہ بھی معلوم ہے؟" میں نے جواب دیا کہ ہندوستان جانے کے وقت وہ مجھ سے ملا بھی نہیں۔ شرما نے فوراً کیا کہ میرے روپے تو اس کے ذمے نہیں نکلتے تھے۔ یہ صاف بات تھی کہ شرما کو ورما کی ایمان داری میں شک تھا۔ اور میں نے اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کی۔

"یہ بات نہیں، ورما میں اور جو کچھ برائیاں ہوں، وہ بد معاملہ نہ تھا، مجھ سے اس نے بارہا قرض لیا، اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا" "تم نے کبھی انگریزوں کا یہ مقولہ بھی سنا ہے: انسٹی ازوی بسٹ پالیسی"۔ ایمان داری کسی اخلاقی اصول پر مبنی نہیں تھی وہ محض اپنی ساکھ قائم کرنا تھا کہ بعد میں اچھی طرح اٹھنے کا موقع ملے، تمہیں یاد ہوگا کہ چلنے کے وقت کیمبرج کے مختلف دکان داروں سے اس نے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ کی چیزیں خریدیں، اور ایک جہاز ہندوستان روانہ ہو گیا، مجھے یقین ہے کہ اگر اسے موقع ملا ہوگا تو اس نے لندن کے دو چار دکان داروں کو بھی چرکے دیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی دکان داروں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ قرض کا بیوپار نہ کیا جائے۔ مجھے یہ بات مجھ سات روز ہوئے پہلے پہل ہاڈ ایمبرز کے یہاں معلوم ہوئی، جن کے وہاں پندرہ سو لڈ شلنگ کی ٹائیاں اور موزے خریدے تھے اور تین قمیصوں کا آرڈر دیا تھا، ویسں نے میرا آرڈر تو لکھ لیا، لیکن بات اور سے کہنے لگا کہ "تمت آپ اسی وقت ادا کریں گے یا جس وقت چیزیں آپ کے یہاں پہنچ جائینگی؟" میں نے کہا کہ "میں کوئی بیانوادر تو ہوں نہیں، آج نہیں ہو گیا ہے؟" میری آواز زرا بلند ہو گئی تھی، منیجر قریب ہی تھا، وہ اور قریب آ گیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ "مسٹر شرما زحمت کر کے آپ میرے آفس میں چلیں"۔ میں منیجر سے اچھی طرح واقف تھا، اس کے ساتھ آفس میں گیا تو اس نے ورما کا قصہ بیان کیا: ورما تین برس مسلسل اس دکان سے چیزیں خریدتا رہا، اور کبھی اس نے بل کے ادا کرنے میں ایک دن کی بھی دیر نہ کی

کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد اس نے ان لوگوں کو کہہ دیا تھا کہ ابھی قانون کے امتحانات میں شریک ہوتا ہے، کیمبرج میں ابھی دو سال قیام اور رہنگا باوجود اس کے کہ اب یونیورسٹی کا ممبر نہ تھا، اس کا اعتبار اتنا تھا کہ یہ لوگ برابر اسے اُدھار دیتے رہے، جانے سے قبل وہ اپنے تیس پونڈ کی چیزیں کچھ نوادرات اور کچھ بنی بنائی مول لیں۔ جب اس کے مکان پر بھیجا گیا تو لینڈ لیڈی سے معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان چلے گئے ہیں۔ وہ لکھ تاسے ہوئے پتے سے اس وقت تک تین چار خط بھیجے جا چکے ہیں، لیکن وہ خط اس وقت تک واپس آ چکے ہیں، ڈاکخانے والوں کو مکتوب الیہ کا پتا نہیں ملتا۔ میں نے خود جیمز منگو اکر دیکھا، وہ نے ہتک کا پتا دیا تھا، حالانکہ ہتک سے اس کا کوئی تعلق نہیں، میں نے منیجر سے کہا کہ تم حق بجانب ہو، اور آج سے میں تو جہد کرتا ہوں کہ بھولے سے بھی کسی دکان سے کوئی چیز اُدھار نہ منگواؤں گا۔ منیجر نے مجھ سے بہت معذرت کی اور یہ کہا کہ میرا حکم آپ کے لیے نہیں، آپ دکان سے حسب دستور چیزیں منگوا سکتے ہیں، لیکن میں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا منظور نہ کیا، اس کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ بارڈوک پلنڈ ٹیچ، ہیز، ایڈمس، تھرسل، فوکسٹر، ہنفرا شرن سب کے ساتھ ورمانے یہی سلوک کیا ہے، ان کے علاوہ اور دکانداروں کو بھی اس نے ٹالا ہے، کہاں تک سب کا نام لوں، میری تحقیقات ابھی مکمل نہیں، ہنفر کا تو ابھی پتا چلا ہے، اب آپ فرمائیں کہ ورمانی ایمان داری کے متعلق "آپ کی کیا رائے ہے"؟

میں نے ایک لمبا چوڑا خط ورما کو لکھا، ورمانے فوراً جواب دیا جو ذیل میں درج ہے، بعض فقرے حذف کر دیے گئے ہیں:-

"تمہاری شکایت بجا ہے، ہندوستان "جنت نشان" اور لوگ اسے جنت نشان کہتے ہیں، میں ان کی تحلیل کی حسرت پر حیران ہوں، اس کی فضا اور ہی ہے، جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیت سے یہاں آکر انسان بالکل گل ہو جاتا ہے، ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں، تم میرے والد صاحب سے نہیں ملے، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، لیکن زراسی کسر یہ ہے کہ قوت تخیلہ سے بالکل محروم ہیں، انہوں نے میری تعلیم میں پچیس تیس ہزار روپے صرف کیے، واپسی پر قانون کی کتابیں منگوا دیں، اور ہائی کورٹ میں تر دل کرا دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محض میری وجہ سے لاہور میں قیام اختیار کیا، اس کے بعد انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اور میں چھ مہینے کے اندر شادی حال، شیخوپورہ فضل میں نہ جی جاؤں تو یہ میرا قصور ہے، تفصیل کہاں تک لکھوں، مختصر یہ ہے اگر والد صاحب کی مہربانی نہ ہوتی تو ورما کو عبداللہ کے بدلے لینی سگریٹ پینے پڑتے اور کلب کا خرچ نکالنا تو قطعاً ناممکن ہوتا، اب بھی میری داستان! پھر بھی شکایت کرو گے کہ میں نے خط نہیں لکھا؟

اب اپنی اور شکایتوں کا جواب سنو:- دکانداروں کو دھوکا دینے کی میری نیت نہ تھی، جس وقت چیزوں کا میں نے آرڈر دیا جیک میں میرے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ موجود تھے، ایک تو والد صاحب ہی نے سفر کے اخراجات کے لیے کافی روپے بھیجے تھے دوسرے یہ کہ میں نے والدہ صاحبہ کو لکھ کر اور روپے منگوائے تھے، کیمبرج سے روانہ ہونے سے ایک دن قبل میں نے لائڈ بینک سے کل روپے نکال لیے اور اپنا کھاتا بند کرا دیا، ارادہ تھا کہ دکانداروں کے روپے اسی وقت جا کر ادا کر دوں، لیکن گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت آگیا ہے، میں نے اس کو تیسرے پہر کے لیے اٹھا رکھا، اور بس پر سوار ہو کر پیری نیٹن روڈ پہنچا۔ گھر آکر جو دیکھتا

(باقی آئندہ مہینہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ)

واپسی

از ولیم گرہارڈی
ترجمہ محمد ادیب صاحب

مجھے بس عورت نے چاے پر بلایا تھا وہ نہایت حسین تھی لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس بات کو ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کے باپ کے سامنے اس کی تصویر جو میرے ذہن میں ہے بالکل ماند پڑ گئی ہے، اس کا باپ غضب کا ذہین تھا، اور اس کا دماغ بڑی سرعت کے ساتھ کام کرتا تھا۔ یہ لوگ ایک سفید رنگ کے مکان (ولا) میں رہتے تھے جو خاکستانے کے دوسرے کنارے پر سمندر سے قریب پائن کے جنگل کے درمیان تھا، ٹوان سے وہاں پہنچنے میں کشتی کے ذریعے آدھ گھنٹا صرف ہوتا تھا۔

وہ میرے آنے کے دو ہی ایک لمحے کے بعد آیا، وہ نہایت ضعیف اور بیمار تھا، اس کی موچھ نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ زیر پائیاں جو خواب گاہ کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے پاؤں میں تکیے اور اس کا گدی دار جیکٹ گلے تک بندھا تھا۔

یہ معلوم کرکے کہ میں ناول لکھتا ہوں اس نے خوش اخلاقی سے ادبیات کے متعلق گفتگو کرنا ضروری سمجھا وہ اپنی معلومات کا اظہار بڑے تعلق کے ساتھ کر رہا تھا نہ اسے کوئی چیز روک سکتی تھی اور نہ کوئی اس کی گفتگو میں مداخلت کر سکتا تھا۔ اس کی بی بی بھی شاعرہ ہونے کی مدعی تھی، اس نے کئی بار اس بات کی قابل رحم کوشش کی کہ کبھی اپنے متعلق اخبارات کی حوصلہ افزا رائیں دکھائے، لیکن بالکل بے سود، بڈھے کو بہت کچھ کہنا تھا، اور ایک ذوق ادب رکھنے والے مہمان کے سامنے اپنی واقفیت کی نمایش کا جو موقع اسے ملا تھا، اُسے اپنی بی بی کی خود نمائی کی خاطر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بی بی کے اشعار جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، محض ادنی درجے کے تھے، وہ بہت سخت بیمار تھا۔ اور ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ بولنا اس کے لیے تکلیف دہ تھا، لیکن اس کے باوجود خاموش رہنا اس کے لیے ناممکن تھا، اس کے مضمون رات اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر کہتا تھا: معاف کیجیے گا، میں ذرا ایسڈ ہوں، میں فوراً ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس کی بی بی ایسے ہی موقع پر کود پڑی تھی، اور اپنی نظموں کا ذکر کرنے لگتی تھی لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں بڈھا سونے پر اپنے پاؤں کو سمیٹ کر بیٹھ گیا، اور پھر سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا۔ عہد ایلی زبیتھ کا وہ سر اسٹاوس کا میں دلدادہ ہوں۔۔۔" اس کا علم حیرت انگیز تھا، اس کے علم کی وسعت کل مالک پر حاوی تھی اور بالکل ابتدا کے زمانے سے شروع ہو کر موجودہ زمانے پر ختم ہوتی تھی، انگریزی ادب میں چاسر کے وقت سے ڈوڈ ہاگارنٹ کے وقت تک کے مصنفین سے اسے واقفیت تھی، غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ پڑھنے میں وہ ایک ایک لفظ سمجھ لیتا تھا، لیکن انگریزی الفاظ کا تلفظ اس کے لیے مشکل تھا۔ اگر اچانک کوئی لفظ اس کی زبان پر آتا تو اس کا تلفظ غلط ہوتا تھا اس کا علم مجھے نہایت صحیح اور اس کی ناقدانہ رائیں منصفانہ معلوم ہوئیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مواد

کی زیادتی کی وجہ سے وہ کسی مصنف کے کمالات ذاتی کے متعلق اظہار رائے کی جگہ یہ پتا چلانے کی کوشش کرتا تھا کہ اس پر کس کس کا اثر ہوا ہے۔

موضوع شاعری کا ذکر آیا، تو میں نے اس کی رائے بقائے روح کے متعلق دریافت کی۔ وہ رگ گیا جیسے وہ ہوا پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھا تھا، اس سے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔ اس کی بی بی نے چھیڑتے ہی کہا کہ "میں نے اپنی نظموں میں کوشش کی ہے ..... لیکن بڑھاپے کے جوش و خروش نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ "میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ صدر ہر کو اس قدر شہرت سے جس کی ہوائی ملکی پوچھی میرے مرجانے کے بعد خاک میں مل جائیگی۔ میں نے نہ تو کوئی کتاب لکھی ہے، نہ کبھی ان کے متعلق کوئی لکچر دیا ہے۔ میری عمر ملازمت میں گزاری ہے۔ (وہ فرانسیسی کونسلر سروس میں تھا) اور مجھے شاذ و نادر ہی ایسے ذہین لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو میرے علم سے مستفید ہو سکتے۔ مجھے ایسے مواقع بھی کم ملے کہ میں اپنا علم دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا، اس علمی سرمایے کا ایک لفظ بھی میرے بعد نہ بچیگا اور اگر چھپے بھی تو اس کا صدر مقام ردی ہوتا ہے۔ مگر فوقیت قدرت کے مقابلے میں سوائے سر جھکانے کے چارہ ہی کیا ہے۔ اس پر بھی میں کتب بینی سے باز نہیں آتا۔ میں پڑھتا اس لیے ہوں کہ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس تشنگی میں میرے لیے یہی ایک واحد ذریعہ تفریح ہے باوجودیکہ میری موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، میں پڑھے جاتا ہوں، بلکہ یہ معلوم کر کے کہ میری زندگی اب تھوڑی ہے میں اور زیادہ کتب بینی کرتا ہوں، انتہائی عجلت کے ساتھ مجھے ان باتوں سے آگاہی حاصل کرنی ہے جن سے میں اب تک نابلد ہوں، سوتے سوتے وقت تک پڑھتا رہتا ہوں، صبح کو اٹھنے کے ساتھ ہی پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہوں اور دن بھر پڑھا کرتا ہوں، کبھی کبھی میں اپنے آپ سے یہ سوال بھی کرتا ہوں کہ "اب جب کہ میں سال دو سال سے زیادہ جی نہیں سکتا کیا کتابوں کے مطالعے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟"

ایک برس کے بعد جب میں اس سے پھر ملا تو، اتنا بیمار تھا کہ بیٹھے بیٹھے بات چیت نہیں کر سکتا تھا، اور اس نے مجھ سے اجازت چاہی کہ لیٹے ہی لیٹے گفتگو کرے۔ دوران گفتگو میں وہ کبھی کبھی یکایک قلب پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور چپ چاپ ہو جایا کرتا تھا، افاقے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتا "کومیڈی آف ہیومرس" (زراعاسیانہ تو مزدھی، لیکن یہ خیال کہ سرت کی افغانیت اعادے سے بیان ہو جاتی ہے، بلاشبہ صحیح تھا، اور جنوب کے سے وقت پسند مصنف جانتے تھے کہ محض کسی بات کے دہرانے سے نازک خصوصیات بھی ظاہر کی جا سکتی ہیں۔"

"اب تم سنتاؤ، میں ہنسوں کی ایک نظم کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے سناؤں گی، مجھے یقین ہے کہ مسٹر ..... لیکن وہ برتاہی رہا، شیلی کی شاعری کا موضوع مابعد الطبیعیات ہے، لیکن میں فرانسس تھامسن کے ہونہار آف ہیون (آسمان کا شکاری کتا) کو میں صوفیانہ نظم سمجھتا ہوں، اور اسپنسر کی فیری کوئین (پریوں کی ملکہ .....) اس نے اپنے

قلب پر ہاتھ رکھا اور دس منٹ تک خاموش رہا۔ جب اسے افاقہ ہوا تو اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:
"میرا کتب خانہ مکمل ہے۔ یہ خیال کر کے بڑی اذیت ہوتی ہے کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔ ابھی ایسی کتابیں بھی ہیں جو میں نے اب تک نہیں پڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں رات دن پڑھتا رہتا ہوں، مجھے وقت کا مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی وہم ہے، لیکن یہ خیال کہ میں ایسی کتابیں چھوڑ جاؤں جو میری نظر سے نہیں گزری ہیں میرے لئے ناقابل برداشت ہے، کتابیں میری نظروں انسانوں کی طرح ہیں۔" اس نے اپنے مصنوعی دانتوں کو جو کسی سرکش بڑیا کی طرح جبڑے میں بند کر رکھا ہو، ہر وقت باہر نکلے آتے تھے، بڑی کوشش سے درست کیا۔ اور پھر گویا ہوا "اگر ہماری روح موت کے بعد باقی رہتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنا بہشت اپنے دل کی خواہش کے مطابق بنانے کا موقع دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو میرے بہشت میں بڑے بڑے جوادار کمرے ہونگے، جہاں بے شمار کتابیں ہوں گی، ان گنت کتابیں، جہاں میں ہمیشہ کتابیں پڑھتا رہوں اور تنگی وقت کی کبھی شکایت نہ ہو۔"
"لیکن کس قسم کی کتابیں؟" میں نے سوال کیا۔
"ہاں، بہت سی کتابیں ابھی ایسی ہیں جنہیں میں مرنے سے قبل ختم نہیں کر سکتا، وقت فریب آ جاتا ہے۔"
میں رخصت ہو رہا تھا کہ اس نے میز پر جو پارسل رکھا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
"فارسی شاعری۔"
"اچھی کتابیں ہیں؟"
"ابھی تک پارسل کھلا نہیں، پھر ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"
اس کے بعد جون گیا تو رات کا وقت تھا۔ ہمسفر پڑھا تھا (میرے چند دوستوں نے جو فاکنار پر مقیم تھے مجھے مدعو کیا تھا وہوت کی تاریخ مجھے غلط یاد تھی اور وہ آخری گاڑی جو ٹون جاتی تھی چھوٹ گئی تھی) ملازم نے کہا کہ چیاں نمبر کو گئی ہیں اور غالباً آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔ میں کتب خانے میں ان کے انتظار میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مجھے قدموں کی آہٹ نے چونکا کر دیا، یہ آنے والا وہی بڈھا تھا جو دی لباس پہنے تھا جس نے پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا، چاند کی روشنی میں جو آمد کے شیشوں سے گزر کر اندر آ رہی تھی یہ ضعیف شخص بھوت کی طرح سفید معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اپنی خواب گاہ سے کھانے میں کوئی کتاب لینے آیا تھا میں کھڑا ہو گیا، وہ بھی ٹھہر کر مجھے دیکھنے لگا۔ بعد ازاں الماری کی طرف جا کر اس نے دو بڑی بڑی جلدیں نکالیں۔ اور پھر دروازے سے باہر چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ یا تو اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، یا وہ خواب کی حالت میں یہاں چلا آیا تھا یا بیماری نے اس کی بینائی کو کم کر دیا تھا۔
صبح کے وقت جب اس کی بی بی اپنی لڑکی کے ساتھ ٹون سے واپس آئی تو میں نے اس سے کہا: "آپ کے شوہر شب کو

کتابیں لینے کے لیے نیچے اُترے تھے۔ لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے یہ سن کر وہ مجھے تعجب کے ساتھ گھورنے لگی، "وہ تو تین ہفتہ ہوتا ہے مجھے کے دن انتقال کر گئے۔"

"میں نے تو رات انہیں دیکھا تھا، وہ دو کتابیں کتب خانے سے نکال کر ساتھ لے بھی گئے۔"

ہم لوگ فوراً اس بات کی تحقیقات کے لیے کتب خانے میں گئے۔ اس کی بی بی نے ان جلدوں کی خالی جگہ کو فوراً دیکھ لیا۔ اور فہرست دیکھ کر ان دونوں کتابوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ یہ لارڈ بائرن کے خطوط تھے، پہلی اور دوسری جلد

یہ ہے سارا قصہ۔ میں اس واقعہ پر کوئی رائے زنی نہیں کرتا۔ بلکہ من وعن حالت جو کچھ دیکھی۔ بیان کر دیتا ہوں، اگر آپ لوگ مجھے محفوظ الحواس سمجھتے ہیں، تو مہربانی فرما کر کسی ڈاکٹر سے میرا طبی معائنہ کرائیے، اگر ڈاکٹر دیکھ بھال کے بعد مجھے صحیح الدماغ قرار دے اور آپ اس تاثر پر یہ سمجھیں کہ اس کا دماغ خود مختل ہے تو پھر اس کے لیے کسی پروفیسر کو بلائیے۔

خاکسار "ہونہار نوجوان"

ہوں تو جیب میں ٹٹولا، وہ، کسی نے جیب سے نکال لیا۔ یا خود کہیں گر پڑا۔ لنچ کھانے کا کمرے حواس تھا، فوراً گھر سے نکلا اور بس سٹینڈ تک جا تلاش کرتا ہوا گیا، لیکن نہ معلوم کہاں گرا تھا، کچھ پتا نہ چلا۔ اس کے بعد میں نے فوراً لوٹ پر وپرٹی آفس کو اطلاع دی اور پولس کو بھی خبر کر دی کیمبرج اور لندن دونوں جگہ کا پتہ دے دیا کہ اگر پتا چلے تو مجھے فوراً اطلاع دیجائے، دوسرے دن سخت پریشانی کے عالم میں لندن پہنچا جائے اتنے کے کیمبرج میں کسی سے قرض لوں یا لندن میں کسی کو تکلیف دوں، میں نے گھڑ دوڑ کا ۳۰ پونڈ اور منگوائے، ٹکٹ میں نے پہلے ہی سے خرید رکھا تھا، لندن میں دو چار روز اور ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن طبیعت بالکل اچاٹ تھی جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو گیا، پیرس میں بھی نہ ٹھہرا سیدھا مارسیلز پہنچا اور جہاز پر سوار ہو گیا، کان داروں کو روپے ادا کرنا خارج از بحث تھا، ڈیڑھ سو پونڈ محض تار دینے سے تو آ نہیں جاتے، خیال آیا کہ چیزیں واپس کر دوں لیکن کل سامان میں نے پہلے ہی لندن روانہ کر دیا تھا، اور وہ چیزیں جو حاصل میری فرمائش سے بھیجی تھیں وہ کاغذوں کے لیے بیکار ہی ہوتیں، تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟ یہ اعتراض کرنا میں نے اصلی تاہنیں تاہت مضحکہ خیز ہے، میرے والد صاحب بڑے ہی ذی ہوش ہیں، میں نے اپنا پتا دیا ہے، رجسٹک ہی میں تھے، اب پشن لیکر لاہور میں مقیم ہو گئے ہیں، جنگ کا خطرہ اگر لاہور نہ پہنچے تو پھر کیا قصور؟ تم میرا پتا سب کو دے دو اور جس جس کے یہاں جانا ہو میری طرف سے اطمینان دلا دو کہ جہاں تک جلد ممکن ہو گا میں روپے ادا کر دونگا۔ آنیگر امی فکسنے میں ہے، اس کے اطلاس میں میں کئی بار کام کر چکا ہوں، لیکن اب وہ آنیگر نہیں۔ تفصیل کسی دوسرے وقت، تمہارے واپسی کے دن بھی اب قریب آ گئے تمہیں اگر زیادہ تکلیف نہ ہو تو دو تصویریں لیتے آنا، قسمت میں یہاں آؤنگا تو ادا کر دونگا، ایک تو وہ تصویر ہو تو میں نے بٹی کے ساتھ کیمبرج آنے کی فکر اس ڈر سے کرا دی تھی، جو میں نے اس کے کیمبرج سے رخصت ہونے کے وقت آنیگر کو دیا تھا، میں یہ دونوں تصویریں ساتھ لایا تھا، لیکن راستے میں وہ بکس ہی غائب ہو گیا جس میں یہ تصویریں تھیں۔۔۔۔" میں نے یہ خط شاہ کو سنایا، وہ بے تحاشا ہنستا رہا، بعد بے ہنسی سے افاقہ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا: "تمہارا پیر اندیشوں سے معاملے میں کیا کہتا ہے؟ ورما یا ناخدا ہے یا بابے ایمان؟" یہ تو مجھے علم نہیں کہ پیر اندیشوں کیا کہے گا، لیکن یہ میں خود جانتا ہوں کہ ورما تمہیں کیا سمجھتا ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ "علم شے بازیچہ اطفال ہے" لیکن میں نے یہ معلوم کرنے کی بالکل کوشش نہ کی کہ ورما مجھے کیا سمجھتا ہے۔

عیّاریاںؔ

از ڈی ہیکیس — مترجمہ عطارد

جوزف گبس نے روڈلائن (شراب خانے) کے نام کے پرائیوٹ بار (شراب خانے) کا دروازہ جھوم نہیں ہوتا) میں اپنا لفٹ پائنٹ اتفاقیہ ٹھہر کے ختم کیا کہ گویا یہ آخری گلاس ہے جو وہ پی رہا ہے اور اس کی خبر نہیں کہ آئندہ کہاں سے آئیگا۔ اس نے گلاس کو تختے پر رکھا، پڑیا سے تمباکو نکال کر پائپ بھرا اور اپنے ساتھیوں کی طرف رُخ کرکے سر ہلانا شروع کر دیا۔

"صبح دس بجے سے یہ پہلا گلاس ہے جو میں نے پیا ہے"۔ اس نے کرخت آواز میں کہا۔

"ہمت ہارنی نہیں چاہیے" جورج براؤن نے مشورہ دیا۔

"یہ حالت ہمیشہ نہ رہیگی" باب کڈنے ہمت بڑھانے کے لیے کہا۔

"میں کسی سے کچھ مانگتا تو ہوں نہیں، صرف یہ چاہتا ہوں کہ کام ملتا رہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں کام چاہتا ہوں اطمینان نہیں"۔ گبس نے زور دار لہجے میں کہا۔

ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے"۔ براؤن نے جواب دیا۔

"بعض لوگوں کے لیے تو خاص طور پر مشکل ہے"۔ کڈنے اضافہ کیا۔

"کہہ لو بھائی جو کہنا ہو، میں بھلا مانوں یا بُرا تمھیں کیا کام! لفٹ پائنٹ بیر پلائی ہے نہ، تمہارا حق ہے اکھل دوبار بھی میں آیا کہ زیادہ تو دیکھوں کہ پانی میں ڈبکی لگانے میں کیا لطف ملتا ہے"۔ گبس اداس ہو کر زبان لایا۔

"بہت سے لوگ ڈوب کر جان دیدیتے ہیں"۔ براؤن نے سوچ کر کہا۔

"اور بی بی بچوں کو خاوند کشی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں"۔ گبس نے بڑی رکھائی کے ساتھ اضافہ کیا۔

"اکثر تو یوں ہوتا ہے کہ بی بی کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے۔ کچھ اور نہیں تو ایک کھانے والا ہی کم ہو جاتا ہے۔ چندے سے بھی کچھ نہ کچھ دھول ہی جاتا ہے۔ بڈھا بیل مرا تو گنگز ہیڈ (شراب خانے کا نام) میں یاروں نے جلسہ کرکے ستر پونڈ اس کی بی بی کے لیے جمع کر ڈالے"۔ اس کے دوست نے جواب دیا۔

"تمہاری بڑھیا کے لیے اس سے زیادہ ہی مل رہیگا، بال بچے تو ہیں نہیں، بڑے آرام سے گزر ہوگی، کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھیں خودکشی کی ترغیب دے رہا ہوں" کڈنے کہا۔

گبس کی پیشانی پر بل آگیا، گلاس کو ٹیڑھا کرکے اس کے اندرونی حصے کو دیکھنے لگا۔

"میاں جو پانی میں ڈوبنے والے لوگوں میں نہیں' پیر ہوتی تو ..." براؤن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

گیس کا قد تو مرد ۵ فیٹ ۲ انچ تھا، لیکن وہ تن کر کھڑا ہو گیا' اور اپنے دوست پر خشم آلود نگاہیں ڈالنے لگا۔

"میں یہ سوچتا ہوں کہ ڈوب مرنے کی بالکل ضرورت نہیں' صرف اس کو شہرت دے دینا کافی ہے' اس کے بعد جو چندہ ہو وہ آپس میں بانٹ لیں۔" کڈنے یہ تجویز پیش کی۔

"ہاں ہاں' تین حصے برابر برابر کریں گے، مگر اس کی صورت کیا ہوگی؟ براؤن نے سوال کیا۔

"ارے میاں تھوڑی بیر اور پیو، کوئی نہ کوئی بات سوچ ہی لیں گے" کڈ بولا جو فرط جوش سے پیلا پڑ گیا تھا۔ تین گلاس بیر اور منگوائی، کڈ اور براؤن نے تو اپنے اپنے کوزے اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، لیکن گیس اپنے کوزے کے دستے سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"میں وعدہ نہیں کرتا۔ یہ نہ سمجھو کہ بیر پی کر میں اپنا قول دے رہا ہوں' جو تم سب باتیں مجھ پر تھوپ رہے ہو۔" کڈ نے کہا۔

گیس راضی نہ ہوتا تھا، لیکن بیر آتی رہی، اور اپنا کام کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کل باتیں آپس میں طے ہو گئیں، دوسرے دن براؤن دو تین دوستوں کے ساتھ اسی شراب خانے میں بیٹھا تھا کہ کڈ طوفان کی طرح داخل ہوا۔ اس کے جلنے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک بنچ پر پڑ گیا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے"۔ کئی آدمیوں نے پوچھا۔

"جو بیچارہ ڈوب گیا! میں اسٹیمر کے لکڑی والے گھاٹ کو اپنی جگہ سے ہٹا رہا تھا کہ جو مدد دینے کے لیے آگیا۔ وہ اسے پانی سے دھکیل رہا تھا کہ۔" کڈ بولتے بولتے یکایک رک گیا، اس پر لرزہ طاری تھا۔ وہ بیر کا ایک کوزہ جو کسی نے اس کی نذر کیا تھا، آہستہ آہستہ پینے لگا، اس درمیان میں رانڈی کا ایک گلاس آ رہا تھا' جو اس کے لیے کسی دوست نے منگوایا تھا۔

"یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا، جب تک میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچوں' اور تیسری بار نیچے جا رہا تھا میں نے نیچے جھک کر اسے پکڑ لیا۔ کوٹ اور ٹائی میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں خود گرتے گرتے بچا۔" کڈ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کڈ نے کوٹ اور ٹائی لوگوں کو دکھائی۔ وہ سرے سے کوٹ کے بٹن والے بٹام تک بھیگا ہوا تھا۔ لوگوں کو یہ بات پسند آئی (کہ اس نے اپنے دوست کو بچانے کی کوشش کی)

"یہ غریب تو ابھی آدھا گھنٹا ہوا یہیں تھا" شراب خانے کے مالک نے کہا۔

ایک گاڑی والا بولا کہ "اب اسے بیر پینا نصیب نہ ہوگا۔"

"یہ کون کہہ سکتا ہے؟ میں نے کبھی کوئی بات اس کے خلاف نہیں سنی' جہاں تک میں جانتا ہوں وہ اچھی زندگی بسر کرتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اب وہ بیر نہیں پیے گا۔" مالک شراب خانہ نے تند ہو کر جواب دیا۔

اس نے کڈ کو برانڈی کا ایک چھوٹا گلاس اپنی طرف سے دیا، اور یہ پوچھا کہ بی بی بچے تو نہیں چھوڑے؟

"بی بی کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس بیچاری کے پاس یہ خبر کون لے جائیگا؟ وہ تو اس پر جان دیتی تھی۔ اس کی بسر اوقات کا کیا سامان ہوگا؟ مجھ سے تو جو کچھ ہو سکتا ہے کرنے کو تیار ہوں۔" کڈ نے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔" براؤن بولا۔

گاڑی والے نے نصیحت ہوتے ہوئے کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہیے۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ پولیس کا کوئی آدمی مسز گبس کو بھی خبر کر دیگا۔ ان لوگوں کو مشاہرہ اسی کا ملتا ہے۔" مالک شراب خانہ نے تجویز پیش کی۔

"یہ حادثہ اس قدر اچانک ہوا ہے کہ ہم تو ابھی سان جاتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے گھر میں ایک دھیلا بھی نہ ہوگا جو کے دوستوں کی کمی نہیں، روپے کا کسی طرح سامان کرنا چاہیے۔" کڈ نے کہا۔

"میاں، پہلے پولیس کو تو اطلاع دو، اور باقی جیسے ہوتی رہیں گی۔" مالک شراب خانہ نے جوش دلاتے ہوئے کہا۔

کڈ نے گرم جوشی سے شکریہ ادا کیا اور براؤن کے ساتھ تھانے میں گیا۔ پولیس نے اس خبر کو اس طرح سنا گویا بالکل معمولی واقعہ ہے، یہ دیکھ کر ان دونوں کو بڑا اطمینان ہوا اور تیزی سے لندن برج سے گزرتے ہوئے ایک پست قامت شخص کی طرف چلے جو بورو مارکٹ میں ایک کھمبے سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔

"کہو کیا ہوا؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے، ہم لوگوں نے بیچ لگا دیا ہے۔" کڈ نے جواب دیا۔

"کیا لگا دیا ہے؟" گبس نے دریافت کیا۔ کڈ نے سب باتیں سمجھائیں۔

"جب تک یہ درخت اگے اور پھل پھول لائے، میرا کیا حشر ہوگا؟ سونے کا کیا انتظام ہوگا، اور کھانا کہاں سے ملے گا؟ میں گھر تو جانے سے رہا۔" گبس نے کہا۔

براؤن اور کڈ نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، دوسری باتوں نے انہیں اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ وہ ان باتوں کو بالکل بھول ہی گئے تھے۔ گبس کی عادات کے طویل اور کثیف وہ تجربے نے انہیں سمجھا دیا کہ معاملات کا رخ کس طرف ہے۔

"گبس ہونے کا انتظام دریا کے اس پار ہی کرنا پڑیگا۔ کسی تہہ خانے میں یا کہیں اور جگہ مل رہی ہوگی اور تمہارا سا چلتا پرزہ اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اس کے لیے ایسے حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔" براؤن نے دبی آواز سے جواب دیا۔

گبس ہنسنے لگا۔

"خیال رہے کہ اس درمیان میں جو روپے ہم لوگ تمہیں قرض دینگے وہ تمہیں اپنے حصے میں سے واپس کرنا ہوگا، اور یہ بھی یاد رہے کہ

جب تک تم اپنی مونچھیں نہ منڈوا لوگے، ایک وسیلا تمہیں نہیں مل سکتا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی تمہیں پہچان لے، اور راز طشت از بام ہو جائے"۔ کڈنے ہنسی کے جواب میں جھنجلا کر کہا۔

گبس اپنی پیٹھ کھجنے سے اڑائے تقریباً آدھ گھنٹے تک اپنی مونچھوں کے لیے لڑتا رہا۔ بڑی ردوکد کے بعد وہ راضی ہوا، دونوں دوست اسے حجام کی دکان میں لے گئے اور بڑے غصے اور بیدلی سے اس نے داڑھی مونچھ دونوں منڈوانے کی درخواست کی۔ گبس نے اپنے بے ریش و بروت چہرے کو آئینے میں دیکھا تو اس کی افسردگی اور بڑھ گئی، تب سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، کڈ اور براؤن کی خوش اخلاقی پر اس کا تحیر غالب آگیا۔

"اب یہاں آگیا ہوں تو سر کے بال بھی کٹوا لوں"۔ گبس نے دیر تک اپنے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"اور شیمپو بھی؟" حجام نے سوال کیا۔

"جیسی تمھاری خوشی، لیکن ہے کیا بلا؟" گبس نے جواب دیا۔ اس کے مالی مددگار ہزار مخالفت کرتے رہے، لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

جب تک حجامت ہوتی رہی، اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس حیرت میں ہے کہ کس عذاب میں مبتلا ہوا۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ طبیعت بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ گویا ایک بڑا بوجھ سر سے اترا۔ دوستوں نے اس اطلاع کو کامل خاموشی کے ساتھ سنا۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے سے انہیں ایک شراب خانہ مل گیا جہاں زیادہ شور و ہنگامہ نہ تھا۔ اس کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ان لوگوں نے الیات کی ایک کمیٹی قائم کر لی جو انھیں تمنوں پر مشتمل تھی۔

"دوست تمھارے لیے یہ کافی ہوگا، مگر یہ نہ بھولنا کہ یہ سب تمہارے حصے میں سے کاٹا جائیگا"۔ براؤن اور کڈ نے گبس کو کچھ نقد دیتے ہوئے کہا۔

گبس نے جواب میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "میں روز شام کو یہیں رہونگا، ملنا چاہو تو یہیں ملاقات ہوگی۔ یہ جگہ یہاں کی بہت اچھی ہے۔ اب تمہیں مسز گبس کے پاس جانا چاہیے"۔ گبس نے کہا۔

دونوں دوست اس سے رخصت ہو کر مسز گبس سے ملنے چلے، جب مکان کے قریب آئے تو انہیں ایک چھوٹا سا مجمع نظر آیا انہیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا اور یہ خیال گزرا کہ مسز گبس کو پہلے ہی خبر مل چکی ہوگی اور دونوں کو گلے پر پہنچے، وہاں مسز گبس ہاتھ میں ایک بھیگا ہوا رومال لیے ہوئے نظر آئی، اس کے ارد گرد اس کی جان پہچان کے لوگ بیٹھے تھے، خفیف آوازیں اس نے کڈ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے گبس کو بچانے کی کوشش کی۔

"کڈ ابھی تک خشک نہیں ہوا"۔ براؤن نے کہا۔

"مجھ سے جو ہو سکتا تھا میں نے کیا، گبس کے سے دوست کہیں ملتے ہیں"۔ کڈ نے جواب دیا۔

"بیچارہ ہر وقت مصیبت زدوں کی مدد کو تیار رہتا تھا۔" براؤن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ایک شخص نے اس کی تائید کی۔
"اب ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر ہم اس غریب کی کچھ بھلائی نہیں کر سکتے، تو اس کی بی بی کی تو مدد کر سکتے ہیں۔" کڈنے جوش کے ساتھ کہا۔
کڈ براؤن کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور وہ ایک آدمی جن سے نگاہیں چار ہوئیں، انہیں اس نے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا، رفتہ رفتہ اس کے پیچھے ایک اچھا خاصہ مجمع ہو گیا اور سب کے سب رڈلائن کی طرف چلے۔
تین چار دن دوستوں نے بڑی محنت کی، اس مضمون کے کارڈ تقسیم کیے گئے کہ رڈلائن میں مسز گبس کی مدد کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوگا۔ ایسی تعریفیں جن سے مرحوم کے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ پر روشنی پڑتی تھی، ہر کہ ومہ کو سنائی گئیں۔ ویٹنگ کو بعد از وقت احساس ہوا کہ اس کا ایک بڑا محسن جو نیکیاں کرتا تھا، لیکن خود منظر عام پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ہے۔
گبس اپنی عمر کی عزلت گاہ میں اپنے دوستوں کی سرگرمیوں کا حال بڑے ذوق و شوق سے سنتا تھا، اس کے دوستوں کو یہ معلوم کر کے بڑی الجھن ہوئی کہ وہ خود بھی جلسے میں موجود رہنا چاہتا تھا، اور جب اس نے منھ میں کالک لگا کر حبشی مطرب کا روپ بھر کر اہل مجلس کے سامنے گانے کا پروگرام رکھا تو کڈ کو اسے زبردستی باہر لے جانا پڑا۔۔۔۔۔۔
"اس کے دماغ کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں، اس نے ضرورت سے زیادہ روپے ہم لوگوں سے وصول کیے ہیں، اب اسے ایک کوڑی نہیں دینی چاہیے۔" براؤن نے راستے میں کڈ سے کہا۔
"وہ شاہانہ زندگی بسر کر رہا ہے اور ہم لوگ غلامی کرتے کرتے مرے جا رہے ہیں۔ میں نے تو اسے کبھی اتنا موٹا تازہ نہیں دیکھا، اسے ہم لوگوں کے برابر حصہ لینے کا کوئی حق نہیں، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے سوا اس نے کیا ہی کیا ہے؟" کڈ بولا۔
اس کی بدمزاجی جلسے کی رات تک قائم رہی، جلسہ ایک ایسی گیرجس نے گھوڑ دوڑ میں خوب روپے بنائے تھے اور اس کے دوستوں کی بدولت خوب کامیاب رہا، آمدنی متعلقین کی توقعات سے کہیں زیادہ ہوئی، ایسی گیرنے اتنا ایسی میں تنخواہ میں پانچ پاؤنڈ کا ایک نوٹ رکھ دیا، یہ دیکھ کر سامعین نے اس قدر گہری سانس لی کہ جملہ مجمع گرنے والے کو اپنی ذمہ داری کا ایک بوجھ سا معلوم ہونے لگی۔ مسز گبس مرحوم کے ماتحوں نے ۳۰ پونڈ ۴۰ شلنگ اور ۴ پنس کی صورت میں خراج تحسین ادا کیا۔
"ایک مصرعہ بارہ پونڈ سے زیادہ ہوتا ہے۔ بات اتنی اچھی ہے کہ مشکل سے اس پر یقین ہوتا ہے۔" کڈ نے خوش خوش رخصت ہوتے وقت اپنے ساتھی سے کہا۔

کام ختم ہو گیا تھا۔ دونوں کو گبس سے ملنے کے لیے شام کا انتظار تھا، شام ہوئی تو ڈرائیور کو لنڈن برنج کے اُس پار لے گیا۔ کڈ، براؤن سے جو ملنی مزاج کا تھا۔ گزدو گز آگے تھا۔ گبس وہیل رائٹ آرمس میں اپنی پرانی جگہ پر موجود تھا۔ جم شدہ رقم سے وہ خوش نہیں ہوا، بلکہ اس نے اشارۃً کہا کہ اگر مجھے اس معاملے میں حصہ لینے دیا جاتا تو اس سے زیادہ رقم وصول ہوتی۔

"میں نے جو محنت گوارا کی ہے اس کا یہ کافی معاوضہ نہیں۔" اس نے اپنا سر ہلا کر کہا۔ "یہاں تنہائی میں میرا جی نہیں لگتا۔ جو رقم مجھے تمہیں دینی ہے، اس کے علاوہ جب تم اپنے حصے لوگے تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔"

"میں تم سے کسی دوسرے وقت گفتگو کروں گا۔" کڈ نے کہا، اور اس کو تیز نگاہوں سے دیکھا۔ "اب تمہیں ہمارے ساتھ دریا کے اس پار چلنا چاہیے۔"

"کس لیے؟" گبس نے پوچھا۔

"قبل اس کے کہ تمہاری بی بی اس رقم کو خرچ کرنا شروع کر دے جو اُس کی ملک نہیں، ہم اُسے یہ خوش خبری سُنانا چاہتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔" کڈ نے کہا۔ "اور ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی ہم لوگوں کے قریب ہی کہیں پر رہو۔ کیونکہ شاید وہ ہماری بات کا یقین نہ کرے۔"

"یہ خبر یکایک سنا دینا، گبس نے کہا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ وہ دنگا پیٹنا شروع کر دے۔ یا اسی قسم کا کوئی اور کام کر بیٹھے جس کی حالت سے جس قدر واقف ہوں، تم نہیں ہو سکتے۔ اور میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ سہولت کے کام لو۔"

وہ ان لوگوں کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا، اور ذرا تامل کے بعد لفٹنگ لگانے پر بھی راضی ہو گیا تاکہ کچھ اس کا حوالگی کھلی ہو جائے۔ یہ لفٹنگ کڈ کی ساس کی تھی، وہ آٹھ بجے صبح سے اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان تھی۔

"تم دس منٹ تک یہیں پر ٹھہرو۔" کڈ نے مونیمنٹ کے قریب پہنچ کر کہا۔ "اس کے بعد ہم لوگوں کے پیچھے پیچھے آؤ۔ جب تم روشنی کے کسی کھمبے کے قریب سے گزرو تو رومال سے منہ پھیلا لو، اور ہر ایک کے کان سے ہم لوگوں کا انتظار کرو۔"

کڈ براؤن کے ساتھ تیزی سے چلنے لگا، لیکن جب دونوں مسز گبس کے مکان کے پاس پہنچے تو ان کی چال حد سے زیادہ دھیمی ہو گئی۔ مسز گبس مکان پر تنہا تھی اور سہمی گفتگو کے بعد اس نے ان لوگوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

"میں تو غریب ہو کے بے اس سے بھی زیادہ کر سکتا۔" براؤن نے کہا۔

"ابھی تک وہ لوٹے تو نہیں؟" بیوہ نے پوچھا۔

کڈ نے اپنا سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کہ ان کی تلاشی لے رہے ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"دریا کا دھارا بہالے گیا۔" براؤن نے کہا اور کڈ کی افسانہ سازی تقریر کا مقصد فوت کر دیا۔

"وہ جہاں بھی ہو، اچھی ہی حالت میں ہوگا۔" مسز گبس نے کہا۔ "اب نبلے کا رہنے کی پرواہ ہے، کسی قسم کا تردد ہے، تکلیف ہم سب کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہی پڑے گا۔"

"ہاں" کڈنے کہنا شروع کیا: "مگر....."

"میری خواہش یہ ہرگز نہیں کہ وہ واپس آجائے" مسز گبس نے کہا۔ "ایسی خواہش رکھنا ارتکاب گناہ کے برابر ہے"۔

"لیکن اگر وہ خود واپس آجانا چاہے"۔ کڈنے بات کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور روپے کو خرچ کرنے میں تمہاری مدد کرے"۔ براؤن نے اپنے دہست کی قضب آلود نگاہوں کی بالکل پروا نہ کی۔

مسز گبس متحیر ہو گئی "روپے خرچ کرنے کا کیا مطلب ہے؟" اس نے کہا۔

"وقتی کرو" کڈنے کہا "تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ وہ ڈوبا ہی نہ تھا۔ میں نے کل رات کو خواب دیکھا ہے کہ وہ زندہ ہے"۔

"میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے"۔ براؤن نے کہا۔

"وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا"۔ کڈنے رقت آمیز آواز میں کہا

"بوب وہ کہنے لگا، جاؤ اور میری بی بی سے کہہ دو کہ میں زندہ ہوں" یہ فقرہ ذرا نرمی سے سنانا"۔

"حرف بہ حرف یہی بات اس نے مجھ سے بھی خواب میں کہی" براؤن نے کہا۔ "عجب کی بات ہے"!

"بڑے تعجب کی بات ہے"۔ مسز گبس نے کہا۔

"برا خیال ہے" کڈنے تھوڑے وقفے کے بعد کہا "کہ تم نے تو اسے خواب میں نہ دیکھا ہوگا"؟

"نہیں، میں کبھی شراب نہیں پیتی"۔ بیوہ نے کہا۔

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا، کڈنے معاملے کو انجام تک پہنچا دینے کا ارادہ کر لیا۔

"اگر جو اس دروازے سے مکان کے اندر آجائے تو تم کیا کرو گی"؟ اس نے پوچھا۔

"بیچ بیچ کر مکان کی بنیاد ہلا دوں گی"۔ بیوہ نے برجستہ جواب دیا۔

"بیچ بیچ کر مکان کی بنیاد ہلا دو گی؟" کڈنے کہا۔

مسز گبس نے اپنا سر ہلایا "میں چیخوں گی، پاگلوں کی طرح چیخوں گی"۔ اس نے تیقن کے لہجے میں کہا۔

"لیکن اگر وہ زندہ ہو گا، جب تو نہ چیخو گی؟" کڈنے کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کیا چاہتے ہو"۔ مسز گبس نے کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے، جو ڈوب کر مر چکا ہے، تم تو یہ جانتے ہی ہو، تم نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور پھر بھی تم مجھ سے خواب کی باتیں کر رہے ہو"

کڈنے، اس کی طرف جھک کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ "وہ بچ گیا" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے"۔

"کیا؟" مسز گبس نے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے۔ اتنی ہی سچی، جیسی یہاں پر میری موجودگی"۔ مسٹر کڈنے کہا "یہ بات سچ ہے نہ جو، رح؟"

"سچ سے بھی زیادہ سچ ہے۔" مسٹر براؤن نے ایک وفادار دوست کی طرح کہا۔

مسز گبس نے گہری سانس لی۔ "زندہ! اس نے کہا۔" لیکن کس طرح؟ وہ زندہ کیوں کر ہو سکتا ہے"؟

"اس قدر زور سے نہ بولو۔" کڈنے اس سے گزارش کی۔ "اگر کوئی دوسرا سن لیگا، تو تمہیں وہ رقم واپس دے دینی پڑے گی۔"

"اگر وہ مجھے واپس مل جائے تو میں اس رقم سے بھی زیادہ قربان کرنے کو تیار ہوں۔" مسز گبس نے جوش میں آکر کہا۔ "شاید تم مجھے دھوکا دے رہے ہو"

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں" کڈنے کہا۔ "وہ قریب ہی ہے۔ اگر تمہارے چیخنے کا خوف نہ ہوتا تو میں ابھی جا کر بلا لاتا"

"نہیں نہیں، وہ زندہ ہے تو میں چلانے کیوں لگی، تم اسے ساتھ ہی کیوں نہ لائے؟ وہ ہے کہاں؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔" مسز گبس نے کہا۔

"اتنی بے قراری ہو، بہرحال لینے دقت پر ٹھیک ہوتی ہے۔ میں ابھی اسے لے آتا ہوں، لیکن، اچھی طرح یاد رکھو، چیخو گی تو سب کام خراب ہو جائیگا۔" کڈنے براؤن کو مسرت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خوش خوش کمرے سے باہر نکل کر نیچے اترا۔ مسز گبس نے براؤن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور منہ کھولے ہوئے انتظار میں دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ تین چار منٹ گزر گئے۔

"آگئے، چیخنا چلانا نہیں!" براؤن نے سیڑھی پر آواز سن کر کہا۔

مسز گبس پیچھے ہٹ گئی، یہ دیکھ کر کہ وہ بالکل خاموش تھی، کڈ اس کے شوہر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، لیکن وہ منتظرانہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھتی ہی رہی۔

"وہ نہیں آئے؟" مسز گبس نے پوچھا۔

"یہی تو ہیں، تم پہچانتی بھی نہیں؟"

"سچ کہیں ہی تو ہوں۔" گبس نے کہا۔

"مجھے سمجھنا تھا کہ تم لوگ مذاق کر رہے ہو، یہ بے رحمی کی انتہا ہے، تم لوگوں سے کیوں کر یہ بات ہو سکی۔" مسز گبس نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا اور کرسی پر گر پڑی۔

کڈنے غصے میں گبس کو دھکیل دیا۔ "وہی تو ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب مونچھیں نہیں ہیں، تم سسکیاں لیکر چیخو نہیں، لوگ چلے آئیں گے۔"

"ابھی یہاں سے اسے ہٹا لے جاؤ، ایسا مذاق کسی دوسری دل شکستہ سے جا کر کرو۔" مسز گبس نے کہا۔

"تمہارا شوہر ہی تو ہے۔" براؤن بولا۔

"ابھی اسے یہاں سے لے جاؤ۔" مسز گبس نے چیخ کر کہا۔

کڈنے دانت پیستے ہوئے سوچنے کی کوشش کی اور گبس سے مخاطب ہو کر اس نے دریافت کیا: "تمہارے بدن پر کوئی نشان تو نہیں؟"

"بالکل نہیں، میرا بدن ہر قسم کے داغ دھبے سے پاک ہے، میرا بدن اتنا ہی سفید....." گبس نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

بس بس، بدن کی باتیں نہ کرو"

"میں دس تک گنتی ہوں، اگر اس دریان میں تم لوگ یہاں سے نہیں چلے گئے، تو میں چلاؤں گی۔ ایک! عورت کے سامنے تمہیں کیوں کر جرأت ہوئی کہ اپنے بدن کا ذکر کرو..... اب جاتے ہو یا نہیں؟ ایک! دو! تین! چار! پانچ!" ہر ہندسے کے ساتھ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی، سب سے پہلے خود گبس اُٹھ کر چلا اور اس کی تقلید اس کے دوستوں نے بھی کی۔

تھوڑی دیر میں گھر بھر کو خبر ہو جاتی اور پھر ہماری مٹی پلید ہونے میں کوئی کسر نہ رہتی، میں پہلے ہی خیال کر رہا تھا کہ مونچھیں نہیں منڈوانی چاہییں۔ اس نے مجھے کبھی بغیر مونچھوں کے دیکھا ہی نہیں، ابھی میرا لونگیں ہی تھا کہ مونچھیں نکلنی شروع ہو گئی تھیں، وہ مجھے لڑکے....." گبس اپنی پیشانی آستین سے پونچھتے ہوئے بولا۔

"بکو نہیں!" کڈنے چیخ کر کہا۔

"بس جناب بس، اب میں آپ کا حکم ماننے کو تیار ہوں۔ آج ہی مونچھیں بڑھانا شروع کر دیتا ہوں۔ وہ مونچھوں کے بغیر مجھے پہچاننے والی نہیں، اور اب میں زیادہ دیر تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتا" گبس نے اس انداز سے کہا کہ گویا اب وہ کسی کی جھاڑ پھونک سننے والا نہیں۔

"گبس ٹھیک کہتا ہے، یوپ" براؤن نے تیقن کے ساتھ کہا۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کی مونچھیں نہ نکلیں ہم انتظار کریں اور اسے کھلاتے پلاتے رہیں؟" کڈنے غصے ہو کر کہا۔

"میرے غصے سے تمہیں سب کچھ واپس مل جائیگا۔ مگر میں کچھ نہیں چاہتا، ہو تمہاری خوشی ہو کرو۔ اگر اس معاملے کو یہیں پر ختم کرنا چاہتے ہو تو میں اس پر بھی راضی ہوں" گبس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

براؤن اپنے دوست کڈ کو غصے سے بھوت ہو رہا تھا، الگ لے گیا اور دونوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ گبس اس دریان میں بے پروائی کے انداز سے کھڑا ہوا سیٹی بجا رہا تھا۔

"مونچھیں کتنے دنوں میں بڑھیں گی؟" کڈ نے

گبس نے اپنے کاندھوں کو حرکت دی: "ٹھیک ٹھیک کہنا مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں دو یا تین ہفتے کافی ہونگے۔ اگر اس پر بھی نہ بڑھیں تو ایک آدھ ہفتہ اور سہی"

"تمہارے غصے میں سے کچھ باقی نہ رہیگا، اس کا یاد رکھنا" کڈنے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہ سہی، بار بار اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے" گبس نے کہا۔

اس کے بعد رستے بھر تینوں خاموش رہے۔ دو ہفتے تک ہر شب دونوں دوست آکر یہ دیکھتے کہ کڈنی شکل میں کتنا تغیر ہوا ہے، انہیں بڑا رنج اس کا تھا کہ تغیر کی رفتار اس قدر سست کیوں

دو ہفتے گذر گئے، تو کڈنے کہا کہ "آج کی رات آزمایش کرنی چاہیے" میں قرض دیتے دیتے تنگ آگیا ہوں"

گبس نے دانشمندانہ انداز میں بمشورہ دیا کہ جہاں اتنے روپے قرض دیے ہیں، تھوڑا اور سہی، لیکن کڈ اپنی بات پر اڑا رہا۔

"اب تو مجھیں اتنی فرصت نکل آئی ہیں کہ تمھاری بی بی تمھیں پہچان لے۔ ہمیں دوسرے لوگوں سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ کل رات کو آٹھ بجے مونیومنٹ میں ملنا اور پھر اس معاملے کو ختم کریں گے" کڈنے سختی کے ساتھ جواب دیا۔

"جو حکم ہو" گبس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"داڑھی وڑھی خوب نئی کرکے پہننا کہ تمھیں اچھی طرح نہ معلوم ہوں' وہ عینک بھی لگا لینا جو میں نے تمھیں دی ہے اور ہاں خوب یاد آیا، لال فلالین کا ایک ٹکڑا بھی منھ پر لپیٹ لینا" کڈنے سختی کے ساتھ اپنے احکام دیے۔

"رہنے بھی دو، میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، تمہاری ہدایت کی ضرورت نہیں۔ میں شرط بتاتا ہوں کہ اگر کل رات کو تم دونوں میں سے کسی نے بھی مجھے پہچان لیا تو میں سب کو بیئر پلاؤں گا، اور نہ تمھیں پلانی پڑے گی" گبس نے کہا۔

شرط قبول کی گئی اور دوسرے دن آٹھ سے پونے نو بجے تک کڈ اور براؤن شرابخانے کی پوری کو شش کرتے رہے۔ جب گبس نظر نہ آیا تو کڈنے پریشان ہو کر بہت سے فاضل الفاظ کے ساتھ براؤن سے یہ دریافت کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

"ڈکیلا ہی چلا گیا ہوگا۔ چلو ہم لوگ بھی وہیں چلیں" براؤن نے جواب دیا۔

مسز گبس کے یہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے، انہوں نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بغل کے مکان سے ایک عورت نے اپنا سر نکالا اور انہیں بتایا کہ مسز گبس چلی گئی۔

"چلی گئی! کہاں چلی گئی؟" دونوں نے یک وقت چیخ کر پوچھا۔

"کناڈا، آج ہی صبح کو تو گئی ہے"۔

کڈ کو کھڑا رہنے کے لیے دیوار کے سہارے کی ضرورت ہوئی، براؤن کا ذہن حیرت سے منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور قوت گفتار سلب ہو گئی۔ مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی، مسز گبس نے بتایا کہ میں دو ہفتے سے چپکے چپکے تیاری کر رہی تھی۔ وہ تو بہت خوش نظر آرہی تھی، بات بات پر ہنستی تھی"

"ہنستی تھی!" کڈنے بولنے کی لہجے میں دہرایا۔

"اور جب میں نے اسے یاد دلایا کہ تمہارا شوہر ابھی واپس آتا ہے، اس طرح ہنسنا مناسب نہیں سمجھا تو وہ زینے پر چڑھ گئی اور اتنا زور سے قہقہے مارنے لگی کہ اس کی آنکھوں سے پانی کی طرح آنسو بہنے لگے"

براؤن عالم تحیر میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "یہ ہنس کس پر رہی تھی؟" "دو۔ پیدائشی احمقوں پر" کڈنے جواب دیا۔

تمثیل

کیتھرین پار

مصنفۂ مورس ہیرنگ — مترجمۂ مستلم

افراد تمثیل

شاہ ہنری ہشتم — ملکہ کیتھرین پار — پیج

منظر۔ لندن۔ شاہی محل میں ناشتے کا کمرا۔ شاہ ہنری ہشتم اور ملکہ کیتھرین پار، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک میز ہے جس پر ناشتے کا سامان رکھا ہے۔ بادشاہ ایک اُبلا ہوا انڈا توڑ رہا ہے۔)

ہنری :۔ یہ انڈا کچا ہے، بہت خراب ہے۔

کیتھرین :۔ کل تم شکایت کرتے تھے کہ انڈا بہت سخت ہے۔

ہنری :۔ کل کے انڈے یقیناً سخت تھے۔ میں سخت انڈے پسند کرتا ہوں نہ نرم۔ انڈوں کو اندازے سے اُبالنا چاہیے۔

کیتھرین :۔ تمہیں خوش کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ انڈا کھولتے ہوئے پانی میں ساڑھے تین منٹ تک رکھا گیا تھا۔ میں نے خود اسے اُبالا ہے۔ اگر تمہیں پسند نہ ہو تو یہ انڈا مجھے دیدو میں ایسا ہی انڈا پسند کرتی ہوں۔ تمہارے لیے دوسرا انڈا اُبال دوں گی۔

ہنری :۔ نہیں۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ پیج پوچھو تو تمہیں انڈا ابالنا ہی نہیں آتا۔ کاش یہ کام تم خادموں کے سپرد کر دیتیں کہ باورچی خانے میں انڈے اُبالا کریں۔

کیتھرین :۔ باورچی خانے میں انڈے ابالے جاتے ہیں تو جہاں تک انڈے لانے میں دیر ہوتی ہے اور اگر تم تیل از وقت بیچ گئے تو شکایت کرنے لگتے ہو کہ انڈے ٹھنڈے ہیں۔ اگر انڈے پہلے سے لاکر رکھ دیے جاتے ہیں تو تم اعتراض کرتے ہو کہ انڈے ٹھنڈے ہو گئے۔

ہنری :۔ میں کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کرتا۔ باورچن کو انڈے اُبالنے میں کمال حاصل ہے۔

کیتھرین :۔ کل سے باورچن ہی انڈے ابالے گی۔

ہنری :۔ تمہاری جیسی تجربہ کار عورت کو کم سے کم انڈے ابالنا تو جاننا چاہیے۔ مجھے کچے انڈوں سے نفرت ہے۔ (خفگی ہو کر) خوب کیتلی انڈے ابالنے میں مشاق تھی۔

کیتھرین :- کون کیتھرین ؟ کیتھرین ہوورارڈ یا کیتھرین اراگن ؟

ہنری :- میں اپنی محبوب کیٹی ہوورارڈ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کیتھرین اراگن میری بیاہی نہ تھی۔ اس سے جو شادی ہوئی وہ ناجائز تھی۔

کیتھرین :- کیتھرین ہوورارڈ کو انڈے ابالنے میں مشاق ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس کی ماں باورچن تھی۔

ہنری :- بالکل غلط ! اس کی ماں رہ گفورڈ خاندان سے تھی۔

کیتھرین :- غالباً تمہاری مراد اپنی بُوا سے ہے۔

ہنری :- ہاں ہاں، کیٹی کی ماں یقیناً سومرسٹ کے خاندان سے تھی۔

کیتھرین :- غالباً تمہیں جین سیمور یاد آ رہی ہے۔

ہنری :- ہرگز نہیں۔ جین سیمور، سومرسٹ کی بہن تھی۔

کیتھرین :- میں تو یہی جانتی ہوں کہ کیتھرین ہوورارڈ کی ماں باورچن تھی، تمہیں اس کا نام میرے سامنے نہ لینا چاہیے۔ شاید تمہاری منشا یہ ہے کہ وہ زندہ ہوتی اور تم اس سے میرے مقابلے میں زیادہ محبت کرتے۔

ہنری :- میں نے تو یہ نہیں کہا۔ بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ اُسے انڈے ابالنے میں کمال حاصل تھا۔

کیتھرین :- تمہاری بات کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ خوبیاں اس میں تھیں وہ مجھ میں موجود نہیں۔

ہنری :- تم خواہ مخواہ یہ مطلب نکالتی ہو۔ میرے وہم میں بھی یہ خیال نہ تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے کچے انڈے پسند نہیں اور آج صبح کا انڈا کچا ہے۔

کیتھرین :- (اٹھتی ہے اور غصے میں دروازے کی طرف بڑھتی ہے) تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے علاحدہ کر دو۔ اور کسی دوسری عورت سے شادی کر لو، جو انڈے اُبالنا جانتی ہو۔

ہنری :- کیتھرین ! ادھر آؤ۔ میں تمہیں رنج کرنا نہیں چاہتا۔ تم تو انڈے ابالنے میں ماہر ہو۔

کیتھرین :- اس قدر جاں فشانی کا یہی نتیجہ ہے؟ اب میں تمہارے لیے کبھی انڈے نہ ابالوں گی۔

ہنری :- اس وقت گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے ایک گیت بنایا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے گاؤ۔ یہ گیت پیلے اور بانسری کے ساتھ گانے کے لیے ہے۔

کیتھرین :- مجھے گانے کی صلت نہیں۔ اس گیت کا نام کیا ہے؟

ہنری :- اس کا نام ہے "محبت کی فتح" اور یہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

سفو سکندر اعظم کے کارنامے تم
وہ بابل آیا تھا چڑھ کر سفید گھوڑے پر
بیان اس کی شجاعت کا سن کے قفل رحم
نظر اس کی زمانے میں مل نہیں سکتی

کیتھرین :- "سکتی" کا قافیہ "پر" نہیں ہو سکتا۔

ہنری :- میرا خیال یہ نہیں کہ "پر" اور "سکتی" ہم قافیہ ہوں۔ صرف گیت میں زور ڈالنے کے لیے میں نے ایسا کیا۔

کیتھرین :- سکندر سے مراد سکندر اعظم ہے؟

ہنری :- بے شک!

کیتھرین :- مگر اس کا گھوڑا تو سیاہ تھا۔

ہنری :- نہیں۔ تم غلطی پر ہو۔ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

کیتھرین :- سیاہ! کوئلے کی طرح سیاہ!

ہنری :- مگر میں تحقیق کر چکا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

کیتھرین :- سکندر کا گھوڑا سیاہ تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا گھوڑا سیاہ تھا۔

ہنری :- اس کا گھوڑا سفید تھا۔ جس سے بھی چاہے پوچھ لو۔

کیتھرین :- اس کے گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔ وہ سیاہ گھوڑے ہی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کی سیکڑوں تصویریں ہیں جن میں وہ اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ میرے والد ماجد کے پاس بھی ایک تصویر ہے۔

ہنری :- مصور نے غلطی کی ہوگی۔ پلوٹارک زینوفون ارسطو، غرض سبھوں نے اس کے سفید گھوڑے کا ذکر کیا ہے۔

کیتھرین :- سیاہ!

ہنری :- تم کس قدر ضدی ہو! میں جانتا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید ——

کیتھرین :- سیاہ! کوئلے کی طرح سیاہ!

ہنری :- تم نے زینوفون کی کتاب پڑھی ہے؟

کیتھرین :- نہیں کوئی دوسری بات یاد آ رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن کے زمانے میں میرے والد مجھے وہ تصویر دکھایا کرتے تھے جس میں سکندر اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہے۔

ہنری :- میں بہت آسانی سے اپنا دعویٰ ثابت کر سکتا ہوں۔ پلوٹارک کی کتاب یہیں پر موجود ہے۔

[کتابوں کی الماری میں سے ایک کتاب نکالتا ہے]

کیتھرین :- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے چچا کا ایک سیاہ گھوڑا تھا جس کا نام بوسیفالس سکندر کے سیاہ گھوڑے کی یاد میں بوسیفالس رکھا گیا تھا۔

ہنری :- [کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر] اگر وہ گھوڑا سیاہ ہوتا تو اس کا نام بوسیفالس ہرگز نہ ہوتا۔ سیاہ گھوڑے کو بوسیفالس کہنا لغو ہے۔

کیتھرین:۔ اتنا تو نہیں جتنا سفید گھوڑے کو بوسیفالس کہنا۔

ہنری :۔ اس نے سیاہ گھوڑے کا انتخاب ہرگز نہ کیا ہوگا، وہ تو وہم پرست تھا۔

کیتھرین:۔ تم خود وہم پرست ہو، دیوتاؤں کے وجود کے قائل ہو اور مورتیوں کی پوجا کرتے ہو۔ اس لیے ہر شخص کو اپنی طرح سمجھتے ہو۔ حقیقت میں سکندر وہم پرست نہ تھا اور اسی لیے اس نے قصداً سیاہ گھوڑا انتخاب کیا تھا۔

ہنری :۔ وہ عبارت گی۔ سنو۔ "زالیوس آئنائے کائی گل میڈے دسز بکفاس" ۔ "وہ گھوڑا نہایت وحشی تھا اور اس کو سدھانا نہایت مشکل ۔۔۔ سچ پوچھو تو اس میں تھیسالیا کے سفید گھوڑوں کی کل خصوصیات موجود تھیں۔

کیتھرین:۔ لیکن اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گھوڑے کا رنگ سفید تھا، تھیسالیا کے گھوڑے تو اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔

ہنری :۔ تم بڑی ضدی ہو۔ میں زینوفون کی کتابوں سے ثبوت تلاش کروں گا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ سفید رنگ کا گھوڑا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کسی نے کبھی اس بیان کی تردید نہیں کی۔

کیتھرین:۔ مگر پلوٹارک کا قول ہے کہ اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔

ہنری :۔ اس کے متعلق پلوٹارک نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس موضوع پر ورڈسی سے بھی گفتگو کی تھی جو صاحب علم تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس نے ایک دن کہا تھا "بوسیفالس جیسا سفید" یہ محاورہ فصحا کی زبان پر رائج ہے۔

کیتھرین:۔ اس نے کہا ہوگا "بوسیفالس جیسا سیاہ"

ہنری :۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

کیتھرین:۔ میں نہیں جھوٹا نہیں بناتی، مگر صرف اتنا کہتی ہوں کہ تمہارا خیال غلط ہے۔

ہنری :۔ مگر میں کہتا ہوں کہ غلطی کرنا ممکن ہی نہیں میں اس حقیقت سے اسی طرح واقف ہوں جس طرح مجھے اپنے نام کا علم ہے۔

کیتھرین:۔ تمہارا حافظہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ ابھی تم نے کیتھرین ہوارڈ کی ماں کا نام بتانے میں غلطی کی تھی۔

ہنری :۔ اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟ نام تو مجھے یاد تھا۔ مگر بروقت زبان پر نہ آیا مگر گھوڑے والی بات تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے میں تمام عمود واقف رہا ہوں۔

کیتھرین :- میں جانتی ہوں کہ تمہارا حافظہ کیوں کام نہیں کرتا۔ تمہیں بہت سے نام یاد رکھنے پڑتے ہیں۔ غالباً تم نے غلطی سے شہنشاہ الفرڈ کے سفید گھوڑے کو سکندر سے منسوب کر دیا، حالانکہ سکندر کا سیاہ گھوڑا بہت مشہور ہے۔

ہنری :- خدا کی پناہ! اگر تم میں تعلیم کی بو بھی ہوتی تو تم ایسی بات نہ کرتیں! یہ تعلیم اور مذہب سے بے بہرہ ہونے اور لاطینی زبان نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔ (تمہاری تعلیم حاصل کرنے سے جاہل۔ رہنا بہتر ہے۔ اپنی آف گلیوں جیسی عورت بھی لاطینی جانتی تھی۔

کیتھرین :- خدا کا شکر ہے کہ میں لاطینی نہیں جانتی! (ہیلی زبان، جو صرف وہم پرستوں اور متعصب مذہبی پیشواؤں کے لیے موزوں ہے!

ہنری :- غالباً تم مجھے متعصب سمجھتی ہو۔

کیتھرین :- کسی بات سے اپنی سمجھ کے مطابق مطلب نکالنا تمہارے اختیار میں ہے — میں نے آصف یہ کہا تھا کہ اس گھوڑے کا رنگ سیاہ ہے۔

ہنری :- میں متعصب بننا پسند کروں گا اگر (تمہاری عقیدے کا دہریہ ہونے سے۔

کیتھرین :- تم غلط بحث کر رہے ہو اور اصل موضوع سے گریز کرنا چاہتے ہو۔ یہ ٹیوڈر خاندان کی خصوصیت ہے۔ اس خاندان کا کوئی فرد کبھی معقول دلائل سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہنری :- تمہیں میرے خاندان کا مضحکہ کرنے کا حق نہیں۔

کیتھرین :- تم نے بھی تو میرے خاندان کی توہین کی، جو تمہارے خاندان سے زیادہ قدیم ہے۔ میرے خاندان کا کوئی فرد خونی نہیں تھا۔

ہنری :- اب میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا (اُٹھتا ہے اور دروازہ کھول کر پکارتا ہے) ڈینی، ہٹس، پیج، — کوئی ہے؟ (ایک پیج داخل ہوتا ہے)

پیج :- شہنشاہ معظم!

ہنری :- جاؤ، اور ڈوچیسز سے کہہ دو کہ سالی ملکہ کو ڈوور میں بیٹھانے کا انتظام کرے۔

پیج :- (متحیر ہو کر) بہت بہتر عالی جاہ! کیا حضور والا کا اشارہ گذشتہ ملکہ کی خاک کی طرف ہے؟

ہنری :- بے وقوف لڑکا! میں نے تو سالی ملکہ کہا تھا — ملکہ کیتھرین پارر۔

بیچ :- حضور عالی کا ارشاد بجا ہے۔

ہنری :- اور لارڈ چیمبرلین سے یہ بھی کہنا کہ ٹوور کے گورنر کو سابق ملکہ کو پھانسی دینے کا سامان کرنے کی ہدایت کر دے۔

بیچ :- کیا کل، سہم اسی طرح ادا کیے جائیں گے، جس طرح ملکہ کیتھرین ہووارڈ کی پھانسی کے موقع پر ادا کیے گئے تھے؟

ہنری :- ہاں، — لیکن نقارہ صرف ایک ہی دفعہ بجایا جائے۔ (بیچ دروازے کی طرف بڑھتا ہے) اور ڈاکٹر بٹس سے پوچھنا کہ سکندر اعظم کے گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا یا سفید۔

کیتھرین :- سیاہ! (بیچ چلا جاتا ہے) اب مجھے پھانسی دی جانی والی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ تم مجھے اجازت دو گے کہ اپنا اسباب درست کر لوں۔ تم نے کل اپنی باندی کو کوٹھری میں چھوڑ دی تھی — میں اسے لانے جاتی ہوں۔

ہنری :- ابھی ٹھہرو۔ جلدی کیا ہے؟

کیتھرین :- معاف کرنا! وقت بہت کم ہے، اور مجھے بہت سے خطوط لکھنے ہیں۔

ہنری :- (ہچکچا کر) میں گانا سننا چاہتا تھا۔

کیتھرین :- اب نہیں میری شرکت کی امید تو نہ ہوگی؟ کسی اور کو تلاش کر لو تو بہتر ہو۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے بہت سی باتیں سوچنی ہیں۔

ہنری :- (مصنوعی ہنسی ہنس کر) میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔ کہیں تم نے سچ تو نہ سمجھ لیا؟

کیتھرین :- میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتی۔

ہنری :- اچھا، اب ان باتوں سے درگزر کرو اور موسیقی سے دل بہلاؤ۔ میں اپنا گانا سننا چاہتا ہوں۔

(بیچ داخل ہوتا ہے)

بیچ :- عالی جاہ! مجھے لارڈ چیمبرلین کا پتا نہ ملا۔ ڈاکٹر بٹس کہتے ہیں کہ گھوڑے کے رنگ کے متعلق حضور والا کا خیال صحیح ہے۔

ہنری :- (خوش ہو کر) بہت خوب! تم جا سکتے ہو۔ لارڈ چیمبرلین کو میرا پیغام پہنچانے کی ضرورت نہیں (بیچ تعظیم بجا لاتا ہے اور چلا جاتا ہے) چلو، اب ہم موسیقی سے لطف اٹھائیں۔ تم نے دیکھا؟ مجھے یقین تھا کہ میرا خیال صحیح ہے۔

(ہنری دروازہ کھولتا ہے)

کیتھرین :- پھر بھی اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔

ہنری :- (زمی سے آگے بڑھ کر) یہ کیا بول رہا ہو) ہاں جی ہاں۔ بے شک اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا مگر اب ہمیں موسیقی سننا چاہیے۔ (دو مطربے جاتے ہیں) پردہ

نظم

انقلاب روزگار

از پریم پجاری بی اے

چاندنی، دریا، خموشی، تیری کشتی، اور تو
مجھ کو بھی ہمراہ چلنے کا اشارہ ہوگیا

بیٹھ کر چپو سنبھالا میں نے، کشتی چل پڑی
رفتہ رفتہ دُور جب ہم سے کنارہ ہوگیا

تونے چھیڑا ساز اور نغموں سے گونج اٹھی فضا
دل میں جوشِ آرزو ہنگامہ آرا ہوگیا

تھی کہاں لیکن مجھے عرضِ تمنا کی مجال
جانے کیونکر حالِ دل کا آشکارا ہوگیا

بیخودی میں یک بیک آنکھیں ملیں اور جھک گئیں
پھر اُٹھیں اور پھر وہی عالم دوبارہ ہوگیا

اک ذرا پہلے فقط تیری نظر تھی برق پاش
اب تو دل بجلیوں کا گاہوارہ ہوگیا

رکھ دیا میں نے اِدھر چپو اُدھر تونے رباب
دُور اب دونوں کو خود داری کا یارا ہوگیا

تیرے سینے میں ہوئی محسوس اک جنبش مجھے
میری جرأت کا یہی شاید سہارا ہوگیا

ہاتھ اٹھے اور تیری گردن میں حمائل ہوگئے
تونے سر خم کر دیا، یا خود تقاضا را ہوگیا

جسم میں اک سنسنی سی، روح میں اک اہتزاز
لفظ کیا بتلائیں جو عالم ہمارا ہوگیا

ہاں، وہی میں ہوں، وہی تو ہے، مگر وہ دل نہیں
آہ، یکسر موم ہو کر سنگِ خارا ہوگیا

کیوں نہیں ملتا محبت سے محبت کا جواب
کس لیے قحطِ وفا پروردگارا ہوگیا

آثار ادبیہ

(۱) مثنوی میر حسن در وصف قصر جواہر
(۲) کلام سلیمان در نعت و طالب۔

مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر

در بہاریہ می گوید

پلا مجھ کو ساقی سے لعل فام
سو غنچہ مراہی ہو اور گل ہو جام
چمن گل سے مدت میں معمور ہے
خزاں اس گلستان سے دور ہے
یہاں تک ہے اس فصل میں جوشِ گل
کہ ہے دوشِ گل سے ملا دوشِ گل
بغیر از گل و لالہ و نسترن
درختوں نے دو کا نہیں واں چمن
نہیں واں درختوں کے ہر سو پہاڑ
وہ جنگل نہیں کہ جو ہو جس میں جھاڑ
خس و خار ہوویں نہ واں جاگیر
کہ تنکا ہے اس آئینے پر لکیر
مرقع کہوں اس کو تصویر کا
کہ تختہ کہوں اس کو کشمیر کا
سہانی، روجا اور جوشش بہار
لبکتا وہ سبزے کا ہے دوازدہ
نہ ہو سبز کیونکر یہ نگینِ فلک
کہ ہے ڈانک سبزے کی اس کی چمک
گرداں کی ہے چشم بلبل زمیں
کریں گل نہیں گوشۂ گل زمیں
صفائی خیاباں کی آئینہ دار
کہ دونی روش پر ہے گل کی بہار
ہر اک شاخ دیبل اس خیاباں کی
نظر میں ہے جدول گلستاں کی
نہیں یہ بھی تشبیہ سے درکنار
یہ ہے خط گزار دستِ نگار
کہیں ایسی داد رس کھلتی نہیں
یہ خوبی ستارے کی ملتی نہیں
یہ صد برگ کا رنگ دیکھا یہاں
جسے دیکھ کر زرد ہو زعفراں
ہر اک فصل میں ہو ہر اک گل کی دھوم
ہمار اپنی اپنی پہ اتنا ہجوم
چنا نچہ کہ شبو ہے اب رو بکار
ہے گویا سواد و بیاض بہار
شمیم اس کی نورِ دلِ مشکناب
طرح اس کی شاخِ گلِ آفتاب
مہکتا ہے خوشبو سے اس طرح باغ
کہ جوں زلف سے ہو معنبر دماغ
چمن ہے لگن اس لگن کی ہے شمع
نہیں شاخ شبو چمن کی ہے شمع
جدھر ہو کے جاوے واں سے صبا
اُدھر سے صدا ہو کہ صلِ علیٰ
کہیں اس مکاں کا ہے فرخندہ نام
یہ خوش بوئی اس کی ہو یا رو تمام
ہر اک شب ہے اس بوسے عنبر سرشت
ہر اک روز اس رو سے روزِ بہشت
ہے رنگیں حنائے کفِ پائے یار
اسی کے قدم سے ہے ساری بہار
یہ شبویہ داؤدی و یاسمن
یہ اجلا مکاں اور سنبہرا چمن

ساقی نامہ در سیر مہتاب

پلا ساقیا ایک جامِ ہلال
برائے شبِ ماہ چھت اس پہ ڈال
نظر میں مجھے سیرِ مہتاب ہے
کہ ہم حوض و ہم عالمِ آب ہے
بلند کی عمارت کی کوٹھی کی شان
کہوں کیا میں خوبی کہ اس کی بیاں
تہ اوپر جو کچھ جلوہ گاہ ہے
نہ پوچھ کہ اللہ اللہ ہے
لب بام سے تا زمیں لے عزیز
عجب چشمۂ نور ہے موج خیز
کہے تو کہ فرہاد روشن ضمیر

لے آیا وہاں کوہ سے جوے شیر
فلک سے پڑے عکس خورشید جوں

شب ماہ واں کی دل افروز ہے
اسے اختلال ہو لسے فراغ

دو نام خدا شب نہیں روز ہے
کہ ہے دامن دل میں اس کا چراغ

بھلا چاندنی کا ہو واں کیوں نہ جوش
لباس شب اس کا ہوا پر تو ا

کہ ہے ماہ اس در کا حلقہ بگوش
ہوا دو سرا اس کا زلف ہوا

پڑے چاندنی پر جدھر کو نگاہ
مرا دل ہے پروانہ اس شمع پر

نہ دے کثرت نور آگے کو راہ
کہ ہر دل کو ہو اس کی ہے سر بسر

نظر میں زلیس ہے مرے وہ جمال
نظر میں زلیس ہے مرے وہ جمال

ہے فانوس کا دل کو واں کی خیال
ہے فانوس کا دل کو واں کی خیال

دل و چشم ہے اس سے لبریز نور
دل و چشم ہے اس سے لبریز نور

کہ ہے وہ جگر گوشۂ کوہ طور
کہ ہے وہ جگر گوشۂ کوہ طور

در صفت سقف

زلیس سقف ہے آئینے کی وہاں
عجب عکس سے شمع کے ہے سماں

دوبالا ہوا حسن شمع و چراغ
گیا عرش پر روشنی کا دماغ

کہوں چھت میں کیا روشنی کی چمک
لیا ہے اٹھا اس نے سر پر فلک

ادھر جلوۂ شمع اس طرف ماہ
کرے کام کس کس طرف کو نگاہ

کہاں اس طرح کی بھلا سیر ہے
تکلف ہے آگے بس اب خیر ہے

خوشا وہ کہ جس جا ہو اس کا ورود
محمدؐ پہ بھیجا کرے وہ درود

جو کچھ سیر کا حق ہے سو یاں ہے بس
اب آگے ہوا باغ کی ہے ہوس

نہ ہو کیوں کہ یہ باغ جنت سرشت
کرایسے کی خاطر ہی وہ ہے بہشت

مدح ممدوح

کیں اس مکاں کا ہے فکر اساس
جواہر علی خاں جواہر شناس

وہ ہے سالک راہ دین نبی
کریں چاہیے اس کی سب پیروی

یہ عدل و سخاوت یہ جود و کرم
یہ عزم و شجاعت یہ تیغ و قلم

یہ شان و صلابت یہ حلم و حیا
یہ خلق و مروت یہ ذہن و ذکا

یہ قائم مزاجی یہ عزم و وقار
یہ ایمان داری یہ طرز شعار

یہ حسن سلوک و یہ علم و عمل
یہ طبع سلیم و یہ دل مستقل

نہ ہو گا کسی میں نہ ہے اب کہیں
یہ سب خوبیاں ختم ہیں بس یہیں

در تعریف بیانا مسی و بیکدو

سبک رو کا اس کی ادا کیا بیاں
روانی میں مانند طبع رواں

بعد گا نہ ہے اس پہ کا ربطلا
سنہری سا بادل ہے وہ صبح کا

نہ سیاہ ہے وہ اور نہ ہے پالکی
وہ اک چیز ہے تخت کی نالکی

کہاں تک کروں اس کی خوبی کی بات

ہر اک چوب اُس کی ہے آبِ حیات
یہ اقبال و حشمت یہ جاہ و جلال
رہے تا ترقی میں مثلِ ہلال

فی المدح

اگرچہ ثنا غیر آلِ نبی
کسی کی بھی کہنی نہیں کچھ بھلی
نہ ایسے کی کیوں مدح کرے بھلا
کہ ہے دو جہاں میں جس کا صلہ
سخن کا نتیجہ ہے، مدحِ امام
دیا اس سوا جو ہو اس کا غلام
کہ صاحب کی ہوتی ہے اس میں خوشی
جو بندے کی اس کے کہے کچھ بھلی
نہیں بے جگر مجھ کو جوش و خروش
دو ہے اس گھرانے کا حلقہ بگوش
موالی جو ہیں اس کے صحبت نشیں
سبھی شیخ ہیں اور سبھی مومنیں
رہیں شاد و خرم صغیر و کبیر
ستارے ہیں یہ گرد ماہِ منیر
یہ ہیں دو ستدار علی ولی
نگہبان رہیں ان کے احمد علی
جگہ ہاں بھی ان کو ہے جنت سرشت
ملے گا وہاں بھی مکانِ بہشت
رہے جب تلک آباد قصرِ جہاں
سلامت رہے یہ مکیں و مکاں
سدا شاد اس کے رہیں خیر خواہ
رہیں دشمن اس کے ذلیل و تباہ

یہ تحریر جو کی ہے ظاہر ہے یہ
مسمّٰی بہ قصرِ جواہر ہے یہ

تہنیت قصرِ جواہر

سُنا تو نے اے شاہِ سلیم بر
مبارک تجھے ہو یہ قصرِ جواہر
مبارک سے تجھے شاد و کامگار
شمالی کا واں اک بنا ہے جواب
کہ ہے سب مکانوں میں وہ انتخاب
ہوئے جب سے دشمن کے رخ اس کے زرد
مٹا اس طرف کی بدی کا اثر
جہاں کے ہوا سر پر احسان یہ
بنا نیک ساعت سے والا بنا یہ
عجب چور خانہ بنا ہے مکاں
عنایت سے خلعت کے دے ہے نشاں
کسی سرزمیں سے نہیں بے خبر
کہ رکھتا ہے چاروں طرف وہ نظر
دلوں کو ہے واں عیش و عشرت سے میل
کہ اس جا ہے چار عالم کا محفل
مرتب نشیمن ہے یہ عبقریت ہے وہ
ہر اک سمت سے بس کہ خوش رو ہے وہ
بجا شاہ چار ابرو ہے وہ
کشادہ دل و عالی ہمت ہے وہ
صفائی کا اس کی گروں کیا بیاں
کہ دیوار اس کی ہے آئینہ ساں
نظر جس کی ہو ان ستونوں میں بند
رہے راست بازوں میں وہ سربلند
بلندی زبس اس کی محراب ہے
وہ در لعلِ تور کا باب ہے
عجب شان سے اس کی ہر سائباں
فلک دب گیا دیکھ کر جس کی شاں
ہوا کا نہ پوچھو وہاں کی بیاں
ہوا دار گیوں کر نہ ہو سائباں
نسیم سحر رات دن یار ہے
ہوا بھی وہاں کی ہوا دار ہے

در تعریف درخت کرک

عجب کرکھوں کے ہیں واں دو درخت
کہ دونوں ہیں ہمسایۂ نیک بخت
ادھر ایک کونے پہ اور اک ادھر
مقابل ترینے سے ہیں یک دگر
مشابہ جو ہیں چیڑ سے وہ درخت
زمیں واں کی ہے بادشاہی کا تخت
اگر دیکھیے اس کی خوبی کو آئے
تو شمشاد بھی رشک سے زہر کھائے
رہے ہفت اقلیم میں ان کا ثانی
کہ عالم کہے بیٹھتا ان کی چھانو
زبس اہلِ ایماں کا وہ ہے مکاں
کھڑے ہیں وہ دو دو سبز داری جواں
نوسایۂ نور کی وہ بہشت
شب و روز ہوتی ہیں ان پر نثار
جسے اس کے سائے کی ہوئے ہوا
لگے اس کو اندھیر خلل سا
ہوا سایۂ ناک مرگ ہر جہاں
پر ایسی ہے موزونی اس میں کہاں

کہ آ کر گرم اس کا پوچھے ہے پانو
دو نام خدا اس کی گہری ہے چھانو
اگر ذرہ چاہے کہ واں دھوپ لے
جیا پو کہ اک واں کے پوتوں میں دے
فلک سے سوا اس کا ہے مرتبہ
زبس ہے وہ جا سے ترا بجا ب
ہے وہ شہ نشیں مطلع آفتاب
دقیقے کئی جب کرے ٹے نگاہ
تو اس شہ نشیں تک ملے اس کو راہ
فلک، تجربو رکھے واں قدم
کہ واں کی زمیں ہے فلک سے بہم
مجھے لے گئی میری قسمت وہاں
وگرنہ یہ معراج ملتا کہاں
زمیں دیکھ واں کی گیا لوٹ دل
کہ اس سے صفا تھی گہر کی مجھل
کھنچے صندلی خط وہ دیکھے کہ بس
رہی پھر نہ خوشبو کی مجھ کو ہوس
رہے اس کے سائے تلے جو بشر
نہ ہوئے کبھی اس کے تئیں دردِ سر

درمدح فوج گویہ

خبردار ہو سا تیا اور شتاب
شجاعت کے خم سے مجھے شراب
مفصل تو ہوئے گا مجھ سے کہاں
کروں جھلا فوج کا کچھ بیاں
ہوا سے جو در اک طرف کھل گیا
مرا جھٹ سے دل اس طرف کو چل گیا
زبس تھا مشرف جلو خانے پر
جلو خانہ تھا اس طرف جلوہ گر
نظر واں کی آئی یہ شان و شکوہ
جہاں کاہ سے ہو برابر نہ کوہ
زبس سنتری تھا انوں کا لباس
ہوئی چشم کو روشنی بے قیاس
ہے آتش کا دریا کہے تو یہ فوج
کہ جوں موج سے شعلہ مائے ہے اوج
تفنگوں کی پیٹی میں یوں تھی جھمک
سیہ ابر میں برق کی جوں چمک
رہے جب تلک چرخ نیلی کبود
اس آتش سے جل جل مریں سب حسود

تعریف توپ بندوق

وہ توپ اژدہا اور جمع تفنگ
بگڑنے کو دشمن کے کام نہنگ
برآئے نہ ان سے عدو کے پلشت
ازل سے خط ان کی ہے سرنوشت
رہے کیوں نہ واں کی سپہ سربلند
جہاں ایسا کپتان ہو عقل مند
جو کچھ اب وہاں ہے سپاہ نجیب
یہ اشجع کسی کو ہوئے کم نصیب
انھوں کا سلامت ہے قدر داں
جواہر علی خان والا مکاں
گر آخوں صاحب کی نکھوں ثنا
قلم کی زباں پر ہو جاری دعا
کسی امر میں کچھ نہ آئے خلل
جہاں ایسا ہو عالم باحمل
رہے کشت سے باوران کا نام
کہ سرسبز ان سے ہے عالم تمام
مے عیش سے جام دے ساقیا
کہ پھر اس مکاں کی ہے مجھ کو ہوا
درقبلہ رو اس کا ہوئے جو باز
پڑھے اس طرف ایک عالم نماز
کھلے پر ہیں پٹ اس کے رنگیں کتاب
منڈے پر ہیں دو مصرعے انتخاب
نہ دیکھا کوئی اس سے خوشتر مکاں
جو منظر واں ہے آب رواں

در صفت آبشار

خزانے سے مل چادر آبشار
کرے ہے دو دیپے کے پتر نثار
اسے بھی زبس سرخوشی ہے گماں
دو پانی بھی چلتا ہے مستی کی چال
نہ پوچھ اس کا عالم عجب آب ہے
کہے تو کہ سیماب بیتاب ہے
زبس شوق تسخیر دل تھا کمال
پا سنگ نے پشت ماہی کا جال
نہ ہو نور کا کیونکہ واں از دحام
کیا دام میں اس نے ماہ تمام
چمک یوں ہے پانی کی جنا ب میں

چراغوں کا جوں عکس ہو آب میں
عجب جگمگاہٹ سے ہے جلوہ گر
کمر کی لچک دیکھے جو کوئی دور سے
نظر اس کی لبریز ہو نور سے
کہیں بیٹھنے والے اس پاس کے
کہ جگنو ہے تختے پر الماس کے
دیا کرتا ہی کے اوپر آب
کسی نے یہ سی شے ہے لہر گنگھرو
شب مریں عالم کہوں اس کا کیا
نہایت بھلی لگتی ہے وہ صدا
کبھی کھرج سے اور کبھی دون سے
کہ اڑا نچے جیسے قانون سے
زمرد کے شیشے سے بھر کر شراب
پلاساقیا آ کے مجھ کو گلاب
ادھر سے بھری جو نظر تک ادھر
گیا میں سر رشتہ کی سمت پر
دو دل سے درختوں کا تھا رنگ یوں
کہ دیکھے مرتع کو شیشے سے جوں
تلے اس کے دیکھا تو رستہ ہے ایک
کہ چلتا ہوا شہر بستا ہے ایک
اپہنچے کا دیکھا ادھر پائیں باغ
کہ لعل و زمرد ہوا جس سے داغ
یہ ایجاد دیکھا ہے کس نے حسن
روش سرخ اور سبزے کی یہ پھبن

نہ گل اس میں ہے اور نہ ہے واں شجر
ولیکن نظر اس سے بھی بار در
فقط سرخی اک خشت کی ہے وہاں
چمن کے بچھا دی ہے جو درمیاں
کیا ہی ہے تحریر اس کی تمام
تکلف نہیں اس میں کچھ والسلام
غرض اس پہ سادہ یہ پرکار ہے
کہ رنگ گل و لالہ انبار ہے
یہ سبزی کہ جد دل ہو دیوان کی
یہ سرخی کہ سرخی گلستان کی
کروں کس روش وصف کا میں بیاں
ہے ترشحہ جس سے خط گل رخاں
یہ سرخی یہ سبزی چمن کی نہیں
بدخشاں کی سرسبز ہے سرزمیں
کسی نے یہ کاہے کو دیکھی ہمار
زمرد کے تختے پہ یا توت زار
نظارے سے اس کے پڑی جس کی خو
تو سوئے نہ گل کی طرف کرکے رو
اگر اس کو دیکھے کوئی غور کر
عجب کیا کہ ہو جائے طوطی نظر
دیا ہے یہ صنعت سے کس نے بٹھا
زمرد کے گھر پر نگیں لعل کا
نہیں باغ اور باغ کی ہے بہار
عجب ہے طلسم جو اہر نگار
مجھے اس کے دیکھے کسے آیا یقیں
کہ ہے فی الحقیقت یہ گل زمیں

دلوں کو ہے اس کے نظر فرح
کہ ہے راستی میں یہ توس قزح
کبھی سے دو ہتی بر سر آسماں
ہوئی راست توس قزح اک یہاں
شفق کا ہوا دیکھ کر رنگ فق
کہ ہوتی ہے ایسی زمیں کی شفق
نہیں سبز سرخی پہ تحریر کی
یہ ہے خط یا قوت کی دیکھی
بھری ہے یہ جام زمرد میں مے
گویا شعلۂ سبز آتش میں ہے
کسی نے سلیقے سے اپنے دیا
ہے یہ میں قرینوں سے مخمل بچھا
پڑے اس جگہ جس کسی کا قدم
ہو رنگ حنا سرخ و سبزہ دم
کسی کی یہ سرخی نہیں رسیاں
چمن میں بھرا ہے یہ خون خزاں
ہے کثرت عیش کا واں ہوش
بچھائے ہیں میدان میں زین پوش
پڑے سرخ اور سبز بانات کے
یہ چشمے ہیں گویا کہ برسات کے
کئے تو گلوں کے یہ صد برگ ساز
چمن بانیاں نے کیے ہیں نیاز
خزاں کا کبھی اس پہ وار آئے نہ
کہ ہے واں مرصع کا چار آئینہ

زبس کھب گئی اس کی رنگیں ادا | اگر نہ ہو سبزیاں تیل و قال | نہ آئے زباں پر سخن مبتذل
فلک نے زمیں کو دو شالا دیا | کرے اس جگہ میں زباں اپنی لال | نئی اس کو سوجھے زمین غزل
گل و لالہ ہو دیکھ کر جس کو داغ | ندائی کی ہر رنگ میں ہے نمود | مرے سر پہ اس گھر کا احسان ہے
بجا ہے جو کہیے اسے لعل باغ | محمد کی ہو آل پر نت درود | کہ میرا سخن سبز ہر آن ہے
ہوا ہے غرض یہ عجب اقتراح | کہے شعر شاعر جو یاں آن کر | اگر آئینہ اس کے آگے نہ ہو
ثنا لکھوں اس کی بخط شعاع | دو مضمون رنگین سے بہرہ ور | سخن کیونکہ طوطی کہے پھر کہو

سخن سچ کے آگے پھرے ہے دل | نہیں اور ہوتا ہے جی مضمحل
خدا اس گھرانے کو رکھے مدام | بہ حق محمد علیہ السلام

سلہ ق = قلمی نسخے میں اس نہیں ہے سلہ جو سے کہ بہتر ہوگا سلہ مرواریدیا پرواریدہ؟ سلہ ق میں اپنا سلہ ق میں فرخندہ کی جگہ خندہ سلہ ق میں کی شان نہیں' یہ قیاسی اضافہ ہے' سلہ ق کیونکہ = کیوں نہ سلہ ق کہ = ہے۔
سلہ ق لی جوڑ = ہے جوڑ سلہ ق کے = کی سلہ ق میں وہ متن میں ہے، حاشیے میں اس کے بدلے نت بھی ہے۔
سلہ ق بھی = ہے سلہ ق عزم شجاعت سلہ ق ہی = بھی سلہ یہ مصرع کاتب کی غلطی سے یہاں پر درج ہو گیا ہے یہ اس مصرع کے بعد ہونا چاہیے" بجا شاعر چار ابرو ہے وہ" سلہ ق پھر = بھی سلہ ق میں ایک جگہ کرک' دوسری جگہ کرکھ ہے سلہ ق جزو = حسود سلہ جو سے کہ بہتر معلوم ہوتا ہے سلہ ق سیہ کی = یہ سی سلہ آ کے قیاسی اضافہ سلہ اور سبزے کی یہ بعض قیاسی اضافہ سلہ ق سخن قلمی نسخے کے کاتب نے یہ شوخی بہت غلط لکھی ہے۔ جہاں قیاسی تصحیح نہ ہو سکی' اصل کے مطابق نقل کر دیا گیا ہے، کسی صحیح نسخے سے کوئی صاحب اس کی تصحیح فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔
ایک جگہ' سہرا بجن' آیا ہے۔ ممکن ہے کہ' ستھرا بجن' ہو۔

کلام سلیمان رقت و طالب

(۱)

کیا ہاتھ لگا مصر کے بازار سے اُن کے
پوچھے کوئی یوسف کو خریدار سے اُن کے

حاصل نہ ہوا کچھ کبھی اقرار سے اُن کے
محروم رہے آج بھی دیدار سے ان کے

اُترے ہوئے ہیں چرخ پہ خورشید و مہ نو
انجاز رخ و ابرو و خم دار سے ان کے

کافر ہی کیا عشق بتاں نے ہمیں آخر
تار رگ جاں گھٹ گیا زنار سے ان کے

ہر رات پڑا ہے مجھے کالے کو کھلانا
کیا عشق ہوا طرۂ طرار سے ان کے

خورشید قیامت نے کہاں تاب یہ پائی
ہمچشمی کرے روزن دیدار سے ان کے

ہے سرخی پان کا لب معشوق میں دھوکا
ٹپکے ہے یہ خون تیر کے سوفار سے ان کے

گل کھائے تھے بلبل نے جو چھوٹا دہن گل
بوے ستم آتی ہے چلی ہار سے ان کے

کرتے ہیں اب انساں بھی سلیماں سے کنارہ
یا فخر تھا پریوں کو کبھی پیار سے ان کے

(۲)

اس قدر بیتاب مت ہو تیغ قاتل دیکھ کر
جایئو مقتل میں نوبت اپنی لے دل دیکھ کر

ہاں دل حیراں کے درد و غم ہوے آئینہ دار
آئینے لے سادہ رو تیرے مقابل دیکھ کر

کہتے ہو گھر کو نہیں جانے کا ہیں اس کے لیے
زور ہی للچاے کچھ تم مفت کا دل دیکھ کر

چاہیے گھر میں دلا اس در کے تب تو جایئو
سوچ ساعات اور کواکب منازل دیکھ کر

کی نظر مجھ پر تو اس نے ترس کھا کر رو دیا
منکڑی اور طوق پاؤں میں سلاسل دیکھ کر

عشق نے وحشت کے کتب کا خلیفہ کر دیا
قیس اور فرہاد میں سے مجھ کو قابل دیکھ کر

کر دیا اس نے مقید جب بقید پیچ و تاب
کاکل پیچاں کا اپنے مجھ کو مائل دیکھ کر

ہم نے بھی جاگیر وحشت ہرزہ گردی لے لیا
عشق کی تقصیر ہی وحشت کا حاصل دیکھ کر

اک غزل کی اور فرمایش ہے رقت آپ کو
فن علم شعر میں استاد کامل دیکھ کر

اپنے دل کو آہ میں مقتل میں بسمل دیکھ کر
رہ گیا کن سرتوں سے سوے قاتل دیکھ کر

کب بگولا ہے یہ روح قیس کرتی وجد ہے
رونق افزا نجد میں لیلی کا محمل دیکھ کر

گل کو بلبل شمع کو پروانہ تم سے سرد کو
بھول جاتے ہیں تری شکل و شمائل دیکھ کر

شکل جو زیبا ہمائل زخم گردن میں پڑا
تیغ کو قاتل کی گردن میں ہمائل دیکھ کر

آہ کیا کیجے کہ یاں دل بریں تو پا جائے ہے
ابھرے رخسارے ترے بوسے کے قابل دیکھ کر

کھل گیا حوال دل کا صاف ہمشوں میں آہ
قطرہ ہائے اشک میں اب خوں کو شامل دیکھ کر

داغ کھایا ہے تو نے رشک سے اے ماہرو
جلوہ گر رخسارۂ پُر نور پر تل دیکھ کر

رقت آنکھوں پر پڑے پڑے ہزار دل اپنے یاں
اپنے ان کے درمیاں پردے کو حائل دیکھ کر

۳

کبھی آنسو سے کبھی لختِ جگر سے برسے
اپنی آنکھوں سے تو کچھ، لعل و گہر سے برسے

اشک اُمڈا ہے مرا ابر سے کہدے کوئی
آبرو چاہے تو ہٹ کر مرے گھر سے برسے

جی گیا زور گیا آپ کا کیا یار گیا
سینے سے چشم سے اور دیدۂ تر سے برسے

جس قدر ابر تو برسے ہے پہاڑوں میں اگر
اتنا پانی تو مرے دامنِ تر سے برسے

اس قدر ابر میں قطرات کہاں تھے یہ تو
کسی مشتاق کے ہی دیدۂ تر سے برسے

رات بھر نالے کیے ہم نے، تو دن بھر روئے
جس قدر شام سے گرتے تھے سحر سے برسے

اس کے آنے کا ہر اوقت بھلا ابر کو دیکھ
خون دل کیوں نہ مرے دیدۂ تر سے برسے

یہ تو کہتا نہیں میں غصہ یہ نہ برسے لیکن
جب وہ آجائے تو پھر جتنا یہ برسے برسے

اشک گلگوں نہیں یہ لختِ جگر ہیں طالب
آج آنکھوں سے جو کچھ اپنے ٹپرسے برسے

کل شبِ فرقت ہماری کیا ہی خواری ہو گئی
کچھ کٹی زاری سے، کچھ اختر شماری سے کٹی

کچھ وصال اور وصل میں اپنا نہیں ہے اختیار
زندگی اپنی بہت بے اختیاری سے کٹی

آپ نے ہم کو کیا دل سے فراموش اس قدر
اور ہمیں ہر پل تمہاری یادگاری سے کٹی

کچھ نہ پوچھو دوستو فرقت کے بیماروں کا حال
دن کٹا نالے سے اور شب بیقراری سے کٹی

ایک دن دیکھی نہ میں نے وائے حسرت تجھ بغیر
مشقِ نرگس عمر اپنی انتظاری سے کٹی

مر گئے لیکن نہ کی افسوس کچھ یادِ خدا
عمر کٹنے کو کٹی، پر شرمساری سے کٹی

حیف ہے صد حیف ہے افسوس صد افسوس ہے
زندگی طالب تری بے اختیاری سے کٹی

اوراقِ پارینہ

(۱) دیوان ہمایون بادشاہ، از جناب حافظ شمس الدین احمد صاحب ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج (۲) اور یہ لطافت مصنفہ آغا محمد تقی مصنفہ قتیل ازق ع (۳) دیوان واقف ازق ع

(۱) دیوان ہمایون بادشاہ

ہندوستان کی تاریخ میں ہمایون بادشاہ کی شخصیت نہایت دلچسپ ہے، بابر کی عظیم الشان سلطنت کا وارث ہونا، بھائیوں کی پیہم مخالفت اور غداری، پٹھانوں سے مقابلہ اور شکست، ہندوستان کے تخت و تاج سے دست برداری مدتوں دشت و جبل میں آوارہ گردی، شاہ ایران کے یہاں پناہ گزینی، شاہ کی مدد سے قندھار و کابل پر قبضہ، وہاں سے پھر ہندوستان پر تاخت، فتح اور بادشاہی، یہ واقعات ایسے ہیں کہ جس شخص کو بھی پیش آتے اس کے سوانح حیات کو رنگین بنا دیتے۔ لیکن ہمایون ایک رنگین طبع شاعر تھا۔ زمانے کے سرد و گرم چکھنے اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کے باوجود اپنی فطری رنگینی سے کبھی محروم نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے واقعات زندگی اپنے اندر ایک ایسی جاذبیت رکھتے ہیں، جو پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو تمامتر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اس رنگین مزاج بادشاہ کو مطالعہ کتب جنگ و جدل سے اور شعر و شاعری، سیر و سفر سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی، مگر جب جنگ و جدل پر مجبور کیا جاتا تھا تو میدان جنگ میں اپنے شیر دل باپ کا خلف الرشید ثابت ہوتا تھا۔ اور جب مصائب حیات کے طوفان میں گھر جاتا تھا تو اس کا عزم و استقلال ساتھیوں کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کی ناخدائی کرتا تھا اور کنارے لگا دیتا تھا سب سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف بات یہ ہے کہ اُس آوارگی کے عالم میں بھی سوائے چند جاں نثاروں کے دنیا میں اس کو کوئی اپنا ہمدرد و غمخوار نہیں آتا تھا اور ہر طرف خطرات و مصائب اور فقر و فاقہ کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھیں، اس کی طبعی شگفتگی اپنے جوہر دکھایا کرتی تھی اور موقع موقع سے دلچسپ لطیفے اور رنگین اشعار اس کے دماغ سے نکل کر ساتھیوں کی کلفت کو دور کر دیا کرتے تھے۔

ایسے زندہ دل بادشاہ کے کلام کی جس قدر قدر ہونی چاہیے تھی، نہ ہوئی، اور آج بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ شاعر تھا اور اس کا دیوان بھی تھا۔ ہاں وہ حضرات جن کی نظر اس عہد کی فارسی تاریخوں پر ہے، ضرور اس سے واقف ہیں کہ نہ صرف ہمایون، بلکہ اس کے خاندان کے اکثر افراد شاعر تھے، اور اس فن لطیف سے خواتین بھی محروم نہ تھیں، اس کی بہن گلبدن بیگم مصنف ہمایون نامہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی اس کا یہ شعر:-

زہشیارانِ عالم گر کردیم منعے دارد ولا دیوانہ شو دیوانگی ہم حالے دارد

آج تک زبان زد خلائق ہے، اور واقعی عجب کیف و سرور سے بریز ہے، اس کے بھائی عسکری، ہندال، کامران سب شاعر تھے، خصوصاً کامران کی شاعری نہایت رنگین ہوتی تھی اور اپنے اندر ایک امتیازی شان رکھتی تھی، کامران کے دیوان کا ایک نہایت نایاب قلمی نسخہ، مشرقی گنجینہ باکی پور میں محفوظ ہے اور جناب پروفیسر محمد فاضل صاحب ایم اے پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے اس کو اپنے تحشیہ اور تصحیح کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ خود اس کا باپ بابر نہایت قابل ادیب اور اچھا شاعر تھا

اور فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں یکساں طبع آزمائی کرتا تھا۔ فارسی میں اس کا یہ شعر:-

ورد و دو جہاں روئے دو لبرے خوشست با بے عیش کوشش کر عالم دو بارہ نیست

عجب تازگی اور کیفیت رکھتا ہے۔ جس خاندان کا یہ حال ہو کہ اس کے اکثر و بیشتر افراد تیغ و قلم دونوں کے مالک ہوں اُس میں ہمایوں جیسی ممتاز ہستی کو ممتاز تر ہونا چاہیے تھا اور ہی ہوا۔ وہ نہ صرف تلوار کا دھنی تھا بلکہ قلم کا بھی بادشاہ تھا۔ علوم و فنون سے اس کو خاص شغف تھا۔ ریاضی اور ہیئت کا وہ ماہر تھا، زائچہ و احکام میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ ایجاد و اختراع کا مادہ اس کی طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ وہ ایسی ایسی چیزیں بنایا کرتا تھا، جو عام لوگوں کے ذہنوں میں بلکہ خواب و خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ اس کے مخترعات میں سے "باغ روان" اور "مرغابہ فلکی" اپنی آپ مثال تھے۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ علمی بحثیں رہا کرتی تھیں اور شعر و شاعری بذریعہ بدیہہ گوئی گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی، خود بابر کو اس کی ان صفات کا اعتراف تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ ہمایوں بہت اچھا رفیق و مصاحب ہے۔

ہمایوں کی شاعری کے متعلق اہل تاریخ و سیر کا اتفاق ہے کہ اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔ سام مرزا اپنے تحفہ سامی[1] میں ہمایوں کے متعلق لکھتا ہے کہ "در نظم اشعار خسرو ارباب نظم و در حسن گفتار حسن المقال سرو فتر ارباب فہم..... این مطلع زادۂ طبع شریف ایشانست۔

"آں نہ سرو است کہ در باغ سراز افراخت است شمع سبز یست کہ پروانۂ او فاختہ است"

اسی طرح صاحب تاریخ خانخاناں[2] تحریر ہے اس کے متعلق کہتا ہے کہ "شعر بغایت نیکی می گفت و در انشا ید بیضا داشت" ملا نظام الدین اپنی طبقات[3] اکبری میں فرماتے ہیں کہ "در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود و شعر نیکو گفتے"۔ غرض اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ ہمایوں شاعر تھا اور اچھا شاعر تھا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی ہوگا، اس زمانے میں اور اس سے بہت پہلے سے دواوین کا رواج تھا۔ خود اس کے بھائی کامران کا دیوان ہمارے حوالہ اور پڑھا جا چکا ہے موجود ہے۔ لیکن ہمایوں کا دیوان کہیں نظر نہیں آتا۔ نہ صرف ہندوستان کے کتبخانے اس سے خالی ہیں بلکہ یورپ میں بھی جہاں ہندوستان کا بیشتر علمی سرمایہ منتقل ہو چکا ہے، اس کا پتا کہیں نہیں چلتا۔ ہمایوں کے متعلق کسی ایسی دارستہ مزاجی کی بھی شہادت نہیں ہے کہ جس سے یہ قیاس ہو سکے کہ اپنے کلام کو دنیا کی طرف اُس نے کبھی توجہ نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی زندگی بے اطمینانی اور آوارہ گردی میں گذری اس لیے دیوان

---

[1] تحفۂ سامی مصنفۂ سام مرزا صفحہ ۱۶۲ نسخۂ قلمی ۲۰۲ کتبخانۂ مشرقی باغی پور۔ پٹنہ

[2] تاریخ خانخاناں تحریر صفحہ ۲۹۵ نسخۂ قلمی ۵۵۱ کتبخانۂ مشرقی باغی پور۔ پٹنہ۔ یہ نسخہ غایت ناایب اور بے مثل ہے۔

[3] طبقات اکبری صفحہ ۱۲۲ نسخۂ قلمی ۵۲۵ کتبخانۂ مشرقی باغی پور۔ پٹنہ

مرتب نہ ہو سکا تو قریب قریب یہی حال اس کے بھائی کامران کا بھی رہا پھر اس کا دیوان کیونکر مرتب ہو گیا؟ ہمایون بادشاہ وقت تھا اور اس کے ادنیٰ اشارے پر اس کا دیوان مرتب ہو سکتا تھا۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ اس کا دیوان بھی ضرور ہو گا اور اس کی شہادت بھی موجود ہے۔ ابوالفضل نے اکبرنامہ میں صاف لکھا ہے کہ "آنحضرت عالی موجود است" اس سے ظاہر ہوا کہ ہمایون کا دیوان تقاد اکبر کے زمانے میں شاہی کتب خانے میں موجود تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ دیوان کیا ہو گیا؟ یہ یقینی امر ہے کہ بہت سے ایسے شعرا کے دیوانوں کی طرح جو باوجود حسن کلام مقبول عوام نہیں ہوئے اور ان کی نقلیں کثرت سے نہیں ہوئیں، ہمایون کے دیوان کی بھی بہت کم نقلیں ہوئیں۔ اور جو ہوئیں بھی وہ ضائع ہو گئیں۔ چنانچہ اکثر تذکروں میں اس کے شاعر ہونے کا ذکر اور اس کے کلام کا نمونہ ملتا ہے مگر اس کے دیوان کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان کا وہ نسخہ بھی جس کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے، زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہا اور جلد ہی ضائع ہو گیا۔ بہرحال یہ تقریباً مسلم ہو چکا تھا کہ ہمایون کا دیوان مفقود ہو چکا ہے۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ راقم کو اس کے عزیز دوست سید حسن عسکری صاحب پروفیسر فرینک کالج کی وساطت سے مل گیا۔ یہ گوہر بے بہا، اصل سید نامرعلی صاحب دیوان کھوہ ضلع چھپرہ کے موروثی کتب خانے میں تھا اور وہیں سے حاصل ہوا۔ اور جناب نواب سید مبارک علی صاحب نے جو دیوان صاحب مرحوم کے اوقاف کے متولی ہیں خاکسار کو توسط پروفیسر حسن عسکری صاحب اس کی اجازت دی ہے کہ اس دیوان کا ایک تنقیدی اڈیشن شائع کرے۔ چنانچہ دیوان مذکور کے متعلق تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ مستقبل قریب میں وہ منظر عام پر آجائیگا۔

دیوان ہمایون کا زیر نظر نسخہ کافی قدیم ہے اور ڈھائی تین سو برس سے کم پرانا نہیں معلوم ہوتا۔ پرانے دیسی کاغذ پر جو نہ صرف کرم خوردہ ہے بلکہ بوسیدگی قدامت کی وجہ سے غایت کمزور ہو گیا ہے۔ روشن اور خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے حاشیے پر سنہری جدولیں ہیں اور سرورق پر اور مختلف اوراق کے گوشوں پر نہایت خوبصورت رنگین نقش و نگار ہیں۔ مسٹر بانک برائیٹ لائبریرین کے پاس قلمی نسخوں کا نادر و بیش بہا خزانہ ہے اور جن کو اسلامی مخطوطات اور تصاویر کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ یہ خیال ہے کہ دیوان مذکور کشمیری فن کتابت کا نمونہ ہے اور ایرانی فن کتابت کے انداز پر ہے۔ لیکن اس نسخے میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ نہ تو اس پر کاتب کا نام ہے، نہ سن کتابت ہے، نہ کسی کی ملکیت کا کوئی ثبوت ہے، نہ کسی قدیم شخص کی مہر یا دستخط ہیں۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ دیوان کامران کے نسخے سے جو کتب خانہ مشرقی پانی پور میں ہے، بہت کم، تہ ہے اور قدامت میں بھی اس سے بہت پیچھے ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ یہ دیوان ہمایون ہی کسی دوسرے شاعر کا دیوان نہیں۔ راقم اپنی تحقیقات سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ دیوان جلال الدین محمد بادشاہ ہمایون کا دیوان ہے۔ اس کے دلائل انشاء اللہ آئندہ مضمون میں پیش کیے جائیں گے۔

لہ اکبرنامہ نسخہ قلمی صفحہ ۱۲۹ جلد اول۔ کتب خانہ مشرقی پانی پور پٹنہ۔

(۲) دریائے لطافت حصۂ عروض مصنفہ قتیل

یہ حصہ ص ۳۶۹ کے آخر سے شروع ہو کر ص ۳۸۰ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔ جزیرۂ چہارم در عروض | کیفیت شہر دل آویز و دراں تماشا می تواں کرد، و در ہندی خاص سوائے اردو پنگل نامند۔

قتیل نے عروض کی اکثر اصطلاحوں کو اپنے حال پر رہنے دیا یا ان کا ترجمہ کرنے یا ان کے بدلے ہندی الاصل الفاظ وضع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ان کا سارا زور طبیعت اس پر صرف ہوا ہے کہ تقطیع کے لیے ان الفاظ کی جگہ جو عروضیوں نے تجویز کیے ہیں، جہاں تک ممکن ہو اپنے زمانے کی ہوا خواہوں کے نام بھر دیں، چنانچہ مفاعیلن کی جگہ پری خانم، وادی گئی ہے اور مستفعلن کھنڈ بنچ کر چنچل پری بن گئی ہے۔ بقیہ ارکان کے نام حسب ذیل ہیں:-

فاعلاتن = نورباتی، متفاعلن = چوتت بتی، مفاعلتن = بتاس پتی، فاعلن = چت لگن، فعولن = پیادہ، مفعولات = صاحب بخشی۔

زحافات یہ ہیں:- قلندر، طاگیر، گجراتی، بی جان، چت لگن، پیادہ، لنگوڑ۔ (اس لفظ نام بیچ محبوبہ نباشد بلکہ از جملہ صفات است برمزدوزن، ہر دو صادق می آید) جان بی (جان بی و لنگوڑ ہر چند نام زنی باشد لیکن در تسمیہ جائے نگرانیست پری خانم سہ گیرد خود، اموسم بایں ناہا کرد) انمیل، انمول، چت لگن، نوبخش، ہمادی، گجراتی، بنگلی جان، پری، سجنی، سجنی جان، بی جان، مال دبی، دیدار بخش، گوری، پیادہ، مراد بخش، بڑی پیادہ، راج دلاری، لیتری (زبان برج بمعنی عورت) قتیل نے تیر کا نام گھٹ بڑھ رکھا ہے اور زحافات کا سنگار، رکن سالم کو یہ صاحب طائفہ، قاض، خانگی کہتے ہیں اور فروع کو کنیز ان خانگی، یا توجہ،

اردو ہندی بحاشا کے تعلقات باہمی کے مسئلہ قتیل کے حسب ذیل اقوال قابل توجہ ہیں:-

(۱) "در ہندی خاص سوائے اردو پنگل نامند ص ۳۶۹

(۲) "برائے متفاعلن لفظے در ہندی نباشد و فارسی ہم نیست الا زبان برج ایں رکن باید و لفظ حاصل می تواں کرد مانند چوتت بتی یعنی دیدار زن محبوبہ" ص ۳۷۲

(۳) "ایسی لفظ اردو نیست، لیکن چوں الفاظ برج در زبان اردو مستعمل است بنا بر ضرورت مثل چوتت بتی ایں ہم مضائقہ ندارد" ص ۳۷۷

(۴) "زبائی از فوز حسن و جمال در برج بہ انمول بروزن فعلات یعنی بے قیمت ملقب شد ایں لفظ اردو و ہو لیکن از بہت فصاحت و نفاست (یعنی ن) زبان اردو نماند ص ۳۸۰ قتیل نے اس باب میں مختلف شعرا کے حسب ذیل اشعار اور مصرعے نقل کیے ہیں، اور چار شربت کا بھی ایک جگہ حوالہ دیا ہے:-

(۱) ہم ہیں قربان ان اداؤں کے
(۲) جہاں میں جنس مروت کا جا بجا ہے قحط — میں جانتا ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا
کچھ تعجب نہیں اگر یہ شعر خود قتیل کا ہو۔
(۳) ہمارے پاس ترا عجب کسی نے نام لیا — (۴) کہ عشق آساں نمود اول ولے افتد مشکلہا
(۵) ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تنقائے مسلمانی — (۶) میں ڈھونڈھا ون ڈھلے دلبر کو کل گھر پہ گھر یارو
(۷) در فراق او مہری فرخی کن کہ شہیارا — مہری شیرازی — می تواں بہ روز آورد روز را کسے چہ کند۔
(۸) جو کوئی ہم سے ستم گشتوں کو عشرت سا کرخفا کریگا — انشا — یہی کہیں گے کہ جا، صاحب خدا تمہارا بھلا کریگا
(۹) ز تجلی شعلۂ رویت دود لطیفش زلف چلیپا — قتیل — صبح قیامت چاک گریباں فتنۂ دوراں قامت زیبا

(۳) دیوان راغب تذکرہ میں راغب کا نام محمد جعفر خان درج ہے۔ لیکن کاتب دیوان نے جعفر علی خان لکھا ہے ان کے حالات زندگی کسی دوسرے موقع پر پیش کیے جائیں گے، اس وقت صرف اسی قدر کافی ہے کہ ان کا اصلی وطن پانی پت تھا۔ لیکن ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی، نواب لطف اللہ خان صادق کے پوتے تھے، خرابی دہلی کے بعد لکھنؤ جا کر فارسی میں میر فاخر کے شاگرد ہوئے تھے، وہاں سے عظیم آباد آئے تھے اور یہاں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۱۵۶ھ سال وفات ۱۲۱۱ھ ہے، علاوہ اُن تصانیف کے جو فارسی میں ہیں، اردو کا ایک بڑا دیوان اور دو چھوٹے دیوان مرتب کیے تھے، ان کی تصانیف بہت کمیاب ہیں، اُردو کے ایک مختصر سے دیوان کے علاوہ جو کتبخانۂ مشرقی پانکی پور میں موجود ہے ان کی کوئی تصنیف ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔ ڈنانکی کا یہ قول کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتبخانے میں راغب کا دیوان موجود ہے، صحت سے دور ہے۔ اس کتب خانے میں راغب تخلص کے ایک شاعر کا دیوان ضرور موجود ہے، لیکن وہ ترکی زبان میں ہے، دیوان راغب چھوٹی تقطیع کے ۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ابتدا کے کچھ ورق (اکیاوا دو) غائب ہیں، آخری ورق موجود ہے، لیکن اس کے قبل کے کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں، انتیسواں ورق اس مصرع پر ختم ہوتا ہے "مستی چشم بتاں تو ہی ہے" اشارہ کاتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کا ورق "لن ترانی" سے شروع ہونا چاہیے۔ لیکن تیسویں ورق کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہر تار ساقہ اس کے ہے وابستہ میری جان — کاکل کا تیری ایسا گرفتار کون ہے۔

کیڑوں نے اس نسخے کو بہت خراب کر دیا ہے۔ صفحات پر بڑی محنت سے اسے درست کیا ہے، لیکن بہت سے اشعار بالکل ضائع ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے بعض الفاظ غائب ہیں۔ مسطر پندرہ سطروں کا ہے، لیکن کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں ۱۵ اشعار ہوں۔ اکثر اس نسخے میں ۱۴ اشعار موجود ہیں کاتب نے یقیناً اس سے زیادہ لکھے تھے، کتاب کی ابتدا مصنف کے دیباچے سے ہوتی ہے جو مجلہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

"دنا فتحش است درستہ یک ہزار و ... دو ہست ہجری نبوی بلدۂ دین کلام فارسی در ترتیب گزار جعفری، وزر جعفری،

وہار جعفری کہ ہر یک نسخہ ایست علحدہ امر تب ساخت و کوس شاعری در قلمرو سخندانی بایں ہنماوانی نواخت از جناب آفرینندہ سخن آفرینان چشم آن است کہ از چشمہ ہر بیان و نکتہ چینان محفوظ گرداند و قول طبائع منصفان سخنداں رسانہ تا وسیلۂ یادگار ایں ہر کردار شود۔ و ایں ذرۂ بے مقدار از گوشۂ غیر خورشید نظیر اجلہ ... اعزہ استقبال برد۔ زیادہ سکوت بہتر و خاموشی خوشتر۔ شعر متن:-

"کم خندہ و تبسم بسیار چشم تر یہ — جز قطرۂ غم دوست ہر قطرۂ مخمر یہ"

والسلام احسن الکلام اقلت کلام دیا چہ

دیوان کے پہلے صفحے میں ۸ اشعار اور ایک مصرع ہے۔ پہلی غزل کے تین شعر یہ ہیں:-

معتقد ہے انساں کو کہاں اس کی ثنا کا — مطلع پڑھا ہوا ہے بندے سے بھلا وصف ہو کس طرح خدا کا
روشن ہے جہاں اس کی تجلی سے سراسر — خالق ہے وہی ہر دو سرا ارض و سما کا
ممنون ہیں ترے فضل کے مشکور خطا ہیں — توصیف نہیں تہ رشناس اہل دعا کا

ایک غزل میں اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے کلام کی مقبولیت کی دعا کی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:-

گفتار کا میری ہو مددگار خدایا ۱ — درخواست مری تجھ سے ہے یا رب خدایا
تاثیر سخن میں ہو مرے حد سے زیادہ ۲ — ہو کر سے ماثر مری گفتار خدایا
رہتا ہوں شب و روز میں تو سوئی اماں ۳ — مقبول جہاں ہوں مرے اشعار خدایا
خاتون فراست کے خلاصوں میں کہو کر ۵ — شامل ہو مرا حیدر کرار خدایا
ان کی تو لطف رہے حال پہ میرے ۶ — دے آل پیمبر ہو میں اظہار خدایا

ایک شعر میں اپنے استاد مکتی سے استفادے کا اعتراف کیا ہے:-

"ہوا ... مرتب شکر مدد شکر — کہیں کے فیض سے دیوان راقب"

فراق دہلی میں ایک شعر کہا ہے:-

"تازہ ہیں دہلی کی فرقت میں ہمارے دل کے داغ — آنکھوں میں ہماری باغ ہے ویراں ہنوز"

ایک مقطع میں میر کے ایک مصرع کی تضمین کی ہے:-

راقب بیمار ہے نہایت بقول تیر — "بجھاؤں کس طرح دل خانہ خراب کو"

تخلص کا انداز یہ ہے، لیکن اس رنگ کا صرف یہی شعر دیوان میں ملا ہے:-

راقب کے تخیل کیسے گرا استاد بھا ہے — اس کا ہر اک شعر ہے دیوان کے برابر

ایک شعر میں نام کی رعایت معلوم ہوتی ہے:-

پھولی یہ جعفری ہے گلستانِ عشق کی
ذیل میں ان کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:۔

اے خوشا دل کہ یہ محنت ہے پندار رہا
ساحتِ سینہ مرا قطعۂ گلزار رہا

پھولتے ہی ہے یہ لحظہ لگی داغ اس کے
جنھوں کو یار کے کوچے میں دعویٰ ہے گدائی کا

ہنیں شاخوں کے در پر شوق ان کو پھیلا سائی کا

ان دنوں جوش پہ یہ وحشت ہے اپنا
کام اب گریے ہی پر شام و سحر ہے اپنا

آگے جائیں تو کہاں جائیں ہم آوارہ شوق
کوچۂ یار ہی تک سیر و سفر ہے اپنا

صد پارہ ہوا آہ دل اپنا جگر اپنا
اے آہ عجب تو نے دکھایا اثر اپنا

از بس کہ نم آلود ہی پایا اسے بھر عمر
سوکھا نہ کبھو دامنِ مژگانِ تر اپنا

ہمارا سیل اشک آخر ہمارے تا گلو پہنچا
ہم ایسے روئے تجھ بن پر نہ ہم تک آہ تو پہنچا

نہ ہرات ہو سکی حرف و حکایت کی حضور اس کے
رہے خاموش ہم جب آہ وقت گفتگو پہنچا

بھڑ اوے منہ سے منھ ساتی ہمارا اور اس کا اب
ہماری بزم عشرت میں جو تو نے کر سبو پہنچا

نہیں کوئی گی ایسی جہاں چرچا نہیں میرا
مری آوارگی کا شور اب تو کو بکو پہنچا

خفا ہو کر یہ بولا پھر تو آیا سامنے میرے
جو میں میں بعد یک مدت کی اُس کے روبرو پہنچا

مجھے بہت رسا پر اس کے راغب رشک آتا ہے
جو ہم وصل میں جو یار کے بے جستجو پہنچا

ہے آٹھ پہر میرے تئیں دھیان کسو کا
میں خود رفتہ ہوں ہر آن کسی کا

کیا جانیے کوئی جان سو جاتا ہے کہ جاگ رہا ہے
کہتا ہوں نہ جاناں کو کہا مان کسی کا

پردہ جو تو نے کھڑے سے اپنے اٹھا دیا
دل سے ہمارے طور کا جلوہ بھلا دیا

جب تک میں نہ جان سے گزرا
وہ یک تک امتحان سے گزرا

موم کیے تھے دل یار سو آہن نکلا
جانتے تھے جسے ہم دوست سو دشمن نکلا

سینہ چاکی و جگر کاوی کسے آتی تھی
ہم ہی دو چار دو انوں سے ہے یہ فن نکلا

دونا ہوا غرور مرے مست ناز کا
خانہ خراب ہو جو آئینہ ساز کا

ولا بھی چمن کی مست ہوں کر
خیالِ شامِ مرغانِ قفس کر

دلِ پُر شور راغب کے تو آگے
نہ یہ ہرزہ درائی اے جرس کر

کیا ضبط اس کے ڈر سے نالہ و زاری کو میں یاں تک
کہ آہیں لب تک آکر پھر گئیں اور اشک مژگاں تک

گئے خنداں ہوں اپنے حال پر اور گاہ گریاں ہوں
عجب حالت ہے میری اے عزیز دہشت حیراں ہوں

نہ ہو آوارہ اے توسن جرس میری نگ و پو میں
کہ میں وحشت زدہ دور آپ ہی صد بیاباں ہوں

سخن کی تہ کو جو پہنچے وہی پائے مجھے راقب
کہ ہوں میں معنی نازک سخن میں اپنے پنہاں ہوں

منزل کبھی نہ پہنچے از بسکہ ناتواں ہوں
پس رہ ہوں کارواں کا میں گرد کارواں ہوں

میں مرغ پر شکستہ ہوں ننگ بوستاں کا
نہ زینت قفس ہوں نہ زیب گلستاں ہوں

تازگی ہر لحظہ ہے داغ دل ناکام کو
یہ چراغ ایسا نہیں جس کو جلایا شام کو

مثل گل اس باغ سے سب لے چلے حنداں ہمیں
شبنم آسا چشم گریاں ہم پریشاں لے چلے

سفر کا عزم ہے اس کو کہو اس آفت جاں سے
اقامت بڑھ کے کرتا حسرت دل کے بیاباں سے

دیوان کا آخری شعر یہ ہے :-

تجھ گلی میں پھرے ہے راقب آج
دل کے ٹکڑے بغل میں مارے ہوئے

خاتمہ :- تمام شد نسخۂ دیوان راقب کہ اسم مبارک شاں نواب جعفر علی خاں بود۔ تاریخ سوم ماہ شوال روز پنجشنبہ از فوہ خام احمد حسین۔

کاتب کچھ بہت خوشخط نہیں اور ذی علم بھی نہیں معلوم ہوتا۔ نظارہ کو ایک جگہ نقارہ لکھا ہے، اس قسم کی اور غلطیاں بھی ہونگی۔

راقب کی زبان وہی ہے جو مصحفی و غیرہ کی ہے، ان کا پایہ شاعری چنداں بلند نہیں، غزلوں میں اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے، بعض زمینوں میں تو صرف دو تین شعر ہیں، بعض زمینوں میں دو غزلے بھی لکھے ہیں، لیکن اس پر بھی اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں

ف گلزار ابراہیم مطبوعہ دہلی، نشتر عشق تین جلدوں میں، تذکرہ عشقی تلمی، نشتر عشق جلدوں میں، تذکرہ عشقی تلمی، تاریخ ادبیات ہندی، ہندوستانی

ص اس تذکرہ میں ۷۰ اشعار شامل ہیں، دو تین لفظ یا ران میں باقی رہ گئے ہیں، باقی کی جگہ سادہ کاغذ چسپاں ہوتے جہاں پر کہ ہزار ۱۰۰ صفحہ دبشتہ ہوگا یہاں جہاں نقطے دیے ہوئے ہیں، ان سے الفاظ غائب ہیں، شاہ ولی کا نام ایک اور شعر میں آیا ہے۔

اس شوخ نیرنگ باز کی چلکن کو یاد کر
ولی میں گر کہیں رووں تو پیچھے وکن میں آب

ت یہ غزل ہولی کی تعریف میں ہے، مطلع اور بعض اشعار یہ ہیں :-

ہولی میں ہو گیا ہے جو سارا جہان زرد
محفل ہر اک ہے جوں چمن زعفران زرد

ہولی میں کس طرف نہ عبیر و گلال ہے
جہاں سے لے کے آج ہیں تا آسمان زرد

بندہ ہو تو زرد پوش، کریں جب کہ ہولی میں
پہنے لباس صاحب والا مکان زرد

"صاحب والا شان" کوئی انگریز تو نہیں ؟

غالب

(۱) پنج آہنگ غالب، از ق ع و (۲) غالب کے دو لطیفے، از ق ع و
(۳) مرا پاکستان اور غالب، از ق ع و (۴) تذکرہ سرور اور غالب

پنج آہنگ

پنج آہنگ، ۵½ × ۸½ انچ تقطیع کے ۴۴ صفحوں کی کتابچہ پہلے صفحے پر عبارت ذیل درج ہے:-

بمن توفیق ایزد متعال کتاب در علم قواعد فارسی و اشتقاق و تصحیح الفاظ و انشاء شیفتہ ہر قسم مصنوعہ غلط ارباب جود و بکر صاحب فیض اعم شہنشاہ ممالک علوم و بی فارسی ملک الشعرائے دوراں جناب فرخندہ خطاب نجم الدولہ دبیر الملک | پنج آہنگ |
ذوالاسد اللہ خان بہادر نظام جنگ دام اقبالہم، مطبع دارالسلام دہلی خاص بہتہ اقل العباد عنایت حسین تصحیح حضرت مصنف دام برکاتہم باہتمام نورالدین احمد گلھذی در ماہ اپریل ۱۸۵۳ء طبع اختتام پذیرفتہ فقط

دوسرے صفحے میں ۹ سطریں ہیں تیسرے سے ۴۰۵ تک ہر صفحے میں ۱۴ سطریں، اس کے بعد سے آخر تک ہر صفحے میں ۱۵ سطریں۔ پہلے صفحے کی بقیہ سطر یہ ہے:- "بعد تقدیم خیابش و ادار جہاں آفرین و تہنیت ستایش حضرت سید المرسلین"

دیباچہ علی بخش خان مخلص بہ ابنی بخش خان معروف کا لکھا ہوا ہے، اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے، کہیں کہیں اصل عبارت بھی توسین کے اندر نقل کر دی گئی ہے:-

علی بخش خاں، دہلی میں کم رہتے تھے، ان کا زیادہ وقت فیروزپور میں ان کے چچا فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ کے ساتھ گزرتا تھا، (زیر سایہ رافت آں والاپایہ پرورش می یافتم) فیروزپور میں ہر قسم کا عیش و آرام مہیا تھا اور امیروں کے لڑکوں کی طرح لہو و لعب میں وقت صرف کرتے تھے، شباب کی ابتدا تھی، اور ہر قسم کی فکر سے آزاد تھے، میرزا غالب کا علی بخش خاں سے دُور کا رشتہ تھا، انہیں اس کا خیال رہتا تھا کہ یہ کچھ لکھ پڑھ لیں (مرا بے آموزگاری من دانست) علی بخش خاں نے میرزا سے درخواست کی کہ چند اوراق میں ایک ایسا رسالہ لکھ دیجیے جس سے ہر قسم کے اوگن کا خط لکھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے (حسب التماس من درقے چند از آداب و القاب و شکر و سپاس خطوط و شکوہ و ملامت رسی مکاتبات بمن عطا فرمود) میرزا نے ان کی خواہش کے مطابق رسالہ لکھ کر ان کے حوالہ کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد میرزا کا کلکتہ جانا ہوا اور اس کے بعد ہی احمد بخش خان کا انتقال ہو گیا، "غم نامدار کا شفقت پدری بلکہ رحمت ایزدی اوّلات بار کا تمش لکھ خطوط داشت" ان کے بڑے بیٹے شمس الدین خان جانشین ہوئے، یہ بالکل ناتجربہ کار تھے، اوباشوں کی صحبت میں انہوں نے بُرے ڈھنگ اختیار کیے، ریاست کا انتظام بالکل بابر ہو گیا۔ علی بخش خان کو ترک وطن کرنا پڑا۔ لکھنؤ اور بے پور گئے، لیکن وہاں کامیابی کی صورت نہ نکلی، ۱۸۵۰ء کی ابتدا میں شمس الدین خان کا عزل ہوا، اس کے بعد علی بخش خان بے پور سے دہلی پہنچے اور میرزا غالب کے یہاں مقیم ہوئے۔ اسی زمانہ میں میرزا کا دیوان (مسمّی بہ متجانۂ آرزو سرانجام است تازمہ فرایم آمدہ) مرتب ہوا تھا، علی بخش خان اور امیر حسین نے میرزا سے

اس کی نثر سبقاً پڑھی، ان کے دل میں خیال گزرا کہ دیوان سے اگر نثر نکال لی جائے اور اس میں وہ رسالہ جو میرزا نے ان کے لیے لکھا تھا، اور متفرق عبارتیں شامل کر دی جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو جائے، حکیم رضی الدین حسن خان بہادر اور میر محمد حسین خان کا اصرار اور یہ خیال کہ یہ کتاب غلام فخر الدین خان کے کام آئے گی، ان کے ارادے کو پختہ کرنے کا باعث ہوا اور کام شروع ہو گیا۔ کتاب کے چھ باب ہیں۔ پہلے میں یہ ہدایت ہے کہ خط کس طرح لکھا جائے، کون کس طرح مخاطب کیا جائے اور اسی قبیل کی دوسری باتیں، دوسرے میں اصطلاحات، مصطلحات، دعائیہ فارسی و درج ہیں، تیسرے میں میرزا کے اشعار ہیں جو خط لکھنے والوں کے لیے کارآمد ہیں، چوتھے میں میرزا کے لکھے ہوئے خطبے اور تقریظیں اور متفرق عبارتیں ہیں، پانچویں میں میرزا کے خطوط ہیں۔

آہنگ اوّل: میرزا کی تمہید کا خلاصہ اردو میں یہ ہے کہ ۱۲۴۱ھ میں انگریزوں نے بھرت پور پر لشکر کشی کی تھی اور قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، میرزا اور علی بخش خاں اس یورش میں امر بخش خاں کے ساتھ تھے۔ میرزا نے (جو عالی مقدار لکھا ہے) علی بخش خاں نے فرمایش کی کہ ایک رسالہ ایسا لکھ دیجیے جس سے خط لکھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ میرزا نے ان کی فرمایش کو رد نہ کیا اور مختصر سا رسالہ لکھ دیا، بارہ برس کے بعد میرزا کی روش کے یہ بات خلاف تھی کہ دوسروں کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق القاب و آداب لکھیں، اور غیریت گوئی اور عافیت جوئی کو وہ بالکل نامقبول جانتے تھے، میرزا کے الفاظ یہ ہیں:-

"بیگانگی این روش از شیوۂ غالب مستبعد نہ چنداں است کہ بگفتن نیاز داشتہ باشد و داد اشناسی واندکہ ہنجار این روش ہم این است کہ چوں کلک دو رو ق گیرم مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ از اعز حالت است در سر آغاز صفحہ آوازہ ہم ز مرتبہ سنجی مدعا گیرم القاب و آداب و غیریت گوئی و عافیت جوئی محشو ز اہانت است ... و نیز دانا شناسد کہ دریں شیوہ گنجایش سخن گستری نا کجاست"

اس کے بعد میرزا نے یہ بتایا ہے کہ خط کی عبارت کس طرح کی ہونی چاہیے، میرزا کی ہدایتوں کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) لکھنے میں گفتگو کا رنگ ہونا چاہیے۔ (۲) عبارت ایسی نہ ہو جس کا سمجھنا دشوار ہو (۳) اگر خط میں کئی باتیں لکھنی ہیں تو اس پر غور کرنا چاہیے، کہ کسے مقدم رکھا جائے اور کسے مؤخر (۴) بات کو پیچ دے کر نہیں کہنا چاہیے (۵) دقیق استعارے، شکل و نامانوس لفظوں سے بچنا چاہیے (۶) مکتوب الیہ کے رتبے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے (۷) طوالت اور تکرار الفاظ سے احتراز چاہیے (۸) قواعد مقررہ کی پابندی ضروری ہے اور لوگوں کے مذاق کا خیال فرض کرنا چاہیے، لیکن فارسی میں ہندوستانی فارسی نویسوں کے تصرفات کو قبول نہیں کرنا چاہیے، عربی الفاظ ضرورت سے زیادہ نہ استعمال کیے جائیں۔ (۹) معاملات کے خطوط میں خاص طور پر ان خطوط میں جو حکام کے پاس بھیجے جائیں، مبالغے اور اغراق سے بچنا ضروری ہے، اشاروں اور استعاروں سے کام نہ لیا جائے۔ لہجہ سنجیدہ، زبان نرم اور آسان ہونی چاہیے۔

اس کے بعد ہر درجے کے لوگوں کے القاب ہیں، اگر زیادہ کے لیے یہ القاب:-

جناب مستطاب معلی القاب، جہانیاں مآب، جم جاہ، اعلم سپاہ، سپہر بارگاہ، نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ و زاد افضالہ۔

القاب میں ایک آدھ جگہ تبدیلی بھی آیا ہے، بظاہر ہندوستانی فارسی دانوں کا یہ تعرف میرزا کی نظر میں نامقبول تھا، دوسرے اور تیسرے ابواب میں کوئی بات قابل ذکر نہیں، ان کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہے کافی ہے، چوتھے باب کے مندرجات کی فہرست یہ ہے:-

(۱) دیباچۂ دیوان فارسی (۲) دیباچہ گل رعنا (۳) دیباچہ دیوان ریختہ (۴) خاتمۂ گل رعنا (۵) خاتمۂ دیوان فارسی (۶) تقریظ تذکرۂ اردو تالیف نواب مصطفیٰ خان بہادر، (۷) نثر جو قصیدۂ مدحیہ کے عنوان کے طور پر لکھی گئی تھی (۸) نثر جو دیوان ریختہ کی پشت پر لکھ کر امام بخش صہبائی کو بھیجی گئی (۹) غمخواری صحیح (۱۰) ظلمت شب (۱۱) تقریظ دیوان حافظ (۱۲) دیباچۂ دیوان مرزا رحیم الدین بہادر (۱۳) عبارت در صفت مقطع الحروف (۱۴) عبارت تقریظ رسالہ موادّ الکلام، صنعت تعطیل (۱۵) دیباچۂ دیوان ہرگوپال تفتہ (۱۶) تقریظ آثار الصنادید (۱۷) دیباچۂ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر نامی (۱۸) دیباچۂ تذکرۂ طلسم راز مولفہ میر مہدی۔

ع شمس الدین خان کچھ اسی کی سزا ملی

تھی ع علی بخش خان کے جیے

غالب کے دو لطیفے

(۱) پرانے زمانے میں راجا بھرت پور کے یہاں ایک منشی تھا جسے انشا پردازی کا سلیقہ تو نہ تھا۔ لیکن باتیں خوب بناتا تھا راجا کسی بات پر اس سے خفا ہو گیا، اور ایک نیا منشی بحال ہوا، پرانے منشی کو بہت خار گزرا اور اس تاک میں رہنے لگا کہ کسی طرح نئے منشی کو ذلیل کرے۔ ایک دن نیا منشی راجا کی طرف سے ایک سردار کو مراجا کے دستوں میں تھا اور جس کی خاطر راجا کو بہت عزیز تھی۔ خط لکھ رہا تھا۔ پرانا منشی سر نامے کو دیکھ کر مسکرانے اور مضحکہ بنانے لگا، راجا اس وقت تو کچھ نہ بولا، لیکن جب خلوت ہوئی تو پرانے منشی کو بلا کر راجا نے اس حرکت کا سبب پوچھا۔ اس نے پہلے تو راجا کی مدح میں زبان کھولی اس کے بعد بولا کہ حضور! ہم لوگ پرانے نمک خوار ہیں۔ سرکار کا ہمیشہ بھلا چاہتے ہیں۔ نئے ملازموں کو اس کی کیا پروا۔ یہ دہلی والے تو خاص طور پر نمک کا پاس نہیں کرتے میں سردار صاحب کو برابر راہ تنظیم مہربان بڑی رح سے لکھا کرتا تھا انہوں نے انہیں مہربان جھوٹی وہ سے لکھا ہے۔ اب جو وہ فرق دیکھیں گے تو حضور کی طرف سے ان کے دل میں غبار آئیگا

یا نہیں ؟ یہ بات راجا کے دل کو لگ گئی ، نئے منشی کو بلا کر بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ جب ہماری طرف سے برابر بڑی رح سے مہربان لکھا جاتا ہے تو تم نے سردار صاحب کو چھوٹا ہ سے مہربان کیوں لکھا ۔ منشی صاحب برطرف ہوے اور پرانے اپنی جگہ پر آگئے (ماخوذ از پنج آہنگ ص ۲۰ و ۲۱)

(۲) میرزا کے ایک شاگرد کا یا دوست الف بیگ نامی تھے ۔ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ۔ میرزا سے درخواست کی کہ نام رکھ دیجیے ۔ میرزا نے حمزہ بیگ نام رکھا اور خط تہنیت کے ساتھ یہ رباعی لکھ بھیجی ۔

چوں الف بیگ دریں سالی پسرے یافت سربسر غمزہ
نام او حمزہ بیگ کردیم الف معنی بود ہمزہ (پنج آہنگ ص ۲۲۹)

سراپا سخن اور غالب

سراپا سخن کا سال تکمیل ۱۲۶۹ھ ہے ۔ اس تذکرے میں میرزا کا حال اور ان کی ایک غزل درج ہے ۔

"مرزا اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ ولد عبد اللہ بیگ خان قوم ترک اولاد میں گشتاسپ کے ، مولد اکبر آباد ، مسکن دہلی ۔ دیوان فارسی اردو ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے ۔ مشاہیر شعرائے دہلی ہیں ۔ مولف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ ذاحسین فدائی تصبۂ دیبائی سے بھیجی تھی ۔

"وہی سادگی سے جان پڑے کوہکن کے پاؤں بہسات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں"

کل ۹ شعر ہیں ۔ شعر زائد دیوان مطبوعہ میں نہیں ۔

بیچارہ کہتی دور سے آیا ہے شیخ جی کہیے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

جن صاحب کا تخلص فدائی لکھا ہے ان کے بارے میں ۱۲ پر لکھا ہے "شیخ ذاحسین فدا خلف شیخ کریم اللہ باشندۂ قصبہ دیبائی ضلع بلند شہر ، صاحب دیوان ، ارشد تلامذۂ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ"

میرزا نے اس تذکرے کے لیے ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا جو گلشن بے خار ص ۳۹۱ اور ۳۹۲ پر درج ہے :-

اس کتاب طرب لقاب نے جب اور پھر چند سر تھا بارہ کا سات اور سات ہوتے ہیں جو وہ
آب و تاب انطباع کی پائی ہا ہزاراں ہزار زیبائی بہ امید سعادت افزائی
فکر تاریخ سال میں مجھ کو سال ہجری تو ہو گیا معلوم غوص اس سے ہیں چارہ معصوم
ایک صورت نئی نظر آئی بے شمول عبارت آرائی جس سے ہے چشم جاں کو بینائی
چند سے پہلے سات سات کے دو مگر اب ذوق بذل سبحی کو اور بارہ امام ہیں بارہ
دیے بارہ کا مجھ کو کھلائی ہے جدا گانہ کارفرمائی جس سے ایمان اگر ہے تو نائی

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے جو ایسے کے ہیں تو لائی۔

غالب ادۂ تاریخ نکالنے سے گھبراتے تھے۔ ظلم دار۔ مسدہ میر مہدی کی تاریخ بھی انہوں نے اسی طرح نکالی ہے

تذکرۂ سرور اور غالب

تذکرۂ سرور میں غالب کا ایک شعر ہے جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں لیکن یہ شعر یا تو غلط نقل ہوا ہے یا اصل نسخے ہی میں صحیح درج نہیں (معیار میں غالب کے اشعار اس تذکرے سے لے کر درج کیے جا چکے ہیں:)

جگر کے ٹوٹے ہوئے موکی سناں پیدا دہان زخم میں آخر جوئی زباں پیدا

میرزا کے متعلق سرور نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، لکھا ہے کہ بعض الفاظ چھوٹ گئے ہوں:-

"اسد اللہ خان اسد، عرف مرزا نوشہ، جلسش از سمرقند، تولدش اکبر آباد، جوان قابل یادراش، اوزدند، جمعیۃ بخوش معاشی بسر بردہ، اذوق پختہ گوئی در خاطر متمکن، غبہائے عشق مجاز تربیت یافتہ، غم کدۂ نیاز، دون سخن سخی تتبع محاورات میرزا بیدل دریخت، در محاورات فارسی موزوں می گفت، الحمد موجد طرز خود است، و بار اقرار الط یک جہتی تحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگ لاخ صفاہین موزوں کردہ، روئیہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد۔ (عمدۃ المنتخبہ نسخۂ قلمی دلتر ہند لندن)

اعظم الدولہ سرور عماد دہلی سے تھے، ان کا سال ولادت معلوم نہیں، لیکن قرائن سے الٰہی بخش خان معروف کے ہم عمر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا تذکرہ عمدۃ المنتخبہ ۱۲۱۶ھ میں شروع ہوا اور نو دس برس میں اس نے کتابی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بہت بعد بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو غالب کا حال اس میں نہ ملتا کیونکہ غالب کی پیدائش ۱۲۱۲ھ کی ہے۔ سرور اور معروف کے مساویانہ تعلقات ہوں گے۔ معروف نے اپنے دیوان دوم میں یاد کیا ہے:-

"لکھ غزل اک اور بھی معروف سرور کے لیے آج اس پر نکتہ فہمی نکتہ دانی ختم ہے"

غالب سے بھی باوجود تفاوت عمر و رتبہ تعلقات تھے، سرور غالب سے ملنے آیا کرتے تھے، اور غالب نے انہیں محرم طپاں ابن ہادی بیگ خاں مقیم کلکتہ کا حال اور کلام بھی دیا تھا کہ اپنے تذکرے میں داخل کریں۔ جیسا کہ مجموعہ نغز ۱۲۴۲ھ اور ۱۲۴۳ھ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ طپاں کا حال کسی وجہ سے تذکرۂ سرور میں داخل نہ ہو سکا۔

لہ طبع سوم ص ۳۴۰۔
طبع اول ۱۲۷۷۔

بہار و بنگالہ

(۱) ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد، ماخوذ از مراۃ الاحوال، آقا بیہانی، مترجمہ جناب یوسف الدین احمد بخی صاحب ایم اے۔

(۲) بنگلہ کا پہلا گل دستہ، ایک بہاری کا ادبی کارنامہ، مجتبیٰ حسین، از جناب حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب۔

ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد

ماخوذ از مراۃ الاحوال آقا بیہانی۔ مترجمہ جناب یوسف الدین احمد بخی

آقا محمد محسن، ملا اسد اللہ اور سید میر صفدر علی لکھنوی، مخلف سید مہر علی موسوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر عظیم آباد کی طرف چلا۔ کئی ہفتہ ماہ مذکور کو رات کے تقریباً دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ہم لوگ جنت البلاد عظیم آباد پہنچے، پائین مدرسہ سیف خان کشتی باندھ دی اور خود مدرسے میں قیام کیا۔ سید کاظم علی خان جمادار اور میر علی خان صاحب اور دوسرے اعزہ اسی شب ملاقات کے لیے آئے۔ دن کو۔ بھارا جا جھاؤ لعل۔ نواب۔ عباس قلی خان بہادر نصرت جنگ۔ مخلف۔ نواب۔ منیر الدولہ بہادر۔ کے ساتھ تشریف لائے۔ رمضان قریب تھا، میں یہیں ٹھہر گیا، اعزہ اور مقربین میرے دل کو خوش رکھنے اور مسائل کی تحقیق کرتے رہتے۔ دوستوں کی مہربانی اور محبت کی بدولت یہ مدت بڑے لطف سے کٹی۔۔۔۔ سلالۃ السادات، علامی فہامی آقا سید حسن، داماد جنت آرام گاہ جناب مرزا محمد مہدی شہرستانی۔ قبل ہی سے اس شہر میں وارد تھے اور اب فیض آباد اور لکھنؤ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ انہیں تامل تھا کہ فیض آباد و لکھنؤ میں کسے ترجیح دیں۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا، میں نے فیض آباد کے حق میں رائے دی اسے قبول کر کے فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے، ڈھاکے میں مجھے ان کا خط ملا جو بنارس سے انہوں نے لکھا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے بنارس سے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کیا ہے مجھے حیرت اور پریشانی ہوئی، اس لیے کہ یہ ان کے حق میں اور وہ کوفہ دیکھا چاہیے کہ وہاں کے منافق ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ خدا انہیں محفوظ رکھے۔

عالی شان۔۔۔ مسٹر ہنری ڈگلس صاحب بہادر کو جج اور مجسٹریٹ یعنی اس شہر کے صاحب عدالت و مالی و فوجداری ہیں۔ اپنے اپنے محکمے میں نہایت ممتاز ہیں، صفات حمیدہ اور خصائل جمیلہ سے متصف ہیں اور ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کی راہ نکالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جب میرے آنے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنی سرکار سے ایک ہرکارہ مقرر کر دیا کہ میرے پاس حاضر اور میرے احکام کی تعمیل کرتا رہے۔ اس شہر کے صاحب عدالت اپیل۔۔۔ ناظم الملک صمصام الدولہ مسٹر ہاکنس صاحب بہادر ہیں، جو فرنگستان کے منتخب شرفا میں ہیں اور طبقۂ امرائے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں ہر ملت اور ہر طبقے کے ارباب کمال اور ذوالتحاص سے ملنے کا شوق ہے۔ علوم و ادبیات عربیہ سے انہیں اتنی واقفیت ہے،

کر اپنے اشال و اقران میں بدرجہا آگے ہیں۔ اس شہر کے صاحبان عدالت میں سے۔۔ مشرکتنے، حکمت صاحب بہادر بھی ہیں، یہی اپنی قوم کے اچھے لوگوں میں ہیں، اور انہیں بھی باکمال اور دانشمند۔۔۔ لوگوں کی ہم نشینی سے رغبت ہے یہ بھی دوسرے حاکموں کی طرح جن کا ذکر اوپر گزرا ہے، نہایت متدین ہیں کسی فریق کی پاس داری نہیں کرتے اور ذرا سی توجہ سے مشکل سی مشکل باتوں کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں۔

میں اسی شہر میں تھا کہ مرشد آباد سے محترمہ مرحومہ بیگم صاحبہ مرحوم کا خط پہنچا کہ فرخ باغ۔۔ آپ کی سکونت کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، آپ مرشد آباد آئیں تو وہیں قیام کریں۔ اس شہر کے بزرگان و اعیان علی الخصوص۔۔ نواب عباس قلی خان بہادر۔۔ نے اصرار کیا کہ میں عظیم آباد سے نہ جاؤں، مجھے ذرا تامل تھا کہ کسے ترجیح دوں، دل کا میلان عظیم آباد کی طرف تھا کہ یہاں کے امرا اور اعزہ بخلاف دار الشرب مرشد آباد مقدس، متدین اور نیک کردار ہیں۔ اسی اثنا میں یہ خبر سننے میں آئی کہ۔۔۔ نیکی کا دروازہ اس شہر میں بالکل بند ہو گیا ہے اور وہاں کے لوگوں میں پہلے سے بھی زیادہ خدا بیگانگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بات اور بھی عظیم آباد کی ترجیح کا باعث ہوئی۔۔۔ القصہ، چند دنوں کے بعد نواب۔۔ کریم علی خان بہادر خلف الوسط نواب منیر الدولہ بہادر۔۔ ملاقات کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ عظیم آباد میں قیام کروں۔ نواب کریم علی خان بہادر بڑی شان اور نام و نشان کے امیر ہیں، مدتوں شاہ عالم۔۔ کی خدمت میں عزت و اعتبار کے ساتھ رہے، بادشاہ سے سرقب الخاقان، منیر الملک ضیاء الدولہ فرزند خان بہادر تہور جنگ خطاب ملا۔ فارسی اور ہندی کے شعر کہنے اور سمجھنے میں ان کی طبع رسا ہے اور گفتگو اور مجلس آرائی کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کی دوستی میں نجابت نہیں، نہ انہیں شرافت کی طرف طبعاً میلان ہے اور نہ سچائی میں استقامت ہے بزرگی اور سرداری کے باز میں نادر اجلال کے سوا کار ایک نہایت کا سردار ہے رونق متاع ہے، کچھ اور سامان ان کے پاس نہیں۔ ان کے فرزند رشید۔۔ ہندی علی خان باکساری اور وجاہت میں ان سے بڑھ کر ہیں۔ اور کریم علی خان بہادر کو تعزیہ داری کے سوا جو ٹھوں باجے کے ساتھ ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کا بہت اجتماع ہوتا ہے، کوئی اور نیک کام کرتے نہیں سنا اسی خاندان کے نیک لوگوں میں محمد صادق خان خلف مرحوم نواب محمد شجاع خان خلف اکبر منیر الدولہ ہیں۔ ان کے بھائیوں میں سے اکثر بنگی کی طرف آئی ہیں اور برابر مجھ سے مل کر میرے دل کو خوش کیا کرتے تھے۔۔ اس سفر میں۔۔ سید وجیہ علی خان خلف مرحوم سید غلام حیدر خان ہزاری کہ بلا نہیں ضلع عظیم آباد سے بعد معاشوں کے کوچ مارڈالا سید یوسف علی خان سید ہونے کے علاوہ، رقیق القلب اور مجسمہ اخلاق ہیں، اور علوم شرعیہ کے حاصل کرنے کا بہت شوق رکھتے ہیں، چنانچہ ملا محمد علی ترشیزی خراسانی کو کہ نحو کی کتابوں کے ترجمہ ظاہر ہیں اس شہر کے دوسرے علما سے فی الجملہ بہتر ہیں، اپنے گھر لے جا کر رکھا اور ان کے کل اخراجات کے کفیل ہوئے اور ان سے شرائع الاسلام کا ترجمہ پڑھتے ہیں۔ اس شہر کے علما میں۔۔ میرزا محمد علی خلف مولوی محمد کشمیری بھی تھے۔ میرزا محمد علی علوم معقولات میں اس شہر میں بے نظیر ہیں۔

اور ان کی گفتگو بڑی اچھی ہے۔ یہ بھی مجھ سے استفادہ کرتے رہے۔ اس شہر کے علما میں ... اخوند ملا ابوالقاسم سبحانی بھی تھے۔ ان کی طبیعت سلیم اور ذہن بھی بے پاک ہے۔ اکثر علوم متداولہ اور علی الخصوص تاریخ، اقوام مختلفہ سے خوب واقف ہیں۔ دوسروں کی طرح جتنا جانتے ہیں اس سے زیادہ دعویٰ نہیں کرتے۔ اسی سفر میں عالی شان، کلب علی خاں مخاطب بہ کرنیل صاحب خلف شیخ نظر اللہ ساکن پرسہ (ضلع عظیم آباد کی ایک بستی) سے ملاقات ہوئی۔ یہ آدمی، تہیں الطبع اور بھی واقع ہوئے ہیں، علما اور سادات سے انہیں بڑا خلوص ہے۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت ..... ہے۔ اس سفر میں ... میر خادم حسین خان خلف میر شاہ علی خان معزی سے ملاقات ہوئی جو میر محمد باقر خان اسلام حالی کے بھائی ہیں۔ ایک ظریف، خوش صحبت ... جوان ہیں اور علم وفضل کی تحصیل کا شوق رکھتے ہیں۔ برابر ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے، دل ان سے مل کر خوش ہوا تھا۔ اس سفر میں اور بھی بہت لوگوں سے ملاقات ہوئی لیکن چونکہ ان کا نسب اچھی طرح معلوم نہیں، ان کا ذکر نہیں کیا۔ سب لوگوں کو مجھ سے مودت و دوستی بدرجۂ غایت تھی۔ لوگ برابر میرے پاس حاضر ہوتے اور مسائل کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ ... چند روز کے بعد ... محمد مجم الدین خاں قاضی القضات ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر وارد شہر ہوئے اور مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ کاکوری کے رہنے والے ہیں جو لکھنؤ کے قصبات سے ہے۔ میں جب فیض آباد میں تھا، یہ اپنے اقربا سے ملنے کاکوری پہنچے تھے۔ میرے بعض رسائل ان کی نظر سے گزرے تھے اور مجھ سے غائبانہ محبت رکھتے تھے۔ ان کا فیض آباد آنا ہوا تو میری ملاقات کے لیے بھی تشریف لائے تھے۔ اور دوستی درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ خدا کرے کہ انہیں سعادت دارین نصیب ہو۔ رمضان تمام ہوا تو میں نے مرشد آباد کا عزم کیا۔ اور ۷ شوال کو دوستوں سے رخصت ہو کر براہ بردیا، مقام سابق الذکر کے ساتھ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

ف مصنف ہر شخص کا بیان دیکھ کر ساتھ تمام لیتا ہے بہت سے غیر معروف الفاظ ترکیب میں نکال لیے گئے ہیں ف میر صاحب کے ذکر کے بعد یہ عبارت ہے "دور قریۂ نامدار کہ محل بیقہ یار است واز ان جا تا دار الامارۂ مرشد آباد دو روز راہ است" ف یہاں یہ عبارت ہے جو اب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتی گو سب نسخے ناخنہ فاجرہ ملونہ کرداما ہی مرشد آباد واز صلب پدر امیر ان ناصبی است شد یہاں یہ عبارت ہے زیرا کہ شان ایں فقرہ ادبی با پیرکہ می خورد زیادہ از اندیکی ذات محمدیہ صفات واطہار کردار است" یا اس کو بجہت تشبیہ واداں امور فقراء ذوالی حاجات است "پیرگاہ پیرو مرشد بود" یا وہ وہ بخش علی الصبوح قرار دہ پس وجناح خود محرف نمود ہم کہ بصیب برکت واداں خیال و فیر شاہان عالی حضرت آقا محسن خواصانی بمشیت امور ولایت بہ مرشد آباد و بردم وزیر دوی مراجعت کنم" ف شیخ علی خان نام تھا بیٹے کا نام بھی صرف محمد عارف خان ہے مگر، لیکن دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے ف اصلی عبارت "خلف ... میر شاہ علی خان معزی مذکور المعروف بہ میر محمد باقر خان اسلام حالی" ف ان کے متعلق جو یہ عبارت پیش کی گئی ہے اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ فاضلہ است عالی شان، نہایت تہذیب اخلاق و متواضع اور سرکار کمپنی بہادر از عمدۂ است۔ فتاوی واحکام عرفی واضب قضات ورظائف متعلق است"

بنگالہ کا پہلا گلدستہ

ایک بہاری کا ادبی کارنامہ

نتیجۂ سخن

از جناب حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب

منشی محمد وزیر وزیر عظیم آبادی کلکتہ میں بشغل تجارت مقیم تھے، اور صدر یہ پٹی میں ان کی دکان تھی۔ دکان کیا بیشک تھی ایک بھرکے رئیسوں سے شناسائی تھی، اور کلکتہ سے متعلق ان کی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے، گویا اس زمانے کے کمیشن ایجنٹ یا آرڈر سپلائر کی حیثیت رکھتے تھے، شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے، اور انہیں حکیم سجاد موہانی سے شرف تلمذ تھا۔ حکیم صاحب مرحوم آج سے پچاس برس قبل کلکتہ کے مشاز حکیم اور بڑے قابل طبیب تھے۔ میں ان کے صاحبزادے حکیم سید یٰسین مرحوم سے ملا ہوں، وہ بھی قابل اور ذی علم طبیب تھے، حکیم سجاد کے اشعار میں نے نہیں دیکھے لیکن ان کا مطلب شعر و سخن علم و ادب کی درگاہ تھا اشعار بنا دیا کرتے تھے، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے مگر خود نہیں پڑھتے تھے (مجھے یہی روایت پہنچی ہے) منشی آبد مرحوم مجھ سے خود فرماتے تھے کہ میں اور وزیر مرحوم نے شروع شروع میں خواجہ محمد شاہ شہرت عظیم آبادی سے اصلاح لی ہے، ممکن ہے کہ قیام عظیم آباد کے زمانے میں شہرت نے اصلاح دی ہو اور کلکتہ میں حکیم سجاد سے اصلاح لینے لگے ہوں، کیونکہ اس گلدستے میں آبد کے نام کے ساتھ بھی تلمیذ حکیم سجاد موہانی لکھا ہے۔ منشی عبدالرحیم آبد عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ۱۳۱۰ھ میں ڈھاکہ آئے اور برسوں یہیں مقیم رہے ایک نکاح بھی کر لیا تھا، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ محلہ منشی بازار میں رہتے تھے، نوجوانوں کے شعر و سخن کی پرداخت ان کے ذمے تھے، اور اسی پر معاش تھی، آخر بیالیس برس یہاں رہے، بی بی کے مرنے کے بعد ڈھاکہ چھوڑا۔ کلکتہ چلے گئے وہاں کچھوا بازار میں قیام تھا، میں نے دو ایک بار تلاش بھی کیا، مگر کچھ پتا نہ ملا۔ سنتا ہوں کہ سات آٹھ برس ہوئے انتقال ہو گیا۔ شروع سے لغت کہتے تھے، غالباً ۱۳۱۱ھ میں سراج آباد کے نام سے پہلا دیوان شائع ہوا تھا۔ ان کے بعض اشعار اب تک میلاد خوانوں کی زبانوں پر ہیں۔

نتیجۂ سخن، جنوری ۱۸۹۵ء میں کلکتہ سے نکلا، یہ معلوم نہیں کہ کب تک زندہ رہا، لیکن فروری اور اپریل ۱۸۹۵ء کے پرچے میرے پاس موجود ہیں، طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ بڑی خصوصیت یہ تھی کہ طرح میں ترتیب

حروف تہجی کا خیال رکھا گیا تھا، اس میں غزلیں چھپواتے رہنے سے ہر شاعر کا دیوان مرتب ہو سکتا تھا۔ فردی ششدہ کی غزلیں ردیف وار اور اپریل ششدہ کی غزلیں ردیف وار ہیں۔ پہلے پرچے میں مصرع طرح الف پر ختم ہوتا تھا اور پرچے میں ش پر۔

اس گلدستے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ فارسی گو شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا، کوئی پرچہ بھی اس سے خالی نہیں اکثر سوانح یا حالات ہوتے تھے، چنانچہ اپریل ششدہ کے پرچے میں حادثۂ جاں گزا وسانحۂ الم افزا کے عنوان سے نواب جاہ بن قدر انجم نواب ناظم بنگالہ کے خلف اصغر کی بیماری، علالت اور رحلت کا حال اور انتقال کی تاریخیں ہیں۔

کبھی کبھی تصویر بھی شائع ہوتی تھی، مگر کیسی تصویر؟ ایک صفحے میں حاشیہ بنوا کر درمیان میں تصویر لگانے کی جگہ رکھی جاتی تھی اور اس میں فوٹو لگا دیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں البتہ یہ بہت مرنے کی بات تھی، مگر مجھے جہاں تک معلوم ہے ایسی تصویریں کم ہی نکلیں۔

فردی ششدہ کے گلدستے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیتو سخن کے قدرداں دور دور کے لوگ تھے۔ افسوس ہے کہ اس پرچے کے ۴ صفحے غائب ہیں تاہم جہاں جہاں اس کے سرپرست اور مربی موجود تھے اس کی ایک ناقص فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔

اس میں ڈنگ، مرشد آباد، جھاگل پور، ڈھاکہ، بوارد، کشن کوٹ، پرتاب گڈھ، میسور، پٹنہ، حیدر آباد، بنگلور، اجودھیا، لکھنؤ، رام پور، الور، مشہد، جام نگر، کشمیر، کاٹھیاوار، مٹیا برج، ٹالی گنج، زیادہ نمایاں ہیں۔

اس گلدستے کے بہی خواہ اور قدرداں اودھ والے تھے، چنانچہ ہمارا جا بہادر مانند سنگھ آف جبلی افسر تخلص، راجہ نارائن سنگھ والی سون برسا۔ جہاں آج بیر بر ٹھاکر کشن سنگھ ولی جھنڈ کشن کوٹ تخلص بیدار شاگرد منشی بنی رام فاخر، رائے امرناتھ لکھنؤ۔ بابو بچو لال رئیس کلکتہ کے نام فردی ششدہ کے پرچے میں موجود ہیں۔

تعجب ہے کہ سانح نے وزیر کا ذکر اپنی کسی تصنیف میں نہیں کیا حالانکہ اس گلدستے کے وہی مربی تھے۔ اگر اس کے سب پرچے مل جائیں تو بنگالہ و بہار کے اکثر شعرا کا نام و کلام مل سکتا ہے چنانچہ کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ لکھنؤ کے نامور وکیل مولوی محمد یوسف بھی شاعر تھے۔ یا بہادر راجا بہادر مانند سنگھ شاعر تھے اور اثر تخلص کرتے تھے اور حکیم سجاد حسین کے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

میرے پاس جو دو پرچے موجود ہیں ان کے سرسری مطالعے سے لکھنؤ، مٹیا برج، ٹالی گنج کے باشندے ۔ ذیل شعرا کا پتا لگتا ہے۔

حکیم سید حسن نیاز بلوی شاگرد داغ۔ مستند الشعرا خواجہ محمد تقی بیتاب لکھنوی، حماد الدولہ بہادر، ہنر شاگرد جہاں عالم اختر، رئیس الدولہ سید آقا بہادر شہاب الدولہ، شیخ الٰہی بخش تسکین، کاظم حسین جوہر شاگرد شہاب الدولہ، رخشاں، منشی عبد الصمد عشرت فتیل شاگرد عابدہ مرزا بیگم، ماہتاب الدولہ کوکب الملک، رخشاں، منشی رفاقت شاگرد ہنر، امداد حسین خان رضا شاگرد گلشن الدولہ

منشی عباس شاد شاگرد اختر، اسماعیل خان شوکت شاگرد اسیر، منشی شرف شاگرد مولوی سید علی حیدر حیدر۔ یمین جان شفیق شاگرد بقا، سید عبد المعبود شہباز دانا پوری، مرزا علی شاگرد منشی بحر، سید فرخ شاگرد سید علی حیدر حیدر طباطبائی مرزا فدا حسین فدا شاگرد گلشن الدولہ، سید مہدی قسیم شاگرد بحر، سید عبد اللطیف لطیفی شاگرد بقا مولوی صادق علی ثاقب شاگرد جان عالم اختر، خواجہ حسن علی عظیم آبادی شاگرد اسیر، آغا مرزا انجم شاگرد مولوی حیدر، منشی فرزند علی ناظم رئیس کلکتہ۔ مولوی دلدار شاگرد گلشن الدولہ بقا، سید علی ہمایوں شاگرد بیمار۔ میر یوسف علی لکھنوی شاگرد دیندار، محمد حسین عظیم آبادی حنیف شاگرد آبد عظیم آبادی۔ شیخ محبوب تجم خلف شیخ محمد علی کلکتہ۔ مولوی وحید رئیس کلکتہ شاگرد فرید عظیم آبادی، منشی عابد مرزا بیگم رہتی گو، حاجی قمر الدین باقی رہتی گو، شیخ افضل حسین افضل رئیس کلکتہ، عطاء الدولہ حسن، صاحبزادہ احمد شاہ کیوان شاگرد حیدر۔ حافظ مرحبا شاگرد اسیر، منشی نعیم۔ صاحبزادہ محمد اکبر شکوہ شاگرد اسیر، خواجہ شاگرد حیدر۔ صاحبزادہ ابراہیم شاہ رسا، شاگرد حیدر۔ مولوی سید مسلمی حیدر حیدر طباطبائی (ناظم لکھنؤ کا مدرس اور سلطانیہ مٹیا برج۔ منشی رضوی، مالک الدولہ مولت شاگرد منشی بحر، منشی عبد اللہ صابر، صاحبزادہ مزید جنت فرید دن شاگرد رضوی۔ فرخ شاگرد حیدر۔ صاحبزادہ محمد غلام یسین معین۔ منشی برخوردار علی مظلوم شاگرد اسیر، منشی نثار حسین نثار شاگرد حیدر،

شاعرات کی بھی ایک فہرست موجود ہے۔ اس میں سب کی سب طوائف ہیں اور اکثر کلکتہ کی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان چند پر شاعری کی تہمت لگائی گئی ہے اس لیے اس فہرست کو الحاقی کہتا ہوں۔

اس گلدستے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مٹیا برج (کلکتہ) میں خاندان میسوریہ کی سرپرستی میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور وہاں کے صاحبزادے اور ان کے متعلقین سبھی سب مولانا علی حیدر ناظم طباطبائی کے شاگرد تھے۔ ناظم مرحوم اس عہد میں حیدر تخلص کرتے تھے مگر ان کی شہرت مٹیا برج سے نکل کر کلکتہ میں انہیں استاد بنا رہی تھی اور اہل لکھنؤ کی طرح مولانا ناظم مرحوم بنگالی اردو دانوں سے نفرت نہیں کرتے تھے۔

زیر مرحوم نے اس پرچے کے لیے رپن پریس نام ایک مطبع بھی کھولا تھا اور غالباً نیچہ سخن کے بعد کلکتہ کا سب سے پہلا پیچ جزل گہر بھی انہوں نے نکالا تھا۔ یہ پرچہ ہفتہ وار تھا۔ اور رنگین کاغذ پر چھپتا تھا۔ بہترین طریقہ صفائی شائع ہوتے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ، بانکی پور سے اخبار، مراد آباد سے کرنی نکلا کرتے تھے بلکہ ہر صوبے سے پنچ اخبار نکلا کرتے تھے۔ یہ اخبار بھی کئی برس تک جاری رہا اور غالباً وزیر مرحوم کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔

ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ اس گلدستے کے شاعروں میں میرے خیال میں سوائے نواب محمد حسین صاحب رئیس پریا نواں کے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔

داغ کی غزلیں تقریباً ہر گلدستے میں میں نے دیکھی ہیں شاید مرحوم بھی حاضر باش ہیں۔ کبھی فرصت ملی تو شاعران عظیم آباد کی فہرست بھی

تکمیل مضمون کے بعد ہی مئی ۱۹۲۶ء کا پرچہ مل گیا۔ اس کے دو صفحے ابتدا کے غائب ہیں، تیسرے صفحے سے، کہ کٹس آف دی کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ تصویر بھی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ کسی انگریزی مطبع میں چھپی ہے اور کاٹ کر خالی جگہ میں جو اس مصرف کے لیے رکھی گئی تھی، چسپاں کر دی گئی ہے۔ تصویر نہایت اچھی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ پانچویں صفحے سے "ترجمۂ آلۂ برقی" کا آغاز ہوتا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس پرچے میں بھی یہ مضمون ناتمام ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر کے توالد بیان، یہ بھی تتمۂ سابق مضمون کا، تیرہویں صفحے پر ختم کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اصل گلدستہ ہے۔ اس پرچے پر جلد نمبر ۴ درج ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ مجبوری نہیں بلکہ فروری میں پہلا پرچہ نکلا تھا۔ مصرع طرح ش پر ختم ہوتا ہے۔

اس پرچے سے کلکتہ اور حوالی کلکتہ کے حسب ذیل نئے ناموں کا علم ہوتا ہے:۔ حافظ انعام اللہ انعام کان پوری و خواجہ حسام الدین حسام و عبدالرزاق شاد تاجور ہلی، حکیم عبدالصمد صمد کان پوری متخلص گلدستہ، شیخ محمد عارف معرف گورہلی مؤلف نہادی ذہبی ساقی الذکر خادمۂ منشی بشر، منشی مظفر علی بشر، حامد الدولہ دبیر، مولوی محمد اسحاق علی آگاہ، امداد الدولہ متخلص تلامذۂ جہاں عالم اختر، میر اصغر علی اصغر، مولوی زین العابدین وقار تلامذۂ گلشن الدولہ دبیر، منشی عبدالاحد احد خلف صمد ساقی الذکر، شاگرد حسام کان پوری، حافظ محمد امین امین کان پوری، مولوی عزیز کان پوری، مالک الدولہ ثابت، خواجہ محمد عاشق عاشق لکھنوی، آغا میرزا محمد حسین شیرازی تلمیذ منشی پیر بخش کریم شی آبدہ، محمد امین نکہت متوطن چکوال (جہلم)، ش، شیخ، شیخ نور محمد ندیم ش حافظ امین، بیگن بیگ بیگن، محمد یحییٰ یقین ش لفظیس کان پوری۔

غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب داغ کلکتہ آئے تھے، چنانچہ ان کی مشہور غزل "داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلا" اس پرچے میں موجود ہے، اس زمین میں ایک آدھ غزل اور ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مشاعرے کی زمین ہے۔

اس گلدستے میں شاعرۂ پردہ نشیں کے عنوان سے فضل النساء بیگم صابرہ تخلص بہ مطلوب مقیم شملہ کی طرحی غزل ہے۔ بازاری عورتوں میں کلکتے کی ساری نامور طوائفیں جلوہ افروز ہیں۔

یہ گلدستہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے تقطیع ۲۰×۲۶ ہے، مجھے روایت پہنچی تھی کہ وزیر مرحوم سندریہ پٹی میں رہتے تھے، مگر اس پرچے کی اخیر سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۵۲ کولمٹی کو صوتوالہ بالی گنج میں رہتے تھے اور وہیں ان کا پریس تھا۔

[بعض نام مکرر ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون کا آخری حصہ ابتدائی حصے کے ساتھ، کہ کہیں لکھا گیا ہے، نتیجہ سخن کے متعلق ایک سلسلۂ مضامین جناب حسرت موہانی نے اردوئے معلی میں لکھا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس گلدستے کی ابتدا فروری ۱۹۱۳ء سے ہوئی اور مجبوری ۱۹۱۳ء کے بعد تک نکلتا رہا۔ جناب حسرت نے یہ نہیں بتایا کہ کب بند ہوا۔ اردوئے معلی، مجبوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۱۳ء۔ سیار۔]

مولوی سید عبد الغفور شہباز داناپوری کی غزل ملاحظہ ہو۔ یہ غزل فروری نمبر ۱۹۳۳ء کے پرچے میں چھپی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم شہباز کی طبیعت ابتدا سے غزل گوئی سے نفور تھی۔ بعض اشعار حذف کر دیے گئے ہیں:-

ہمیں ہے علم کے شجر کی تلاش — شجرِ علم کے ثمر کی تلاش
علم انساں کا دل ہے علم جگر — تم کو ہو اس دل و جگر کی تلاش
قتل کرنے کو جہل موذی کے — کیجیے تیغ کی تبر کی تلاش
ہو نہ جس شخص پاس نقدِ عمل — نہ کرے علم کے ثمر کی تلاش
یاد رکھو ریاضی و حکمت — ہے یہ دانش کی عرعر کی تلاش
قول سے پہلے ہو عمل مطلوب — آہ سے پہلے ہو اثر کی تلاش
کیجیے سو کام چھوڑ کر دل سے — بہتر و بیج علم، زر کی تلاش
شام ادبار کو ہے ویرے یاں — عزو اقبال کے سحر کی تلاش

تا اڑیں عرشِ مجد تک شہباز
اس لیے ہے یہ بال و پر کی تلاش

خود مالک گلدستہ محمد وزیر وزیر کے رو چار شعر اس زمین میں لیجیے:-

شب فرقت پھر آنے والی ہے — شام سے ہوگی پھر سحر کی تلاش
کیوں مری خاک اڑتی پھرتی ہے — ہے اسے کس کے بام و در کی تلاش
تم سے کیتے عمر کو ڈھونڈھا — تم نے دیکھی مری نظر کی تلاش

غیر طرح میں، نواب سید آسمان قدر اسد علی مرزا ثریا خلعت نواب ناظم مرشد آباد۔

جاتا ہوں سر کو پھوڑنے میں کوہسار پر — وحشت بڑھی ہے آمد فصل بہار سے

نواب ابراہیم علی خاں والی ٹونک متخلص بہ حافظ۔

ذرا پوچھو حال شب جدائی ہو دل کو رنج خوں ہوا — تمہارے سر کی قسم ہے صاحبو کہ صبح کرا کٹھن ہوا ہے

نواب والا قدر سید حسین علی مرزا، نواب ناظم بنگالہ۔

آئیں کیونکر ہم سے بدقسمت تری محفل کے پاس — ڈوبنے والے پہنچ سکتے نہیں ساحل کے پاس
پوچھتے جاتے ہیں غیروں سے پتا ولدار کا — لے چلی ہے جستجو سے حق ہمیں بابل کے پاس

اپریل ۱۸۳۳ء، خواجہ ولایت علی سرور شاگرد خواجہ آتش۔

ملنے سے کچھ فرق ہے نہ فریاد سے فرق — مجھ کو ہے چپکے چپکے تری یاد سے فرق

مقالات

(۱) ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات از ڈاکٹر ابوالعلم محمد نظام الدین بی ایچ ڈی، صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ و مترجمہ جناب عبدالمنان صاحب بیدل ایم اے پروفیسر مشن کالج (۲) سکندر اور خاقانی از قاضی عبدالودود (۳) افسر کے متعلق چند غلط فہمیاں، از آزاد و حبیلی۔

ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات

از ڈاکٹر ابوالعلم محمد نظام الدین صاحب
مترجمہ جناب عبدالمنان صاحب بیدل

ایران پر جب مسلمانوں کا تسلط ہوا تو اس ملک میں ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے پہلوی کے مقابلے میں فارسی کہتے ہیں۔ اس زبان نے بے شمار شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا تماشا دیکھا ہے اور اس کا ادب ہزار سال سے زیادہ کی مدت میں جو تغیرات ہوئے ہیں اُن کا آئینہ دار ہے۔ شاید ہی کوئی اور زبان جو ادبی حیثیت اختیار کر چکی ہے فارسی کا اس خصوصیت میں مقابلہ کر سکے۔

رودکی کا عہد فارسی شاعری کے بچپن کا زمانہ ہے، فردوسی نے اسے رزم سے آشنا کیا، خاقانی اور نظامی کا عہد قصیدہ گوئی اور افسانہ نگاری کا زمانہ تھا۔ سعدی و رومی کی صوفیانہ اور اخلاق آموز شاعری میں تمثیلی حلقے کے اثر نمایاں ہیں۔ حافظ اور جامی نے تغزل کو اوج کمال پر پہنچایا، قاآنی کے ہاتھ میں فارسی شاعری ایک موسیقی کا ساز بن گئی جس سے دلکش صدائیں نکلتی تھیں لیکن یہی شاعری آج کل اصلاح معاشرت اور احیائے ملت کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔

اس زبان میں نثر کی ابتدا عربی تواریخ اور تفاسیر کے ترجمے سے ہوئی، بلعمی، ناصر خسرو، نظام الملک طوسی، نظامی عروضی سمرقندی اور سعدی نے تاریخ اخلاق اور ادب میں ایسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ تاتاریوں کے خونی کارنامے جامع التواریخ، تاریخ جہاں کشا، جوینی، تاریخ وصاف اور تاریخ گزیدہ مصنفہ حمد اللہ مستوفی کے صفحات میں ایسے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں جو مرتوں زندہ رہیں گے محقق طوسی اور واعظ کاشفی نے اخلاق، رسالے لکھے ابوالفضل و فیضی کے زمانے میں انشاء و رسائل کے سیاسی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنی، آخری دو صدیوں میں تشبیہ سے متاثر ہوئی، اور اب اسی کے ذریعے سے حب وطن کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔

فارسی ادب کے پانچ دور ہیں فارسی ادب کی تاریخ پانچ دور میں منقسم ہو سکتی ہے۔ پہلا دور،
(سنہ ۹۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک) سامانیوں اور طاہریوں کا دور حکومت اسے رودکی کا بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں منطقی، بادغیسی اور دقیقی جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ یہ فارسی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس زمانے میں دو بیتی یا رباعی تصیدے اور مختلف اقسام کی مثنویوں کا رواج ہوا۔

دوسرا دور (۱۰۰۰ء سے ۱۷۲۱ء تک) فارسی ادب کا دورِ زریں تھا اور یہ غزنویوں، سلجوقیوں اور خوارزم شاہیوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں فارسی ادب میں ہر قسم کی نظم اور مختلف طرح کی نثر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور شعرا عنصری، فردوسی، عمر خیام، ناصر خسرو، سنائی، خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، عطار، اور سعدی ہیں، بیرونی اور بیہقی سے مورخین، بوعلی سینا سے فلسفی، نظام الملک سے سیاست داں، غزالی سے منطقی، ابو سعید ابوالخیر سے صوفی، اور نظامی عروضی سمرقندی سے ادیب نے ادبیات ایران کو مالا مال کر دیا۔

تیسرا دور (۱۵۰۰ء سے ۱۹۲۵ء تک) مغلوں کے حملۂ ایران سے شروع ہوتا ہے۔ اور تیمور کے زمانے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس دور کو ایرانی تیموری دور کہتے ہیں اس دور کے مشاہیر ادبا، رومی، ناصر الدین طوسی، رشید الدین فضل اللہ، عطا جوینی، وصاف، عراقی، اوحدی، شبستری، ابن یمین، خواجو کرمانی، عبید زاکانی، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی، میر علی شیر نوائی، جامی اور واعظ کاشفی ہیں۔

مغلوں کے حملے کے بعد ہی فارسی کی تمام ذہنی اور ادبی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ لیکن تیموریوں اور ان کے اخلاف کا زمانہ اس زبان کا دور تجدد ہے۔ اس دور کا آخری حصہ میں فارسی شاعری کے درخت میں پھر پھل پھول آئے۔ اس زمانے کی بہت ہیں لیکن کچھ زیادہ بلند پایہ نہیں، اور ان میں وہ جدت اور آزاد خیالی بھی نہیں ہے جو مغلوں کے حملے سے پیشتر ادب فارسی کی ممتاز خصوصیت تھی۔

چوتھا دور (۱۷۲۱ء سے ۱۸۰۰ء تک) جو ایک طویل دور ہے۔ صفویوں، مغلوں اور قاچاریوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور خاندان صفویہ کے عروج سے شروع ہوتا ہے۔ اور ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل اور حکومت مشروطہ کے مطالبے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ دور انحطاط و جمود کا دور تھا۔ صفویوں نے آزاد خیالی بالکل نہیں آنے دی تھی، صرف مذہبی علوم کی ترویج کے درپے تھے اور ان کے زمانے میں سارا زور شیعیت مذہبی مناظروں میں صرف ہوتا تھا۔ البتہ مغلوں نے جو ہندوستان کے فرماں روا تھے اس زبان کے وقار کو باقی رکھا اور فارسی کے شعرا و مصنفین کی خاطر خواہ ہمت افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی تہذیب کا ایک نیا مرکز ہندوستان میں قائم ہو گیا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کی طرز بیان پیدا ہو گئی جس کا معتد بہ اثر وسط ایشیا کے ادبیات پر پڑا۔

قاچاریوں کی حکومت کی ابتدائی زمانے میں شعرا و مصنفین قدیم طرز کا تتبع کرتے رہے۔ اور کوئی قابل قدر کتاب نہیں لکھی، لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جبکہ ایرانیوں کو ان یورپی اقوام سے جن کا موقع ملا جو فارس میں اپنا اقتدار اور اثر قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل تھیں تو فارسی شاعری میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا، اور اس زبان میں نئی طرز کا ادب پیدا ہونے کی راہ کھل گئی۔

اس جدید تحریک کی ابتدا اتفاقاً آنے سے ہوئی، وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان سے واقف تھا اور اس لیے متعدد

کتابیں ان زبانوں سے ترجمہ بھی کی گئیں۔ بشپ بہائی اور یوناے جدید قی نے بھی زبان کی صفائی میں اچھی طرح کوشش کی اصلاح زبان کے لیے ایک تعلیمی ادارہ دار الفنون کے نام سے کھولا گیا جس کا مقصد مغربی علوم کی تعلیم تھی۔ اس ادارہ کا پہلا ناظم رضا قلی خان لالہ باشی المتخلص بہ مجمع الفصحا، الشخاص پر ہدایت تھا۔

ارب فارسی کا پانچواں اور آخری دور ۱۹۰۵ء کے انقلاب فارسی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور "تنفست مشروطہ خواہی" اور "شورش ملی کا دور ہے۔ اسی دور میں خاندان پہلوی کو جو اب تک قائم ہے عروج ہوا۔ معاشرتی اقتصادی اور ملی جنگ وجہاد از نئی طرح کی حکومت نے ایک نئے قسم کا ادب اس زبان میں پیدا کر دیا۔ اور ایک جدید تہذیب کی بنا ڈالدی۔ اس دور کے ادبی رجحانات کے تصور کے لیے ایران کے آخری تیس برس کی سیاسی اور تاریخی حالت سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر براؤن کی کتاب "انقلاب ایران" میں انقلاب فارس ۱۹۰۵ء لغایت ۱۹۰۹ء کے دور عبوری کے وحشت خیز واقعات بوضاحت درج ہیں یورپ کے جنگ عظیم کے قبل اور بعد کے چند ضروری واقعات بیان کرتا ہوں:۔

قاچاریوں کے عہد میں ایران کا اقتدار و وقار بہت کچھ زائل ہو گیا تھا۔ ایران انگلستان اور روس کے نشانے میں تھا، اس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بلوچستان ہندوستان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ہرات اور قندھار برطانیہ کے زیر نگیں آچکا تھا، اور آذربائیجان سلطنت روس کا جزو ہو گیا تھا۔ ایران اپنے مقبوضات کی حفاظت سے قاصر تھا۔ بیرونی حکومتوں کو طرح طرح کی رعایتیں اور تجارتی آسانیاں دیدی گئی تھیں۔ ایران روس اور برطانیہ سے کڑے شرح سود پر قرضے لیتا اور شرمناک اور ذلیل معاہدے کرتا تھا۔ ۱۹۰۷ء کا برطانوی روسی عہد نامہ ایران سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں گھرا ہوا تھا، بادشاہ اور وطن پرستوں کی کشمکش روز بروز سخت تر ہوتی جارہی تھی۔ اگرچہ پرانی حالت ۱۹۰۶ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے بعد باقی نہ رہی تھی تاہم رعایا عجب پراگندگی کی حالت میں تھی، آخر کار بادشاہ کی علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔

سیاسی بیداری۔ اس زمانے میں اصلاح حکومت کی تحریک زوروں پر تھی، حاکموں کے ظلم، مذہبی مقتداؤں کے تعصب، رعایا کے افلاس، غرض سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں۔ مظفر الدین شاہ کی سادہ لوحی اور وزرا کے اقدامات غیر قانونی نے اہل ملک کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ خفیہ انجمنوں کی تشکیل ہوئی۔ باوجود سفاکانہ طریقہ استبداد کے اہل ملک نے جان پر کھیل کر ناصر الدین شاہ کے جانشین محمد علی شاہ کو تشکیل شروطہ کے لیے مجبور کیا۔ تبریز میں وطن پرستوں کا ماوی تھا، سلطنت کے خلاف بغاوت ہوئی، پسپا ہونے وطن پرستوں کی ایک جماعت کے ساتھ طہران پر دھاوا بول دیا، نہایت جوش میں سردار اسعد جو سردار انقلاب تھا اپنے ہم قوم بختیاریوں سے ملکر گورنر کو معزول کر کے طہران پر فوج کشی کر دی۔ جب ان دونوں سرداروں نے مل کر

دارالسلطنت پر حملہ کر دیا تو بادشاہ نے حکومت مشروطہ کو از سر نو قائم کرنے کی رضامندی تو دے دی لیکن جب مجلس کی کارروائیوں میں بادشاہ برابر رکاوٹیں پیدا کرتا رہا تو لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے احمد شاہ کے لیے تخت شاہی خالی کر دے، لیکن اس نے بھی اہل ملک کے ساتھ بے وفائی کی اور ملک کو اپنی حالت پر چھوڑ کر یورپ چلا گیا۔

اگرچہ جنگ کے زمانے میں ایران نے اپنے غیر جانبدار ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر اتحادی سلطنتوں نے جو اس کے اطراف میں قائم تھیں اس کی ذرا بھی پروا نہ کی اور ایران بھی ساحت جنگ بن گیا۔ انگریزی، الائی روسی اور ترکی فوجوں نے ملک میں گھس کر ملک کو تباہ کرنا شروع کیا۔ طہران کی مرکزی سلطنت میں نہ اپنے کو غیر ملکی حملہ آوروں سے بچانے کی قوت تھی اور نہ ملک کے متمدنین کو مطیع رکھنے کی صلاحیت تھی۔

فروری ۱۹۲۱ء میں جنرل رضا خاں نے ایک دستہ فوج کی مدد سے دارالسلطنت پر قبضہ کر کے سنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ایک کیبنٹ قائم کی اور خود وزیر جنگ بنا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے مشہور پہلوی کیبنٹ قائم کی اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

رضا شاہ قوم کے ناخدا کی حیثیت سے۔ مختصر ایک زبردست ہستی کی آمد نے ملک کو بربادی سے بچا لیا۔ وہ مملکت جو صرف تیس برس پہلے غیر متمدن غیر منظم، بے سرمایہ اور بے حیثیت اور جو محض چند دنوں کی مہمان سمجھی جاتی تھی، حیرت انگیز طور پر ایک ایسی جدید سلطنت بن گئی جسے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے

اس انقلاب عظیم کا سہرا رضا شاہ پہلوی کے سر ہے۔ رضا شاہ پہلوی نے ایک سپاہی کی طرح اپنی زندگی شروع کی مگر اپنی ان تھک کوششوں، ہوشیاری، ذہانت، قابلیت، ہمت، اور اصول جنگ کی واقفیت سے آخر کار تاجدار ایران بن گیا۔ اس نے ترک مصطفےٰ کمال اتاترک سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے ایران کے مرتبے کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے اس کے پانزدہ سالہ دور حکومت میں ایران نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اب ایران آزاد ہے، قرضوں سے اسے نجات مل چکی ہے۔ انیار کے بچوں سے چھوٹ چکا ہے اور اپنی قسمت کا آپ مالک ہے۔ رضا شاہ کی کارروائیوں کا خلاصہ یہ ہے۔ ایالاتی امتیازات اجنبی میں کیپی چریشنس منسوخ ہو چکے ہیں۔ ایران میں منظم حکومت قائم ہے۔ جمہوری اداروں کی داغ بیل پڑ چکی ہے اور عالمگیر سے مستقل سیاسی تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ معاملات پر اب غیر اقوام کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ نوابین انصاف کی اصلاح کی گئی ہے۔ فوجی تعلیم ملک بھر میں جاری ہے۔ اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے باقاعدہ فوج موجود ہے جنگی جہازوں اور ہوائی بیڑے کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ ملک میں، قومی زراعتی اور پہلوی بینک قائم کیے گئے ہیں، اور اینگلو پرشین آئل کمپنی سے جو نیا معاہدہ ہوا ہے اس سے توقع ہے کہ ایران کی مالی حالت بڑی حد تک ٹھیک ہو جائے گی۔ رضا شاہ نے سماج کی حالت درست کر دی ہے۔ قوم تعصب کی آلودگیوں سے پاک کر دیا ہے۔ نظام تعلیم کی تجدید کر دی گئی ہے اور مضبوط سڑکیں بنوائی ہیں۔ ریلوے تیار کی ہے۔ تار، لاسلکی، ٹیلیفون اور فیکٹریاں قائم کر دی ہیں

ملکی صنعتوں کی ہمت افزائی کی ہے ایک پائدار سکہ رائج کیا ہے۔ درحقیقت ایران جدید کا قائم کرنے والا وہی ہے اور یہ اس کی کرامت ہی کرامت ہے۔

ایرانی صنعتوں کی نمایش ۱۹۳۰ء میں لندن میں پہلی بار ایرانی صنعتوں کی نمائش ہوئی۔ اس نمائش کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے بین الاقوامی تعلقات کے پیدا ہونے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ورنہ آج تک ایران دنیا سے الگ تھلگ رہنا ہی مستحسن سمجھتا تھا۔ برٹنگٹن ہاؤس میں جن صنعت کاریوں کی نمائش ہوئی اس نے حسن پرست یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس نمایش سے یورپ اور ایشیا کے صنعتی تعلقات کا بھی پتا چلا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مغربی تہذیب پر ممالک سے کہیں زیادہ ایران کا اثر ہے۔ ایشیا کو بھی ایران سے بہت سی چیزیں ملی ہیں۔ ہند کی مینیچر پینٹنگ ایران کی فن کاری کے اثر کی ایک مثال ہے۔ اس نمایش سے اس بات کا بھی پتا چلا کہ ایرانیوں نے غیر ملکی تہذیب کے اخذ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے، اور حالت زمانہ اور ماحول کے مطابق ان میں پرانی ترکیبوں کو درست کر لینے کی کافی استعداد ہے۔ ایران کی صنعت کا بیش بہا فرانہ تمام ملکوں سے جمع کر کے بااصول اور مرتب طریقے سے دینا کے سامنے پہلی بار پیش کیا گیا۔ نمائش کی کامیابی بادشاہ کی اعانت اور ذوق کی مرہون ہے، شاہ ایران کے اس قابل قدر اقدام کا خیر مقدم تمام اقوام نے کیا، دو تہائی سلطنتوں نے اس نمائش میں شرکت کی۔ ۳۵۰ سے زیادہ عجائب خانوں، یونیورسٹیوں اور کتبخانوں اور رصد ہاؤ دوسرے لوگوں نے نمائش کی چیزیں بھیجکر اس میں بین الاقوامی مشارکت صنعی کو کامیاب بنایا برٹش میوزیم میں بھی ایران کی صنعتوں کی نمائش ہوئی۔ رضا شاہ نے پہلی بار دنیا کو دکھا دیا کہ وہ کتنا اصلاح و ترقی کا دلدادہ ہے۔ کس عمدہ اور مناسب نظم و نسق کے ساتھ کسی کام کو انجام دے سکتا ہے۔ اور ایران کے وقار قدیم کو از سر نو قائم کرنے کا کس درجہ خواہشمند ہے، ایران کو مشرق کی قوموں کے صف اول میں لانے کے لیے کتنا بے چین تھے۔ لینن گراڈ میں جو ایران کی صنعتوں کی نمائش ہوی۔ اس سے ایران کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۳۳ء میں رضا شاہ کی سیاحت یورپ سے شوکت ایران بہت بڑھ گئی سیاحت سے واپسی کے بعد رضا شاہ پہلوی نے سوسائٹی کے اصلاح کی اسکیم تیار کی اور اس اسکیم پر استقلال کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے۔

فردوسی کی ہزار سالہ برسی ۱۹۳۴ء میں فردوسی ایران کے مشہور رزم نگار کی ہزار سالہ برسی بڑے جاہ و جلال، شاہانہ شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ کسی دوسری مشرقی قوم نے شاید ہی کسی شاعر کی عظمت کا اعتراف اس انداز سے کیا ہو۔ دنیا کے ہر حصے سے مہمان ایران اور دستور قبیں اس موقع پر اپنے اپنے ملک کی طرف سے خراج تحسین ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ایرانیوں نے جس جوش اور سرگرمی کا اس موقع پر اظہار کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اب بیدار ہو چکے ہیں، اور اپنی تہذیب کو مرنے نہیں دینا چاہتے۔

۱۴ اکتوبر کا دن طوس کی تاریخ کا سب سے شاندار دن ہے۔ شہنشاہ ایران نے مختلف ممالک عالم کے

نمایندوں کے سامنے فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے متعلق کارروائیوں کا افتتاح کیا۔ ہزار برس قبل شاہنامہ کو قدرشناس مل نہ سکا۔ لیکن ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو فردوسی کی عظمت شاعرانہ کے آگے مشرق و مغرب دونوں سر تسلیم خم کیے تھے۔

پرشیا کی جگہ ایران: ۱۹۳۵ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ ملک کا نام ایران ہے جو قدیم سے چلا آتا ہے۔ پرشیا ایک بیرونی لفظ ہے جس کا اطلاق ملک پر نہیں ہونا چاہیے۔

لفظ ایران کا ماخذ پہلوی زبان ہے اور اس کا سلسلہ اوستا کے لفظ آریانا سے ملتا ہے جو لفظ آریہ کی صورت مصغر ہے۔ لفظ پرشیا مغربی الاصل ہے۔ غالباً قرون وسطیٰ میں ایران اس نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ لفظ پرسائی جو یونانیوں اور رومیوں کی زبان پر اکیمینید کے لیے تھا۔ یہ غالباً پرسس سے ماخوذ ہے جو ایران کے جنوبی مغربی حصے (جو آج کل فارس کہلاتا ہے) کا نام ہے۔ اس کا نام غالباً ایک قبیلے 'پارسوا' کے نام پر رکھا گیا تھا جس کا ذکر اسیریا کے کتبات میں ہے۔ لیکن قدیم زمانے سے لفظ فارس خاص قسم کی بولیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جیسا کہ فہرست میں لکھا ہوا ہے' یہ زبان نویں صدی سے ایران کی ادبی زبان بن گئی، اور اسی کو ہم فارسی کہتے ہیں۔

ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد لفظ ایران جب عام ہو گیا، لیکن انیسویں صدی سے قبل ایران کے باشندے اپنے کو ایرانی اور اپنے ملک کو ایران نہیں کہتے تھے۔

جدید اجتماعی اصلاح: ایران میں سوسائٹی کی اصلاح کے لیے اور بھی تحریکیں ہو رہی ہیں اور ان پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔ مثلاً یورپی لباس کا جبریہ استعمال، کلاہ پہلوی کی جگہ پر یورپی فلٹ سیٹ کا پہننا، اور پردہ کا اٹھا دیا جانا، جس سے عورتوں کو آزاد کیے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔

آج کل ایران اس دھن میں ہے کہ ایرانیوں کو جدید یورپی اقوام کے دوش بہ دوش کھڑا کرے، اور اس مقصد کے حصول کے لیے اور دوسرے افادی اصول کی بنا پر وہ کوشش کر رہا ہے کہ جہاں تک حد امکان میں ہو مغربی بن جائے۔ یہ تغیرات صرف فروع سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اصل تک جاتے ہیں۔ آگے چل کر ان کا ملک پر کیا اثر ہوگا اس کا ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ملک کا قدامت پسند طبقہ ان جدت طرازیوں کا سخت مخالف ہے، لیکن رضا شاہ پہلوی اپنی "مغرب سازی" کی کارروائی جاری رکھی ہے۔ ایک اور اہم کام جو اس سلسلہ میں ہوا ہے وہ مذہب و سیاست کی تفریق و تقسیم ہے، نئی روشنی کے پروانوں نے دیکھ لیا کہ قوم کا صدیوں تک اپنی ناکامیوں پر ماتم کرنا فعل لاحاصل تھا، اور صرف لاحاصل ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی تھا اس لیے کہ اس ماتم گساری اور سینہ زنی نے قوم کی ذہنیت کو پست کر دیا ہے؛

ان کے خیال میں ادبی ترقی کی کوشش فرض ہے اگرچہ اس کوشش میں دینی اور دماغی مفاد کو قربان کر دینا پڑے اس لیے کہ مذہب کے غلط تصور نے ایران میں سیکڑوں فتنے برپا کر رکھے تھے۔

یوم ملت: قدیم ساسانی تہوار کو منانے کی رسم بہت دنوں سے ایران میں رائج تھی۔ لیکن ۳ اسفند ۱۲۹۸ھ شمسی مطابق ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء پہلوی خاندان کے آغاز کی تاریخ ہے۔ "عید ملی" کی تاریخ قرار دی گئی۔ حال ہی میں "عید ملی" بڑی دھوم دھام اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ ۲۳ فروری ۱۹۳۵ء کو طہران میں منائی گئی۔ یہ عید کزلباش مقاتلوں کے طہران پر حملہ کرنے، ان کے کمانڈر ان چیف بنا دیے جانے، اس کے بعد وزیر جنگ، وزیر اعظم بننے اور بالآخر ۱۹۲۵ء سریر آرائے سلطنت ایران ہونے کی یاد کا دن ہے۔

نظام تعلیم کی اصلاح: اب تک زبان، ادب اور طریقۂ تعلیم کی درستی میں انفرادی کوششیں ہوتی رہی تھیں لیکن موجودہ دور میں حکومت نے نظام تعلیم کو اساس استوار پر قائم کرنے کی خاص کوشش کی ہے۔ پرانے مدارس توڑ دیے گئے ہیں اور طرز جدید پر ابتدائی و ثانوی مدارس قائم کیے گئے ہیں۔ حال ہی میں ایک یونیورسٹی بھی سائنس اور آرٹ کے ہر شعبے کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی ہے۔ سپہ سالار کا پرانا مدرسہ جو قدیم طرز کا مذہبی اور دینی مدرسہ تھا اب قانون، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم کا کالج بن گیا ہے۔ نصاب تعلیم نئے اصول پر مرتب ہوا ہے۔ ہر سال طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے سلطنت کی طرف سے یورپ بھیجی جاتی ہے۔ قلمی کتب کی حفاظت اور نئے اصول پر کتبخانوں کی تنظیم شروع کی گئی ہے۔ مذہبی اوقاف کا انتظام نئے اصول پر کیا جا رہا ہے۔ مشہد مقدس کے اوقاف کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔

فرہنگستان اور اصلاح زبان کا مسئلہ: سلطنت عالیہ ایران کے جدید ترین مساعی جمیلہ میں سب اول انجمن کا قیام بھی ہے جو فرہنگستان ایران کے نام سے مشہور ہے اور جس کا مقصد زبان اور ادبیات ایران کی ترقی و توسیع ہے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد میں زبان فارسی کی وہ زائد خوبیوں کو پورا کرنے کی ترکیب سوچنا ہے اور اس ڈھنگ سے زبان کی اصلاح کرنا ہے کہ اس کی بین الاقوامی اہمیت باقی رہے۔

سرکاری اعلان کے مطابق اس انجمن کا مقصد ایک لغت کا مرتب کرنا موجودہ فارسی سے بعض محاورات اور الفاظ کا نکالنا۔ ان میں اضافہ کرنا۔ اصطلاحات علمی کا وضع کرنا۔ بیرونی عناصر سے ملک کی زبان کو پاک کرنا۔ آئندہ کے لیے فارسی کے شعراء اور ادیبوں کی رہبری کرنا اور رسم خط کی اصلاح کرنا ہے۔

یہ ہدایتیں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وقت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب مفکرین، ادباء اور سیاست داں اشتراک عمل کی کوئی ٹھوس بنیاد قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف "تاریخ تنقید جدید" مسٹر جرج سینٹسبری کا قول جدید فارسی ادب پر بالکل منطبق ہوتا ہے: "قدیم ہیئت جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی

نا مابل اصلاح حماقت ہے۔" مغربی تہذیب کو تمام تر اختیار کرنا، یورپ کی ہر بات کو مستحسن سمجھنا اور ان کی معاشرت کو اندھوں کی طرح قبول کرنا اساس ملی کے فقدان کے نمایاں آثار ہیں۔ جدید فارسی ادب میں تین متضاد رجحانات نمایاں ہیں۔

بعض لوگوں کا مستقل خیال ہے کہ اسلامی روایات سے علیحدگی نہ کی جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ان کا میلان خالص فارسی روب وتمدن کی ترقی اور تاریخ ایران کی اہمیت کو واضح کرنے کی طرف بھی ہے۔ بعض "ایران پرست" لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہو سکے تو فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کر کے سامانیوں کے زمانے کی فارسی کو، جسے وہ اصلی فارسی سمجھتے ہیں، رواج دیا جائے۔

ایک معتد بہ تعداد فارسی اور عربی کے موجودہ تعلق اور اختلاط الفاظ کو روا رکھتی ہے۔ اور یورپ کی بہ نسبت قاہرہ سے الفاظ کے لیئے کوزیادہ پسند کرتی ہے۔ مگر مصنفین اور عربی خط تحریر کی طرف داری" اس خواہش کا وہ بااثر اور باعمل طبقہ مصنفین مخالف ہے۔ جو اپنے اہل وطن کو تقلید یورپ کا سبق پڑھاتا ہے۔ اور لاطینی رسم خط کو اختیار کرنے کا حامی ہے۔

جب سے ترکوں نے لاطینی خط اختیار کر لیا ہے، اہل فارس بھی اس معاملے پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہے ہیں مگر قبل اس کے کہ تبدیل خط عمل میں آئے امور ذیل کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

رسم الخط کی حالت دونوں ملکوں میں بالکل جداگانہ ہے۔ "عربی خط" ترکی زبان کے لیے نامناسب تھا۔ یہ فارسی زبان کے لیے بالکل نہیں تو بڑی حد تک مناسب ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان کے الفاظ فارسی کے اجزائے صحیح بن گئے ہیں۔

فارسی کی ادبی زبان میں بہ نسبت بکلی اور بازاری زبان کے عربی کی اہمیت اور ضرورت کہیں زیادہ ہے۔ فارسی کا خزانہ ایسا قیمتی خزانہ ہے، جس کی نظیر کسی دوسری مشرقی قوم کے پاس نہیں، جدید حکمیات کے سوا کوئی ایسا علم وفن نہیں جس کا بہترین نمونہ فارسی زبان میں دستیاب نہ ہو سکتا ہو۔ بہتر سے بہتر پایہ اخلاق فلسفیانہ تخیلی، اور مذہبی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں ہیں۔

سیاسی شورشوں اور ہنگاموں سے فاتحانہ نجات کے بعد ایران کو بڑے بڑے سماجی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ فارس مغرب کی کورانہ تقلید کرے یا "حیات جدید" کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مشرقی قوم کی حیثیت کو قائم رکھے اس مسئلے کا حل آسان نہیں۔ ایران اب تک ناپائدار اور بے ثبات حالت میں ہے۔ ایران کے سامنے ترکی کی مثال ہے، جو فی الحال ازمنۂ گزشتہ کو بھول کر اندھوں کی طرح مادی مفاد کو پیش نظر رکھ کر یورپ کی نقالی کر رہا ہے۔ لیکن ترکی اور فارس کی جغرافیائی اور ذہنی اور ملی حالت بالکل مختلف ہے۔

ایران جدید میں ہر آدمی کو مشرق و مغرب میں ایک جنگ نظر آئے گی، مدعا یہ ہے کہ بالکل مادی مفاد کے اصول کے ماتحت اور یورپی معاشرت کی طرز پر ترقی کی جائے لیکن کلچر کے لحاظ سے یہ بھی خواہش ہے کہ ساسانیوں سے قبل کی روایات کی طرف پلٹ چلنا چاہیے، موجودہ حکومت کی اُن کوششوں کے طریقوں کو جو ایران کی معاشرت کی تبدیل کے لیے کر رہی ہے، کسی فلسفیانہ اصول یا قاعدے کی بنا پر سراہنا ناممکن ہے۔ ایران ہمیشہ سے ایک علم دوست ملک ہے، وہ اپنے قریب اور بعید کے ازمنۂ گزشتہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ فارس کا منتہائے نظر ہمیشہ غیر مادی اور مذہبی رہا ہے اور یہ نظریہ سوسائٹی کے ہر طبقے میں موجود ہے۔ اسلام نے ایران میں ایک روح پھونک دی تھی جس نے ساسانیوں کے ہر جزو بدن کو نئی زندگی بخش دی تھی لیکن اگر اب وہ فتح اسلام کے قبل کی روایات کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو اس کی حالت اس بہتر نہ ہوگی جیسی ساسانیوں کے آخری تاجدار یزدجرد ثالث کے زمانے میں تھی۔ لیکن اسی طرح مصر کی مثال بھی مشرقی اقوام کے سامنے ہے جس نے باوجود مغربی اقوام سے براہ راست تعلق کے اپنی زبان کی امتیازی خصوصیات کو قائم رکھا اور زبان میں ایسی اصلاحیں نہیں کیں جن سے اس کا اصلی رنگ بدل جائے۔

جب ایرانیوں کو ایران کی عظمت کے خواب دکھائی دے رہے ہیں، جب وہ ساسانیوں کی روایات پر فخر کرتے ہیں۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے مفاد سے کیوں کر علیحدگی کا اظہار کر سکتے ہیں جس کی تہذیب اُن کی روح میں سرایت کر چکی ہے اور اسلام کے برکات کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جو ان دنوں سب سے بڑی متحد کرنے والی طاقت ہے۔ زمانۂ ماضی میں ایران نے اسلامی اسپرٹ کو ہر شعبۂ حیات میں ممتاز جگہ دے رکھی تھی اور اب بھی جدید قوتوں کے باوجود ایران اپنی برتری اور بزرگی ثابت کر سکتا ہے اور، اپنے مذہب، اپنی زبان اور اپنی قومیت کو قائم رکھ سکتا ہے۔

سکندر اور ضاحک

از ق ر ا ر د ہ

کلیات سودا کے بعض نسخوں میں ایک مخمس ہے جو میر ضاحک کی ہجو میں ہے، اس کی شان نزول آزاد یوں بیان کرتے ہیں۔ "سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا یا رب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر، تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام؟ میر مہدی حسن قزاغ کو خدا مغفرت کرے، انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے، صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے، شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر (مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے، ان کی پرانی وضع اور لباس پر... صاحب عالم مسکرائے۔ میر صاحب آکر بیٹھے، مزاج پرسی ہوئی، حقہ سامنے آیا، اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کچھ ارشاد فرمائیے... سودا نے کہا کریں نے تو ان دنوں کچھ کہا نہیں، یہاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے ایک مخمس کہا ہے، سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر یہاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب، یکایک آفت آگئی، سب اٹھ کھڑے ہوئے، دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں"

مثل اور اردو کے مصنف نصیر حسین خان خیال مرحوم اس روایت کو از سر تا پا لغو سمجھتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ تو آغا بھی... ایک عجب ستم ظریف ہیں، مگر آزاد اور عجب ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں بھی دلی کے شرفا کو دیکھا اور ان کی تیز داریوں کو نگاہ رکھا ہوگا، اس پر وہ ایک ایسا قصہ بیان کر گئے! سکندر کو میں نہیں جانتا، مگر ضاحک کو پہچانتا اور ان کے خاندان سے واقف، اور ان کے گھر کی شرافتوں سے آشنا ہوں۔ اس لیے میں کہونگا کہ یہ حکایت از سر تا پا لغو ہے۔ اول تو یہاں سکندر کا لکھنؤ جانا ہی ثابت نہیں، پھر یہ کہ ضاحک کے سے بزرگ کسی صحبت میں شریفوں سے یوں ہاتھا پائی کر بیٹھیں! اس پر مزید یہ کہ واجد علی شاہ کے سے مہذب شہزادے کی صحبت میں ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد کے وقت میں دلی کے امرا کی صحبتوں کا کیا قرینہ ہو گیا تھا اور ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے زمانے میں کیا دیکھا۔ مگر جس وقت کا قصہ انہوں نے چھیڑا ہے اس زمانے کا ہمارا کوئی امیرزادہ اتنا بے قرینہ نہ تھا کہ اس کی صحبت میں دو شریفوں کی گتھی ہو جائیں، ہمارے آزاد اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے ہیں" (ص ۱۲۱ و ۱۲۲)

اسی کتاب میں ذرا آگے بڑھ کر صاف صاف یہ الزام لگاتے ہیں کہ آزاد نے یہ روایت گڑھ لی ہے۔ "آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں، اس لیے تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابل معافی ہیں، مگر تذکرے کی غلطیاں اور اس طرح کی داستان سرائیاں قابل معافی نہیں، جہاں سودا اور ضاحک کا ذکر ہوں ڈھٹائی سے بیان کر دیا گیا ہو وہاں اور فقروں

کمانیوں کے ساتھ مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں کی ایک صحبت اور خاصۂ سکندر کی اس روایت کا گڑھ دینا کیا بڑی بات ہے!

خیال مرحوم کا استدلال زیادہ تر قیاسی ہے، ان کے نزدیک میر خاصۂ کا کسی شریف سے شریف آدمی سے دست و گریباں ہو جانا، اور وہ بھی سلیمان شکوہ سے جذب شہزادے کی صحبت میں، امور خلاف قیاس ہے۔ اس کے متعلق گذارش ہے کہ میر خاصۂ کی شرافت جب اس بات سے مانع نہ ہوئی کہ خود دوسروں کی ماں بہنوں کو گالیاں دیں اور اپنی ماں بہنوں کو گالیاں سنوائیں، آقا ہاتھا پائی کے لیے تیار ہو جائے، کون سی بڑی بات ہے۔ سلیمان شکوہ کی صحبت کے رکن رکین، انشاء، رنگین، ہرات سے تھے، قتیل اور صاحب قران کی بھی جیسا کہ بعض کتابوں میں سے ان پچکاں رسالی تھی، یہ لوگ ان کے یہاں ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل پر بحث کرنے کے لیے نہیں جاتے تھے، بلکہ ان کی اصلی غرض گالی گلوچ ہنسی مذاق سے شہزادے کا دل خوش کرنا تھا۔ ایسی صحبت میں اگر اتفاقی طور پر لوگ زبان سے ہاتھ پر اتر آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ایسی باتیں اچانک ہو جاتی ہیں ان کی اطلاع پہلے سے نہ ہوتی ہیں کہ پیش بندی کی جائے۔ خیال مرحوم کی یہ دلیل کہ سکندر کا لکھنؤ جانا ثابت نہیں، زیادہ توجہ کی مستحق ہے، اور اگر واقعی یہ ثابت ہو جائے کہ سلیمان شکوہ کے زمانے میں سکندر کا قیام لکھنؤ میں نہیں رہا، تو پھر آزاد کی روایت کو مصنوعی سمجھنے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ سب سے پہلا تذکرہ جس میں سکندر کا حال ملتا ہے، تذکرۂ میر حسن ہے۔ میر حسن ان کی مرثیہ گوئی، ہندوستان کی متعدد زبانوں سے ان کی واقفیت، عبارت فن خوش گفتی، اور ان کی ایک نظم کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ص ۱۲۲:

"اگرچہ علم ندارد لیکن بر کلام او جائے انگشت نہیت۔ چوں باہمہ مردم خوش طبعی دارد و شراب می خورد بہ نظر لطیفہ ایشک می نماید۔ غرض مرد زندہ دلے ست۔ گاہ گاہ بطرز قدیم شعر می گوید۔ طبعش مائل اصلاح بسیار است، سلامت باشد"

میر حسن نے اس کی تقریح نہیں کی کہ ان سے ذاتی ملاقات تھی یا نہیں، اور نہ یہ لکھا ہے کہ ۱۱۹۲ھ (زمانۂ ترتیب تذکرہ) میں سکندر کا قیام کس جگہ تھا، تاہم ان کے الفاظ سے یہ امر زیادہ ترجیح ہوتا ہے کہ جو کہہ رہے ہیں ذاتی علم سے کہہ رہے ہیں۔ میر حسن سے اگر دہلی کی ملاقات ہوتی تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ چونکہ ترتیب تذکرہ کے وقت میر حسن اور سکندر کا قیام ایک ہی شہر میں تھا، اور میر حسن نے تذکرہ جمع کو فیرخ آباد ہی لکھا۔ ممکن ہے کہ بعض اصحاب اس استدلال کو قبول نہ کریں، لیکن اتنا تو ہر شخص کو ماننا پڑیگا کہ میر حسن نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جو سکندر کے قیام اودھ کے خلاف ہو۔ یہی حال مصحفی کا ہے جو سکندر کے متعلق لکھتے ہیں:

"شخص دائم الخمر و خوش طبع ظریف، مزاح و پیش، طبعش بطرف پنجاب است... اکنوں ہم گاہ گاہ فکر شعر بطور قدیم و جدید می کند"

مصحفی کا تذکرہ ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوا ہے، مصحفی نے جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، لکھنؤ میں انہیں دیکھا، دہلی چلے جانے سے پہلے تو تقریح ضرور کرتے۔ میر حسن اور مصحفی کے اقوال ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ یہ تذکرے سکندر کے زمانۂ حیات میں لکھے گئے ہیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تذکروں میں سکندر کے لکھنؤ میں قیام کا قطعی ثبوت ملتا ہے، ہم صرف یہ دکھانا چاہتے

ہیں کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ سکندر کبھی لکھنؤ نہیں گئے۔ اس دعوے کے قطعی ثبوت کے لیے کہ سکندر لکھنؤ گئے تھے، ہم شاہ کمال مصنف مجمع الانتخاب کے ممنون ہیں، یہ تذکرہ شاہ کمال نے حیدرآباد میں سکندر کی موت کے بعد مکمل کیا ہے، اس میں انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ لکھنؤ میں سکندر سے ملاقات ہوئی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم اس تذکرے کی عبارت اس وقت نقل نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کا قلمی نسخہ جو ہماری نظر سے گزرا ہے وہ لندن میں ہے اور ہندوستان میں جو نسخے ہیں اس سے بھی فوری استفادہ ممکن نہیں، وتاسی نے اپنی تاریخ ادبیات گی دوسری یا تیسری جلد میں شاہ کمال کے حوالے سے سکندر کے لکھنؤ جانے کا ذکر کیا ہے، وتاسی کے حوالے کبھی کبھی غلط بھی ہوتے ہیں، لیکن سکندر کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی مجمع الانتخاب سے ماخوذ ہے۔

سطور بالا کے مطالعے سے ہمیں امید ہے کہ ناظرین بھی ہماری طرح اس نتیجے پر پہنچے ہونگے کہ خیال مرحوم کی دلیلیں آزاد کی روایت کو مسترد کرنے کے لیے کافی نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ان دلیلوں سے یہ روایت غلط ثابت نہ ہو سکی، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے صحیح تسلیم کر لیں، ہم اس روایت کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنے سے قبل وہ مختصر نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جس کی شان نزول آزاد نے بیان کی ہے:۔

یارب تو مری سُن لے یہ کہتا ہے سکندر (۱) ضاحک ..... کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تو لد ہو اگر بچہ بندر گلیوں میں نچاتا پھرے وہ ننگے کے اندر

رُدّی تو کہا کھائے کسی طرح پھندر

گھر والی کو اس کی یہی اپ فکر دن رات (۲) بچہ کوئی بندر کا جو لگ جائے مرے ہات
سکھلا کے اسے ناچ کی بندر کے دو اک بات دوں بھڑوے لکھنؤ کو جو اس کی کٹے اوقات

اک ہانڈی پرانی سی کا گھر میں نہ ٹھاؤں (۳) بکرا تو کہاں لینڈی سا کتا ہی منگا دوں
جو اس کے نچانے کی طرح ہے سو جتا دوں پھر کیا کروں اتنا بھی جو سامان نہ بنا دوں

کر جھوا لوگوں کی تا حق مجھے پھولے (۴) اور اپنی نوی جیتی کی گالی سے: شرمائے
کوئی دوست اگر اس کا جو اس بھڑوے کو سمجھائے اس سے تو بھلا دو گھڑی بندر ہی نچا لائے

گر چرخہ و پونی جو میں پیدا کروں پونی (۵) کھا جائے اسے بھوک، رکھے پیل ٹے دونی
جم جم رہے آباد یہ بستی نہ ہو سونی بندر کے نچانے میں بھلا کیا ہے زبونی

بندر تو ہے کیا مرد جو تو ریجھ لڑائے (۶) پیسا ہو اگر ملتا تو دو پیسے یہ پائے
پر میری نصیحت مو اخاطر میں نہ لائے میں چاہتی ہوں اس سے بھلا کچھ تو کمائے

مر جائے مرا تو میں دوں بی بی کی پڑیاں (۷) لے، روٹیاں روکھی مجھے مانگے ہے چپڑیاں

لے لے کر ٹکے پیسے کو سب شہر کی کڑیاں
سی سی میں اسے دوں جو یہ بیچا کرے گڑیاں

یوں بھی نہ ہوا میں سے آ ٹپکی ٹکا اور تاؤں (۸)
دو چٹکیوں ہی رنگ کر حلوا خاتوں بنا دوں
ٹکڑے ٹکے کے لیے کمنہ بڑی کی ایک جھولی سلاؤں
میں کل کلی بی بی جو لے کچھ تو سکھا دوں

چھوڑا میں لے جو رنڈوا اب اس کی نہ ہونگی (۹)
دوزخ کے لیے اس کے پراٹھا تو کروں گی
رنگ چھاپ لے دو حلوا خاتوں میں ڈونگی
کمنا پھرے بھڑوا کر جنیا لال ہونگی

کمنا ہوں میں اس سے جو لے شرم ہو میری (۱۰)
پھر ہو نہ کرتا پھرے بھڑوا مری تیری
ان باتوں سے ہونے کی نہیں پیٹ کو سیری
لے کر حلوا خاتوں یہ کرے شہر میں پھیری

کرلے حلوا خاتوں کو یہ کلیوں میں ہانڈی (۱۱)
دس میں بڑی بوٹیوں سے کرکے یہ شاہانہ
چادر کو بچھا چوک میں اور باندھ کے ماتھی
بیٹھا انہیں دیکھوں مجنوں کی ست ہو . .

اک اور ملاح اب نظر آیا مجھے اس کا (۱۲)
منڈواتی ہوں ڈاڑھی ہو سے نالی کو بڑا
نتھ ناک میں ڈال اور پہنا ساری و لہنگا
بکواؤں گی اس بھڑوے سے کوے ہی پکڑوا

یوں بھی نہ ہو تو لے کے اک آدمی کی چادر (۱۳)
او ندھا جو رہے زیر فلک . . کو رنگ کر
جھٹپا جو کرے میل اسے جھٹ سے پکڑ کر
چاچوک میں بیچا کرے دو چار ٹکے پر

پایا یہ گدھا میں نے تو گانے میں نہ پورا (۱۴)
گانا جو یہ سُر سے لے دیتی طنبورہ
جس کام میں دیکھا تو یہ چھڈ دے ادھورا
آخر میں بناؤں گی اسے تو پ زنبورہ

ان باتوں میں سے اس کو اگر کچھ نہ بن آئے (۱۵)
اک جرثقہ کر شہر کا یہ طرح بنائے
اس طرح کو پھر مولی ساجد کو سکھائے
بازو کرا سے بلدہ کیسٹہر کو یہ جائے

گر ہو کسی لوگوں کی نہ کھائیگا یہ سوگند (۱۶)
آماں ہی پھریں اس کی ہوں پیرا ہی یہ فرزند
اب فجہ کو رکھا چاہے تو منہ اپنا کرے بند
ان کاموں سے جو کام کرے اس کی ہو نی رنڈ

آخر کہا اس نے مجھے اس پاس نہ رہنا (۱۷)
پھر بات نصیحت کی مجھے اس سے نہ کہنا
ان کاموں سے کب اس کے نصیبوں نے نکھنا
لے دوں گی میں دو بھیجہ کریاں بیچ کے گہنا

گر یوں نہ کروں میں بھلا کیا کروں لوگو (۱۸)
بھڑوا نی ہو جو بھڑوے کی شہرت میں لکھی ہو
جو چیز جہیز ہے مری مجھ سے کوئی لو
گر دی اسے رکھو اسے دو بھیجہ کریاں لے دو

خاموش ہو سودا نہ زباں اپنی بہت کھول (۱۹)
جھگڑے میں خصم جورو کے آگے تو نہ اب بول
بکھ سیم ستھری نہ گئیں گی بجا دھول
ڈنکا ہے دمامے کا کہ یہ مصرع ہے انمول

روٹی تو کسی طرح کھائے مچھندر

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ فراغ کس قسم کے راوی ہیں، ان کی سیرت کے متعلق اب کچھ نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ ان کی کوئی تصنیف موجود ہے اور نہ ان کے معاصرین نے کچھ اس بارے میں لکھا ہے۔ آزاد کے بیان سے ان کے زمانۂ حیات کی البتہ ایک حد تک تعیین کی جا سکتی ہے، آزاد لکھتے ہیں کہ یہ سحر کے قدیمی دوست اور ہم مشق تھے، پھر ناسخ کے شاگرد تھے، اور ان کی پیدائش ہرگز ۱۲۱۵ھ سے قبل کی نہیں تھی۔ اگر فراغ سحر سے عمر میں بڑے بھی ہوں تو ۱۲۰۰ھ سے قبل پیدا نہیں ہوئے ہوں گے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ سودا اور مصحفی کے زمانے کی باتیں یہ آنکھوں دیکھی بیان نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہو چکا تھا اور مصحفی بھی ۱۲۰۰ھ سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے، مصنف مغل اور اردو کی رائے میں سلیمان شکوہ سودا و مصحفی کی وفات سے قبل لکھنؤ گئے تھے، لیکن کل مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ غلام قادر کے واقعہ کے بعد ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے، اور ۱۲۰۵ھ میں سودا اور مصحفی کا سلیمان شکوہ کی صحبت میں اکٹھا ہونا قطعی ناممکن ہے، سلیمان شکوہ کا ۱۲۰۵ھ سے قبل بھی لکھنؤ آنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں، لہٰذا فراغ سے پہلے جب سودا اور مصحفی دونوں وفات پا چکے تھے، سلیمان شکوہ نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا، اس لیے مجلس کے متعلق جو روایت آزاد نے بیان کی ہے وہ بتمامہ صحیح نہیں ہو سکتی، اور سلیمان شکوہ کا اس مجلس سے کسی قسم کا تعلق نہیں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی اس روایت کا صرف ایک جز غلط ثابت ہوا ہے، اس کا ابھی تک امکان باقی ہے کہ سودا نے یہ مجلس سکندر کے نام سے سلیمان شکوہ کے بجائے کسی دوسری جگہ پڑھا ہو، اور میر ضاحک ایسا کہ آزاد نے لکھا ہے سکندر سے دست و گریباں ہو گئے ہوں۔ مسئلے کے اس پہلو سے گفت و شنید کرنے سے قبل ہم ایک اور مجلس رنج کرتے ہیں جو ہمیں کلیات مصحفی میں ملتی ہے اور جس کو پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ دراصل میر ضاحک کا ہے اور غلطی سے میر حسن کے کلیات میں شامل ہو گیا ہے:-

ضاحک نے خوف کر تو اب کیا ہے وہ چھندر (۱) بکرے کا ہے وہ .... اور زادۂ قلندر
انڈے ہے جب نہ تب وہ بکرے کا باپ اندر بکری کے بل سمجھا تو اس کو مثال بندر
.. تو اوندرے ہے ... ہے سکندر

وہ صورت نحست ہے ایک مسخرہ سا (۲) ... تل چاندی کی داڑھی اور بوڑھی خانساں
.....
پھر اس سے کام کر کر تو آگے چل ادھم کو (۳) ... ہاں اور میں ہوں اس کی اوپٹی ہو جدھر کو
گر وشر گاہ اس کے جا کر تمام گھر کو ..... کھا کے ضاحک مضبوط کر کمر کو
ا غیب سے صدا یوں آتی ہو جو کہ ہر دم (۴) ... تو ہے وہ بھڑوا اس کا نہ کر تو چم چم
سارے قبیلے کو تو ..... اور مار شوق سے تم
وہ ایک ..... بچہ ہے بھڑوا (۵) باطن میں نرم بے ظاہر میں گرم ہے کڑوا

کترا کے اپنی موچھیں جب آئے وہ چھڑوا ... کارکھ بنا کر تو اس کے سر پہ گڑوا

دھینگر کا چھوکرا ہے پورب کا ہے زنانہ (۶) ہے بار داڑھیوں کے ..... دواتا
پنجابیوں کا رکھتا ہے ..... ایسے کی بات ہرگز خاطر میں تو نہ لانا

ہر اک زبان کا ماہر اس واسطے ہوا ہے (۷) ماں نے حرام اس کی ہر جنس سے کیا ہے
سو لفظ جمع ہو کر ہر بانی اک بنا ہے کہہ اس کے سخنہ یہ جا کر ایسا وقف کیا ہے

ہے نقل اس کی اک دن جو در کو یار آیا (۸) اس ساحرہ نے چنڈھا اس کے تئیں بنایا
ڈرنے لگا جو دھگڑ اس کے تئیں سنایا

اس نے کہا کہ گڑوہ آجائے گا تو پھر کیا (۹) کہنے لگی کہ مجھ کو اس کی نہیں ہے پروا
کچھ بات میں بناؤں ہر طرح سے لجھے گی

..... آگے اس سے تا پہ خالا (۱۰) وہ چھڑوا سب طرح سے ہم جو نہ بچی بھالا
گڑوہ چڑے تو کیا ہے ہے ایک چڑیا والا ایسا کہاں سے آیا وہ رانی خاں کا سالا

ہمسائے میں تھی اس کے اک دن کسی کی شادی (۱۱) واں کے جا کے جو دو اس کی نن بیٹھی پیرزادی
ننھے میاں کو سر پہ بٹھلا کے مال زادی کر آپ کو مخاطب پھر یہ مثل سنا دی

ننھے میاں جب آئے تب اڑیاں رگڑ کر (۱۲) کہنے لگی کہ ... آئیں تو کھیلوں سر پر
دیور لگا یہ کہنے بھائی کا ہے لجے ڈر جھنجھلا کے پھر وہ بولی تو پرے آگے لا دھر

سو ایسا سکندر گر ہوئے کوئی کھیسا (۱۳) مفلس ہو وہ سخن یار رکھتا ہو پاس پیسا
جیسا کہ کوئی ہوگا پائیگا یار ویسا ناحق جو ہوئے دشمن تو کیا ہے ایسا تیسا

ان مخمسوں کے سوا تیسرا رسالہ یہ ہے کہ یہ دونوں ۱۱۰۵ھ اور ۱۱۰۸ھ کے درمیان روہیلوں کی شکست سے پہلے فیض آباد میں لکھے گئے ہیں۔ میر فتاحک کے تعلقات سورا اور سکندر دونوں سے خراب تھے۔ دوسرا مخمس پہلے کا جواب معلوم ہوتا ہے۔ پہلا سکندر کی تصنیف سے ہے اور دوسرا میر فتاحک کا لکھا ہوا ہے۔ پہلا کلیات نہ تھا میں اور دوسرا کلیات میں ہے۔ تیسرا مخمس کلیات کی غلطی سے شامل ہو گیا ہے، ہم نے اپنی رائے جن وجوہ سے قائم کی ہے وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) پہلے مخمس کے پندرہویں بند کا ایک مصرع ہے:۔ "بازو کرا سے جلد گھیسر کو یہ جائے" یہ مصرع روہیلوں کی شکست کے بعد اگر لکھا ہوا ہو تو اس میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ شجاع الدولہ اور رحمت خان کی لڑائی ۱۱۸۰ھ میں ہوئی ہے اور روہیلوں کو شکست فاش نصیب ہوئی ہے۔ جس نے ان کی قوت کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ اودھ والے شجاع الدولہ کی چڑھائی میں مصلحۃً روہیلوں کو اپنی بیعت کا دشمن قرار دیتے تھے۔ سو آٹھ ۱۱۰۸ھ اور ۱۱۰۸ھ کے درمیان فیض آباد آئے ہیں۔

کیمبل ہیل کھنڈ کا پرانا نام ہے۔

(۲) اس کا ثبوت کہ محسن فیض آباد لکھے گئے، یہ ہے کہ دوسرا پہلے کا جواب ہے اور پہلے محسن کے ابتدائی بند میں لفظ 'بنگلہ' سے مراد فیض آباد ہے، بنگلہ فیض آباد کا پرانا نام ہے، جس کا مصرع ہے "کہ دو سال ہو چکا ہے بنگلے میں عید"۔

(۳) دونوں محسن کے ابتدائی بند بہت ملتے جلتے ہیں اور چونکہ دوسرا پہلے کی بہ نسبت زیادہ سخت ہے، خیال ہوتا ہے کہ دوسرا پہلے کو دیکھ کر اور اس کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

(۴) سودا اور ضاحک کی ہجو بازیوں کا کلیات سودا کی بدولت ہر شخص کو علم ہے، لیکن دوسرے محسن کے آخری بند سے ثابت ہوتا ہے کہ سکندر نے بھی ضاحک کی ہجو کہی تھی، ضاحک کی رائے میں سودا اور سکندر ناحق ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

(۵) پہلا محسن کلیات سودا کے اس مطبوعہ نسخے میں جو آج کل رائج ہے نہیں پایا جاتا، آزاد نے اس کا ذکر کیا ہے، صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر جلد اول میں متعدد بند نقل کیے ہیں اور کلیات کے دو قلمی نسخوں میں بھی جو اس وقت پیش نظر ہیں موجود ہے، لیکن سودا کے کلیات میں مرتب کرنے والوں کی بے پروائی سے بہت سا کلام دوسرے شاعروں کا داخل ہو گیا ہے، کیا تعجب ہے کہ سکندر نے اصلاح کے لیے دیا ہو، اور اس کا مسودہ سودا کے پاس رہ گیا ہو، مرتب کرنے والوں نے یہ سمجھ کر کہ سودا کا ہے کلیات میں شامل کر دیا اور اگر آزاد کی روایت کے مطابق یہ محسن سودا کا ہے تو اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میر ضاحک نے اس کے جواب میں سکندر کی ہجو کیوں لکھی۔

(۶) دوسرے محسن کے آخری بند میں میر ضاحک کے بیٹے غلام حسن کا تخلص درج ہے۔ اور انہیں کے کلیات میں یہ محسن ملا بھی ہے۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ یہ محسن ضاحک کا ہے اور یہ مصرع "مفلس ہو وہ جس یار رکھتا ہو پاس پیسا" اس طرح ہوگا "مفلس ہو یا وہ ضاحک الخ" تیسرا اور چوتھا بند کبھی بیٹا باپ کے متعلق نہیں لکھ سکتا۔

لہ آب حیات طبع نہم ص ۱۰۳ و ۱۰۴ حال ضاحک ۔ لہ ص ۱۲۴ ۔ تذکرۂ بیخبر سلیمان شکوہ کے رفقا کا حال معلوم کرنے کے لیے مجالس رنگین کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۔ ۳ ص ۱۹ و ۱۰ یعنی اگر کسی شاعر سے دلی کی طوائفیں ہوتا ہے قرار دیا ہے اور یہ بھی اگر طوائفیں ہوتی ہے تو اس کا ذکر کسی کرتے ہیں کبھی نہیں ۵ جلد سوم ص ۱۴۲ و ۱۴۳ ۔ ۶ مصرع اول آب حیات اور جلوۂ خضر میں ایک طرح ہے لیکن کلیات کے قلمی نسخوں میں دوسری طرح ہے ۔ نسخہ کتبخانہ مشرقیہ پانی پت ۔ ۷ الف نسخہ کتبخانہ جناب مولوی حسن صاحب، جناب یاس حسن خاں صاحب الیہ ۔ ۸ اس محسن اور اسکے بعد والے محسن میں جہاں جہاں تقطیع میں یہ نہ سمجھا جائے کہ الف نسخہ کی وجہ سے خارج کیے گئے ہیں ۹ ب روئی ترکی کھائے کسو عرصہ ۔ ۱۰ یہ نسخہ کا مصرع ہر بند کے آخری آتا ہے ۱۱ یہ بند اب میں نہیں، جلوہ خضر اور الف میں ہے ۱۲ الف اور ج میں تیسرے مصرع کی جگہ یہ ہے "کھڑا ہوں کے کھنڈ کی اک بھولی سلاطوں ۱۳ ب اس سے کچھ ابیہ کیسی ہیں آگے ۱۴ ب اک بات تاروں ۱۵ ب اور ج میں تیسرا مصرع یہ ہے "ہوا ہوں گے کھانے کی لوح آ ۱۶ ب ہاں لال ہے ۱۷ ب دسواں اور بارہواں بند ب میں نہیں ۱۸ ص ۱۰۳ ۱۹ ص ۱۱۹ ۲۰ قتیل چاولی ؟

اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں

از آزاد و جلیلی

ہمارے ملک میں قیاس کو تحقیق پر ترجیح دی جاتی ہے اور سنی سنائی باتوں پر حد سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا بالکل دیا تو وہ لوہے کی لکیر ہو جاتی ہے اور مٹائے نہیں مٹتی۔ کسی روایت کا ایجاد ہونا شرط ہے، پھر تو نسلاً بعد نسلٍ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہے اور اعتقادیات میں اس طرح داخل ہو جاتی ہے کہ اس کی صداقت میں شک کرنا بھی کفر سمجھا جاتا ہے۔ نورالٰہی مرحوم اور محمد عمر صاحب نے ۱۹۲۱ء کے رسالہ آرہ میں ایک مضمون بالاشتراک لکھا، اور اس میں اندر سبھا کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا خیال فرانسیسیوں نے پیدا کیا اور انھیں کی ہدایت کے مطابق قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہوا اس کی تصنیف واجد علی شاہ کی فرمایش سے ہوئی اور خود بادشاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔ صاحبان مضمون کے پاس کوئی تحریری ثبوت نہ تھا، اور استبارا دعویٰ محض زمانہ حال کے ایک پارسی ایکٹر کے قول کی بنا پر کر دیا تھا۔ روایت پرستی کی یہ مثال تاریخ ادب اردو میں یادگار رہے گی۔ شرر نے دلگداز (جنوری ۱۹۲۶ء) میں اس مضمون کی تردید کی اور یہ لکھا کہ واجد علی شاہ کا مقرب بارگاہ کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ صاحبان مضمون نے اس کا جواب رسالہ ہزار داستان لاہور میں شائع کرایا جس کا خلاصہ ان دونوں کی مشترک تالیف ناٹک ساگر میں درج ہے۔ ان صاحبوں نے اپنے دعووں کی تائید میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملخصاً یہ ہے:۔

الف ناٹک ساگر ص ۳۵۵: بقیہ اہل کار تھے سب اسی دھن میں لگے، رہتے تھے کہ رنگیلے پیا کے لیے کوئی نیا سامان تفریح پیدا کریں ..... اسی سلسلے میں ایک فرانسیسی مقرب بارگاہ نے مغربی تھیٹروں کا نقشہ پیش کیا ..... یہ وہ وقت تھا کہ بہ مصداق **کل جدید لذیذ فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا (یعنی وہ ڈراما جو سر بسر رقص و سرود کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے) کا گرویدہ ہو رہا تھا۔** اس لیے واجد علی شاہ کے حضور میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا وہ اوپیرا تھا۔ ناچ گانا پہلے ہی ایک دل پسند خاطر چیز تھی۔ اس لیے ایسا ہوا کہ ہندوستانی مذاق کا اوپیرا تیار ہو۔ ترجمہ فال الماٹ کے نام پڑا، جنھوں نے ۱۸۵۵ء میں اس فرض کو بہ وجہ احسن ادا کیا؟

ص ۳۵۹ "جس تو غیر ہندوستان میں عام چیز ہے، لیکن پرے جو **بالکل مغربی چیز ہیں** اور جس کی نمایش اُن کی دست نگر نہیں ان کا قیصر باغ میں کیسے دخل ہوا؟"

ص ۳۶۲ "اندر سبھا کا تیار ہونا تھا کہ قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہو گیا، جس میں فرانسیسی ہدایت کے مطابق ہندوستانی حرفت نے اپنے کمال دکھائے۔ مہ جبینان قیصر باغ پریوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔

واجد علی شاہ انہ کے تخت پر براجمان ہوے۔ باقی پارٹ باغاق اہل دربار کو ہے۔ عوام کو اس مجلس میں بار نہ مل سکتا اس لیے ان لوگوں کے لیے چھوٹے پیمانے پر اس کی نمایش شروع ہوئی اور انہ سبحانہ کو قبول عام کا خلعت ملا۔

مولفین ناٹک ساگر کے دعووں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) واجد علی شاہ کا ایک فرانسیسی درباری تھا۔

(۲) اس فرانسیسی درباری نے فرانسیسی اوپیرا کا نقشہ پیش کیا، کیونکہ اس زمانے میں فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ اس لیے واجد علی شاہ کے دربار میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا وہ اوپیرا تھا۔

(۳) پردے بالکل مغربی چیز ہیں اور ہمس کی نمایش ان کی دست نگر نہیں۔

(۴) امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی اور واجد علی شاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔

یہ چاروں دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ میں ہر دعوے کے خلاف فرداً فرداً تاریخی ثبوت پیش کروں گا۔

(۱) ہمارے موجودہ علم کے مطابق واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ تاریخ کے اوراق سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ یہ بات خلاف قیاس ہے۔ نواب اودھ اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں نواب سعادت علی نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ملازمت میں کسی یورپی کو نہ رکھے گا۔ اس معاہدے کی حقیقت میں ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

۱۸۰۱ء میں جب نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوا تو اس کی جانشینی کے لیے مرزا وزیر علی اور سعادت علی میں جھگڑا ہونے لگا۔ مرزا وزیر علی آصف الدولہ کا متبنیٰ تھا اور آصف الدولہ نے اس کو اپنا وارث نامزد کر دیا تھا۔ سعادت علی آصف الدولہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ سعادت علی فساد کے خوف سے بنارس میں مقیم ہو گیا۔ سر جون شور کی مدد سے سعادت علی ۱۲ جنوری ۱۷۹۸ء کو مسند پر بیٹھا۔ اور اس کے عوض اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کے دفعات یہ ہیں:

(۱) نواب چھبیس لاکھ روپے کا سالانہ خراج ادا کرے گا۔

(۲) (الف) اودھ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

(۳) اودھ میں انگریزی فوج کی تعداد دس ہزار ہوگی۔

(۴) (الف) نواب انگریزوں کو ۱۲ لاکھ روپے سعادت علی کے، کیونکہ وہ انگریزوں کی مدد سے مسند پر بیٹھا تھا۔

(ب) بغیر انگریزوں کی اجازت کے وہ کسی بیرونی ریاست سے راہ و رسم نہیں پیدا کرے گا۔ (ج) اپنی ملازمت میں کسی فرنگی کو نہ رکھے گا اور نہ کسی فرنگی کو اپنے علاقے میں سکونت اختیار کرنے دے گا۔[1]

انگریز یہ چاہتے تھے کہ کوئی فرنگی دربار اودھ میں نہ آئے۔ اس پر وہ بڑی سختی سے عمل کراتے تھے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۸۰۹ء کو

[1] ۳ ایچیسن صفحہ ۳۱۰ جلد ششم صفحہ ۵۵۔

ولیسلی نے اودھ کے ریزیڈنٹ کو ایک خط لکھا تھا:

"..... میری خواہش ہے کہ کمپنی کے ملازمین کے سوا ہر یورپی نکال دیا جائے۔" [1]

۱۸ نومبر ۱۷۹۸ء کو ولیسلی نے نواب وزیر سے ایک معاہدہ کیا جس کے ذریعہ اودھ پر کمپنی کو پورا اختیار حاصل ہو گیا ان تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ سے بہت پہلے اودھ کا دربار فرنگی ملازمین سے خالی کرا دیا گیا تھا تو اب اودھ اور اس سے ادنیٰ بات بھی انگریزوں کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ کسی فرنگی کو اودھ میں رہنے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی تھا۔ جناب محمد عمر صاحب سے گزارش ہے کہ فرانسیسی درباری کے متعلق مستند کتب تاریخ کے حوالے پیش کریں۔

(۳) **اوپیرا کی تاریخ**:۔ مولفین ناٹک ساگر کا قول ہے کہ عہد واجد علی شاہ یعنی انیسویں صدی عیسوی میں نہ صرف بلکہ تمام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ ان صاحبوں نے اوپیرا کو فرانسیسی ڈرامے کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ اوپیرا کی پیدائش اٹلی میں سترھویں صدی عیسوی ہوئی۔ "اوپیرا" اطالوی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی کام کے ہیں۔ اوپیرا کی بنیاد سولھویں صدی عیسوی میں پڑ چکی تھی۔ مگر اس نے اپنی موجودہ شکل سترھویں صدی عیسوی ہی اختیار کی۔ اٹلی کے مشہور ماہر طبیعیات گلیلیو کا باپ وسنزو گالیلی اوپیرا کے اولیں بانیوں میں تھا۔ اس نے ایک مشہور قصے کو منظوم ڈرامے کی شکل میں اس طرح پیش کیا کہ اٹلی کے ماہرین موسیقی دنگ رہ گئے۔ ۱۶۰۰ء میں جیکوپو پیری کا اوپیرا "یوریڈیس" پبلک کے سامنے پیش کیا گیا۔ اب اٹلی میں اوپیرا کا رواج عام ہو گیا۔ اس کے بعد جب یورپ میں اوپیرا کی شہرت ہوئی تو جرمنی اور فرانس میں بھی اوپیرا نے رواج پایا۔ اوپیرا کے متعلق انیسویں صدی میں کل جدید لذیذ کی مثل صادق نہیں آتی۔

یہ مان بھی لیا جائے کہ اخذ بھارت ہندوستانی ناٹک کا اوپیرا ہے جب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی تیاری میں فرانسیسی ہدایت کو دخل تھا۔ اگر زبانی دعویٰ کرنا ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اندر سبھا کی تیاری میں اطالوی جرمنی، روسی اور سپانوی شیروں کی ہدایت کو دخل تھا۔

(۴) **ہندوستانی تھیٹروں پر پردے کا استعمال**:۔ مولفین ناٹک ساگر نے پردے کو خالص مغربی چیز قرار دیا ہے۔ یہ دعویٰ ان صاحبوں کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کا استعمال ابتدا ہی سے تھا۔ مسٹر ہوریس ہیمین ولسن نے اپنی شہرہ تصنیف "تھیٹر آف دی ہندوز" میں سنسکرت کے بعض ڈراموں کا ذکر کیا ہے جن میں پردے کے استعمال کے متعلق ہدایات ہیں۔ ڈراما سنگیت رتناکر میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں اور اسٹیج گاتے ہوئے داخل ہوں اور رقاصہ پردے کے پیچھے سے آگے بڑھے"۔ سنسکرت کے

[1] تاریخ ہند مصنفہ ایل جلد ششم، ص ۱۷۶

ڈراموں میں جب مثل اسٹیج پر آتے ہیں تو پردہ اٹھاکر" یا "پردہ کھینچ کر" آتے ہیں۔ اس کے لیے سنسکرت میں ایک لفظ ہے "اپاکشے پے" جس کے معنی ہیں "پردہ اٹھاکر" یا "پردہ کھینچ کر"۔ مدارا کشس سنسکرت زبان کا ایک مشہور ڈراما ہے جس کا مصنف ویساک دت ہے۔ یہ ڈراما آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا اور بمبئی "سنسکرت سیریز" میں چھپ چکا ہے۔ اس کی چوتھی اشاعت میں صفحہ ۲۰۸ پر یہ عبارت ہے:

(پردہ ہٹا کر وہ آگے بڑھتا ہے) "ادکرشس میں بشنو گپتا تجھے سلام کرتا ہوں"

یعنی بشنو گپتا جب اسٹیج پر آتا ہے تو پردہ ہٹا کر آگے بڑھتا ہے اور کرشس سے گفتگو کرتا ہے۔ سنسکرت کی اصل عبارت میں لفظ جبنیکا ( ) استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی پردے کے ہیں اور سنسکرت زبان میں پہلی صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے۔ سنسکرت ادب کے محققین کا متفقہ خیال ہے کہ سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کا استعمال اتنا ہی ہے جب سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کے استعمال کے متعلق یہ تین موجود ہیں تو پھر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمیں تسلیم کر لینا پڑیگا کہ پردہ بالکل مغربی چیز نہیں بلکہ ان کا وجود ہندوستان میں کم سے کم پہلی صدی عیسوی سے ہے۔

(۴) اندر سبھا کی تصنیف کا سبب: سولیفن نانک ساگر کا قیاسی دعویٰ یہ ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ ان سوانحوں کے دوسرے مؤلفوں کی طرح یہ دعویٰ بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں کوئی بھی ثبوت پیش نہیں کیا۔ واجد علی شاہ کے اندر بنے کا ثبوت وہ لالہ کنوہیا لال کے قول سے دیتے ہیں[1] اور لکھتے ہیں کہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے ہماری مزید تشفی کر دی۔ کنوہیا لال یا کیفی صاحب نے امانت کا زمانہ نہیں دیکھا کہ ہم ان کے قول کو آنکھیں بند کر کے مان لیں۔ خود واجد علی شاہ کی تصانیف میں کہیں امانت کی اندر سبھا کا ذکر نہیں۔ اس موضوع پر جناب سید حسن مثنوی صاحب کا ایک مضمون رسالہ اردو (اپریل ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوا ہے جس میں جس مضمون نے شرح اندر سبھا کے حوالے اور دیگر دلائل سے سولیفن نانک ساگر کے دعوے کی تردید کی ہے شرح اندر سبھا کی مکمل عبارت اس مضمون کے ساتھ درج ہے اس میں خود امانت نے اندر سبھا کی تالیف کا سبب بیان کیا ہے۔ امانت کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر شاگرد عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی شرح اندر سبھا کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:-

"..... ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی ..... شاگرد اول موزوں طبیعت مخلص عبادت عاشق کلام امانت نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسے کا ہو طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے۔ آخر الامر موافق اس کی فرمائش کے بند و بست پر آمادہ ہوا۔

امانت کے اس بیان کو پڑھ کر بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ ؟ اس کے متعلق رضوی صاحب[2] مفصل بحث کر چکے ہیں شرح اندر سبھا کے مطالعے سے مجھے ایک نئی بات

[1] نانک ساگر ص ۲۶۲ سے اردو - اپریل ۱۹۳۵ء ص ۳۱۹۔

معلوم ہوتی کہ اندر سبھا کی تیاری بڑی شکل سے ہوتی تھی۔ امانت کا بیان ہے:۔

"دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے، ہجوم حد سے زیادہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ بعد ہزاراں شور و فساد کے اور محبت تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔"

اگر امانت کو واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل ہوتی تو ڈیڑھ برس کی محبت و تکرار کے بعد کیوں جلسہ تیار ہوتا؟ وہ شخص جن کا ذکر شرح اندر سبھا میں ہے، غالباً امانت کے دوست ہوں گے۔ کیونکہ اگر وہ واجد علی شاہ کے درباری ہوتے، اور واجد علی شاہ کے ایسا سے اندر سبھا کی تیاری پر آمادہ ہوئے ہوتے تو امانت اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس کے علاوہ اندر سبھا کا جلسہ ہنگامہ و فساد کے بعد تیار نہ ہوتا۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑیگا کہ امانت کو واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے۔ امانت کو لکنت کا مرض تھا، اور کسی زمانے میں ان کی قوت گویائی بھی سلب ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے گوشہ نشین رہا کرتے تھے۔ شرح اندر سبھا میں امانت لکھتے ہیں:۔

"..... شب کو شام سے دو پہر رات گئے تک صحبت میں شاگردوں اور احباب کا مجمع رہتا تھا۔ مگر دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی جلبیت کو حسن سے لاگ تھی۔ وضع کے خیال سے نہیں آتا تھا نہ جاتا تھا۔ زبان کی دلبستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی....."

شرح اندر سبھا کے مندرجۂ بالا اقتباسات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ امانت کہیں آتے جاتے نہ تھے اور جب تنہائی کی زندگی سے جی گھبرانے لگا تو انہوں نے اپنے شاگرد و عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ امانت حسن پرست تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسا ڈراما لکھا جس میں ناچ گانا زیادہ ہو۔ ان کی طبیعت کا رجحان ہی کچھ ایسا تھا کہ انہوں نے جو ڈراما لکھا وہ رقص و سرود پر مشتمل تھا۔

یہ دو شخص کون تھے، جن کا اندر سبھا کی تیاری میں حصہ تھا؟ اس کی تحقیق کے لیے میں نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مصنفہ نام لکھنوی کا مطالعہ کیا، اس تذکرے کی کتابت ۱۲۶۰ھ میں ہوئی، لیکن اس کے بعد نامر و قتاً فوقتاً حاشیے میں اضافہ کرتے رہے۔ امانت کے حالات حاشیے میں درج ہیں اور نام نے اندر سبھا کی تیاری کے متعلق چشم دید حالات لکھے ہیں، خوش معرکہ ایک نایاب تذکرہ ہے۔ اس لیے میں امانت کے متعلق نام کا مکمل بیان نقل کرتا ہوں جسے پڑھ کر ناظرین خود فیصلہ کریں گے کہ امانت نے اندر سبھا کیوں لکھی اور اس کی نمائش کس طرح ہوئی:۔

"صاحب دیانت و سعادت سید آغا حسن تخلص امانت ابن میر آغا علی عرف میر آغا بزار و نواسۂ میر طالب علی اچھرتی والے مشہور اوائل میں میاں امانت نے برائے چندے میاں و دیگر صاحب اصلاح لی تھی پھر خود استاد بن بیٹھے۔ صاحب دیوان خمسہ مسدس و مدوسوخت و غزل اور مرثیہ و سلام بھی اپنی دانست میں خوب کہا اور ان کے کلام میں جگت و ضلع ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرثیے بھی ان کی جگت سے خالی نہیں ہیں۔ ان کے مرثیے کا ایک مصرع یہ ہے:۔

"شامی کباب ہو کے پسند قضا ہوئے"۔ اور میاں امانت نے ہر چند چاہا کہ میرے آگے رنگ میر انیس صاحب اور میرزا دبیر صاحب مٹ جائے، لیکن کہیں خواجہ صاحب اور شیخ صاحب کے روبرو کوئی اور شاعر چمکا کہ میاں امانت اور میاں عشق صاحب آگے ان دونوں کے چمکتے۔ بہ قول شاعر:۔

چراغے را کہ ایزد برفروزد ہر آں کس پف کند ریشش بسوزد

آمدم برسر مطلب۔ میر امانت صاحب کی زبان میں لکنت بھی تھی اور یہ عرض ان کا آبائی ہے، بلکہ ان کی اولاد تک کی زبان میں لکنت موجود ہے۔ لہٰذا مرثیہ تصنیف ان کا ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے اور ان کے شاگردوں میں جو ہے اس کے تخلص کے اخیر میں تے ہوتی ہے، مثل جنت وعبادت و میاں فرحت وغیرہ کے۔ میاں امانت نے ایک میر انیس کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی۔ اس میں بجائے امانت تخلص استاد اپنا قرار دیا تھا، اور اس مثنوی میں غزل اور جولی، ٹھمری اور چھند یاں بھا گھا میں کہی تھی۔ چنانچہ جس کو شنکر پنڈت کشمیری اور بھاری کہا اور میر حافظ نے چند طفلان حسین اور امردان ماہ جبیں خوبصورت جمع کر کے اور لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے، اور تعلیم راگ اور ناچ دلوا کر ایک رہس کھڑا کیا تھا اور وہ پندرہ روپے فی دفعے پر مجرے کے لیے بھی جاتے تھے، چنانچہ خلائق نے یہ جلسۂ جدید دیکھ کر بہت پسند کیا، اور ہزارہا لوگ بازاری جمع ہونے لگے۔ ایک روز مؤلف بھی اس جلسۂ رہس اندر سبھا میں گیا، دیکھا میں نے کہ ہزارہا لوگ ان امردان حسین پر مفتوں و شیفتہ (ہیں) بہ قول راحت خان:۔

ہجوم ماہ رویاں اس قدر تھا کہ مجھ کو دل کے کھو جانے کا ڈر تھا

اور میاں امانت مسند پر بیٹھے تھے اور ایک لونڈا مہ پارہ آگے گاتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر چند وقفے کے بعد اپنے مکان پر چلا آیا۔ غرض کہ یہ اندر سبھا خوب چمکی اور مشہور خلائق ہوئی۔ جیسے کہ مرحسن کی مثنوی سے ہزارہا عورات فاحشہ ہوئیں ویسے ہی اس مثنوی اندر سبھا سے ہزارہا مرد لوطی منعلم ہو گئے، اور اغلام نے خوب رواج پایا، اور مرثیہ میاں امانت صاحب کا اچھوتیوں والے امام باڑے واقع منصور نگر لکھنؤ میں پڑھا جاتا ہے، تا حال شنیدنی ہے (؟) یہ چند اشعار اچھوتے میاں امانت صاحب کی غزل کے، واسطے یادگار کے لکھے جاتے ہیں۔ وجوہ ذیل:۔

خیال آتا ہے دل کو شکوۂ بیداد کیا کیجے خدا سے لے بت کافر تری فریاد کیا کیجے
امانت گاہ پر پہنچا تو یوں فریاد چلایا لبوں پر جان شیریں ہے ابھی امداد کیا کیجے

نام کے مندرجۂ بالا بیان سے ہم سب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:۔

۱ شنکر پنڈت کشمیری، بھاؤ کھار اور میر حافظ نے اندر سبھا کے لیے اسٹیج تیار کیا۔
۲ کم سن لڑکوں کو ناچ کی تعلیم دی گئی اور انہوں نے اندر سبھا میں پاٹ کیا۔
۳ امانت کی زبان میں لکنت تھی، اس لیے ان کے مرثیے ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔

امانت نے شرح اندرسبھا میں جن دو شخصوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ شنکر نیڈت کشمیری، بہاری کمار اور میر حافظ میں سے کوئی دو شخص ہونگے، جن کا تیسرے کے مقابلے میں اندرسبھا کی تیاری میں زیادہ نمایاں حصہ ہوگا۔ اندرسبھا کی تیاری کی جو کچھ حقیقت ہے وہ یہی ہے۔ اس شہادت کی موجودگی میں لالا کنور سین یا نولفین نانک ساگر کے قیاسی دعووں کی کچھ بھی وقعت نہیں۔

نام کے بیان سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کمپنی والوں نے اندرسبھا میں پارٹ کیا۔ واجد علی شاہ یا ان کے درباریوں نے اس میں کوئی پارٹ نہیں کیا۔ میں اس کے قبل یہ لکھ چکا ہوں کہ امانت کو لکنت کا مرض تھا۔ اور جب ان کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی تو وہ کہیں آیا جایا نہ کرتے تھے، نام کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امانت کے مرثیے ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔ ایسے شاعر کا واجد علی شاہ کے درباریں کیونکر گزر ہوا ہوگا جو اپنے اشعار خود نہ پڑھ سکتا ہو؟ لکھنؤ میں اچھے اچھے شعرا موجود تھے۔ امانت میں کوئی خاص خوبی نہ تھی کہ واجد علی شاہ انہیں اپنے دربار میں بلا لیتے۔ امانت کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہیں واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ نام کے بیان سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ نام نے خود اپنی آنکھوں سے اندرسبھا کا تماشا دیکھا تھا۔ عہد حاضر کے کسی ادیب کے مقابلے میں نام کا بیان زیادہ قابل وثوق ہے، اس کے بیان سے خود مصنف اندرسبھا کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے نولفین نانک ساگر کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔

---

[1] "سعادت خان نام ولد رسالت خان باشندہ نگینہ مقیم لکھنؤ۔ باغ و ایوان ایک تذکرہ ان کا ہے۔ شعرہ چھوٹے مرزا مذہب سے ان کو تھا"۔ سراپا سخن مصنفہ محسن لکھنوی۔

محسن نے جس تذکرے کا ذکر کیا ہے وہ خوش صرکہ ہے، جس کا میں نے حوالہ دیا ہے۔

[2] امانت کی پوری غزل میں نے اس لیے نقل نہ کی کہ میرے مضمون سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ یہ غزل اندرسبھا میں موجود ہے۔

۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

ہمایون لاہور جولائی "انیس" از جناب وحی رضا ایم۔ اے۔ ص ۳۰۹ تا ۳۲۵ "میر" از جناب صفی حیدر خانی بی۔ اے ص ۳۲۰ تا ۳۳۰ "غالب" از حضرت طالب صفوی ص ۳۳۱ تا ۳۵۰

(ہمایون نے اس سوال کے بہترین جواب کے لیے انعام مقرر کیا تھا کہ اردو کا بہترین شاعر کون تھا؟ انیس و میر و غالب کے علاوہ حالی و اقبال کو بھی لوگوں نے اردو کا بہترین شاعر قرار دیا ہے۔ معیار)

النظر لکھنؤ مرتبہ جناب غضنفر الملک علوی **پد ماوت (عشرت و عبرت)** از جناب حاجی امیر احمد علوی صاحب ص ۱ تا ۱۰۔ (۱) عبرت و عشرت کی پدماوت ۱۲۹۵ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے شائع کی تھی (اس کے دیباچے میں عشرت نے میزا علی لطف کو سودا کا شاگرد رشید لکھا ہے۔ معیار)

سالک از جناب محمد یحییٰ صاحب تنخلص ۳۱ تا ۳۴ (۱) قربان علی بیگ سالک کے حالات زندگی سوا اس کے کہ پہلا تخلص قربان تھا، غالب کی ہدایت سے بدل کر سالک رکھا، کل حالات مخمنہ جاویدہ سے ماخوذ ہیں۔ مخمنہ جاویدہ میں سالک کے بچپن کا نام رن بہادر خان رکھا ہے۔ بمعنون نگار = مرتے اسے بہادر خان بنا دیا ہے، نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مردے سن وفات نکلتا ہے۔ مرتے کے نزدیک اس سے ۱۲۹۱ اور صاحب مخمنہ کی رائے میں ۱۲۹۲ نکلتا ہے۔ دونوں غلطی پر ہیں "یہ تاریخ اگر بغیر تحریر کے ہے تو اس سے ۱۲۹۰ نکلتا ہے۔ سن عیسوی دونوں نے ۱۸۷۹ دیا ہے، یہ ۱۲۹۷ کے مطابق ہے۔ معیار) (۲) دیوان مطبوعہ کا نام بہار سالک ہے (سال از نامت ۱۸۷۱ء ابتدا میں حالی کی تقریظ اور سالک کا دیباچہ ہے۔ ہر دو فارسی (سالک کے کلام پر ناقدانہ رائے بھی ظاہر کی ہے۔ معیار)

ندیم جون "بیدل عظیم آبادی" از حکیم سید احمد اللہ صاحب ص ۱ تا ۱۲

سر اوپر جب کوئی نہیں تو دشمن آپ کیسں — چٹنگری چھاڑو بن اب بیدل چلے پریس

(م نے اس شعر کو بیدل کی طرف منسوب کرکے بہت سے نتائج نکالے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس کیا ثبوت اس امر کا ہے کہ یہ شعر بیدل کا ہے۔ معیار) (۲) (م نے حسب ذیل تذکروں سے بیدل کے حالات نقل کیے ہیں۔ تذکرہ تسلی اورنگ آبادی، تذکرہ مخزن الغرائب مصنفہ ناصر علی سرہندی، تذکرہ قدرت اللہ شوق، تذکرہ بے نظیر، تذکرہ چمنستان شعراء، مخزن الغرائب ایک غیر تذکرہ ہے جس کا مصنف احمد علی سندیلوی ہے، جہاں تک ہمیں علم ہے نام علی نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔ اگر اس نام کا کوئی دوسرا تذکرہ نام علی نے لکھا ہے تو اس کا ثبوت دینا چاہیے۔ معیار) (۳) بہار سخن مصنفہ عبد الرزاق خان خوانی مخاطب بہ شاہ نواز کے حوالے سے م نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ناصر علی نے ایک غزل لکھی:- "آ چوں در جلوہ آئی معنز جاں سیماب می گردد — تجلی می کند بہتے کہ آتش آب می گردد"

نام علی نے یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی اس کا جواب لکھ کر ملک سخن میں خدائی کا دعویٰ کرے تو میں اس پر ایمان لاؤں گا۔ بیدل کے اشارہ سے ان کے شاگرد ۔ ش جرت نے جواب لکھا۔ نام علی سن کر خاموش ہو رہے۔ کسی دوسرے شاعر نے نام علی کی غزل کا جواب نہ دیا۔ (۴) (بیدل کے عظیم آبادی ہونے کے متعلق جو شہادتیں ہیں۔ ان کے بارے میں مئی کے معیار میں لکھا جا چکا ہے۔ م نے بیدل کے اُستاد کے کمال کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ عبدالعزیز عزت کو بھول گئے۔ معیار)

اُردو نثر کی ارتقائی ارباب بہار کا حصّہ، جناب سید محمود اشرف صاحب ص ۳۹ تا ۴۲ (۱) حضرت شاہ احمد حسین، دلی المتخلص بہ صبح کیا، سنہ ولادت نامعلوم، وفات ۱۲۰۳ھ عمر ۵۰ سے زیادہ پائی۔ اُردو میں آپ کی تصانیف موجود ہیں (م نے اور حالات بھی دیے ہیں۔ معیار) (۲) القول المحمود فی بیان محفل المولود سال تصنیف ۱۲۰۴ھ مطبوعہ مطبع محمدی خواجہ کلاں، پٹنہ ۱۲۹۵ھ ص ۱۹۹ کے بعد عبدالاحد آرائی طبیب تخلص کی تقریظ ہے جو ایک صفحے کے بعد ضائع ہو گئی ہے۔ (۳) ترتیب المدارج مصنفہ ۱۲۰۱ھ، مطبوعہ مطبع محمدی ۱۲۹۵ھ موضوع مسئلہ ترتیب خلفائی خلفائے راشدین (۴) رسالہ قطعی مصنفہ ۱۲۰۹ھ موضوع وجوب تقلید شخصی (۵) حضرت سید شاہ ظہور الحق قادری برادر مصنف رسائی مذکورہ کے بھائی تھے۔ ان کی تصانیف زیادہ تر عربی فارسی میں ہیں اُردو میں صرف ایک رسالہ ازالۃ الخفاض سنۃ الاشرف الشرفا ملا ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، موضوع حضرت فوث پاک کی سیادت کا اثبات،

اظہار حقیقت، پہلی قسط، مولوی شاد عظیم آبادی ص ۴۳ تا ۵۲ (۱) گوز سکو رابع معاصر مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۳۱ء کو ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جو لوگ اس کے مدعی ہیں کہ جناب شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے ان کے قول کے بطلان کے لئے اس سے دو برس قبل ہی اس سلسلہ کا ٹریکٹ چھپا تھا۔ اس مشاعرے کا مکمل روداد انجم شمس العلما مرزا بیگ صاحب نے مرتب کیا تھا، اس میں شاد کو زیادہ کوشش کی ہے۔ (۲) اس گلدستے میں انجم نے گیارہ ممیز شعرا اور استادوں کے نام ترتیب وار بحیثیت تفوق شاعرانہ درج فرمائے ہیں۔ ... شاکل دہلوی، سید شاہ حکیم احمد صوفی، محمود محیدالدین محمد الآبادی، حکیم عبدالحمید پریشاں، محمد علی خاں حیرتی، سید علی محمد شاد، سید فرزند احمد مضطر، ایک غیر جانب دار شخص نے شاد عظیم پر ترجیح دی ہے (جناب حمید کو چاہیے تھا کہ انجم کی عبارت نقل کرتے، جس سے یہ پتا چلتا کہ انجم نے ترتیب میں کس اصول کو مدنظر رکھا ہے محض اس امر سے کہ ایک خاص ترتیب سے نام لکھے گئے ہیں، کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اس بنا پر تو یہی ماننا پڑے گا کہ انجم صوفی کو وحید سے بہتر سمجھتے تھے اور حیرتی کو شاد و مضطر دونوں پر ترجیح دیتے تھے معیار) (۳) اس گلدستے میں شاد کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے ہیں "یگانۂ میدان فصاحت، غواص دریائے طاقت موجد طرز نگیں بیانی ندیم المثال لاثانی سخن آور، مقام شناس، رنگین ادائے بدیع اساس محمود حساد جناب سید علی محمد شاد" عظیم آبادی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "سرو قد خنیاگان جہان، ہر حلقۂ فصحائے زماں، واقف و ماہر ہر فن سخن بیان

شیریں سخن، دیسا چہ دیوان علم، شیرازۂ مجموعۂ علم، رشک اورنگی وجامی جناب مولوی شد فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی (محمود حسامد سے بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا، اہم کی غرض صرف مقفیٰ نثر لکھنی تھی اور بس، ورنہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ واقعی صفیر کو اورنگی اور جامی پر ترجیح دیتے تھے۔ مبیار) (۴) اسی مشاعرے میں جناب شاد نے ایک قطعہ پڑھا۔

فلک روئے نہ اب کیونکر عظیم آباد کے اوپر ۔۔۔ اب باقی بلاغت ہے نہ یاں شورِ فصاحت ہے

اس میں معاصرین کا بھی ذکر کیا ہے۔

عطا با وصف غم نگار آرائے معانی ہے ۔۔۔ مشامِ جاں معطر کرنے میں معروف نکہت ہے
صفیر خوش نوا کی شکر افشانی کے چرچے ہیں ۔۔۔ وحید بے بدل کے شعر سے عالم کو رغبت ہے

(م نے، اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاد نے صفیر کا ذکر استاد کی حیثیت سے نہیں کیا ہے، یہ نتیجہ صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعرائے عظیم آباد میں حضرت شاد، حضرت صفیر کو اپنا اُستاد نہیں مانتے تھے۔ مبیار) (۵) (م نے شاد و صفیر کی طرحی غزلیں نقل کرکے شاد کے تفوق کا دعویٰ کیا ہے۔ مبیار)

جولائی، اظہارِ حقیقت، از جناب حمید، ص ۵۰۱ تا ۵۰۸ (جناب شاد مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیف انکریٹیسزم اور مرحوم دیدہ کے اقتباسات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاد نے صفیر کی وساطت کے دبیر کے پاس اصلاح کے لیے گئے تھے، ایک مرثیے اور ایک فارسی مثنوی کے علاوہ کسی چیز پر دبیر سے اصلاح لینے کا موقع نہ ملا۔ مبیار)

آثارِ ادب ص ۴۰ (۱) ثابت تخلص سید محمد تقی شاہ مظفر علی اسیر شعر ذیل کے علاوہ ... شعرا دعروج بہار نومبر ۱۹۳۲ء سے نقل کیے گئے ہیں:۔

شاید آغاز میں انجام کی ہے فکر اسے ۔۔۔ شمع روتی ہوئی محفل میں مری آئی ہے

(۲) مفتون تخلص سلیمان مرزا لکھنوی شاعر رشک، ترک وطن کرکے بمبئی میں مقیم تھے، عروج بہار بمبئی اپریل ۱۹۳۵ء سے ۴ شعر نقل کیے گئے ہیں از ان جملہ:۔

رنج والم ملے ہیں جو روجفا ملے ۔۔۔ ملنے سے اور تجھ سے سنگر سے کیا ملے

(۳) وحید تخلص منشی بشیشر سہائے پانڈے رئیس گورکھپور شاعر ماخوذ از گلدستۂ شعرا:۔

اس کا کیا شکوہ کہ وہ جور و جفا کرتے ہیں ۔۔۔ اپنی تقدیر کا البتہ گلہ کرتے ہیں
ملے فردوس میں حضرتِ ناسخ کو وحید ۔۔۔ یہم شب روز خدا سے یہ دُعا کرتے ہیں

---

(۵) مئی ۱۹۳۶ء کے معارف میں بھی ان دونوں کے حالات ہیں ص ۳۶۶ تا ۳۷۲

محکمہ

(۱) دیوان معروف از جناب ریاض حسن خان صاحب خیال (۲) تبصرہ سہیل از ؟ (۳، ۴، ۵)

دریائے لطافت،
ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد،
شرف جہاں کا ایک شعر، از قلم

(۱) دیوان معروف میں ابھی بہت سے اشعار باقی ہیں جو تنقیح کے محتاج ہیں۔ بعض کی تنقیح جو میاریں کی گئی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے، اس قسم کے چند اشعار اس وقت لکھے جاتے ہیں۔ باقی آئندہ:-

ص ۱۱۹ دل جو جس کا فقیر کہہ اس کو نہیں مانع غنا فقیری کی = غنا
ص ۱۲۶ گر کلاہ دوریا مانگے کوئی مجھ سے فقیر = کلاہ دوریا
ص ۱۲۷ ذوقِ سماع مجھ کو کہ آج سے ہیں ہیں سوزیدہ ازل سے ہوں ڈھب مجھے سدا کی

اس شعر کی تنقیح پہلے ہو چکی ہے "سوزیدہ کی جگہ شوریدہ" اور "سدا کی جگہ صدا" صحیح ہے، لیکن "ڈھب" اپنی جگہ پر رہنے دیا ہے، یہ میری رائے میں اصلاح ہے۔

ص ۱۳۰ جس کو چوری کا پڑ گیا چسکا شاہ کی قدر کب وہ جانے سے

شاہ سین مہمل سے بمعنی تاجر، بیوپاری، بنجارا۔

ص ۱۲۹ بوسہ پایہ لیکے دل سے کہا دل اتنا چڑھا دیا کس نے = یہ، یہ
ص ۱۳۰ میں گنہگار لیکن اے رحمت ہم کو تقویٰ بند ھا دیا کس نے = میں
ص ۱۳۱ یہ ادا کے فیض شہر کے ماریں گے اگر ہاتھ سے اپنے اوسان دو گے
جنون آچکا تھا کہ صبر اگر تیں جبھی ورنہ پڑ دگے جو میدان دو گے

مصرع سوم یوں ہونا چاہیے:- جنوں آچکا تھا کہ صبر اگر تیں اب

۱۳۵ جیب جو معروف کو حاکم نے کیا ہے یہ حکم کوئی اس شہر میں ہاں شعر نہ بکنے پائے = چپ
۱۳۶ سہل ہے کیسی ہی کو کیسی ہی مشکل آئے پر یہ آفت تو نہ ہوئے کہ کہیں دل آئے = کہتی ہی
۱۳۸ بخشے نہ کیونکہ گوہرِ مقصد وہ زیرِ فیض بیٹھی ہے دونوں ہاتھ صدف اب پسار کے = مقصود ہر؟
۱۴۰ دوست دشمن سب ملے آتے ہیں لینے کو خبر تو بھی گھر تک واں چلا کیا اس میں تیرا جائے ہے = ٹک
۱۵۱ اب اٹھایا تو بھی ہم نے دے عقل سے قلم ہے بہت حسن کا انجام خدا خیر کرے = گر انجام
۱۵۴ سر پہ ہے مجھ کے غم و درد و صدمہ ہائے فراق اس کی تنقیح ہوئی ہے "غم و درد و صدمہ ہائے فراق"
میری رائے میں غم و درد و صدمہ ہائے فراق ہونا چاہیے۔

(۲) تبصرہ سہیل:- سہیل کے ایک مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا۔ ص ۲۴۳۔

"۱۰ امین الدین امین کے متعلق یہ لکھنا کہ ۱۲۵۰ھ میں یہ عالم صفحی زندہ تھے، فاحش غلطی ہے، کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کے زمانۂ حیات وممات کے متعلق مضمون نگار سری رام کے بیان کو مرزا علی لطف علی کے بیان پر ترجیح دیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ امین کا انتقال ۱۲۰۰ھ سے بھی قبل ہو چکا تھا، جیسا کہ ایک قدیم بیاض سے ثابت ہوتا ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔"

سہیل اس وقت ہمارے سامنے نہیں، اور ہمیں یہ یاد نہیں کہ مضمون نگار نے مرزا علی لطف کے تذکرے کا ذکر کیا تھا یا نہیں، بہر حال، اس تذکرے میں امین کی وفات کا ذکر نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ امین ۱۲۱۵ھ (سال تالیف تذکرہ) میں زندہ تھے۔ اس بیاض کے علاوہ ہمیں کوئی اور ہم نے دیا ہے، علی ابراہیم خان کا ایک خط ریاض المنشات میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علی ابراہیم خان زندہ ہی تھے کہ امین کا انتقال ہو چکا تھا علی ابراہیم خان کا سال وفات ۱۲۰۸ھ ہے۔

(۳) دریائے لطافت نسخۂ مرشد آباد کے مصحح نے ایک تمہید لکھی تھی، اس کے اقتباسات معیار ص ۵ پر شائع ہوئے تھے، ہمارے ایک فاضل دوست نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس میں تین غلطیاں رہ گئی ہیں۔ سطر ۲ میں الفنا طا کی جگہ التقاط ہونا چاہیے۔ س ۹ میں جذالوجود کی جگہ جدید الورود، اور اسی سطر میں بکار آمد کی جگہ کار آمد صحیح ہے۔

(۴) ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد اس مضمون میں یہ آیت نقل کی گئی تھی "انّ المستجاب اللہ فلا تدعوا مع اللہ احداً"۔ حاشیے میں لکھا گیا تھا کہ اس سے ۱۰۳۸ نکلتا ہے ص ۱۸۲ مرآۃ الاحوال کے دو نسخے پٹنہ میں ہیں اور دونوں میں یہ آیت اس طرح ہے، لیکن آیت در اصل یوں ہے: انّ المستجاب للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً، اس صورت میں ۱۰۳۸ کی جگہ ۱۰۳۷ نکلے گا۔ ص ۱۸۵ اس سے حاجی محمد ناصر قزوینی، ناصر غالباً ناصر ہے۔ ص ۱۸۵ اس سے آقا محمد نصر اصفہانی۔ ایک نسخے میں اسی طرح ہے، لیکن دوسرے میں آقا محمد نصر اسانی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۵) شرف جہاں کا ایک شعر معیار ص ۱۱۶ پر اس طرح نقل ہوا ہے۔

"زبیداد تو کے خواہم جدا ای بر گرفتن کرا بزمت بیک حرف خطاب آمد برخیزم"

شعر مجھ میں برگرفتن کی جگہ نے تبسم ہی، کلیات حسن مختار گرفتن ہی ہے لیکن یہ صحیح نہیں شرف جہاں کا دیوان یہاں موجود نہیں کہ قطعی طور پر یہ کہا جا سکے کہ برگرفتن کی جگہ شرف جہاں نے کیا لکھا تھا۔

ہماری زبان

(۱) جزاء و جزو کی بحث از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ صدر شعبۂ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی۔

(۲ و ۳) ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں کو کا استعمال۔ از ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم اے پی ایچ ڈی استاذ فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی

وڈاکٹر عبدالستار صدیقی و جناب ریاض حسن خان صاحب خیال۔

'جزء' اور 'جزو' کی بحث

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی

اُردو میں اس لفظ کا فصیح تلفظ "جُزو" ہی ہے اور اتنا ہی دلیل اس کی صحت کے لیے کافی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ آپ فارسی عربی کی سند مانگیں گے، اس لیے اُدھر رجوع کرنا ضروری ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ "جُزو" (ٹکڑے کے معنوں میں) عربی لفظ ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ج ز ء) ہے (ج ز و) ہرگز نہیں، بلکہ عربی میں (ج ز و) سرے سے کوئی مادہ (کسی اور معنی میں بھی) ہے ہی نہیں، آپ فرمائیں گے کہ "جزو" صحیح ہے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے مانے لیتا ہوں کہ اس لفظ میں واؤ ہے، مگر یہ واؤ اصلی نہیں ہو سکتا، جب اصلی نہیں تو آپ فرمائیں گے کہ زائد ہوگا، مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ واؤ یہاں لام کلمے کی جگہ پر ہے اور فے کلمہ، عین کلمہ یا لام کلمہ زائد نہیں ہوتا، اصلی ہوتا ہے، جب وہ نہ زائد، تو اس کی ہستی موہوم ہے۔

اس موہوم ہستی کے متعلق آگے چل کے کسی قدر تفصیل سے عرض کروں گا، پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ فارسی لغت نویسوں نے کیا فرمایا ہے۔ فارسی لغت کی زیادہ سے زیادہ صحیح حاصل کتابیں تاتارخانی نے تالیف کیں اس لیے پہلے انہیں کو دیکھنا چاہیے۔

فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع میں نہ "جُزو" مذکور ہے نہ "جَزو" اور نہ "جِزو" اور یہ ٹھیک بھی ہے اس لیے کہ ان کتابوں میں خالص فارسی لغات درج کیے گئے ہیں، عربی لفظوں سے مطلق بحث نہیں، اگر تعجب تو یہ ہے کہ فارسی لفظ "جُزو" (جس کے معنی "سوا" "علاوہ" وغیرہ ہیں) اس کو بھی نہیں لکھا ہے۔ اس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے فارسی لفظ "جُزو" کو بھی عربی سمجھ رکھا تھا۔ بہار عجم میں عربی لفظوں کو بھی جگہ دی گئی ہے، چنانچہ اس لفظ کے متعلق یہ تفصیل ملتی ہے:-

"جُزو، بالضم، در لغت عرب بمعنی پارہ است۔ و در فارسی جُز، بدون ہمزہ، ظاہر اً مخفف ہمان عربیست، چوں آن را مضاف نمایند یا چیزے، بجاے ہمزہ واؤ آرند، و گویند جُزو علاہم طلاست، و ہمچنیں 'جزو بدن' و 'جزو آن'۔ بہر تقدیر اسم است و یعنی قریز اسم است،

لیکن یہ اضافت مستعمل نیست ۔ و یعنی مگر حرست ، چنانچہ گوئی "آمدنِ ہمہ مردم
جز زید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس فارسی عبارت کا خلاصہ یہ ہے :۔

(۱) عربی لفظ "جُزو" ہے [ہمزہ کے ساتھ] (۲) تو اس میں یہ لفظ "جُز" (بلا ہمزہ) ہوگیا۔
(۳) یہ فارسی "جُز" عربی لفظ کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔
(۴) فارسی میں اضافت کی صورت میں ہمزہ کی جگہ واؤ لکھتے اور بولتے ہیں یعنی "جُزوِ"
(۵) بہرحال یہ لفظ اسم ہے۔
(۶) اس لفظ کے ایک معنی ہیں "غیر" اور اس معنی میں بھی اسم ہے، لیکن اضافت کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔
(۷) اس لفظ کے ایک معنی ہیں "مگر" اور اس معنی میں یہ لفظ حرف ہے۔

ان سات باتوں میں سے پہلی، دوسری اور پانچویں میں کوئی شبہ نہیں، تیسری بات میں کچھ تامل ہوتا ہے، اس لیے کہ "مخفف" کے اصطلاحی معنی اور ہیں۔ اس لفظ میں سے ہمزہ اسی طرح گرا ہے جیسے دعاء، شفاء، حکماء وغیرہ میں سے، فارسی زبان میں لفظ کے آخر میں ہمزہ نہیں ہوتا (سوا اضافت کرنے کے جب وہ مختفی ہے کے بعد آئے جیسے "بندۂ درگاہ") اس لیے جن عربی لفظوں کے آخر میں ہمزہ تھا وہ فارسی میں بغیر ہمزہ کے بولے جانے لگے۔ پس "جز" کو عربی لفظ "جُزو" کا مخفف کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مخفف نہیں کہہ سکتے۔ (۲) کے متعلق آگے چل کے عرض کروں گا (۶) اور (۷) کو عربی لفظ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان معنوں میں "جز" ایک مستقل فارسی لفظ ہے۔ عربی لفظ "جُزو" کا کوئی اشتراک اس پر نہیں پڑتا ہے (۴) کے متعلق یہ دریافت کرنا ہے کہ ہمزہ اور لفظوں میں بھی واؤ سے بدلا گیا ہے یا نہیں؟ "سُو" ایک عربی لفظ ہے فارسی میں اکیلا نہیں بولا جاتا۔ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، جیسے سُوءِ ادب، سُوءِ مزاج، سُوءِ ہاضمہ وغیرہ یہاں ہمزہ واؤ سے نہیں بدلا، "نور" میں بھی نہیں بدلا، یعنی "نورِ آفتاب" کہیں گے، نہ کہ "نوءِ آفتاب"۔ عربی لفظ "شیٔ" کا ہمزہ بھی فارسی زبان میں نہ آیا بلکہ "شیٔ" کو بھی "لاشی" بولنے لگے۔ واؤ اس میں بھی کہیں نہ آیا۔

صاحب غیاث اللغات نے بھی وہی لکھا ہے جو بہار عجم میں ہے، صرف دو باتیں زیادہ کی ہیں ایک یہ تشریح کی :۔

"لفظ 'جز' بدون واؤ لفظ فارسی است و بمعنی 'غیر' آید۔ ہرچند کہ مرادف لفظ 'غیر' است مگر بخلاف لفظ 'غیر' مقطوع الاضافۃ باشد یعنی بکسرۂ علامت اضافت استعمال نہ می شود"

دوسری بات یہ لکھی کہ :۔

"و عبارت عربی ایں ہمزہ اگر مضموم باشد بصورت واؤ نویسند چنانکہ "ھٰذا اجزُؤُہٗ" و اگر

مکسور باشد بصورت یائے نویسند چنانکہ "مَوْرِدُ إِلَى جُزُمَادَةٍ" و اگر منصوب باشد
بصورت الف نویسند چنانکہ "رَأَيْتُ جُزْأَ" [یہ ڈھنگ عربی کے غلط نویسوں کا ہوں
کا ہے اور اسی سے فارسی دانوں کو وہم کا ہوا اور وہ "جزو" بولنے لگے۔]

عربی میں ہمزہ کی کتابت کے کچھ قاعدے مقرر ہیں۔ ان میں سے یہاں صرف دو کا بیان کر دینا کافی ہے:-

(۱) اگر ہمزہ، لفظ کے آخر میں واقع ہو اور اس کا ماقبل ساکن ہو تو ماقبل کی حرکت کا ہم جنس حرف لکھ کر اس کے اوپر ہمزہ بنا دیا جائے گا، جیسے قَرَأْ، جُزْءٌ، صَبْءٌ۔

[قَرَأَ کی ر پر فتحہ تھا۔ اس لیے فتحے کا ہم جنس یا موافق حرف (الف) لکھا گیا۔ اسی طرح ضمے کا ہم جنس واؤ اور کسرے کی ہم جنس یٰ کام میں لائی گئی۔ یہ حرف گویا ہمزہ کی کرسی قرار دیے گئے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں، پڑھے نہیں جاتے۔ آواز تینوں لفظوں میں ہمزہ ہی کی نکلتی ہے۔]

(۲) اگر ہمزہ، لفظ کے آخر میں واقع ہو اور اس کا ماقبل ساکن ہو، تو کوئی حرف (سوا ہمزہ کے) نہ لکھا جائے گا، جیسے جُزْءٌ، بَطْءٌ، اَلْجُزْءُ الْاَوَّلُ، بَقِيَ الْجُزْءُ الْاَوَّلُ، خَبْءٌ، مِلْءٌ، اَلشَّيْءُ، بِالشَّيْءِ وغیرہ۔

"جُزْءٌ" کا لفظ، اس دوسرے قاعدے کے تحت میں آتا ہے، اس لیے کہ اس میں ہمزہ کا ماقبل (یعنی ز) ساکن ہے جتنی عربی کتابوں میں (چاہے وہ نئی ہوں یا پرانی) یہ قاعدہ بیان ہوا ہے، مثالوں میں "جُزْءٌ" ضرور موجود ہے۔

پرانے ہی زمانے میں بعضے کاتبوں نے یہ غلطی کی کہ صحیح لفظ "جزء" کی جگہ "جزو" لکھنے لگے، اور ایران اور ہندوستان کے کاتبوں نے اسی غلط اِملا کو اختیار کیا، چنانچہ کلام مجید کے اکثر ہندوستانی نسخوں میں ہر سپارے کے شروع میں حاشیے پر "الجزو" لکھا ہوا دیکھیے گا۔ عرب بیچارے نے اس انقلاب کو اگر وآ سے لکھ بھی دیا تھا تو تلفظ صرف ہمزہ ہی کا کرتا تھا، واؤ کو اوا نہ کرتا تھا۔ ایرانیوں اور ہندیوں نے واؤ کو اسی طرح ادا کرنا ضروری جانا جیسے عربی لفظوں "شهود" "نحو" "تو" میں جن میں واؤ اصلی ہے، اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "جزو دماغ" اور "جزو بدن" "امر جزوی" اور "جزو لاینفک" فارسی زبان میں جاری ہو گئے۔

صاحب بہار عجم نے "جزو" کو اضافت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، ہمگ آگے چل کے خود ہی "جزو دان"، "جزو کشیدن" اور "جزو کشی" کو اپنی کتاب میں داخل کیا ہے اور سندیں ملا سعید اشرف اور ملا طاہر غنی کے شعر نقل کیے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب انہیں کے قول کے مطابق فارسی میں "جزو" کے لیے "جز" بھی بولا جاتا ہے۔ تو "جز دان" اور "جز کشی" وغیرہ بھی صحیح ہیں۔ "جزو کل" میں تو "جز" کا لفظ ہمیشہ بغیر واؤ کے استعمال ہوتا ہے۔ "فرہنگ شعوری" بھی ایک مستند لغت ہے۔ افسوس کہ میں اس سے

لہ یہ عربی کا فقرہ کچھ بھی سا ہے۔ لفظ "اِلی" بھی یہاں صحیح نہیں ہے!

براہ راست مستفید نہیں ہو سکتا، مگر فرس کے فارسی لاطینی لغت میں شعوری کی عبارت کے ٹکڑے نقل ہوئے ہیں شعوری نے "جزدان" ہی لکھا ہے اور سند میں کسی شاعر کا یہ شعر دیا ہے:-

کہ اوراق پریشاں ہر چہ دارم زجزدان بود ضائع بیقرارم

خلاصہ اس سب کا یہ ہے کہ فارسی میں اضافت کی حالت میں "جزو بدن" وغیرہ فصیح ہیں اور "جزبدن" وغیرہ بھی صحیح ہیں: "جزدان" اور "جزودان" یا "جزکشی" اور "جزوکشی" وغیرہ کی دونوں صورتیں صحیح، اس لیے کہ دونوں صورتیں اہل زبان استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں، جیسا کہ شروع میں ذکر کر چکا ہوں، "جز" فصیح ہے اگرچہ "جزو" پر ترجیح ہے۔ "جزودماغ" وغیرہ بھی فارسی کے تتبع میں صحیح، اگرچہ جہاں اضافت نہیں ہے، جیسے "جزدان"، "جزرسی" وغیرہ "جزو" (بلاواو) کو ترجیح ہے، بلکہ "جزودان" اور "جزورسی" میں سراسر تکلف ہے "جزو" کو کاٹ کر "جز" بنانا ہرگز درست نہیں۔

"جزو" اور اس کے مُعرّبات "جز" اور "جزہ" کی بحث ختم ہوئی، اب اس "جز" کے متعلق بھی کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں "جوز" "بوز" (ابوجز) میں ہے اور ٹھیٹ فارسی ہے، یہ تو اوپر آچکا ہے کہ اس لفظ کو عربی سے کوئی، کسی قسم کا تعلق نہیں ہے،

اس کے فارسی الاصل ہونے کے بارے میں متاخرین کی فرہنگوں میں (سوا "غیاث" کے) کہیں کچھ ملتا نہیں، متقدمین کی مختصر فرہنگوں میں سے اکثر فرہنگ جہانگیری کا ماخذ تھیں، ان میں سب سے پرانی تین ہیں۔ (۱) فرہنگ ابوالحفص سُغدی (۲) فرہنگ اسدی طوسی (یعنی "لغت فرس") (۳) فرہنگ حکیم قطران۔ پہلی اور تیسری کا پتا نہیں، دوسری کو جرمانی مستشرق پاؤل ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا۔ یہ ایک بہت چھوٹی سی کتاب ہے جس میں کچھ کم بارہ سو لغات درج ہیں، مجمع جو صفحے بھی ہو گیا سو سند کے شعروں کی بدولت۔ اس کتاب میں بھی "جز" کا لفظ نہیں ملتا، اور کتاب کے حجم کو دیکھتے یہ کوئی ایسے کی بات نہیں، سغدی اور قطران نے بھی اپنے رسالوں میں غالباً اس کو درج نہ کیا ہوگا، اور نہ صاحب جہانگیری اور دوسرے فرہنگ نگار مفرد لفظ نقل کرتے۔

پرانی کتابوں میں ایک اور چیز ہے۔ جس سے فارسی کے فرہنگ نگار بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہے زمخشری کی قابل قدر عربی فرہنگ "مقدمۃ الادب" جو ایرانیوں کے فائدے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی تالیف کا زمانہ اسدی کی لغت فرس کی تالیف سے کوئی پچاس برس بعد کا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس مصنف کی المفصل کی اتنی "اور تیسرے شارح نے یہ شہرت پائی، اس کی مقدمۃ الادب" کو، اور تو اور نحویوں تک نے آنکھ بھر کے نہ دیکھا۔ زمخشری کی کتاب کو بھی ایک جرمانی مستشرق (ویسٹن فیلڈ) نے ۱۸۴۶ء میں شائع کیا۔ اس کتاب میں عربی لفظوں کے معنی فارسی زبان میں بیان ہوئے ہیں، چنانچہ عربی لفظ "جزء" کے معنی "پارہ، جزو" لکھے ہیں اور جمع "اجزاء" اور عربی لفظوں فیر "اور نحوی کے

معنی یوں لکھے ہیں: "دیگر، جز، چیزے دیگر"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "دیگر، چیزے دیگر" کا مرادف "جز" ایک فارسی لفظ ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لفظ فارسی نظم و نثر کی کتابوں میں کثرت سے آیا ہے۔

لفظ کے اشتقاق کے متعلق مختصر عرض کر دوں کہ سنسکرت میں "جتاک" اور "جُت" کے معنی ہیں "الگ کیا ہوا"۔ اور "الگ" "جتاک" کا لفظ فارسی میں آکر گر گیا اور ت، ذ سے بدل گئی، اس طرح وہ "جذا" اور آگے چل کر "جُدا" ہو گیا۔ "جُت" کی ت بدل کر ذ آئی ہوئی تو "جُذ" ہوا۔ اس کے ساتھ "از" اکثر آتا تھا "جذاز"۔ ان دونوں لفظوں کے ایک ساتھ بولے جانے سے "جُذز" ہوا اور بالآخر "جُز"۔ اسی پیچھے ہوئے "از" کے باعث اس پر اضافت نہیں آتی اور اسی لیے اسے اسم کہنا بھی درست نہیں۔ معنوں کے لحاظ سے بھی متعلقات میں ہے، اسم نہیں۔

ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں کو کا استعمال

(۱) آپ نے ص ۲۱۲ پر لکھا ہے کہ ریاض وجلیل کے کلام سے مفعولی حالت میں ضمیر کے ساتھ کو کے استعمال کی سند دیکھا سکتی ہے اور نہ میں داغ کا شعر نقل کیا ہے۔ اگذارش یہ ہے کہ میرے نزدیک نثر میں کسی لفظ یا کلمے یا اصطلاح یا محاورے کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق نظم سے استناد کرنا ہمیشہ صحیح نہیں کیونکہ نظم میں وزن اور ردیف وقوافی کی مجبوریاں نکلنے والے سے کچھ کا کچھ لکھوا دیتی ہیں چنانچہ کل داغ کا ایک شعر نظر سے گزرا:۔ ہاتھ جوڑے پاؤں پر ان کے گرے ۔ پھر بھی اور رحم ہی کے رحم ہی رہے، ظاہر ہے کہ "رحم کے رحم ہی رہے" ہونا چاہیے تھا۔ مگر قافیے کی مجبوری نے کچھ کا کچھ کروایا۔

(۲) ۱۵۱ کی آپ نے جو تصحیح فرمائی ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے "مجھ کو" "اس کو" "تجھ کو" وغیرہ کو زبان سے خارج فرما دیا۔ یہ تو ناسخ کو بھی نہ سوجھی تھی، مجھ کو اور مجھے وغیرہ بالکل مترادف ہیں جس مقام پر جو صورت دونوں میں سے پسند آئے بولے لکھے۔ البتہ بعض مواقع میں کہنے سے زیادہ وضاحت یا تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے مگر فرق اگر ہے تو ایسا خفیف کہ قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۳) میرے نزدیک حالت مفعولی میں کو کا استعمال صحیح ہے، بلکہ بعض صورتوں میں "مجھ کو" "تجھ کو" "مجھے" "تجھے" سے قابل ترجیح ہو سکتا ہے۔ سند تو ناروں کے یہاں بے شمار ملیں گی، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں:۔

مقدمۂ حالی ص ۲۴ "سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو" ص ۱۳۹ پھر اس کو درست کہنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔ اردوئے معلی ص ۱۳ "تم کو یاد ہے" ص ۱۵ "حیاں سیاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے"۔ آب بقا خواجہ عبدالرؤف عشرت ص ۱۳ "ان کو اکثر بڑے جوان کہتے تھے" ص ۲۴ "مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا محکمہ دیا"، نظم لکھنوی رسالہ اردوئے معلی جنوری ۱۹۱۲ء "اس کو استعمال کرنا دشوار ہے" ص ۱۱ "شعر میں بھی ان کو نمونہ کہہ دینا مشکل ہے" (امیر مینائی، میر غلام علی آزاد کی بھی سندیں دیکھا سکتی ہیں) وہی سوا سی سلاست و شائستگی ہے۔

عالمِ ادب

(۱) بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیا سمیلن ناگپور کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا، اس کے چند اقتباسات ہون کے پرچے میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس بار ہم مزید اقتباسات پیش کرتے ہیں:-

ہندی کو دوسری زبانوں سے الفاظ لیکر اپنے ذخیرے کو بڑھانا چاہیے، ہندی میں عربی فارسی کے جو الفاظ رائج ہیں ان کے بارے کاٹ کی کوشش فضول ہے، ایک دوست نے "زوال" کے لیے "کھ مارگ درستہ کھنڈ" کا استعمال مناسب سمجھا تھا۔ یہ ہندی کے ساتھ ظلم ہے، ہندی کے الفاظ کے ذخیرے کی تکمیل سنسکرت سے ہو لیکن دوسری زبانوں کے سلیس اور چھوٹے لفظوں سے ہمارا مطلب کیسے حل ہو سکتا ہو لینے میں ہچکچانا نہیں چاہیے، آج سے ۹۰ برس پہلے راجا شیو پرشاد نے ہندوستانی کی نیو ڈالی تھی، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "پنڈت لوگ سوچتے ہیں کہ جتنے اصلی سنسکرت شبد (چاہے وہ کچھ ہی آئیں چاہے نہیں لکھے جائیں اتنی ہی ان کی ناموری کا سبب ہے، اور اسی طرح مولوی لوگ فارسی اور عربی شبدوں کے لیے، غرض پل بنانے کے بجائے دونوں خندق کو گہرا اور چوڑا کرتے جا رہے ہیں"۔ ہم بھی تک اس خرابی کو جانتے ہوئے بھی اس خندق کو گہرا ہی کرتے جا رہے ہیں، ہندی کے ایک مصنف اجودھیا سنگھ جی اپادھیائے لکھتے ہیں:-

رویوڑیاں پر پھلا پر ایکا نیکا، رکنہ دو دھاتا، شنو کی کلھاسنی سر سکا کریڑا کلا تیلی، شو بھا داری دھی کی امولیا نمی کی لاوینہ لیلا حیائی، شری رادھا مرو بھاشنی مرگ کی، اھوریہ سمودی تھیں، کمنا دینا دتا دونا موہ گھٹا ملینا، آسانا تھی نکٹ پتی کے موہنیتہ الیشوا دھا۔ اسی مصنف نے یہ بھی لکھا ہے:- ایک دُنیا سے اٹھا ہے چاہتا، اودھے اشتی جوانی ایک کی، چاند اور سورج گگن میں گھومتے ہیں رات دن، اُدوا لوں میں سر محو اتباں، جو سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا، دُنیا کی محفلوں سے گھبرا گیا ہوں یارب، اور نیا شوالا کی سی نظموں کے مصنف تھے، خیالات کے تغیر کے بعد ایسی خشک نظم لکھنے لگے جیسے "اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے، جم اور، ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور۔ ہمیں جہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ فارسی عربی لفظوں کے بائیکاٹ سے ہم مسلمانوں کے لیے ہندی کو بہت مشکل تو نہیں بنا رہے ہیں، وہیں یہ لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ صرف فارسی عربی کے لفظوں کو کر اور سنسکرت کا بائیکاٹ کر کے گجراتی، مرہٹی، آسامی، تامل، اڑیہ وغیرہ کے بولنے والوں کے لیے ہندی کا سمجھنا دشوار نہ ہو جائے، ہمارا شمر، آسام وغیرہ کو چھوڑ سکتے ہیں نہ شمالی ہند کے مسلمانوں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کے متعلق ہماری روش یہ ہونی چاہیے کہ (۱) جو لفظ عربی فارسی کے ہندی میں رائج ہیں انہیں خارج نہ کیا جائے (۲) عربی فارسی کے جو الفاظ گجراتی، مرہٹی، بنگلہ، پنجابی اور دکن کی زبانوں میں آگئے ہیں اور ان کے ٹھیک ہم معنی لفظ ہندی میں نہیں ملتے انہیں بھی لے لیا جائے (۳) ان کے علاوہ ایسے نئے لفظ جو نئے مطالب کو ادا کرتے ہیں ان کو لینے میں بھی تامل نہ کرنا نہیں چاہیے، ایک بہت چھوٹا لفظ "شرط" ہے جسے سب سمجھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ

اس کی جگہ سنسکرت کا کوئی لفظ کھوج کر نکالا جائے۔ کچہریوں میں محکمہ مال اور حکومت سے متعلق بہت سے لفظ ہندوستان کی سب زبانوں میں رائج ہیں اگر ان کے ہم معنی لفظ ہندی میں رائج نہیں تو سنسکرت کے لفظ (صرف شاستر سے نکال کر) ان کی جگہ استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (۳) انگریزی کے بہت سے لفظ رائج ہیں انہیں رہنے دینا چاہیے۔ ٹرین کی جگہ "لوہ پتھ گامنی واشپ یان" سٹیشن کی جگہ "مولیا پتر" کاغذ کے لئے کی ضرورت نہیں (۵) صوبے کی زبانوں میں ایسے بہت سے لفظ ہیں۔ جو آج کل ہندی میں رائج نہیں ہیں، انہیں لانا چاہیے۔ "باڈو" کی طرح ہندی میں داخل کرنا چاہیے (۶) علمی اصطلاحات ہندوستان کی کل زبانوں کے لیے ایک ہوں تو بہتر ہے جیسے کنسرٹ کے لیے "دھارا سبھا"، "ویوستھا پکا سبھا" (۷) گاؤں کی بولی میں بہت سے الفاظ ہیں گے جن کے ٹھیک ہم معنی الفاظ ہندی اور سنسکرت میں نہیں ملتے۔ گریرسن نے اپنی کتاب بہار ریورل لائف میں برتے کے ہر ایک حصے کا نام دیا ہے۔ گاؤں کی زبان میں نئے لفظ گڑھنے کی اچھی طاقت ہے۔ موٹر کار کے لیے ہر گاڑی، بائیسکل کے لیے پیر گاڑی، ماچس کے لیے دیا سلائی، ریلوے سکنل کے لیے سکندر۔ لوف کے لیے پاؤ روٹی۔ کتنے اچھے لفظ ہیں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی طاقت جو گاؤں کی بولی میں ہے، کتابی زبان میں نہیں۔ لوٹنے سے لوٹاس بنے سے بچوس، صابن سے صبونانا، مٹی سے مٹیانا، پانی سے پنی آنا، غصہ سے غصانا۔ دھکے سے دھکیانا، شرم سے شرمانا، گھن سے گھنانا، ایسے ہی الفاظ ہیں۔ ہمارے یہاں کے بھی کچھ استادوں سے ایسی کوشش کی ہے "اور جو ہاری سواری کی نندتی ہے" (پنڈت سدل مصر) "عرب کا اونٹ کس طرح جگا لیا ہے" (پنڈت پدم سنگھ شرما) نند سے نندتی جگالی سے جگالتا بنا لیا ہے لیکن ایسی کوشش بہت کم ہوئی ہے۔

جو لوگ ہندی نہیں جانتے، انہیں تین چار باتوں کی وجہ سے بڑی مشکل پڑتی ہے (۱) ایک تو "انیت وتذکیر" اس میں بڑا جھگڑا ہے، بڑے بڑے لکھنے والے بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے لفظ "اور" عام طور پر مؤنث مانا جاتا ہے لیکن ہندی کے ایک بڑے مصنف نے اسے مذکر لکھا ہے۔ نئے لفظوں کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ کومن، لالٹین، موٹر، کانگریس اور کانفرنس کیوں مؤنث بنا دیے گئے ہیں۔ اردو کے لفظ قلم اور چراغ ہندی میں کیوں مؤنث ہو گئے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ ان کے ہم معنی لفظ سبھا، کمیٹی، اور لیکھنی وغیرہ مؤنث ہیں۔ اور نہ سنسکرت کی سند پر ان لفظوں کی تذکیر وتانیث مقرر کی جا سکتی ہے، اگنی، آتما اور پستک سنسکرت میں مذکر ہیں لیکن یہ ہندی میں مؤنث ہیں۔ بے جان لفظوں کے لیے موزوں اور سہل قاعدے بنانے کی ضرورت ہے (۲) نے کے استعمال میں بھی بڑی مشکل پڑتی ہے۔ پنجاب میں نے کا استعمال الگ ہے اور آگے ہندی لکھنے والے سمجھتے اور جانتے ہیں (۳) بڑی مشکل اس میں بھی ہے کہ کب فعل کی جمع کام کے مطابق ہو اور کب کام کرنے والے کے مطابق پنڈت جواہر پرشاد شرما کا ایک جملہ ہے "جہاں تک میں پہلے تو ہاں ہوں کی اس میں جو فعل کے لیے کون سا مونث کام ہے یہ کچھ میں نہیں آتا (۴) ایک ہی لفظ کی طرح سے لکھا جاتا ہے۔ اس میں بھی بڑی دشواری پیدا ہوتی ہے:

مطبوعات جدیدہ

(۱) دیوان تاباں، از قاضی
(۲) کلیم مجم از ؟

(۱) دیوان تاباں، مصنفہ میر سید المی تاباں ولد میر عبدالحق صاحب سلسلہ، انجمن ترقی اردو ص ۲۰۶۴، قیمت مجلد ۴ عہ، غیر مجلد ۳ عہ۔

انجمن کی اکثر مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی حسن طباعت کا بہتر نمونہ ہے اور اس کے مقدمہ مصنوی کے متعلق ہم اپنی مفصل رائے دے چکے ہیں۔

(۲) دیوان تاباں کے قلمی اور مطبوعہ نسخے جو اس وقت موجود ہیں حسب ذیل ہیں: قلمی نسخہ ۱، ملوکہ سرسید انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۲، ملوکہ انجمن ترقی اردو، ۳، ملوکہ جناب کیفی ۴، ملوکہ سر راس مسعود ۵، ملوکہ ذیر علی صاحب حیدرآباد، ۶، ملوکہ کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد، ۷، ملوکہ کتبخانہ مدرسہ حیدرآباد، ۸، ملوکہ نواب سالار جنگ، ۹، انتخاب دیوان از نواب عماد الملک مطبوعہ ۱۸۹۶ء و نسخہ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء۔ یہ نسخے یا تو نہیں چھپے اور جو نسخوں پر مبنی ہے۔ انجمن کا شائع کردہ نسخہ پہلے دوسرے تیسرے نسخوں پر مبنی ہے۔ ت

دیباچے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ متن کی درستی کس اصول کی بنا پر کی گئی ہے۔ بظاہر کسی ایک نسخے کو اصل قرار دیا ہے اور باقی تمام نسخوں کو جو دوسرے نسخوں میں ملتے ہیں، انہیں بھی متن میں شامل کر لیا ہے۔ الحاقات، اختلافات، اضافے کیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل سے احتراز کیا ہے کہ کون سے الفاظ کس نسخے میں ہیں۔ قلمی نسخوں کے سنین کتابت بھی نہیں دیے۔ اس قسم کی کتابیں آئندہ جو شائع ہوں گی ان میں ان دو باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہے ایک تو یہ ہے کہ ان کلی نسخوں کے متعلق جن پر کتاب کا متن مبنی ہے مفصل اطلاعات فراہم کی جائیں، دوسرے یہ کہ اختلافات یا تو دکھائے نہ جائیں، یا اگر دکھائے جائیں تو یہ ضرور بتایا جائے کہ کس نسخہ میں کس طرح ہے۔

(۲) یہ نسخہ جتنا چاہیے، اتنا صحیح نہیں، لیکن دوسرے اداروں سے جو کتابیں چھپتی رہتی ہیں ان کے مقابلے میں زیادہ غلط بھی نہیں، تاہم انجمن کو آئندہ صحت کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

(۳) دیوان کی جامعیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جس کے متعلق اس کے مرتب کا دعویٰ ہے کہ کل کلام پر حاوی ہے) کل ۱۹۵۵ اشعار ہیں اور اس کے نسخے میں ۲۶۹۲، بڑی تلاش سے ہمیں جتنا اشعار ایسے ملے ہیں۔ جو اس میں موجود نہیں۔ یہ اشعار ص ۲۰۵ پر درج ہیں۔

(۴) الحاقی کلام اس میں بہت کم داخل ہے۔ اس قسم کے کل اشعار ہم نے قبر سے کے آخر میں نقل کر دیے ہیں۔

(۵) مصنف کے حالات دیباچے میں موجود ہیں، لیکن زیادہ تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ہمیں ان کا بیان ہے کہ میں عالم شباب میں انتقال کیا۔ ہماری رائے میں موت کے وقت ۲۵ برس سے کم کی عمر تھی، فاضل مرتب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مثنوی دیوان کے ۱۵۸۰ پر شروع ہوتی ہے، وہ عمدۃ الملک امیر خان کی مدح میں ہے، یہ مثنوی عمدۃ الملک کے قتل کے بعد لکھی گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ عمدۃ الملک کے باغ اور حبشی ہولی کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن تاباں کا اصلی حامی عنایت اللہ کشمیری ہے، جس کے یہ رفیق تھے۔

تصحیح اغلاط

ظالم = بے ظالم۔ اس قسم کی غلطیاں اور بھی ہیں، جن میں سے اکثر نظر انداز کر دی گئیں ۱۲ کوہ بیاباں = کوہ و بیاباں ۳ پرانا = پراتا، ۱۵ ہے تس = ہے تس پر، ۲۲ تمہارے لال = تمہارے لعل، ۲۵ حرم کو چھوڑوں کیوں نہ سیکے = سیکے میں بیٹھ = سیکے، اس کے علاوہ متذکرہ میں بھی سیکے ہی ہے، سیکے صریحاً غلط ہے، ۲۶ یاقوت لب ترا ہوا کیوں خط سے جرم دار = دار؟ ۳۲ آرزو ہے کہ ترے غم سے بیاباں میں پھروں اور ہوا پا کو ترے خار نصیب = مرے ۳۵ سخن کے بھر میں آکے مری کشتی تباہی تھی کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا اشتہ = آگے کے علاوہ اور جگہ بھی اسی طرح ہے، آگے سے کوئی مطلب نہیں نکلتا، ۳۶ مثل لیس، اصل غرا = غرا، ۴۹ شمع رو کے گرد پھرتی ہیں سدا قربان ہو = چشم میری پر لگا مژگاں کے پروانے کی طرح = پھرے، میرے تاباں کی زباں پر لفظ چشم نہ کر، نوشت دونوں ہے فصل جمع کی رعایت سے اس شعر میں نہ کر پڑھنا بہتر ہوگا، ۵۳ چھ تس = تس می ۵۴ جاں لب ہیں غم میں تیرے ساغر صہبا کی طرح = ساغر صہبا، ۵۴ ہوہوں = ہوں ہوں، ۵۵ ہے سبب نہیں تندی بوگل میں اکثر باغ میں میرے گل رو کے عوض سمجھ سے پڑا ہے گر = اگر ۶۱ جھل کر = جھیل کر ۶۲ مت رکھ امید یہ کہ کر دیگا جہاں کی سیر = لے سخر سمجھ تو غنیمت جہاں کی سیر = جہاں دونوں مصرعوں کا قافیہ نہیں ہو سکتا، دوسرے میں اگر جہاں پڑھا جائے تو یہ مبالغہ دور ہو جاتی ہے، ۶۲ گر شاہ آسماں میں زمین غزل کے سب تاباں کو فکر شعر میں ہے آسماں کی سیر = گو؟ ۶۴ جو در یاد ہوں کے تئیں اور پھر نہ دل داری کرے رہتا ہوں بدل اسی سے میں اسی دلربا سے کیا غم ہے جو دلربا دلوں کے تئیں ۶۵ ہے کس کے شک میں اوں سوگوار طبع کیوں اس طرح سے رونی ہے بے اختیار شبنم = طبع ۶۶ روتی ہے ہیں کہ غم میں ترے زار زار شبنم = مرے ع، کس کا غم، مشتبہ کا یا عاشق کا؟ ۶۶ جاتی طرف = طرح ۶۸ اور دیوانے مرے خود سے چھپ جاویں گے بھوسے مجنوں کر لیجا کر زمانہ اس کی فرف = چھپ، مخفف چھپ یعنی شرما جاویں گے۔ چھپ جانے کی تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۶۸ دیا کہاں

جاب کوئی ہم ترکے ہم ۔ کہ ۔ ۹۲ ایسا نہیں غریب کوئی گھر گھر کا ہم ۔ ایسا نہیں خراب کوئی دربدر کہ ہم ۔ عزیز، تم، ح کے علاوہ کسی نزکر ے میں بھی اسی طرح ہے ۔ ۹۳ نذر اس کو دیا اپنی سلامتی کے نہیں ۔ اس کی کرپا ۹۴ پنے میں پنے ہو عمل کا سیمیا بنایا ہے گل مجمل نہیں ۔ جمد مجمل ۔ حاشیے میں صمنا کی جگہ جیفا اور مجمل کی جگہ مخمل لکھا ہے ۔ صمنا اور جیفا دونوں غلط ہیں، اور مجمل صحیح، خلاف بیں بلکہ کاٹ کا بیدا کر وہ ہے ۔ ۹۵ آرزو ہے مرے تاباں کو بھی اے قاتل رہی ۹۶ تیری آنکھیں بری کی بیماری ہیں ۔ ح میں بڑی ہے، جوہری اور بڑی سے صحیح تر معلوم ہوتا ہے ۔ ۹۷ اس جوانی پر ہیں ہے خاک جینے نہ مر ۔ ہوا اور ابر ۔ ۹۸ اپنے لب سے ایک بوسہ دے تو میں جیتا ہو جاؤں ۔ ہوں جان ۹۹ ساغر و مینا ۔ ساغر و مینا ۔ ۱۰۰ خط نے یہ مصحف رخ کی ترے لکھا ہے ۔ تفسیر ۱۰۱ نیند سے اٹھ کے سیماساتی ۔ بسما ۔ ۱۰۲ کرے تو کس طرح تاباں غلط الفاظ معنی میں ۔ مصرع جہاں دیکھا گیا اسی طرح پایا گیا لیکن الفاظ اور معنی کے درمیان واو عطف ضروری معلوم ہوتا ہے، ۱۰۳ جس طرح ترے غم میں دن کاٹتے ہیں بھاری ۔ وے ہی گزرتی ہے یہ رات مجھے بھاری ۔ ساری، ۱۰۴ جو طبیل گئی اب کے تاباں چمن میں آوے پنے میں کانٹے پھر ہوگی ۔ میں فاضل ہے ۔ ۱۰۵ ظالم وفا مری کو تو لیتا ہے کیا حساب اپنی جفا و ظلم کا بھی رکھ شمار ہے ۔ یہ شعر سوا نسخوں الجن کے جہاں دیکھا گیا، اسی طرح دیکھا گیا، ظالم مری وفا کا لکھ اپنی جفا و ظلم کا بھی رکھ ۱۰۶ ابرو کا اس کے وصف تکلف سے کر گروں تاباں تو دیجیو نہ کوئی سنج میں مجھے ۔ جس تاباں کے معارفین کا شعر ہے ۔ جو نہ ہیں نہ ہے اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل بہت کی تو نے اس تیغے کی خدمت کو کن بس کر ۱۰۷ نام فردوس کا سنتے ہوئے سب باتیں ہیں ۔ ہو یہ سب ۱۰۸ ہی گرنے میں گرتی ہے صدا اپنی یہ تغزل کی ہے سد ۱۰۹ پھر بھر پیاریوں کے نے زور دے پڑے ۔ زور ہے ۱۱۰ کیا کروں یا ہوا جائے ہیں اس کا قاتل اب تو تاباں مرے ۱۱۱ کے اپر آن بنی ۔ کے میں اس قاتل کا ۱۱۲ ہم مان مان گئے میں پر ان کی نہیں سان اگر لے تو بتا ان جڑ جائیے ۔ پھر اس، ۱۱۳ لکھا تمت کا کوئی بھی مٹا سکتا نہیں ۔ ہے کیا قدرت مذکر و مؤنث ۱۱۴ حسن کی گرمی سے اپنی آپ تپ کرتا ہے دو ۔ آپ ۱۱۵ تھرے سے مدام اس کو ہے شوق عرض مے کے تاباں جو کوئی جگا اس در میں بنیادی ۔ بنیاد ہوں ۔ اس شعر میں اگر کوئی صحیح نہیں تو بنیاد ول صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ بنیادی سے کوئی مطلب نہیں نکلتا ۱۱۶ کیوں نہ لڑکے اس کے نہیں غیر کہیں شیخ تو رکھتا ہے ڈاڑی گزبڑی ۔ ایک تو ڈاڑھی صحیح، ملا ہیں، دوسرے لفظ گزبڑی نہیں کر بڑی ہے (سرمایۂ اردو مبلال) میں ۱۱۷ س ۱۱۱ ب ٹوکی جاتی نہیں اہل دول کی نہیں ۔ تن، ۱۱۸ سطر ۶ ہوتی نہیں مجھ کو اس سنج سے ٹک فرصت، ہوتی ہی نہیں ۱۱۹ س ۳ و ۴ اسی آئینہ رویں ہے مجھے اس طرح بے تابی کہ جو سیماب ہی آب ہوئے مردم آبی ۔ جوں سیماب یا بے آب ۱۲۰ س ۵ فرزدیک اپنے ٹوٹھی میں سے خرچ کم کروں ۔ لے ۱۲۱ یہ تن زرد کے لے ربط ہوا کھوتا ہے ۔ مرا ۱۲۲ س ۱۵ ہتیا ہوں لے اپنے دیر کے

کے ہمراہ = پیتے ہیں ہے ہم ۲۰۰ س ۱۶ پرسے بھی دیتا ہے ہر لحظہ وہ ماہ = رہے ہے یاد دیتا ہے برس ۹ بھڑکی اس وقت الفت کی آتش = بھڑکی ہے، ۲۴۰ س ۳ ناصح کی یہ ہم کو جاتی نہ لقی پند = جو فاضل ۲۴۰ س ۵ کہتا تھا یہ ہم گو بجھا کے ہر چند = وہ فاضل، ۲۴۰ س ۶ تھے میکدے سے بھی ہم بس کہ خورسند = ہم فاضل س ۹ کہ جانے آئی ہے کیسی یہ آفت = یہ فاضل ص، ۲۴۰ س ۱۱ ہیں غم سے یک لفظ ہم کو فراغت = دم س ۱۵، آیا ہے گھٹن میں تو ہو کے بدست = آئے ہو گھٹن میں ہو کے ۲۳۰ س ۱۰ و ہم سے کہ وہ کے ہیں بدست سے ساجد ہم شیشے سے کہ لکھتے ہیں شاہ = ہیں سے کہ وہ کے کو فاضل س ۱۰ تو ہاں کے لئے تو کا بان تو کر کم - خوباں کا خطا ص ۲۲۶ تا ۲۳۰ تک حافظ کی ایک غزل کی قطعیں ہے، بہ کثرت مصرعے بگڑے ہوئے خارج ہیں اگر کاتب کی غلطی نہیں تو مصنف کی غلطی ہے، لیکن ایک مشاق شاعر سے ایسی غلطی کا ارتکاب قرین قیاس نہیں) ۲۲۹ س ۵ جنوں کا دست ہوا دشمنی شعور ہوا دشمن ۲۶۰ س ۴ و ۵ اہل کمن بیچ ہے بادشاہ = بادشا، ۲۶۹ س ۸ کوئی مثل ذوارہ کرے تھا صحت = کرتا تھا، ۲۶۰ بروے پر چرخ کھاتے تھے داں = ہوا ۲۶۰ س ۱۱ یہ مراقی ہوا دوے ہوا ہوا بہار = ہو ۲۶۸ س ۸ قطع ہر یار کی محبت کی = یار ہے یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا = جھپکاں ۹۵ اپن کیوں کسی کے سالقہ دل اپنا لگہ ہے ہر ہو تا ہے کاہے کو عاشق کہا ئیے = کیوں ہر کس، کے جنہاں شعر اص ۲۶۲ س ۲۶۶ بچا آتا تھا جب وہ گل بولی کی دھوم = کو

یہ اشعار دیوان میں نامکمل درج ہیں۔

۵۵ پڑھتا ہے دیکھ آیت فاتو بسورۃ (دوسرا مصرع نہیں ہے ہوا تراق فیہ گھنڈ، دلف) ۵۴ لفظ سادہ ڈیوں ..... ہو کر نگر کو ہو جاتا ہے آخر کے خیس، دی لکن کو عد ۴۳ دام ہی شبک مرگان یار ہے لیکن زاس تعدے خستہ مگر کہ ہر ۱۵۲ دل لگا جب یار سے سب غیر اور طاقت کہاں (دوسرا مصرع نہیں۔ بنائے جائے قافیہ ۱۱۲ نارہ تو شعلہ کو کہ ترے اڑے پر میں اٹھے ہو اس کی گلی کی طرف مڑے ۱۹۵ اس سے مل خواب میں جب میں نے کہا تھا ... کم اس بیش کا اسباب کہیں ہوتا ہے تھوی کے گئی شعر نا کمل ہیں۔ ص ۲۶۵ زس سے ملک لگ ص ۲۶۶ کوئی ہاد دیا تھا ... کوئی خرچ کرتا تھا ناٹ مدار (یا کی جگہ یار ہوگا) ۲۶۷ لفی خوشبوے

مشکوک اشعار یا مصرعے

۱۲ دیوان ہمارا فورے تاباں تو دیکھ تو (دیکھ تو کی جگہ رکھیہ ہو سکتے ہے۔)
۳۵ پھیلا دیکھ سکے نہ جب کا (حاشیے میں محمد ہے اور ہیں بھی پھیلا کاتب کی غلطی تو نہیں ؟) ۲۰ ہیا ہیں ہمارا یہ ڈاہ ۱۰ روزنا (حاشیہ دھار ڈاہ ڈاہ کہیں کاتب کی غلطی تو نہیں ؟) ۱۲ جو یار آیا تو میں دیکھا کہانی

تم اے آنکھیں مری مت پھوٹ بہنا

۲۵ نگہ کی تیغ کی کس کو جرأت ہے کہ ٹھہرا دے ترے سنگھ ہو عاشق ہی بچا سکتا ہے کیا قدرت ہے

شرم سے سر شکستہ ہو کے زمین میں گڑ جائے (حاشیے اور ع میں قبل ہے، شکست کا تب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۲۵ آ آپ ہی میں میں کہ کروں اب وفا کو ترک، ۲۵ دست عدم میں پارۂ دیوانگی ہے اے بخت بتا کر کروں میں کہاں کی سیر ۲۵ کوئی پیدا نہ ہوا تا قیل و کفار ہنوز ہر سر دہی میں بالا سی ہے زناز ہنوز (قاتل کفار قاتل و کفار کی جگہ، دوم امصرع غیر موزوں ہے، گو مطلب ظاہر ہے) ۲۵ چاک کرتا ہوں گریباں کو میں ہر بار ہنوز (کیا کیا؟) ۲۵ کہتے کو مرے دل کے سن اے گلشن خوبی گر ہے تو ترے کو ہے یہ فردوس میں ۲۵ بڑا ہے عاشق کو ترے روز قیامت ہر روز جدائی میں اسے ہوتے ہیں جہاں ہو عاشق ہنوز شکل جن اور عشق زیادہ چاہیے باہم ہو دم جام اعظاں ۲۵ سن خبر صیاد کی جس وقت قفس آتی ہیں دیکھ کر سنتا ہے گل تب خندہ لباں کی طرف (ع میں دیں کی جگہ دہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ گل دیں کوئی لفظ بھی ہے ۲۵ دیکھے کیا کیا گزرتا ہے اب مرا تمام عشق (حاشیے، انجام ع، انجام انتظام خاں غلط کاتب) ۲۵ جو تری آنکھوں میں ہے کیفیت لے ساقی بہار ایسی کم ہوتی ہے کیفیت شراب اب میں (شعر موزوں ہے، لیکن یا تو مصرع اول میں لفظ بہار یا مصرع دوم میں لفظ کیفیت فاضل ہے) ۲۵ زخان کی آگ سے جانوں کے تیں ڈساؤں اٹھتی ہے لہر تاباں الکزیہ مرے تن میں ۱۱۹ یا پھرے اسکے اس سے دل میرا عشق کا نام پھرتا اوتاں (باقی جگہ گر بہتر ہوگا) ۱۲۰ ہولی جلی قفس میں دعوائے عشق کر کے کس منہ سے ہم چمن میں پھر ان کو دیں گے (ہولی جلی کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ جولی جولی کی کوئی شکل تو نہیں؟ یعنی مکس ہے کہ ہولے جولے کی جگہ ہولے ہو۔) ۱۲۵ چمن میں ہے دل ہر غنچہ دیکھ لو پر خوں جگر خراش یقین بلبلوں کا شیون ہے (لفظ یقین محل نظر ہے، دیوان یقین میں بھی یہ مصرع نہیں ہے) ۱۲۶ مردی کی جو کچھ قدر اسے ہی نہ رہی پھر تو اب جا اور سا جو سر دارہ ہو وے (تو اب جا اور جا و چلا جا و ہر ا، حیرت خاں احمد شاہ کا خطاب تھا۔ مطلب واضح نہیں) ۱۲۶ بید مجنوں جس طرح ہے فرہیں مجنوں کے دنا سر نگوں اس طرح بھی ہے تیشہ فرہاد بھی (ایک بھی فاضل پہلے بھی کی جگہ سے پڑھا جائے تو بہتر ہوگا) ۱۲۷ لگاتا ہے تگ کا تیر دل میں جس طرح میری تک اک تو دیکھ اس طرح اے بردکاں ہری + ملایا خاک میں جن نے تج ہم کو دکھلا کر کبھی اس راہ جو آنگا وہ سرو رواں تری۔ ۲۰۵

نزدیک نہیں کہ ہو ہو لالہ سنبل گردش نے فلک کی ہائے کیا بیگانہ کر دیا، ۲۲۵ آخری سطر میں شکوہ ترا اگرچہ قیامت تلک گر بلا نزدیک اپنے تو بھی میں لے چوخ کم کردں + ہو، بجائے تیرے مراد دل ہوا ہے واں (مسدس مصرعے میں پہلے اور دوسرے دونوں میں لفظ کردں قافیہ ہے) ۲۲۱ سطر ۲ تا ۱۰ اپ کے معشوقوں کو ہے شوق ابھی

تنگ جامے کو پہن سج کے سجیلی دستار + چھبیلی پاؤں میں کھاب کی پھڑکا کے ازار + سجے تئیں جا کے تو آتے ہیں دکھاتے ہیں بہار + لالچی ایسے کہ جس پاس سُنے زر کی بو + جا ٹھریں پہلے تو پیچھے ہو جو کچھ ان پہ سو ہو ۲۵۹ عجائب غرائب کو جانے ہے غیب + کہ بے شک ہے اس کے تئیں دست غیب ۲۶۳ وہ دیوان خانے میں جب مجھ + اوڑھے پری رُو دے دے بلا ۲۶۵ کوئی کرکے آغاز ساتوں کرام ۲۶۶ سبکتا تھا ان میں جو مثل حباب ۲۶۷ زین رنگ ہے بس کہ ہوتی تھی لال + کبھی محض خالی لوں پہ بھتا گلال ۲۶۸ تو کئی جام دے بے بھے پے بہ پے ۲۶۹ ہو کے تب فلگیں کہی ہاتف نے یہ کہ موے ہے یہاں محض کیا ۲۷۰ کہتا ہوں اس سے کہ جن نے (میں اس سے یہ کہ؟)

اشعار ذیل دوسرے شاعروں کی جانب بھی منسوب ہیں:-

الا مرغ جوڑے پہ ترے پیلی کناری کی بھلک + برق سال ابر کے ہوتی ہے نثار دامن - یہ شعر انتخاب دیوان بیدار مرتبہ سید فضل الحسن صاحب حسرت میں موجود ہے، اس و مجموعہ نغز قاسم میں ۔ علط ایں یہ شعر بیدار کے نام لکھا ہے ص ۱۳۳، اور اسی جلد کے ص ۱۲۷ اس کے متعلق حاشیے میں یہ عبارت درج ہے: ایں شعر در دیوان شاہ محمد بیدار دیدہ شد و زبان زد عالم است کہ ازاں عبدالحی تاباں است، واللہ اعلم بحقیقت الحال"

(۲) ایں کیوں ہر کسی کے ساتھ دل اپنا لگائیے ۔ ہر بے وفا سے کاہے کو عاشق کہائیے
ہم جان جان آئے ہیں پیراں کی نسبتیں ۔ ساجن گر آئے تو نیازاں چڑھائیے

یہ دونوں شعر مختلف اختلاف کے ساتھ شفیق نے صابر لاہوری کی جانب منسوب کیے ہیں۔ ایک شعر اور بھی اس زمین کا دیا ہے، لیکن وہ دیوان مطبوعہ میں نہیں، شفیق لکھتے ہیں: بعضے اشخاص ایں چار بیتہائے میر صابر را در مولود و غیرہ بنام ... تاباں می خوانند محض بیجا است، زیرا کہ آن اشعار از زبان امرء معتبرہ کہ بارہا ملاقات میر صابر یافتہ اند بہ سمع رسیدہ کہ از نشاسبت آں تاسین تحریر در دیوان تاباں ہم دارد" اس کے بعد تین شعر نقل کیے ہیں۔ ج میں بھی یہ غزل موجود ہے، بلکہ ایک شعر اور بھی ہے جو مت میں نہیں ہے:-

کچھ عیب نہیں ہے درس دکھانا تو ثواب ہے ۔ جیسا کسی پیاسے کو پانی پلائیے

شفیق کے قول سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو ان اشعار (علی العموم) و دو شعر جو شفیق نے نقل کیے ہیں) کی زبان تاباں کی زبان نہیں معلوم ہوتی ہے اور یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ دیوان تاباں میں کسی کے غلطی سے داخل کر دیا ہو

(۳) میخانے میں کیا پھرے ہے مشکی + زاہد عابد سے دور بھاگی مشکی + قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے کافر + یہ دختر زر ہے جس سے اگی اگی۔ یہ بڑی اماوہ گردوبا ہے، کئی شاعروں کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ مجموعہ نغز جلد ا ص ۹ مختلف اختلاف کے ساتھ منسوب بہ انشا۔ کلیات انشا کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں ہماری نظر سے نہیں گزری، گلزار ابراہیم مطبوعہ ص ۱۱۴ پر یہ رباعی بہیت قلی خان حسرت کے نام اختلاف کے ساتھ لکھی گئی ہے، حسرت کا دیوان موجود ہے

لیکن ہمیں اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۴) بیان میں کیا کروں دیوانگی اپنی کا افسانہ: یہ مخمس سری رام نے (مخزنہ جاوید جلد ۴ ص ۲۴۳) سودا کی طرف منسوب کیا ہے، آخر کے تین مصرعے مخزنہ جاوید میں اس طرح ہیں: کہتا ہوں میرے ساتھ سودا بھی طفلاں تجلی اس طرح سے دیکھ کر اب خوار و سرگرداں' کوئی کہتا ہے سودا کی کوئی کہتا ہے دیوانہ: تب میں: سودا کی جگہ تاباں اور تجلی کی جگہ مرے تئیں ہے، کلیات سودا کے مطبوعہ نسخے (نولکشوری) میں یہ مخمس نہیں ہے، کلیات کے کئی قلمی نسخے جو ہم نے دیکھے ہیں، ان میں نہ مل سکا، مخزنہ جاوید میں مخمس کا جو آخری شعر ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل تجلی کی ہے' اور تضمین سودا کی، مزید تحقیق کے لیے ہم نے تجلی کا کلیات دیکھا، لیکن یہ غزل نظر نہ آئی، مخمس کے دیکھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ ایک مستقل مسلسل نظم ہے، جس کسی نے بھی اسے لکھا ہو، ایک بار اسے لکھا ہے' یہ نہیں کہ غزل پہلے لکھی ہو بعد میں اس کو مخمس کیا ہو، ہمیں سودا کی جانب اسے منسوب کرنے اور تاباں کو اس سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ اشعار دیوان میں نہیں لیکن دوسری جگہ پائے جاتے ہیں:۔

(۱) اے ناانصاف شیریں حیف تو کیا کام فرمائے — سمجھ کر کوہ کن اپنا عاشقی اپنا وستاد اپنا (ح)

(۲) مضرت ہے تجھے عاشق کے مارے یتیمی لے ظالم — کہ ہم تلمی کشوں کا خون بیشک زہر قاتل ہے (گلشن گفتہ)

(۳) کچھ عیب نہیں ہے درس دکھانا الخ (ح، اوپر لکھا جا چکا ہے)

(۴) سرسبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا + آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا

مرزا علی لطف نے تاباں کے نام سے لکھا ہے، لیکن قایم و میر کے تذکروں میں مشتاق کی طرف منسوب ہے۔

دیوان تاباں کا یہ نسخہ ہر صاحب ذوق کے کتب خانے میں رہنا چاہیے۔

کلیم عجم، مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی (عمدہ کا معیار ملاحظہ ہو)

جناب سیماب نے اپنے خطبات میں غزل کا معیار خود ہی قائم کیا ہے، بہتر ہوگا کہ ان کا کلام انہیں کے معیار سے جانچا جائے، ذیل میں ہم غزل کے انتخابات درج کرتے ہیں:۔

(۱) ص ۲۳، اس قسم کی شاعری جس میں تقلید اور فرضی جذبات کے زیادہ سے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہیں' ایک روحی بدعت' ایک بے اصولی' اور ایک غلط ذہنی تربیت کے ماتحت مروج ہے، جس میں عام اور پست ترین قدیم ترین معاشرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں، وصل و وصال، ہم خوابی اور ہم آغوشی، بوس و کنار اور ایسے ہی مخرب اخلاق اور تہذیب سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں، پھر روایہ ہے کہ یہ موضوعات بھی اس صادق جذباتی کیفیت سے خالی لہجے میں ظاہر کیے جاتے ہیں، جس سے تقلید اور نقالی کو ظاہر ہو جاتی ہے، لیکن حقیقت کا کہیں پتا نہیں چلتا۔"

(۲) ص ۲۵ "غزل کی تعریف میں معاطبندی کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے، الغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت

سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیے۔ حقیقی تغزل وہ ہے جس کی بنیادیں جذبات لطیفہ پر قائم ہوں اور جس میں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ تک نہ ہو۔"

(۳) ص ۲۱ "جب شعر مطلق روحانیت اور ایک زائدہ الہام چیز ہے تو کیا اس کے متکلم کو مادی دنیا میں تمام عالم اور تمام کائنات پر حاوی نہ ہونا چاہیے؟"

(۴) ص ۲۰ "ہماری شاعری ماحولی مضمونیات کی حامل ہونا چاہیے، اور زیادہ سے زیادہ فطری، ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہیے۔ ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے مطابق، اہل ملک اور فرزندان وطن کے لیے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیے اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذبات عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ہمارے نوجوان ماضی حال اور مستقبل کا بیچ ادراک کر سکیں، جو ہمیں تدبیر منزل اور شاہراہ ترقی بتا سکے، اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کرے۔"

(۵) ص ۳۰ "اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت نہیں رہا، مجازی جذبات وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا، حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور فضولیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہیے۔"

(۶) ص ۲۳ "اگر یہ فکری تصویریں ہماری معاشرت اور ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں ہوں تو کیا ہماری شاعری حقیقی شاعری نہیں کہی جا سکتی اور کیا اس میں بلحاظ واقعیت زیادہ اثر و قوت پیدا ہو جانے کا امکان نہیں؟"

(۷) ص ۳۰ "جب تک ہم اپنی شاعری کو مغنیہ، تین، مذہب و با اثر نہ بنائیں گے، جب تک اپنے تغزل میں رفعت، اپنی تغزلیں شوکت، اپنے خیالات میں بلندی اور اپنے الفاظ میں ترفع پیدا نہ کریں گے، ہمیں دنیا میں زندہ رہنے ..... میں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔"

(۸) ص ۵۴ "اردو شاعری کا بیشتر حصہ ایسے پست خیالات و جذبات کا حامل ہوتا ہے کہ ایک شاعر بیٹا ایک بزرگ باپ اور اپنی محترم مادر کے سامنے اپنے اشعار آزادی سے نہیں سنا سکتا۔"

(۹) ص ۵۶ "مبتذل شعرا غلط محاورے، غلط بندشیں، غلط ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں۔"

(۱۰) ص ۶۰ "شکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کو ہمیشہ مندہے نئے الفاظ نئے معنی اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لیے ... مہلک ہے۔"

(۱۱) بعض لوگ صرف روزمرہ کی ترویج کے حامی ہیں اور متانت خیال و الفاظ کے مخالف، وہ ... نہیں چاہتے کہ قول ... تغزل محض سے تجاوز کرے یا اس کے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجایش ہو۔"

(۱۲) ص ۶۹ - ۷۰ "میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا

ہوں، غزل کی ... زبان علمی، الفاظ مضبوط ولطیف، پُرشوکت اور خوش گوار ہوں، اور خیالات وجذبات بلند پایہ و پاکیزہ ہوں، سادگی کے ساتھ متناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی پیدا ہوسکتی ہے۔"

(۱۳) ص ۱۰۰ "جب تک ہم اپنی شاعری کی زبان کو جہلا اور عوام کی زبان سے ممیز نہ کردیں، ہمیں کوئی تعوق اور امتیاز حاصل نہیں ہوسکتا۔"

(۱۴) ص ۱۰۱ "اب موضوعات غزل میں فلسفہ حسن وعشق عرفان، حقیقت شناسی، اسرار کشائی، درس وپیغام، واردات وجذبات اور محاکات کے علاوہ دوسرے موضوعات کی بہت کم گنجائش ہے ..... جو کیفیت حقیقتہً ہمیں بیرونی دنیا کی ہو جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصل موضوع ہیں، یہ لازمی نہیں کہ اگر ایک شاعر کسی کے فراق میں مضطرب الحال نہیں ہے، تو وہ فراقیہ اشعار ضرور ہی لکھے ... اس قسم کی ... غزل گوئی تعالی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اور اگر قائل کی حالت اس کے قول کی تکذیب بھی کردے تو سمجھے کہ عقل میں بھی نقص ہے۔"

(۱۵) ص ۱۰۵ "یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگ تغزل کے امتزاج سے بقدر معتدل پیدا ہوا تھا۔ اگر وہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا متبع دکھائی دیتا ہے۔"

(۱۶) ص ۱۰۰ "میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو، میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام ضمائر کا مرکز وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہو ... میں خیالات میں تضع ... کا حامی نہیں، میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

غزل کی زبان کے متعلق جناب سیماب کے عمل اور ان کے نظریے میں بہت زیادہ فرق نہیں، ان کی شاعری حمادے اور روزمرے کی شاعری نہیں ہے، جناب سیماب کا دعویٰ ہے کہ آگرہ اسکول میرزا داغ اور میرزا غالب کے رنگ تغزل کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے، لیکن کیا زبان، کیا طرز بیان اور کیا معانی کہیں بھی متبع داغ کا پتا نہیں چلتا، جناب سیماب کے کلام میں پرشوکت فارسی الفاظ اور تراکیب کی بہتات ہے، اور ہندیت نہ ہونے کے برابر ہے، انہوں نے اپنی زبان کو صرف جہلا اور عوام ہی کی زبان سے ممیز نہیں کیا ہے، بلکہ عام بول چال کی زبان سے بھی علیحدہ رکھا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو صرف جناب سیماب ہی اس کے مرتکب نہیں، آج کل اکثر مشہور غزل گو فارسیت کو بدرجہ برتر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب وحسن کے بعد داغ نے دلی میں اور شاگردان آتش نے لکھنؤ میں فارسیت کے سیلاب کو روکنا چاہا تھا۔ بازگشت کے شعرا میں حالی بھی ان لوگوں کے ہم خیال تھے، لیکن بیسویں صدی میں کلام غالب کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ فارسیت کا بول بالا رہا اور اس کے آگے ہندیت کا چراغ نہ جل سکا۔

فارسیت کے قطع نظر سے قطع نظر کرکے بھی دیکھا جائے تو ان کی زبان میں دو باتیں قابل اعتراض پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معتدل فارسی تراکیب کے ساتھ غیر معتدل فارسی تراکیب بھی ہیں، غیر معتدل سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ یا تو فارسی قواعد

کے رُوسے جائز نہیں، یا اُردو میں ان کا رواج مناسب نہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ حدوث کی خفتہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا۔

۲۔ انہیں ترتیوں کی تیں قسم، یہ ہیں تھوڑی دور قدم قدم، کہ صدا آرزو زدہ کرم، ابھی اور ایک مزار ہے

۳۔ کوئی دیکھے مری وحشت سوا لی انہیں کو مانگتا ہوں میں انہیں سے

۴۔ تا کجا ہم انتشار گرد راہ کارواں وہ قدم بڑھ کر امیر کارواں ہو جایئے

۵۔ آئینہ تیں نظر گلگہ رس کی داتیں گنتی زنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ غزلوں میں کثرت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اخبار نویس بے تامل برت سکتے ہیں لیکن غزل کی نزاکت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی آج سے نہیں سیکڑوں برس سے ہمارے یہاں یہ بات مسلمات میں سمجھی جاتی ہے کہ ہزاروں الفاظ جو بجائے خود صحیح ہیں، اور نثر و نثر قصیدہ و مثنوی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں، غزل میں نہیں کھپ سکتے، اور ہماری رائے میں کوئی وجہ اس کی نظر نہیں آتی کہ ہم غزل کو اس کی مخصوصیت سے محروم کر دیں۔

جناب سیاب ان لوگوں میں بھی نہیں جو غزل کے دائرے کو مستقل حیثیت سے وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے یہ عذر بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ نئے معانی کے لیے نئے الفاظ کی ضرورت ہے، مثالیں بکثرت ہیں گی۔ چند ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ یہ نکما پن مجھ دل کا اک انجام ہے ۲۔ گر میں کچھ یہ ہر نگاہ کر نہ سکا

۳۔ واقعات عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی ہر نفس میں میں نے اک رومان پیدا کر دیا

۴۔ سب مرے انجام پر آمادۂ تنقید ہیں ۵۔ انتظام تشنہ خواب ہو نہ سکا

۶۔ محبت اک بڑا احسان ہے تاریخ انساں پر ۷۔ دل کی تنقید مناسب ہے زیوں تو بدل

۸۔ روایات محبت میں نہ تبدیلی ہوئی اب تک ہزاروں انقلاب آئے ہے تاریخ انساں میں

۹۔ مرنے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا ہم کس کے ساتھ عہد محبت بسر کریں۔

۱۰۔ دو حقیقی اور فطری نعمتیں ہیں حسن و عشق مادیت سے انہیں کیوں لعنت آلودہ کریں

۱۱۔ محض میرا ذوق نظر تھا ترے لیے تائید عام نے جسے دستور کر دیا

۱۲۔ یہ مطلب ہے کہ تنقید حسن دشوار ہو جائے ۱۳۔ نہ پوچھ اس پاکباز آرزو کا مطلع الفت

۱۴۔ ایک ہی سانچے نظام عشق کا ماضی و حال میری تجویز وفا ناکام تھی ناکام ہے

یہ عشق کا ذکر ہے یا کسی انجمن میں کسی تحریک کے نامنظور ہونے کا؟

۱۵۔ مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں ۱۶۔ ابھی تبلیغ کو کیا تم میخانہ نہیں اٹھتی

۱۷۔ کبھی اقدام کرے دوست تو کر بھی سمجھی۔

جناب سیماب نے مجروحؔ، جفتہؔ، النسبتہؔ، رشناؔ، خلقتہؔ وغیرہ کو بڑی کثرت کے ساتھ غزل میں استعمال کیا ہے، ہماری رائے میں غزل میں ان سے احتراز لازم ہے۔

جناب سیماب کی شاعری کا موضوع "عورت یا اس کے متعلقات" ہیں اور ان کی شاعری "ہوس پرستی کی نفسیات پر مشتمل" ہو، اس کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام مضامین کا مرکز وہ ذات ہے جو حال حسن اور مرکز محبت ہو۔ ایک جگہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "تغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیے"۔ حسن محض اور عشق محض سو جناب سیماب کی کیا مراد ہے؟ یہ انہوں نے اسے سمجھایا ہے اور نہ ان کی مدد کے بغیر ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، ممکن ہے کہ ان کے اشعار میں شاید حقیقی سے خطاب ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اخلاطوں کا عالم امثال ان کے ذہن میں ہو، ہماری غرض ان کے نصب العین پر اعتراض نہیں (اگرچہ ہمارے خیال میں مادیت کو غزل سے بالکل خارج کرنے میں وہ غالب کے اس قول کو بھول گئے ہیں۔

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا")

ہمارا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ جناب سیماب کا عمل کہاں تک ان کے نظریے سے مطابقت ہے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اشعار ذیل میں مخاطبت کس سے ہے، یا ان کا موضوع کیا ہے:-

۱- وہ خود دلے بیٹھے ہیں آغوشِ توجہ میں — بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا

۲- عشق ہے اک ہوش سیماب جوانی تند و تیز — حسن ہے اک موجۂ رنگین طوفانی شباب

اس شعر میں جس عشق کی تعریف کی گئی ہے، کیا وہی عشق محض ہے؟

۳- ہو چکا ہوں بارہا عذرِ نزاکت کا شہید — کر چکا ہوں امتحان قوتِ بازوئے دوست

۴- بے ہوسی کو ہم کناری و ہم آغوشی نشاط — یعنی اک ہنگامہ ہے اندیشۂ پہلوئے دوست

۵- خندہ آ آ کر اُچٹ جاتی ہے تیری یاد میں — تارِ لبستر نشترِ آغوش ہے تیرے بغیر

(اس غزل کا مخاطب کوئی "غیر محسوس" ہستی نہیں ہو سکتی)

۶- سیماب آدھی رات کو آئیں وہ بے قرار — تیری دعائے نیم شبی میں اثر تو ہو

۷- یہ آستھیں سانحۂ یہ جوانی فسانہ سہیا — خدا رکھے تمہیں تم بھی تو ہو تصویرِ میخانہ

۸- وہ چاند نی میں نظریں بچا کر ان کے مکاں کا طوف مسلسل سب سے چھپا نا راز نہانی، اے محبت اے جوانی

۹- وہ ان کا جانا دامن جھٹک کر وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر، وہ ان کا آنا وہ شرمانی، اے محبت اے جوانی

جناب سیماب کی رائے میں غزل کو رکاکت و ابتذال سے پاک ہونا چاہیے، اور اشعار ایسے ہونے چاہییں جو ہر صحبت میں بے تامل پڑھے جا سکیں، ہم بلا خوف تردید یہ اعلان کرتے ہیں کہ جناب سیماب کی غزلیں رکیک اور مبتذل مضامین سے یک قلم خالی ہیں، ان کے اشعار میں چند ہی ایسے ہیں جو ایک حیادار نوجوان اپنے والدین کے سامنے نہ پڑھ سکتا ہو، یا تیرھویں صدی کا باب

اپنی دوشیزہ لڑکی کے سامنے نہ سُنا سکتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اشعار کا یہ معیار کہاں تک صحیح ہے؟ اگر ہم اسے صحیح تسلیم کر لیں تو قدیم شعرا میں خواہ وہ کسی زبان کے ہوں، دس پانچ کے سوا کسی کا کلیات معتدبہ اشعار کو خارج کیے بغیر نہیں شائع کیا جا سکتا، اور نثر کی ہزاروں کتابوں کا بھیجوانا بالکل بند کر دینا پڑیگا، کل یہ ہے کہ اس معیار کے ساتھ ساتھ جناب سیماب غزل میں تسخیر فطرت اور واقعیت کے بھی خواہاں ہیں، اس کی بحث آگے آئیگی۔

جناب سیماب غزل میں بجا طور پر تقلید اور رقابت سے متنفر ہیں، ان کے نزدیک شاعری وارداتِ قلبی پر مبنی ہونی چاہیے۔ کسی مضمون کو محض اس لیے باندھنا کہ شعرا باندھتے چلے آتے ہیں، محض لغو اصول ہے، ہم جناب سیماب کی حسبِ ذیل نظم کی طرف مبذول کراتے ہیں، اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے "آپ بیتی" بیان کی ہے:-

۱- "مجھ سے پہلے کوئی جلوہ گہِ دل نہ ہوا — یہ دھندلکا ہے جو روشن کبھی حاصل نہ ہوا"

کیا واقعی وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقام حضرت موسیٰ کے مقام سے آگے ہے؟ اگر نہیں تو یہ شعر محض قدما کی تقلید میں کہا گیا ہے۔

۲- "آئے ہو دینے دعوتِ دار و رسن ہمیں — جب ہم نے ترک شیوۂ منصور کر دیا"

ہم نے تو نہیں سُنا کہ جناب سیماب نے کبھی انا الحق کا دعویٰ کیا ہو، یہ گفتِ اشعار اس قسم کے ہیں، بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ جدید خیالات ان کے یہاں بہت کم ہیں، اور انہیں ان کے ادا کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ذیل میں ہم پرانی طرز کے چند کامیاب اشعار درج کرتے ہیں، اس کے بعد ہم چند ایسے اشعار نقل کریں گے جن میں شاعر نے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

طرزِ قدیم:- دل کچھ جتنا قفس میں آشیانے کی طرف — دور اتنا ہی قفس سے آشیانہ ہو گیا

آج تیرے فضل و کرم کو بیشتر دیکھا — مجھے شرم آ گئی جب اپنا دامن مختصر دیکھا

نیازِ عشق کو آزادِ قید رنگ و بو پایا — جنوں کو بے نیازِ بندشِ دیوار و در دیکھا

ترک مدعا کر کے کیا کیا کچھ نہ پایا — ہم نے ساری دنیا کو حسبِ مدعا پایا

کم سے کم فرشتوں کو یہ حق حاصل تھا — آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا

شکستہ پا ہوں شریکِ غبارِ کارواں میں نہیں — مرے نصیب کی گردش بھی آسماں میں نہیں

جنوں کی نذر سامانِ سکوں دیکھا نہیں جاتا — بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

۱۹۱۹ء سے قبل کا کلام:- میں تمہارا نہیں تو کس کا ہوں — دل تمہارا نہیں تو میرا ہے؟

مستِ مدہوش یہ گراں سیرِ جوانی کی — جھکی تو پھر نہ اٹھی شاخ آشیانے کی

بتاؤں دل میں چھپاں آپ کا کہاں کے رہا ہے — محبت ان کے آنسو ہے تمہاری کے رہا ہے

شرم پہلی کی ہے قاتل ترے احسان کے ہاتھ — ہاں ذرا تول کے تلوار ذرا آن کے ہاتھ

دھونڈتے ہیں ترے در سے خشت غم پر سر جھکاتے ہیں — یہ رہا اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہیں

خلوص دل سے سجدہ ہو تو اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا جہیں ہم نے جہاں رکھ دی

جدت کا نمونہ:- وہ نوزنظریں کہ برسات میں آتے ہیں
منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا

رات کا جانا وداع شیشہ و پیمانہ تھا
صبح کا تارا تھا قفل درمیخانہ تھا

دو ہی انگارے تھے ہاتھوں میں خدائے عشق کے
ایک کو دل ایک کو میرا کلیجا کر دیا

ہیں تبسم ریز تارے کہکشاں انگڑائی ہے
ہر شب ہستی میں ہے میرا ہی ساماں شباب

جناب سیماب کی رائے میں شعر "زیادہ سے زیادہ فطری اور موضوع کے لحاظ سے مکمل" ہونا چاہیے۔ "ان کے نزدیک شعر میں "جب تک واقعیت نہ ہو اس میں اثر و قوت پیدا ہونے کا امکان نہیں"۔ "شاعر کو ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں کھینچنی چاہیے، ہماری بھٹکی ہوئی آہ کو یہ مقدمۂ حالی کی صدائے بازگشت ہے یا جناب سیماب اردو والوں کے سامنے زوال کا پردہ گرانا پیش کر رہے ہیں، شعر کی خالص روحانیت کے متعلق جناب سیماب کے اقوال دیکھ کر ہماری حیرت اور بڑھ جاتی ہے کیا کوئی شاعر سوسائٹی کی مکمل تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جو مادیات کے وجود کا قائل ہی نہیں، یا کم از کم اشعار میں انہیں کسی وجہ سے یک قلم نظر انداز کر دینا چاہتا ہے؟ جناب سیماب بظاہر اُن لوگوں میں ہیں جو "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" کے مصداق ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں زمانہ مدارس کی استانیوں اور اہل فن دونوں کو بہ یک وقت خوش رکھنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اگر ان اشعار کی مدد سے جو ہم نے اس تبصرے میں نقل کیے ہیں نہ ہو سکے، تو ناظرین کلیم عجم کا خود مطالعہ کریں۔

جناب سیماب کے خیال میں "شاعری کو اخروی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے"۔ دوسرے لفظوں میں شاعری میں تقدس کا رنگ گہرا ہونا چاہیے، اس معاملے میں ان کا نظریہ ان کے عمل سے بالکل مختلف ہے۔ قیس، لیلیٰ، فرہاد، شیریں، اور دیگر تلمیحات سے دیوان بھرا پڑا ہے:-

"جہاں میں قابل تقلید تھی طرز فغاں میری
پیچھے نے بالآخر یاد کر لی کہاں میری

اس قسم کے اشعار دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہ ہوں گے، اگر یہ اشعار نکال دیے جائیں، اور دیوان کا ترجمہ فارسی میں کر دیا جائے تو آسانی سے اسے کسی ایرانی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے:-

دو عالم قیس کی فریاد کا وہ جاں تنگ
دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیا کیا

بجد کے ہر نوں سے اعجاز محبت پوچھیے
پڑ گئی جس پر نگاہ قیس لیلیٰ ہو گیا

چھپی برق تجلی کوند کر موسیٰ تو شکوہ کیا
تماشا تھا یہ انداز تمنا رہ گیا ہو کر

جناب سیماب نے شعر کی افادی حیثیت کو بڑی اہمیت دی ہے، شاعر اگر وہ حقیقی شاعر ہے تو کل مسئلوں کا حل کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کے لیے محض متغنی یا مصور ہونا کافی نہیں، اسے صاحب فکر بھی ہونا چاہیے، اس مسئلے کی عمومی حیثیت سے قطع نظر کر کے کہ شاعر کے لیے صاحب فکر ہونا ضروری ہے یا نہیں ہمیں مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ جناب سیماب کس حد تک

فلسفی یا صاحب فکر کہے جانے کے مستحق ہیں، ذیل میں ہم ان کے چند اشعار درج کرتے ہیں جن میں ان کے مذہبی، اجتماعی اور فلسفیانہ معتقدات منظوم ہوئے ہیں۔

۱۔ "نہ تھا وہ بعید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی — میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا"

۲۔ "اس کی ہستی وہم ہستی وہم اور پستی بھی وہم — نام ہے انسان اک مجموعۂ اوہام کا"

۳۔ "میرا ہی ایک بلبلہ تابندہ بحر تھا — اپنی ہی اک ادا پہ ریاضی میں مٹا ہوا"

۴۔ "میں نے خاک میں مل کر منصب فنا پایا — اے اجل بتا تو نے مجھ کو کھو کے کیا پایا"

۵۔ "جسم پھر پہنتے ہیں صرف خاک داں ہونے کے بعد — جمع پھر ہوتے ہیں ذرے راگاں ہونے کے بعد"

۶۔ "نہیں آشنائے حال سے کوئی آنکھ بزم مجاز میں — ہوں وہ آئینہ جو ہے نا تمام بھی ذہن آئینہ ساز میں"

۷۔ "تکمل خالی ہوئی حدوں سے نگاہ کو وسعتیں عطا کر — تمام عالم وطن ہے تیرا اگرچہ تیرا وطن نہیں ہے"

۸۔ "تراب ذرہ حمل ہو نہ جائے اے سیماب — اے جناب رسالت مآب دیکھیں گے"

۹۔ "اے خاک کے پتلے تجھے ادراک نہیں ہے — کچھ اور بھی ہے تجھ میں فقط خاک نہیں ہے"

۱۰۔ "انجام ہر اک شے کا بجز خاک نہیں ہے — کیا ہے جو یہ عالم فنا و خاشاک نہیں ہے"

۱۱۔ "تری دنیا ہے دنیا اپنی مگر مطمئن ذہنی دنیا نہیں ہے — کاوش زندگی، کاہش مرگ کا کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے"

۱۲۔ "پھول کا، خار کا، باغ و کہسار کا، علم انساں کو کس کا نہیں ہے — پھر بھی اس جلوہ گاہ پر اسرار کا کوئی راز آشنا نہیں ہے"

۱۳۔ "سب یہ جلوے ہی جلوے تو ہیں ہر طرف میں حجابات اوہام حائل — پھٹے پڑتے ہیں ان میں کہ پردہ کوئی حائل چشم بینا نہیں ہے"

۱۴۔ "زندگی کیا ہے اور اک مقصود اگر تیہ بھی سے آگے گر جیا — زندگی کے مظاہر پہ نقد و نظر فلسفہ زندگی کا نہیں ہے"

اگر کوئی شخص کوئی ایسا نظام فلسفہ جس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے غیر مربوط نہ ہوں، ان اشعار سے نکال سکتا ہو تو ہم اس کی طباعی پر ابھی مبارک باد دینے کے لیے تیار ہیں، ہمارا خیال ہے کہ فکر کی گہرائی سے جو فلسفی کے لیے ضروری ہے جناب سیماب قطعاً محروم ہیں، انسان کی حقیقت، فطرت سے اس کے تعلق، انجام حیات انسانی، علم انسانی، غیرہ کے متعلق جو خیالات کا انہوں نے اظہار فرمایا ہے، وہ بعض دوسرے شعرا کی تقلید میں ہے، اور ان مسائل پر انہوں نے کافی غور نہیں کیا شعر کیا ایک رائج العقیدہ مسلمان کے قلم سے نکل سکتا ہے؟ اور شعر کیا ایک وطن پرست کا خیال فکر ہو سکتا ہے؟

جناب سیماب کے بعض اشعار یا تو واقعی قابل اعتراض ہیں یا ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہ آئے، ہم انہیں درج ذیل کرتے ہیں، جناب سیماب یا کوئی اور صاحب ہمارے شبہات کو دور فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

۱۱۔ "فرمان و تراب کیسا یہ دوا ں تیری ہی تحتیں ہیں — اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عتاب تیرا"

یہ شعر سب سے پہلی غزل کا ہے جس میں اول سے آخر تک عروس فطرت سے خطاب ہے، ہمیں پہلے اور دوسرے مصرعے میں ربط

شاعر نے بظاہر ایک طائر کی نفسی کیفیت کو بیان کیا ہے جو اسیری کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک طائر اپنے آشیانہ میں تھا اسے آشیانہ سے کسی خاص محبت کا احساس نہ تھا۔ اسیر ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ آشیانہ کس قدر عزیز تھا۔ اب اس کی زندگی قفس میں گزرتی ہے، اور اپنی جان کا بالکل دشمن نہیں، لیکن بجلی تو بڑی چیز ہے، جگنو بھی چمکتا ہے تو وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے کہیں آشیانے کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔ اگر شاعر کے ذہن میں یہ مطلب تھا، تو ہماری رائے میں الفاظ سے ادا نہیں ہوا۔

(۱۲) "چمن کے حادثے کو دیر میں گزریں گوارا بھی — چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے"

آشیانے کو جلا ڈالنے والی بجلی اور آشیانہ طائر کے ذہن میں ایک ہو گئے ہیں۔ یہ خیال الفاظ سے اچھی طرح ادا نہیں ہوا۔

(۱۳) ترقی پر ہے روز افزوں خلش درد محبت کی — جہاں محسوس ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتی ہے"

"معلوم ہونا" نمایاں ہونے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور نہ شاعر کو نفسی حیثیت سے محسوس و معلوم میں فرق بتانا پڑیگا۔ ہمارا عمر انی یہ ہے کہ درد محبت کی خلش ایسی چیز ہی نہیں جو نظر آئے، اور اگر بالفرض ایسا ہو تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ خلش ترقی پر ہے۔

استفسارات

(۱) میرزا غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی صاحب کے علم میں یہ کتابیں کہیں موجود ہوں تو براہ کرم براہ راست یا معیار کے ذریعے سے مجھے مطلع فرمائیں۔ جن کتابوں کے سال طباعت دیے ہوئے ہیں وہ کتابیں نظر سے گزر چکی ہیں۔ ان کے خاص نسخے مطلوب ہیں:-

۱- دستنبو، مطبوعہ مفید خلائق آگرہ ۱۸۵۸ء
۲- دیوان اردو مطبوعہ مطبع ابو جان دہلی ۱۸۴۱ء (۱۲۵۶ھ)
۳- نامۂ غالب مطبوعہ دہلی ۱۸۶۱ء
۴- سید چین مطبوعہ دہلی (۱۲۶۶ھ؟)
۵- دیوان اردو مطبوعہ مفید خلائق آگرہ ۱۸۶۲ء
۶- معیار فتنۃ النشتر از سید مقصود عالم چانوی نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۷ء
۷- مثنوی دمیع الباطل
۸- مثنوی خطاب فاضل
۹- پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۶۹ء
۱۰- ہمیش پرشاد، ڈاکخانہ لنکا، بنارس

(۲) "دامان گونگ گل حسن تو بسیار — گلچیں بگاہ تو زداماں گلہ دارد"
"در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا — نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد"

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ کلیات قدسی کے دو قلمی نسخے دیکھے، نہ یہ اشعار ملے ہیں۔ نہ اس زمین کی کوئی غزل۔ فارسی اشعار کے ایک مطبوعہ مجموعے میں یہ اشعار عشرتی کے نام نظر آئے، مقطع کا ایک مصرع یاد ہے۔ "اے عشرتی از دعوت تو جاناں گلہ دارد"

اگر کسی صاحب کو اس کا یقینی علم ہو کہ یہ غزل کس کی ہے، تو مجھے مطلع فرمائیں۔ ممنون ہونگا۔

عبدالودود

نظر نہیں آتا۔ دوسرے مصرعے کا مطلب غالباً یہ ہے کہ تیرے کرم اور عتاب پر میرا اختیار نہیں، اگر عذاب و ثواب دونوں شاعر کی نظر میں نعمتیں ہی ہیں، تو پھر اختیار نہ ہونے کی شکایت کیسی؟ اس بے ربطی سے قطع نظر کرکے بھی عروس فطرت کو ان الفاظ میں مخاطب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) "برہمن کہتا ہے اللہ شیخ بولی اللہ احد — نکتہ میں دونوں کے تھے آپس میں جھگڑا ہو گیا"

(۳) طور موسیٰ اور طائف چغتائی خلیل — یادگاریں ہیں تری جلوہ جاناں کیا کیا

(۴) کہیں راز جذبات الہام ہو تم

'الہ' کس زبان کا لفظ ہے؟ 'دل طائف' سے کیا مراد ہے؟ الہام کا جذبہ کیسا ہوتا ہے؟

(۵) قفس سے چھوٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا — خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

'ٹھکانا' بمعنی اطلاع' اسے ہائے مختفی سے لکھ کر 'آشیانہ' کا قافیہ نہیں بنا سکتے۔

(۶) "خلاف ہمہ دنیا جو شعار عشق ہوتی ہے — وہی اک بات رہ جاتی ہے قانون وفا ہو کر

شاید کہ نہیں، نوشت ہے، اگر بات کو "ہوتی ہے" کا فاعل مانا جائے تو الفاظ کی نحوی ترتیب قابل اعتراض ہے۔

(۷) "نہ ابتدا ہوں کسی کی نہ انتہا ہوں میں — بس ایک خواب سحر ہوں تمام ساہوں میں

دونوں مصرعوں میں ربط نہیں معلوم ہوتا، شاعر کا مفہوم واضح نہیں، شاعر کا یہ قول کہ وہ کسی کی ابتدا ہے نہ انتہا ایک معنی سامنے اور اگر اس کا کوئی مفہوم ہو تو اگلے دوسرے مصرعے سے کیوں کر تقویت مل سکتی ہے؟

(۸) "آج تو نکل کا مشکل قابل تصور ہے" قابل تصویر یا تصور کھینچنے کے قابل؟

(۹) انہیں تڑپوں کی نہیں قسم، یہ وہی تھوڑی دور قدم قدم، کہ صدا کرو تو رہو کرم، ابھی اور ایک مزار ہے"

اس شعر میں 'قدم قدم' محل نظر ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ چند قدموں پر لیکن یہ مطلب 'قدم قدم' سے حاصل نہیں ہوتا۔

(۱۰) "مجھے پروانے پہلے فنا ہو چکے، کہ انہیں زندہ اور پوچھ ان سے، دیر میں نہیں کہ پرتو کی ہے روشنی کیا وہ شمع کلیسا نہیں ہے"

دیر و حرم، کنیسہ و کلیسا میں تقابل ہے، دیر و کلیسا کو شمالے قریب قریب، کیساں مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ نحوی کا معترض ہے

• فائدہ کیا جو ہوئے شیخ حرم، راہب دیر"

(۱۱) سکوں نہ پیر جنوں شباب ہو نہ سکا — شگفت و سحر گل کامیاب ہو نہ سکا"

شگفت کو مذکر کہنا — مگر استعمال کیا ہے، اس کی سند فصیحہ ہو۔

(۱۲) چمک جگنو کی بتی ہے، اس معلوم ہوتی ہے — قفس میں رہ کے قدر آشیاں معلوم ہوتی ہے"

خیال خوب سے لڑنا، اور قفس میں رہ کے آشیاں کی قدر معلوم ہونا، ان دونوں میں کوئی بھی تعجب انگیز نہیں، دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ دونوں میں ربط کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

اشاریہ

قاضی صاحب کی تحریریں

تحقیقات: میر تقی میر ۱۷۹/۱۸۰ • سکندر اور ضاحک ۳۴۳/۳۴۹ • تاریخ وفات بخف خاں، ۲۶۲ • سال وفات حاتم ۱۸۱/۱۸۲ • سال وفات آبرو، ۴۴/۴۰ • دیوان راغب (نسخۂ خدا بخش) ۳۱۷/۳۲۰ • سال آغاز تذکرہ ہندی ۲۶۳/۲۶۳ • دریاے لطافت کا سال تصنیف، ۲۱۰ • دریاے لطافت ۶، ۵۳/۵۸، ۳۶۱ • حصۂ عروض مصنفۂ قتیل ۱۹۸، ۳۱۶، ۳۶۱

تبصرے: • ندیم (بہار نمبر) ۸۶/۸۸ - • نیرنگ خیال (سالنامہ) ۱۲۱/۱۳۳ • ادبی دنیا (سالنامہ) ۱۲۵ • زمانہ (حالی نمبر) ۱۲۲ • ساقی جاپان نمبر ۱۳۱ • ہمایوں (سنگر نمبر ۱۲۳/۱۲۵ • شاہکار (سالنامہ) ۲۶۰/۲۶۱ • مساوات (سالنامہ) ۲۷۱ • ادب لطیف (افسانہ نمبر ۲۷۱/۲۷۲ • دیدۂ حیرت (ڈھاکے کا ایک گلدستہ) ۲۷۲ • (سالنامہ) سہیل ۳۳۵/۳۴۴ ۳۶۱ ▬ دیوان تاباں ۲۶۹/۲۷۵ ▬ کلیم عجم ۲۸۴/۲۸۴، ۲۸۵/۲۸۴ ▬ خطبات گارساں دی تاسی (مترجم داس مسعود وغیرہ، مرتبہ عبدالحق): دی تاسی، عبدالحق اور شیخ چاند کے اغلاط ۳۳۳/۳۳۸ ▬ نکات الشعرا (مرتبہ عبدالحق) (توصیفی تبصرہ) ۹۲/۹۴ ▬ دریاے لطافت (مرتبہ عبدالحق و مترجمہ کیفی) ۶۹/۸۲ ▬ دیوان معروف دہلوی (مرتبہ عبدالحامد بدایونی): تصحیح متن ۶۸، ۱۱۴، ۱۳۴، ۱۹۴، ۲۶۸، ۳۷۰

▮ سحر بنگال (طاہرہ دیوی شیرازی) ۸۲/۸۵ ▮ افکار عصر پر (گبسن - مترجمہ نصیر عثمانی) ۹۰/۹۱

▮ حبش اور اطالیہ (مرتبۂ اختر حسین رائپوری) ۹۱

▲ یوسف الدین بخی کا مضمون، ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد": تعارف ۱۲۹ ▲ فخر الدین درد ائی کا مضمون" حیدرآباد کے کتبی نوں میں اُردو کی بعض قلمی نشانیاں": تصحیح ۳۶۱

مختلف مباحث: ترتیب متن: اس روش پر تنقید کہ "قلمی نسخہ صحیح ہو یا غلط، مکمل ہو یا ناقص، کاتب کے حوالے ... اب کاتب جانے اور کتاب ...؛ اس سے تو دیوان کا پردہ گمنامی میں پڑا رہنا بہتر ہے" ۶۹؛ ۷۱ • ترتیب متن میں اغلاط راہ پا جائیں، تو ان کی درستی ضروری ہے" ۲۶۵

• اغلاط طباعت و کتابت کی تصحیح کے لیے غلط نامہ چھپوانے کی روش پر ۲۰۷ • عربی و فارسی سے مدد لیے بغیر سنجیدہ مباحث پر لکھنا ناممکن ہے ۲۰۵ • اردو کے بہترین شاعر: انیس، میر اور غالب کے علاوہ حالی اور اقبال بھی ۲۰۷، ۳۵ • بعض الفاظ کے بارے میں خدا لیب شادانی سے اختلاف: یا اتفاق: سونتنا (اتفاق ہے) چونا چاننا (اختلاف ہے) ترجمہ (اعراب نہیں)، تبادلہ (مبادلہ ایکسچینج - تبادلہ ٹرینسفر کے لیے) سونچنا، اکیلے (اتفاق ہے) قبلہ کاقبلا (اختلاف ہے) ۲۶۵/۲۶۶ • نصیر احمد عثمانی کے ایک ترجمہ پر طبیعی (= ایکسٹرو میگنیٹک) کا تعریف، ۹۱ • قلمی کتابوں کے تحفظ اور فہرست سازی کے بارے میں چند سطریں ۲۵۷ • ایک فرد گذاشت: "سالنامہ سہیل" کا حسن ترتیب اور اس کی تقاریظ لیے دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں "معیار" کا تبصرہ ان خصوصیات کو اچھی طرح نمایاں نہ کر سکا ہیں اس فرد گذاشت کا افسوس ہے ۱۳۹ • بیدل کا شعر ہے اس کا کیا ثبوت ہے:

سر اوپر جب کوئی نہیں تو دشمن آپ کیں ✤ ٹپنہ گری چھاڑ دھن اب بیدل چلے بس، ۳۵۷

— بیدل کا عظیم آبادی ہونا ۲۴۱، ۳۵۸ — بیدل کے استاد ۳۵۸ • سلیمان شکوہ کے بارے میں چند سطریں (بذیل ادبی مضامین) ۲۶۱ • امیر مینائی کے بارے میں (۹ سطریں) ۱۴۲ • غالب و ذوق کی نوکجھونکوں کے قصے (بذیل ادبی مضامین) ۱۵۶، ۱۵۷

• مصنف اور مترجم: مصنف بے چارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے اور ان کی دماغ سوزی کی داد اس طرح دی جاتی ہے کہ بعض تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا، ۱۲۵ • اسلام اور عورت (بخ الدین جعفری کے مضمون مطبوعہ نیرنگ خیال پر تبصرے کے ذیل میں) ۱۲۲/۱۲۳ • آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس: کیا یہ صرف ہندو تہذیب سے متعلق و مخصوص ہوگی، ۱۰۷ • ہندو سوسائٹی کے اقدامات کی طرف صدر اورنٹیل کانفرنس کا رویہ، ۱۰۷

معیار میں مندرجہ ذیل رسالوں کے مضامین کا ذکر، اقتباس یا ان پر تبصرہ ہوا:
شاہکار، شاعر، الناظر (لکھنؤ)، ہمایوں (لاہور)، ندیم (گیا)، تنویر (کراچی)، اردو (اورنگ آباد)، نیرنگ خیال (لاہور)، ادبی دنیا (لاہور)، ادب لطیف (لاہور)، رفتار اردو، سہیل (علیگڑھ)، جامعہ (دہلی)، کلیم (دہلی)، کنول (اکبر آباد) معارف (اعظم گڑھ)، (لاہور)، ساقی، مساوات۔

زبان و ادب: ۔ دریائے لطافت : یحییٰ کے ترجمہ پر تنقید ۷۹/۸۲ • دریائے لطافت حصۂ منطق، مصنفۂ قتیل ۱۹۸/۲۰۱ • استفسارات : مصنفۂ مغل اور اردو (یعنی نصیر حسین خیال) کے چند اعتراضات بشکل استفسارات ۲۰۷ • اردو کے بعض تاریخی ماخذ : ابوالبرکات صدیقی کے مضمون مطبوعہ سہیل، پر تنقید ۲۲۶/۲۲۸ • 'یورپ میں اُردو' : انتظام اللہ صدیقی کے مضمون (مطبوعہ 'کنول'، اکبرآباد) کے اغلاط ۱۳۲/۱۳۳ • بہار اور اردو شاعری : معین الدین دردائی کے مضمون (مطبوعہ سہیل علی گڑھ) کے اغلاط، ۲۳۹ - ۲۴۴ • صفیر بلگرامی اور دریائے لطافت ۵۲/۵۵ • علی بخش دعا کے بارے میں (آرزو جلیلی کے مضمون مطبوعہ 'ادبی دنیا'، کا ذکر کرتے ہوئے) ۲۳۱ • دیوان جوشش ۶، ۴۷/۵۲، ۲۱۰ — اشتہار : کہ دیوان عنقریب شائع ہو جائے گا، ۳۸۴ کے بعد پیر کمال علی کمال کی مثنوی اُردو کے اقتباسات ('ندیم' گیا سے منقول) مع تبصرہ، ۱۲۸ • شتاب رائے : ابوظفر ندوی کے مقالہ کے اغلاط (مطبوعہ 'ندیم' بہار نمبر ۳۵ء پر تبصرہ کے ذیل میں) ۸۶/۸۷ • شیخ چاند کے اغلاط خطبات گارساں دی تاسی کے حواشی ۲۳۷/۲۳۸ • دی تاسی کی تعریف میں ۲۳۳/۲۳۴ • دی تاسی کے اغلاط ۲۳۴/۲۳۷ • دیوان دوم معروف (قلمی) ۱۹۴/۱۹۸

علمی تنقید: سیماب اکبرآبادی کی شاعری پر ۳۷۵ • معروف (الٰہی بخش) کے رنگ کلام پر ۶۸ (پہلا پیراگراف)

مختلف کتابخانوں کی قلمی کتابوں سے حاصل شدہ نوادر :

غالب : • غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں بعض مطلوب کتابیں (استفسارات) ۳۸۴ • غالب نے فدوی کی طرف جو شعر (گلہ دارد) منسوب کئے وہ کس کے ہیں (استفسار) ۳۸۴ • رباعی شیخ علی حزیں (فارسی) بنام آنجہانی برادر رام نرائن موزوں ۲۵۴ • شرف جہاں قزوینی کا ایک شعر (فارسی) ۱۱۶، ۳۶۱ • کلام سلیمان شکوہ ۳۱۱ (۲۷۶ تعارف) • کلام رافت شاگرد جرأت (۳۱۱ (۲۷۶ تعارف) • کلام طالب رام پوری ۳۱۱، (۲۷۶ تعارف) • مثنوی میر حسن ۱۲ - مثلثات میر حسن، ترکیب تضمین، ایجاد میر حسن ۱۱۳۔ مثنوی میر حسن در تہنیت عید ۱۴۴ (۲۵۰، ۲۷۶ تعارف) • مثنوی در وصف تصر جواہر۔ از میر حسن ۲۵۱، ۳۰۵ • بہبہانی کے مرآۃ الاحوال کے ایک اور نسخے کی روشنی میں بعض تصحیحات ۳۶۱

مخمس مسخی ۹ استغاثہ بجناب اصف الدولہ ۹ غزل آصف الدولہ و جواب شمس النسا بیگم ۱۱، ۱۰۴ • غزلیات سراج و ممنون و مشیر (ایک ایک غزل) ۱۱۴ • کلام دل عظیم آبادی ۱۱۷ • کلام سید محبوب خیر صولت عظیم آبادی (فارسی) ۱۱۷

• غزل میرزا غالب (کہوں یا نہ کہوں' ماخوذ از دیوان معروف) ۹۵ • غالب : اشعار غیر مطبوعہ' ماخوذ از تذکرۂ سرور ۱۴۳' ۱۳۹ • غالب کے دو لطیفے (بیخ آہنگ) ۳۳۳ بیخ آہنگ (ایک قدیم ایڈیشن کا تعارف) ۳۲۱/۳۲۳' ۲۷۶ • تذکرہ سرور اور غالب ۳۲۵ • سراپا سخن اور غالب ۳۲۴ • بیخ آہنگ ۲۷۶ (دو سطریں) • میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار 'احسن الاخبار' بمبئی ۱۸۴۴ء کا اقتباس ۹۵/۹۹

انجمن ترقی اردو : انجمن ترقی اردو کی تنظیم جدید کے سلسلے میں (اداریہ) ۲۵۰

• انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی 'اُردو' کی خدمات پر ۳۰ • انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار ۳۸۴ کے بعد (مٹا ہوا حصہ کی پشت پر) • انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کی ایک شاخ ۲۷۴ • لاہور کی ایک انجمن : انجمن اُردو پنجاب : کیا انجمن ترقی اُردو سے اس کا الگ رہنا مناسب ہے (اداریہ) ۱۹۳، ۲۵۰ • اُردو کی جانب گاندھی جی کے معاندانہ رویہ پر تبصرہ (اداریہ) : پس چہ باید کرد : اُردو کے مسائل سے انجمن کیسے نبٹے : ایک کانفرنس کے لیے ضروری مسائل کی تفصیل (اداریہ) ۲۵۰ • اُردو کا مسئلہ ۱۳۸ متحدہ ہندوستان کا خواب، گاندھی جی کا کانگریس کی پالیسی اور اُردو ۱۳۸۔

زبان کا مسئلہ : اردو ہندی ہندوستانی ۲۵۰ • اُردو کا مسئلہ : گاندھی؛ عبدالحق ۱۳۸۔

لسانیات : بہار کی اردو شاعری : تبصرہ' ۲۳۹/۲۴۴ • اُردو کے بعض تاریخی ماخذ (ابواللیث صدیقی کے ایک مضمون پر تبصرہ) ۲۲۶/۲۲۸ • گیارھویں صدی کی اُردو کا نمونہ : بہار کے عمادالدین قلندر کی طرف منسوب رسالہ مراۃ المستقیم معروف بہ سبد بھارستہ کے بارے میں ایک نوٹ ۶۳' ۶ • یہ رسالہ تمنا عمادی کی تحقیق پر جعلی ثابت ہوا جسے معیار نے شائع کیا لیکن تبصرہ کے ساتھ کے اعتراضات • نورجشمی (سید رضا قاسم کے جواب میں) ۲۶۴ • چند اعتراضات (خلیب شاداں) ۶۳/۶۷ • زبان کے بارے میں کے جواب میں ۲۱۱/۲۱۳ • دریاے لطافت، حصہ منطق، نوشتہ قتیل : مصطلحات علمیہ کو بیٹھ ہندی میں ترجمہ کرنے کی پہلی کوشش ۱۹۸/۲۰۱

اشخاص: آغا شاعر کی نظم پر چند سطری تنقید ۲۷۰ • آرزو جلیلی ۔ کلیات علی بخش دعا پر آرزو جلیلی نے ادبی دنیا ۱۰ فروری میں لکھا ہے، ۲۲۱ ۔ 'ادبی دنیا' جنوری ۳۵ء میں مطبوعہ جلیلی کے مصطلحاتِ علمیہ کی تعریف ۹۰ ۔ راسخ کے حالات لکھ رہے ہیں، کلیات کا انتخاب بھی شائع کرنا چاہتے ہیں، ۲۶۶ ۔ آرزو جلیلی کے مضمون 'اندر سبھا' کے بارے میں ۲۵۶ • ابوبکر شیث فاروقی نے بر جیس شاہ حقیقت کی قلمی کتاب 'ہشت بہشت' ترجمہ ہشت بہشت، دریافت کی ہے، ۱۸۶ • اختر حسین رائپوری: مہتابی رنگ پر اعتراض ۔ بشیر احمد میاں، ۱۲۵ • اختر کی نظم پر دو سطری تنقید، ۲۷۰ • ایم اسلم کے افسانہ پر تبصرہ، ۲۷۱ - ۲۷۲ • پریم بجاری (عندلیب شادانی) اور عروض، ۵ • تمنا عمادی (سید عارفہ اختر) خانوادۂ عمادیہ سے ملا، ہم نے اپنے شبہات (خدشے) سے انہیں آگاہ کر دیا ہے • تمنائی: "پیلیاس اور میلسانڈ" میٹرلنک کے ڈرامے کا ترجمہ جناب تمنائی نے کیا جو ان کے مقدمے کے ساتھ 'ادب لطیف' میں چھپ چکا اور کتابی صورت میں چھپ رہا ہے • تاجور نجیب آبادی کی شاہکار کے سالنامہ پر تبصرہ کے ذیل میں، خاصی تعریف)، ۲۷۰ • جارج پنجم کی وفات، ۱۰۵ جوش ملیح آبادی پر ۱۲۱؛ ۱۲۴/۱۲۵ • جوش (سلطان حیدر) ۔ افسانے کی تعریف ۲۳۹ حبیب الرحمٰن (حکیم) ۔ "شمائلہ خصال" کشف الظنون کے طرز پر لکھ رہے ہیں" انجمن سے شائع ہوگی ۔ حکیم صاحب نے بہار میں شعرا کی فہرست بھیجی ہے جن کا کلام 'نتیجۂ سخن' میں ملے، یہ ستبر کے 'بہار' میں شائع ہوگا" (ستمبر کا معیار کبھی نہ نکلا!)، ۳۰۰ • حجاب امتیاز علی کے بارے میں، ۱۲۲ • حسن عسکری (سید) ۔ 'دیوان ہمایوں'، دریافت کیا ہے ۱۸۶ • خیال (ریاض حسن خاں) دیوان مسرور کی تصحیح میں ان سے مدد لی ہے حسن کی مثنوی کی قیاسی تصحیح میں جناب خیال سے مدد لی، ۲۵۰ • خیال (نصیر حسین) ۔ مصنف 'مغل اور اردو' سے چند استفسارات کئے گئے (اختر اضافات)، ۲۰۷ • درد ائی (معین الدین) ۔ ان کے مضمون 'حیدر آباد میں قلمی مثنویاں' میں بہت سے اشعار غلط معلوم ہوتے ہیں، ۱۱۹ ۔ ذاکر صاحب ('در سہیل') کی تعریف ۔ مطبوعہ سالنامہ 'سہیل' پر تبصرہ کے ذیل میں ۲۳۹ • رشید احمد صدیقی (سہیل پر تبصرہ کے ذیل میں) کی تعریف ۲۳۸ ۔ (نیرنگ خیال پر تبصرے کے ذیل میں) ۱۲۳

• راجندر پرشاد کے خط کے طویل اقتباسات اور تعریف ۲۶۶، ۲۶۹ • راشد الخیری (مرحوم) ۱۰۶ • رامو میریادل والا (اللہ) کی وفات ۱۰۷ • سجاد انصاری کی تعریف (سہیل، پر تبصرہ کے ذیل میں) ۲۳۸ • سلیمان ندوی (سید) پر ۸۶؛ ۱۳۵ • سیدین (خواجہ غلام السیدین) کے مضمون حالی کی مصلحانہ شاعری، کا طویل اقتباس، ۱۲۷، "سالنامہ مشاہیر کار کے طبعزاد افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا افسانہ" قانونی مجرم" خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہے۔ خواجہ صاحب نے غالباً افسانہ نویسی کے میدان میں حال ہی میں قدم رکھا ہے لیکن انداز کہنہ مشقوں کا ہے، ۲۷۰ • عبدالحق: اولین پرچے میں تصویر (ص ۸ کے مقابل) نوٹ ۸۰ — ان پر تنقید، ۲۳۶ - • عبدالحمید (حکیم): ذوق کی تربوزانی ہے ۱۸۶ • عبدالستار صدیقی کی مضمون نویسی کی تعریف ۲۳۹ • عرش گیاوی، ثمیر احمد (۳ جولائی ۳۶) ۲۷۸ • عرشی (امتیاز علی) — نوابان رامپور کے نام، غالب کے خطوط کی جمع و ترتیب میں لگے ہیں، ۵، ۱۳۸ • فرحت اللہ بیگ: ان کے افسانہ کی تعریف ۲۷ • صولت عظیم آبادی (چند سطریں) ۱۱۳/۱۱۴ • عندلیب شادانی کے چند اعتراضات اور انکے جوابات ۱۲۳/۱۲۵، ۱۲۴/۱۲۵ • طاہرہ دیوی شیرازی: کیا یہ مؤلف کی ذہنی مخلوق ہیں "دسحر بنگال" پر تبصرہ کے ذیل میں) ۲۴۵/۲۴۶ • فلک پیما کی تعریف ۱۲۴ • فیاض محمود کی غیر معمولی تعریف ۱۲۴ • قاضی عبدالودود: انجمن کے لیے دیوان جوشش، مثنویات مصحفی اور تذکرہ میر حسن ایڈٹ کر رہے ہیں ۱۱۲ • کیلنگ کی وفات، ۱۰۵ • منصور احمد: ان کی کتاب دنیا کے بہترین افسانے دوسری بار آرہی ہے ۱۱۲ • مہیش پرشاد (ہوئی) ۲۷۶، میرٹھی کی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں ۱۱۲، • نظام الدین (ابوالعلم)، تصویر؛ مضمون انگریزی میں لکھا تھا۔ ہم جناب کے ممنون ہیں انہوں نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کر دیا ۲۷۲ • وحید مرزا: خسرو کی ہندی شاعری (اقتباس: ماخوذ از حالات و تصانیف خسرو مصنفہ وحید مرزا) ۲۱۵/۲۱۶ • وصی احمد بلگرامی کے بارے میں رائے، ۸۷-۸۸۔

مقالات: جن کا خصوصی نوٹس لے کر ان کا خلاصہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین، مطبوعات جدیدہ، یا عالم ادب کے عنوانات کے تحت درج کیا گیا:

• آرزو جلیلی، کلیات دما، ۲۳۱ • آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میسور کے مقالات کی فہرست

۱۰۹/۱۱۰ • ابواللیث صدیقی: اُردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ ۲۲۷/۲۲۸ • احمداللہ (حکیم سید) میر صاحب کی اصلاحیں ۲۳۱ ؛ بیدل عظیم آبادی ۳۵۷ • اسحاق الم (محمد): چغتائی صاحب کے ایک استفسار ۲۳۰ • اعجاز حسین: جدید اردو شاعری کی خصوصیات ۲۵۸ • افسر امروہوی: مصحفی کا قیام دہلی ۱۰۴ — منور خاں غافل لکھنوی، ۲۳۰ • انتظام اللہ صدیقی: یوپی میں اُردو ۱۳۲/۱۳۳ • تاجور نجیب آبادی: تاریخ اردو زبان ۱۳۳ • تبسم (صوفی غلام مصطفیٰ): غالب کے اُردو کلام کی چند نمایاں خصوصیات ۱۰۳/۱۰۴ ؛ غالب کا تصورِ حسن و عشق ۱۳۳ • تمکین کاظمی: اُردو کا پہلا گلدستہ جسے ایک خاتون نے جاری کیا • تنہا، محمد یحییٰ: قربان علی بیگ سالک (خلاصہ) ۳۵۷ • جاں نثار حسین اختر علیگ ابن مضطر: مضطر خیر آبادی ۲۲۸ • حسن نظامی: مرقد غالبؒ و مرقد ذوق کے بارے میں ۱۸۶، ۲۵۹/۲۶۰ ؛ ذوق کا حلیہ، غالب کا حلیہ ۲۵۹ • حمید عظیم آبادی: شاد و صفیر ۳۵۸/۳۵۹ • دردانی (معین الدین): بہار اور اُردو شاعری ۲۲۸/۲۲۹ ؛ ۲۳۹ • ذاکر حسین: حالی محبِ وطن کی حیثیت سے ۲۲۹ • راشد (ن۔م): اردو ادبیات پر غالب کا اثر ۹۹/۱۰۱ • رضا قاسم (سید): اُردو کے یورپین شعرا ۲۲۱ • زور، سید محی الدین قادری: اُردو کے آغاز اور ماخذ کے بارے میں بعض غلط فہمیاں ۲۵۸ • زین العابدین: قصۂ رضوان شاہ، ۲۶۱ • ساغر جعفری: اُردو شاعری پر ادب انگریزی کا اثر ۲۲۹ • سجاد انصاری: روز جزا (ڈراما) ۲۳۸/۲۳۹ • سیدین (= خواجہ غلام السیدین): حالی کی مصلحانہ شاعری، ۱۲۹ • سیماب اکبرآبادی: سحر معنی۔ غلام امام گویاموی، م۔ ۱۹۴۱ء کی مثنوی، ۱۳۲ •

• شاغل (= سید شاہ عطاء الحق شاغل فریدی بہاری) مضطر علیہ الرحمۃ، ۱۰۱/۱۰۲ • طٰہٰ اشرف (سید محمد): اردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصّہ ۲۵۸ • عامر عباس (میر محمد): اُردو کی تاریخ اور حالت (: اُردو سے ہندوؤں کی نفرت پر مناظرانہ مقالہ) ۲۲۹ • عظیم بیگ چغتائی: میر انیس و فردوسی (انیس کے بہت سے اشعار فردوسی کے ہو بہو ترجمہ ہیں) ۲۲۰ • عبدالحق: — سرسید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ اورینٹل یونیورسٹی، ۹۰ — گلدستۂ رنگین و سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی، ۹۰ — ایک ہندی شعرا اور اردو شعرا پر مولانا حالی کا محاکمہ، ۹۰ — خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو انجمن حمایت اسلام لاہور، ۱۹۱/۱۹۳ • عبدالرؤف (حافظ سید): میر کمال علی شاہ المخلص بہ کمال

اوران کی مثنوی اردو، ۱۳۰/۱۳۲ • عزیز احمد: غدر سے پہلے کی اردو شاعری پر ہندستانی تمدن کے زوال کا اثر، ۹۷/۹۸ • عشرت لکھنوی: جان عالم ۲۷۱ ——— جلیس ماضی ۱۲۷/۱۲۸ — تعلیم اردو ۲۳۲ • غوث (محمد): کتبخانہ دفتر دیوانی حیدر آباد میں کرناٹک کی تاریخ کے مخطوطات، ۱۲۰ • قادری (حامد حسن) اُردو شاعری کے ادوار پر، ۱۰۲ • قاضی عبدالودود: کلام جوشش عظیم آبادی ۲۱۰ • کیفی (دتاتریہ) تاریخ اردو کا مطالعہ، ۹۸/۹۹ — غالب کی شخصیت اور اردو ادب میں اس کا مرتبہ ۲۶۰ • مجیب محمد: ہندستانی ڈراما • مرتضیٰ حیدر نقاد (سید): مصنف سیر المتاخرین کی آل و اولاد، ۲۳۱ • مسعود حسن رضوی: دیوان افسوس، ۲۵۸ • نظام الدین، ابوالحلم: خطبۂ صدارت شعبۂ اسلامیات، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، ۱۸۷/۱۹۰ • نیاز احمد ترمذی: لاہور نظیم کا علمی و ادبی حلقہ، ۱۲۸ —— عہد شاہجہانی کا علمی و ادبی حلقہ ۱۲۹/۱۳۰ • ہندستانی اکیڈیمی میں جو مضامین پڑھے گئے ان کی فہرست ۱۱۱/۱۱۲ • وقار عظیم: شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر، ۱۰۱ • ولی الرحمن (شاہ): غالب و اقبال، ۱۰۲/۱۰۳ • یاس یگانہ چنگیزی: خواجہ آتش، ۹۸ • یوسف حسین خاں: نظام الملک کے آبا و اجداد ۲۵۸۔

شعر/مصرع کا استعمال:

اقبال کے شعر/مصرع کا استعمال، ۲۷۵ ع "جو کام کچھ کر رہی ہیں تو میں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے" ۲۷۵ • غالب کے شعر/مصرع کا استعمال: ۳ ض "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے" • حسرت موہانی کا شعر ۱۲۴ — فانی کا اشعار کا استعمال ۱ ع سپردم تو مایۂ خویش را + تو دانی حساب کم و بیش را۔

یوروپی ادب و فضیلت کے حوالے:

اناطول فرانس کا ایک قول (دو سطر): فائدہ کی بات: ۲۷۵ (کتابوں کے لکھنے سے کرم کھائے' کی کاشت کرنا زیادہ فائدہ مند ہے" • پیرلوتی، ۱۲۲ • جون میسفیلڈ ۱۰۵ • فرانک وائش وبر آلس، ۳ • ارسل پرد ست، ۳ • جورج ایلیٹ ۸۳ • ژوزف ژساں ۸۳ • پیرلوئی ۸۳ • پیرآذاں ۸۵ • موپاساں ۸۵ • دولڑ پیرڈ ۸۰ • فرانڈ ایڈورڈ ۸۵

ادب کے بارے میں:

ادب کی وسعت (اسکوپ): اک قدر وسیع حس قدیالمثال زندگی؛ ادب کہ سکتا ہے انسان ہوں، ۳ • ادب کی اہمیت قومی زندگی میں ۳ • تخلیق حسن تبلیغ عقاید سے زیادہ مقدم • ادب کا دوسرے علوم سے تاگزیر واسطہ: نفسیات، فلسفہ، تاریخ، ۶ • تخلیقی ادب کی اہمیت پر، ۶ • ہم کس قسم کے

ادب کے خواہاں ہیں : (۱) اجتہاد کو تقلید پر ترجیح ، (۲) قواعد فن منزل من السماء نہیں (۳) غلبہ یافتہ جماعتوں کو ادب کو اپنی اغراض کے تابع بنانے کی کوشش کرنی چاہیے (۴) فن کار کی آزادی ۳ • اہم الفاظ صنعت کار (= فنکار) ۳ ، ذوقیات و معنویات ۳

ادبی تنقید • تنقید میں توازن کی مثال : دیوان تاباں ، مرتبہ عبدالحق پر تبصرہ ۳۶۹/۳۷۰ • پنڈت کیفی کے ترجمہ دریائے لطافت پر ، ۷۹ • لحر بنگال ، از طاہرہ دیوی شیرازی پر تبصرہ ۸۳/۸۵ • خالص ادبی تنقید کی مثال : سیماب کے دیوان کلیم عجم پر تبصرہ ۳۸۴/۳۸۵ • قاضی صاحب کی ۱۹۳۶ء کی طرز انشا کے لیے : ضروری گزارش : پہلا پیراگراف (پہلا پرچہ) ، الف ، معروضات ۳ - ۴ ، ریڈیو ڈیکلنگ ۱۰۵/۱۰۶ • ہجو ملیح / طنز (سید سلیمان ندوی پر) ۸۶ • روش املا : عمزہ لکھنا صحیح نہیں (ہوے ، ہوی ، کیجے ، چاہیے ، لیے میں) پہنچنا (نہ کہ 'پہونچنا') • ہاے مختفی لکھنا صحیح نہیں (انگریزی یا ہندی لفظ کے اختتام پر) اغلاط مونث نہیں مذکر ہے : ۲ • اعلام کا ترجمہ کرنے کی روش : مجلس خانہ برطانی ۴ • تحریر پر انگریزی طرز فکر کا اثر ' راموں کی وفات ۱۰۹/۱۱۰

افسانے : • ایک ہونہار نوجوان (طبع زاد افسانہ) ۲۷۹ • واپسی (افسانہ ، از ولیم گرہارڈی - ترجمہ) ۲۸۴ • عیاریاں (افسانہ ، از د- دجیکبس - ترجمہ) ۳۱۸ • کیتھرین بلد (تمثیل / ڈراما ، از مورس بیرنگ - ترجمہ) ۲۹۸

'معیار' کے بارے میں : • اندرونی ٹائیٹل پیج پر : انجمن ترقی اردو بہار کا رسالہ (= ایک آدھ بار 'شاخ نشیمن' کا رسالہ بھی لکھا گیا) • قواعد معیار ، (جو ہر پرچہ میں پابندی سے چھپتے رہے) : اولین پرچہ میں : ۱۳۶ کے بعد • ضخامت کی اسکیم یوں تھی کہ چھ ماہ ۱۲ صفحات اور چھ ماہ ۲۴ صفحات : ۱۱۳ • مرتب قاضی عبدالودود ، معاون : محمد شریف عالم آرزو علیلی • جولائی - اگست ۳۶ء مشترکہ شمارہ کا اداریہ ، ۲۷۶ • 'معیار' کی زبان پر دوسروں کی تنقید کا جائزہ ، ۲۷۵ • 'معیار' کے تبصروں پر دوسروں کی تنقید کا جائزہ ، ۲۷۵ • معیار کا تعارف : معیار کی ترتیب کی اسکیم ۳۴/۸ (۱) مستقل عنوانات : معروضات ؛ اقتباسات ؛ استفسارات) آثار ادبیہ ، غالب ، اوراق پارینہ ؛ ہماری زبان ، مطبوعات جدیدہ ؛ محکمہ (یعنی فورم) ؛ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین ؛ عالم ادب • (۲) افسانے : طبع زاد یا تراجم ؛ تمثیلیں ؛ نظمیں یعنی رائے حال کی غزلیں

شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے]؛ مقالات، تصاویر) ۲۵ • رسالہ کی کامیابی کے لیے چار ضروری عناصر (اولین پرچہ میں: ضروری گزارش کے عنوان سے) — اوّل: نکالنے والے، جو سرمایہ لگا سکیں۔ دوم: مرتبین — جن میں علم کے ساتھ صحیح قوت نقد ہو۔ سوم: قلمی معاونین چہارم: خریدار، جو ان صحیح ذوق پایا جائے۔

• 'معیار' کیوں نکالا گیا (معروضات) ۳ — "معیار" کی پہلی جلد مکمل ہوگئی اس میں ۴۸ صفحوں کی کمی ہے، جو اسی سال پوری کر دی جائیگی۔ ہمیں افسوس ہے کہ معیار ابتداے اشاعت ہی سے وقت پر شایع نہیں ہو رہا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ ستمبر کا پرچہ ستمبر میں نکل جائے اور ہر ماہ وقت پر شائع ہوا کرے۔ اگست کا پرچہ معیار ۱۱۲ کے بجائے ۱۲۰ صفحات پر شائع ہوگا۔" (لیکن ستمبر کا معیار پھر کبھی نہ نکلا اور آخری پرچہ ثابت ہوا)

• 'معیار' کے غلط نام شائع کرنے کی روش پر تنقید کا جائزہ، ۲۷۵۔

اشتہارات: (۱) مطبوعات شاد بکڈپو، پٹنہ (۲) دیوان چوشش: عنقریب شائع ہو جائیگا (۳) اصلاحیہ بک ڈپو، پٹنہ

••

دوسرے مضمون نگار

مصنف وار اشاریہ:۔ آرزو جلیلی : سکون (تمثیل، از مترلنک)، ۳۰

• مثنوی مادر ہند، از شاد عظیم آبادی پر تبصرہ، ۸۸ • اشعار میر، مرتبہ عبدالمنان بیدل پر تفصیلی تبصرہ، ۱۱۹ • اشعار مومن، مرتبہ عبدالمنان بیدل پر تفصیلی تبصرہ ۱۱۹ • میٹر لنک کے خاموش ڈرامے، ۷۹ • بدگمانی (مولیئر کے ڈرامے کا ترجمہ)، ۱۷۰ • حسن رائگاں (موپاساں کے افسانے کا ترجمہ)، ۱۴۸ • میکسم گورکی: تعزیتی نوٹ، ۲۷۸ • اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں، ۳۵۰ • علی بخش دعا (ادبی دنیا میں شائع شدہ مضمون کا خلاصہ) ۲۳۱/۳۳۲ • سیماب اکبر آبادی کے مقدمہ "مادر ہند" مصنفہ شاد پر تنقید ۵۵/۸۹ -

• **اعجاز حسن خاں: امیر مینائی** اور ان کی یادگار ایک مرقع، ۱۴۰ • میرے خاندان سے تعلقات، کی تفصیل مع تذکرہ ۱۴۰/۱۴۲ ◎ **اعجاز بستوی**: گوتمی کے پلاٹ یا ترجمہ پر اعتراض (۴ سطریں) ۳۱۲ • **بیدل (عبدالمنان)**: نظام الدین کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ، ۳۳۴ ◎ **پریم بچاری**: عندلیب شادانی ◎ **تماشائی**: قاضی عبدالودود ◎ **تمنائی (زہیر احمد)**: سانپ (المیروز پیرس کے افسانہ کا ترجمہ)، ۹ ◎ **ثمر (عبدالحفیظ)**: ندیم (بہار نمبر) پر تبصرہ، ۱۱۵ ◎ دیہات کی جھونپڑی (جیخوف کے افسانے کا ترجمہ)، ۱۶۸ • محکمۂ تعلیم کی درسی کتاب میں مضحکہ خیز اغلاط، ۱۳۲ • سید سلیمان ندوی کے "ندیم" میں ایک بیان پر اعتراض، ۱۲۵ ◎ **حبیب الرحمٰن (حکیم)**: بنگالہ کا پہلا گدستہ "نغمۂ سخن" ایک بہاری کا ادبی کارنامہ، ۳۲۹ ◎ **حسن عسکری (سید)**: صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے، ۲۵۵ ◎ **حسن نظامی**: مرقعِ غالب اور مرقعِ ذوق (اقتباس)، ۱۸۶ • **حمید عظیم آبادی**: مرکز شاد و صفیر (ندیم میں شائع شدہ مقالہ کا خلاصہ)، ۳۵۸، ۳۵۹ • **خیال (ریاض حسن خاں)**: ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال، ۳۶۶ — دیوان مروف میں تصحیف مزید، ۳۶۰ • **دردائی (معین الدین)**: حیدر آباد کے کتبخانوں میں اردو کی بعض قلمی مثنویاں ۲۰۲ • بہار اور اردو شاعری (سہیل) میں شائع شدہ مضمون سے بعض کام کی باتیں) ۲۲۸/۲۲۹ • **راجندر پرشاد (بابو)**: ہندی ساہتیہ سمیلن کے خطبۂ صدارت کے طویل اقتباسات، ۲۶۶، ۳۶۷ • **راشد (ن-م)** اردو ادبیات پر غالب کا اثر ("ادبی دنیا" کے مضمون کا خلاصہ) ۹۹/۱۰۱ • **رضا قاسم**: 'نور جہانی' صرف عورت ہی کے لیے یا مرد کو بھی کچھ کہتے ہیں؟ • **سید حسن**: سالنامۂ ادب لطیف، پر تبصرہ ۱۲۶

• **سیدین (= خواجہ غلام السیدین)**: حالی کی مصلحانہ شاعری

(مطبوعۂ کلیم، دہلی سے طویل اقتباس) ۱۱۹ • سنہا (سچدانند): خطبۂ صدارت ہندستانی اکیڈمی (خلاصہ) ۱۱۱/۱۱۸ • شمس الدین احمد: دیوان ہمایون بادشاہ، ۳۱۲/۳۱۵ • طٰہٰ اشرف (سید محمد): اردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ] (۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین کے ذیل میں 'ندیم' میں شائع شدہ مقالہ کا خلاصہ) ۳۵۸ • عبدالحق: تصویر، ۸ — خطبۂ صدارت انجمن اسلام (اقتباسات) ۱۹۱/۱۹۳ — بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی حقیقت (اس میں خصوصی زور اردو کی طرف گاندھی جی کے غیر ہمدردانہ رویہ پر ہے) ۲۱۷/۲۲۵ • عبدالستار صدیقی: 'جز' اور 'جزو' کی بحث ۳۶۲/۳۶۶ — ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال ۳۶۴/۳۶۶ • عرشی (امتیاز علی): غالب کے تین خطوط (غیر مطبوعہ)، ۱۵ • عروج قادری (سید احمد): نمکدہ (افسانہ از منفلوطی: ترجمہ)، ۲۵/۲۹ • عزیز احمد: غدر سے پہلے کی اُردو شاعری پر ہندستانی تمدن کے زوال کا اثر (خلاصہ)، ۹۷/۹۸ • عطارد = قاضی عبدالودود • عندلیب شادانی: خسرو کی شاعری پر تنقید (وحید مرزا کی کتاب حالات و تصانیف خسرو کے ایک باب پر)، ۲۱۴ — معیار کی زبان: الفاظ، تراکیب اور طرق استعمال پر تنقید ۲۱۲/۲۱۳ — معیار کے مضمون نگاروں کا استعمال کردہ تلفظ الفاظ و محاورات (نمونۃً: کراہیت، ترجمہ بمعنی حال - تبادل بمعنی مبادلہ، سوچنا بمعنی سوچنا، اکیلے بجائے اکیلا، قبلہ گاہی)، ۲۶۴ — ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال ۳۶۶ — شکست پندار نظم)، ۴۲ — شملہ کی برکھا (نظم) ۱۴۶ — تصحیح ۲۶۴ — انقلاب روزگار (نظم) ۳۰۴ • محسن مصحفی، غزل آصف الدولہ، مثنوی میر حسن (تلامذۂ گرزہ قاضی عبدالودود) کے متن کے بارے میں ۲۱۰/۲۱۲ • ق-و = قاضی عبدالودود • مبتدی = قاضی عبدالودود • متعلم = قاضی عبدالودود • مجیب (محمد): مکتوب بنام گاندھی جی (جو جواہر لال نہرو نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور اجلاس میں پڑھ کر سنایا اور مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں نقل کیا) ۲۲۲/۲۲۴ • محمد ادیب = قاضی عبدالودود • منصور احمد: گومتی (رونین کے افسانے کا ترجمہ) ۱۷/۲۴ • نظام الدین (ابوالعلم محمد): آل انڈیا اورینٹل کانفرنس شعبۂ اسلامیات کا خطبۂ صدارت ۱۸۶/۱۹۰ — ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات ۳۳۲/۳۴۲ • وحید مرزا خسرو کی ہندکاری ۲۰۹/۲۱۴ • یوسف الدین (احمد): بلخی باطن: ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد (ماخوذ از مرآۃ الاحوال مصنفہ بہبہانی) ۱۸۵/۲۲۲ • ؟ = قاضی عبدالودود۔

معیار کے لکھنے والے

• **آرزو جلیلی** محمد شرف عالم: مجالا (ضلع دربھنگا) کے رہنے والے تھے۔ والد جلیل صاحب وکیل تھے۔ آرزو سائنس کالج کلکتہ کے طالب علم تھے۔ ہم اور وہ دونوں کل ہند اردو کانفرنس کے موقع پر عبدالحق صاحب کے لئے بہت سی چیزیں بہار شریف سے لائے تھے نمائش کے لئے۔ ڈاکٹر رشید (تاریخ۔ بی، این کالج) اور قاضی مجاہدالاسلام ان کے اعزہ میں ہیں (عسکری صاحب کی زبانی)۔

• **اعجاز حسن خاں**: رسول پور کے زمیندار اور ریاض حسن خاں خیال کے بھائی تھے۔ معارف میں اکثر لکھتے تھے۔ امیر مینائی کے خاندان کی تصویر قاضی صاحب کو انھیں سے ملی تھی۔ ان کے والد امیر کے شاگرد تھے۔ امیر بہار آتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ امیر کے متعدد خطوط ان کے نام سے ہیں۔

• **پریم بچاری** = عندلیب شادانی۔

• **ممتاز علی** (زبیر احمد): "زندہ چلن" کے مصنف "تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے" وہاں چند سے انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ اردو ٹائپ رائٹر کی تجارت میں لگے ہوئے ہیں۔

• **حکیم حبیب الرحمٰن** (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۴۷ء) ڈھاکہ کے معروف ادیب، طبیہ کالج ڈھاکہ کے بانی، حکومت سے شفاء الملک کے خطاب یافتہ، قومی تخریب میں شمول کے بعد خطاب واپس کر دیا۔ مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے ۵۰ برس پہلے، شولے ڈھاکہ، آسودگان ڈھاکہ کے مصنف؛ بنگال کے مصنفوں پر ثلاثۂ غسالہ مرتب کی تھی، معلوم نہیں چھپی کہ نہیں۔ ہفتہ وار المشرق، اور ماہنامہ جادو (ڈھاکہ) کے ایڈیٹر رہے۔

• **عبدالحق**: (م ۱۹۶۱ء) اردو کے معروف ادیب اور انتھک مجاہد، متحدہ ہندوستان میں اور اس کے بعد پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے ناظم اعلیٰ۔

• **عبدالستار صدیقی**: (۱۸۸۵ء-۱۹۷۲ء) آلہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر تھے۔ عربی فارسی اور اردو کے مسلّم الثبوت عالم تھے، اردو کے تین چار مستند محققوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ زبان اور املا کے مسائل پر انہیں استناد کا درجہ حاصل تھا، ہندوستانی اکیڈیمی کا رسالہ "ہندوستانی" بھی عرصہ تک ان کی نگرانی میں نکلا۔ سلم صدیقی، ان کے صاحبزادے ان کی یادگار ہیں۔

• **عبدالحفیظ نثر**: پھپھوند کے وکیل عبدالماجد صاحب کے بیٹے، عسکری صاحب کے شاگرد تھے۔ ہائیسکورٹ کی مسجد کے متولی تھے۔ (عسکری صاحب کی زبانی)

• **عندلیب شادانی** (وجاہت حسین) (م ۱۹۶۹ء): رام پور میں پیدا ہوئے، فارسی کی اعلیٰ تعلیم اورینٹل کالج لاہور میں پائی اور لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ تقریباً نصف صدی ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے، جہاں وہ صدر شعبۂ فارسی و اُردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے منصب پر فائز تھے اور استاذ الاساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ پُرگو اور خوش گو شاعر تھے، ناقد اور محقق تھے۔ فارسی اور اُردو پر یکساں عبور تھا۔ 'تحقیقات' 'دورِ حاضر' اور 'اُردو غزلگوئی' اور 'نشاطِ رفتہ' (کلام) ان کی چند کتابوں کے نام ہیں۔

• **عروج قادری** (سید احمد): آنجہانی جماعت اسلامی کے ماہنامہ 'زندگی' کے ایڈیٹر رہے۔

• **سید حسن عسکری**: (پ ۱۹۰۱ء) تاریخ از منۂ وسطیٰ کے معروف مورخ۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے منسلک رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں قیام ہے۔

• **سید رضا قاسم**: مختار تھے، عسکری صاحب کے ہم محلہ تھے۔ یعنی گولکپور میں رہتے تھے، ادب کا اچھا ذوق تھا۔ (عسکری صاحب کی زبانی)

• **سید حسن ایم اے**: سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، اب پٹنہ ہی میں قیام ہے۔

• **حافظ شمس الدین سیزی** (۱۸۹۶ء-۱۹۷۵ء): پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے، ایل، ایل، مظفر پور میں اُردو فارسی کے اور کلکتہ میں قانون کے استاد رہے۔ ۱۹۲۷ء میں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے پٹنہ کالج آئے اور صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ فروری ۱۹۷۵ء میں انتقال کیا کلام کا مجموعہ 'گلبانگ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے

• **ریاض حسن خاں خیاؔل** (۱۸۷۸ء-۱۹۵۳ء): اعجاز حسن خاں کے بھائی۔ موضع رسول پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔

• **معین الدین دردائی**: علیگڑھ یونیورسٹی کے نائب رہ، بہار شریف کے رہنے والے؛ علیگڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کی تصانیف میں 'جلوے' اور 'تاریخ خاندان فردوسیہ' قابل ذکر ہیں۔ ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو انتقال ہوا۔

• **منصور احمد** : پنجاب کے مشہور ایڈیٹر اور ادیب - اُس وقت ادبی دنیا کے ایڈیٹر تھے۔ 'ھمایوں'، 'شاہکار'، وغیرہ کی ترتیب میں شامل رہے، آزاد و جلیلی سے قریبی تعلق تھا۔

• **مہیش پرشاد** : صدر شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، خطوط غالب کے مرتب۔

• **عبدالمنان بیدل** : سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، حال مقیم پٹنہ

• **ڈاکٹر نظام الدین** (حیدر آباد) : عربی و اسلامیات کے فاضل عثمانیہ یونیورسٹی اور دائرۃ المعارف سے ملازمت تک وابستہ رہے۔ قاضی صاحب کے کیمرج کے ساتھیوں میں تھے دسمبر ۱۹۶۸ء میں انتقال کیا۔

• **وحید مرزا** : سابق صدر شعبۂ تہذیب اسلامی لکھنؤ یونیورسٹی، العدۂ دائرۃ المعارف اسلامیہ کے لیے پاک، حکومت کے پروجیکٹ ڈائرکٹر (در لاہور) اکتوبر ۱۹۷۲ء میں وفات پائی۔

• **محمد ادیب ایم، اے** = عطارد = تماشائی = متعلم = 'ع' = قاضی عبدالودود۔

• **یوسف الدین احمد بلخی** : فیضی الدین بلخی کے بھتیجے تھے۔ رانچی کالج میں فارسی کے لکچرر تھے، اچھے شاعر بھی تھے۔ قاضی صاحب کے رشتہ دار تھے۔ ۱۹۶۱ء کے آس پاس وفات پائی۔

قاضی عبدالودود (پ: ۱۸۹۵ء) والد کا نام قاضی عبدالوحید، جو احمد رضا خانی تھے، رسالہ تحفۂ حنفیہ کے مالک و ایڈیٹر تھے اور ۱۳۲۶ھ میں فوت ہوئے ('مغفور')۔

ابتدائی تعلیم اینگلو محمڈن اسکول (پٹنہ سیٹی) اور اینگلو محمڈن اورینٹل کالج (علیگڑھ) سے منسلک اسکول (ہوسٹل: مورسن کورٹ و اسکڈ آنل ہاؤس) بلڈنگ ٹوٹوریل کالج (علیگڑھ) میں پائی۔ میجر جنرل گرامی کے انتقال کے بعد پٹنہ آکر پرائیوٹ میٹرک کا امتحان دیا، انٹر کیا اور بی اے کیا، پھر تحریک ترک موالات میں شامل ہوگئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان گئے، جہاں کیمرج سے اکنومکس میں ٹرائی پوس لیا اور لندن سے بیرسٹری کی سند لی۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں واپس آگئے۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں معتمد ار نکالا۔

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 200.88